بنگلا ادب کی تاریخ

(دور قدیم - تا دور جدید)

دور قدیم و وسطی :-

ڈاکٹر محمد شہید اللہ - صدر شعبۂ بنگالی

راج شاہی یونیورسٹی

نثر دور جدید :—

محمد عبد الحی - صدر شعبۂ بنگالی

ڈھاکا یونیورسٹی

نظم دور جدید :—

سید علی احسن - صدر شعبۂ بنگالی

کراچی یونیورسٹی

مترجم :—

مولانا عبد الرحمن بیخود

ہڈ مولوی ، نیوگورنمنٹ ہائی اسکول ، ڈھاکا

ناشر :— ڈھاکا یونیورسٹی

ناشر :—
ڈھاکا یونیورسٹی

طبع اول — جون سنہ ۱۹۵۷ع

طابع :—
عبد المجید سرکار
مالک — مجید پبلشنگ پریس
۲/۲ راجا ڈیوڑھی - ڈھاکا

پیش لفظ

حکومت پاکستان کے شعبۂ تعلیمات کی خواهش پر سنه ۱۹۵۲ع میں ڈھاکا یونیورسٹی نے پاکستانی اسلوب فکر پر بنگلا ادب کی تاریخ بنگلا زبان میں مدون کرنے کی اهم ذمه داری تین گرانپا یه اهل قلم حضرات کے سپرد کی - دور قدیم اور دور متوسط کی تدوین مشهور عالم لسانیات جناب الحاج ڈاکٹر محمد شهید الله صاحب نے کی - دور جدید یعنی انگریزی عهد حکومت کی ابتدا سے زمانۂ حال تک کی نثر پر فاضل محترم جناب پروفیسر محمد عبد الحی صاحب صدر شعبۂ بنگالی، ڈھاکا یونیورسٹی نے عرق ریزی کی اور حصۂ نظم کو جناب مکرم پروفیسر سید علی احسن صاحب صدر شعبۂ بنگالی، کراچی یونیورسٹی نے مدون کیا -

ڈاکٹر محمد شهید الله اپنی مهارت لسانیات اور وسعت علم کیلئے پاک و هند برصغیر میں محتاج تعارف نهیں هیں - کم و بیش چالیس سال تک انهوں نے ڈھاکا یونیورسٹی میں بنگلا اور سنسکرت زبان و ادب پر تحقیقات کرتے هوئے معلم کی حیثیت سے گرانقدر خدمات انجام دی هیں - ان کے دوسرے دونوں رفقائے کار جواں سال اور جواں همت مگر پخته کار اور با صلاحیت ادیب و تنقید نگار هیں - ان کی مساعی کتابی

صورت میں حاضر خدمت ہے اس لئے مزید تعارف لا حاصل ہے -

یہ حقیقت ہے کہ بنگالی ادب نے انگریز حکمرانوں کے سایہ عاطفت میں ترقی حاصل کی اور مسلمان اپنے قابل رشک ماضی کی پاداش میں مقہور و مغلوب کئے جاتے رہے - اس لئے اس بنگالی ادب میں جو حقیقۃً غیر اسلامی تھا مسلمانوں کا وجود صفر سے زیادہ نہ رہا - پیش نظر تاریخ آپ کو بتائے گی کہ مسلمانوں نے کیوں بنگالی ادب میں حصہ نہ لیا اور اس کی وجہ سے انھیں کیا کیا نقصانات اٹھانے پڑے -

بنگالی ادب کی نشو و نما میں ابتدا سے چونکہ غیر مسلموں کا ہاتھ تھا اور معدودے چند مسلم ادیبوں نے جو حصہ لیا بھی وہ انھی کی تبعیت میں تھا اس لئے وہ میدان ادب کے شہ سوار نہ گنے جاسکے - تذکرہ نویس چونکہ غالباً ہندو تھے اس لئے انھوں نے ممتاز مسلمان ادیبوں کو ہمیشہ نظر انداز کیا اور سنہ ۱۹۲۷ سے پہلے تک جو تذکرہ بھی لکھا گیا اس میں ہندو شعرا اور نثر نگاروں ھی کے گلے میں دیوتاؤں جیسی عظمت کا ہار پہنا کر ان سے اظہار عقیدت مندی کیا گیا - مسلمان ادبا ہندوؤں کے نقش قدم پر چل کر بھی کوئی مقام حاصل نہ کر سکے - اس کتاب میں ان اسباب کی پوری پوری تفصیل ملے گی جنھوں نے علمی، سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر مسلمانوں کو پس ماندہ رکھا -

آخر تاریخ نے ورق الٹا اور سنہ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد سے مسلم ادیبوں کا انداز فکر اور اسلوب نگارش بدلا۔ زمانے نے نئی کروٹ لی اور خودداری کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی کے احساس نے مشرقی پاکستان کے مسلمان نوجوانوں کو ماضی کی بنیادوں پر مستقبل کیلئے عمارت کھڑی کرنے کا خیال دلایا۔ ہمیں اس احساس پر ناز ہے جو ہمارے لئے تازیانہ عبرت بھی ہے اور شمع راہ بھی۔ قافلہ رواں ہے اور یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ منزل مقصود سے ہمکنار ہو کر رہے گا۔

پیش نظر تذکرے میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندو ادیبوں کو ان کی شایان شان جگہ دیتے ہوئے مسلمان ادیبوں کے کارناموں کو تنقید کے معیار پر پرکھ کر نمایاں کیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر کسی کی حق تلفی کئے بغیر جائز حق داروں کو حق دلایا جائے۔ یہ تذکرہ اس سلسلے میں پہلی قابل اعتماد کوشش ہے اور متوقع ہے کہ مستقبل کے تذکرہ نویسوں کو اس کی بنیاد پر کام آگے بڑھانے کا موقع مل سکے گا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بنگلا زبان کروڑوں باشندگان پاکستان کی ایک زندہ زبان ہے اور اب جبکہ اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوچکا ہے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہمارے اردو ادیب بھی اپنے اشہب قلم کا رخ موڑ کر اس زبان کے

دامن کو وسیع تر کرنے کیلئے خود اس زبان میں مہارت پیدا کریں - تاریخ شاھد ھے کہ مسلمان صاحبان ذوق نے ھمیشہ نئی نئی زبانیں سیکھی ھیں اور اسی طرح یونانی، لاطینی، سنسکرت اور دوسری زبانوں کے شہ پارے اسلامی زبانوں میں منتقل ھوسکے ہیں - ایرانی زبان کو جس طرح عربی مسلمانوں نے اپنا کر اسے اسلامی زبان کا درجہ دیا اسی طرح اس کی سخت ضرورت ھے کہ بنگلا زبان کو بھی علمی، فنی اور فکری طور پر دور حاضر کی ترقی یافتہ زبانوں کے ھمدوش بنانے کیلئے سارے پاکستانی اھل قلم ھم آھنگ اور ھمنوا بن جائیں - یہ زبان اب ھمارا اثاثہ ھے اور اس کے گلشن ادب کی آبیاری ھمارا مقدس فریضہ -

جس طرح ڈھاکا یونیورسٹی نے تین فاضل علمائے ادب بنگالہ کو اس کتاب کی تدوین پر متعین کیا تھا اسی طرح اصل بنگلا کتاب کا بلا واسطہ اردو میں ترجمہ کرنے کا کام میرے سپرد کیا - باوجودیکہ غیر ضروری اقتباسات اور بے ضرورت تطویل سے حتی الامکان پرھیز کیا گیا ھے تاھم یہ تذکرہ کافی ضخیم ھوگیا - لیکن یہ بھی حقیقت ھے کہ ایک زندہ ادب کی بارہ صد سالہ ارتقا کا تذکرہ اس سے مختصر اوراق میں ناممکن نہیں تو دشوار ضرور تھا -

اردو زبان میں بنگلا ادب پر یہ پہلا تذکرہ ھے اور متوقع ھے کہ

علم دوست حلقوں میں اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اس کے ترجمے میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ اسے اصل سے قریب تر رکھا جائے یہاں تک کہ بعض مقامات پر طرز ادا میں بھی اصل کا چربہ من وعن اتارا گیا ہے۔ اس لئے اگر اردو داں حضرات کو اس کی بعض عبارتیں اردو طرز نگارش سے الگ نظر آئیں تو وہ مترجم کی اس دانستہ جسارت پر اسے معاف رکھیں کیونکہ اس سے مقصد بنگالی اسلوب نگارش سے واقف کرانا بھی ہے۔

معہذا اگر کچھ واقعی خامیاں رہ گئی ہوں تو اسے مترجم کی بے بضاعتی پر محمول کرکے قارئین قابل درگذر سمجھیں اور بڑا کرم ہوگا اگر مترجم کو اس کی کوتاہیوں پر مطلع کردیں تاکہ طباعت ثانی میں مفید مشوروں کو شکر گذاری کے ساتھ قبول کیا جاسکے۔

قارئین اس کا بھی خیال رکھیں کہ بنگلا کی اس ادبی اور تنقیدی کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ اس لئے بھی دقت طلب تھا کہ دونوں زبانوں میں انداز فکر اور طرز ادا کا بہت زیادہ فرق ہے۔ صنائع اور بدائع کے علاوہ اسلوب نگارش کے فرق نے بھی بڑی رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ تاہم جو کچھ ہوسکا حاضر خدمت ہے۔

ع ۔ گر قبول افتد زہے عزو شرف ۔

عبد الرحمٰن بیخود
نیو گورنمنٹ ھائی اسکول ۔ ڈھاکا
۱۶۔جون سنہ ۱۹۵۷ء

فہرست کتاب

حصۂ اول

از ڈاکٹر محمد شہید اللہ

۱۰—۹۴

حصۂ دویم

از ڈاکٹر محمد شہید اللہ

۱۲۰۱—۱۸۰۰ء

حصۂ سوم

از پروفیسر محمد عبد الحی

از پروفیسر سید علی احسن

از پروفیسر محمد عبد الحی

از پروفیسر محمد عبد الحی

حصۂ سویم

از پروفسر محمد عبد الحی

از پرو فیسر سید علی احسن

از پرو فیسر سید علی احسن

از پرو فیسر سید علی احسن

از پروفیسر سید علی احسن

دسواں باب — انیسویں اور بیسویں صدی کے

از پروفیسر سید علی احسن

از پروفیسر سید علی احسن

معذرت

مشرقی پاکستان میں اردو کے اچھے پریس کی کم یابی، عمدہ ٹائپ کی نایابی اور پریس والوں کی اردو سے ناواقفیت کی بنا پر جو کتابیں بھی یہاں سے شائع ہوتی ہیں وہ اغلاط سے نہیں بچتیں - عموماً ایسا ہوتا ہے کہ حروف کے نقطے یا بعض حروف بالخصوص "ر" پریس میں جا کر اس طرح اڑ جاتی ہے کہ مطبوعہ نسخہ پروف ریڈر کی کوششوں کے باوجود طباعت کی غلطیوں سے نہیں بچتا - مرتب اس سلسلے میں قارئین سے معذرت کے ساتھ اظہار افسوس کرتا ہے - طبع اول میں طباعت کے ساتھ ساتھ دوسری غلطیوں کا باقی رہنا لائق درگذر بھی ہے -

تصحیح اغلاط کی فہرست

تعداد صفحہ	سطر	غلط لفظ	صحیح لفظ
ث	۱۳	بدگلا	بنگلا
ت	۵	بوھینی	بودھینی
,,	۱۳	بدکم	بنکم
۱۴	۸	نہیں	نہیں
شجرہ	۲	ہ ق م	... ہ ق م
۲۳	۷	درھما	برھما
۳۲	۱۱	Bad	Bud
۵۶	۳	دام	نام
۷۴	۱۷	نی	رانی
۸۰	۱۱	Wrind	Wind
۹۲	ابتدا		(۹۲)
,,	۱۷	فدیم	قدیم
۹۳	۷	ذنڈے	ڈنڈے
۹۶	۵	کو بغاوت کی	کی بغاوت
۱۱۰	۱۳	کا پہاڑ	کالا پہاڑ
۱۱۶	۴	ے	نے
۱۲۵	۳	۱۰۴۷	۱۶۰۷

تعداد صفحہ	سطر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۱۳۲	۱۰	شعـواء	شعـراء
۱۴۲	۲	۱۱۷۰ ء بنگلا	۱۱۷۰ بنگلا
۱۷۱	۱۷	کرے	کرنے
۱۷۲	۳	معابارت	معاربات
"	۵	غالما	غالبا
۱۷۴	۳	مسیر	میسر
۱۷۵	۹	عتراف	اعتراف
۱۷۹	۱۶	زباں	زمانے
۱۸۱	۱۱	کلی	کی
۲۰۴	۹	استعمل	استعمال
۲۰۶	۱۸	دلی	دل
۲۰۹	۷	جذ باتی	جد باتی
۲۱۲	۱۴	خیر	خبر
۲۱۸	۱	بالغصوص	بالخصوص
۲۲۶	۹	جیسے	جسے
۲۲۷	۱	اس	اسی
۲۳۲	۵	اپیش	پیش
۲۴۲	۱۴	اجنبت	اجنبیت
۲۵۰	۱۴	ترنلو	ترنگو

تعداد صفحه	سطر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۲۵۱	۱۲	چرگان	چوگان
۲۵۴	۹	جیات	حیات
۲۵۴	۱۳	کارناماموں	کارناموں
۲۵۵	۱۷	اھم	ھم
۲۵۶	۶	وظالف	وظائف
۲۶۰	۸	انقعاد	انعقاد
۲۷۳	۳	داسی	داس
۲۷۶	۱۶	ثبرت	ثبوت
۲۷۷	۱۵	تھی	نھیں
۲۷۸	۲	۱۹۰۴	۱۸۰۴
۲۷۸	۱۳	۱۷۰۴	۱۸۰۴
۲۸۰	۱۱	سنکرت	سنسکرت
۱۹۱	۴	اوو	اور
۲۹۱	۱۳	کتابوںں	کتابوں
۲۹۵	۶	ودیا ساکر	ودیا ساگر
۲۹۷	۵	اُتھان	اُتھان
۲۹۷	۲۱	اھگیان	ابھگیان
۲۹۹	۳	syllablel	syllable
۳۰۱	۹-۱۰	۱۸۲۴ سے ۱۸۸۲ تک	۱۸۱۴ سے ۱۸۸۳ تک

تعداد صفحه	سطر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۳۰۴	۱۱	مُزراعت	مزارعت
۳۱۲	۱۴	حرترو	چرترو
۳۱۵	۳	Harmonions	Harmonious
۳۱۶	۱	بہترین	بہتر
۳۲۵	۵	Muhammadan	Muhamedan
۳۲۷	۱۱	شیرازی	سراجی
۳۳۹	۷	پڑھتا گیا	بڑھتا گیا
۳۴۰	۱۹	هرں	هوں
۳۴۳	۷	مظوم	مظلوم
۳۵۱	۱۰	هے کی	کی هے -
۳۵۶	۳	خاص طور	خاص طور پر
۳۵۹	۱۵	اصلا صی	اصلاحی
۳۶۶	۱۹	کر	کو
۳۷۳	۱۹	فروسی	فردوسی
۳۷۷	۵	س	اس
۳۹۰	۷	ابتدا	ابتداءاً
۳۹۰	۱۱	نچریه	نیچریه
۴۰۳	۲	برهایا	بڑهایا
۳۹۳	۱۹	حامی	حامل

تعداد صفحه	سطر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۴۰۶	۷	اکری شک	کریشک
۴۶۲	۱۰	اپدی	اپنی
۴۶۲	۱۲	ے	نے
۴۷۰	۵	در آتشه	دو آتشه
۴۷۰	۵	الفاط	الفاظ
۴۷۶	۱۸	مکالے	مکالمے
۴۷۸	۲	دونو	دونوں
۴۸۹	۱۷	زمائے	زمانے
۵۰۲	۱۸	کَسم	کُسُم
۵۳۱	۱	مدزلزل	متزلزل
۵۳۱	۱۰	حفرت	حضرت
۵۳۵	۷	قضل الکریم	فضل الکریم
۵۴۰	۱۸	اپلی	اپنی
۵۴۴	۱۰	یم حوانده	نیم خوانده
۵۴۴	۱۱	ازرواج	ازدواج
۵۴۴	۱۲	دسواں	نسواں
۵۵۹	۱۹	طیقے	طبقے
۵۷۵	۹	صلاظه	ملاحظه
۵۷۶	۶	کیلے	کیلئے

صحیح لفظ	غلط لفظ	سطر	تعداد صفحه
عیسوی	عیسوں	۲	۵۸۳
کورانه	اکورانه	۱۲	۵۸۴
میگهناد	میگناد	۸	۵۹۴
مشغول	مشنول	۱۶	۵۹۹
یکے بعد دیگرے	یکے دیگرے	۱۷	۵۹۹
کردار	راکرد	۱۹	۶۰۸
مہا کابر	مہا کانو	۵	۶۱۷
بیرا نگنا	نیرانگنا	۷	۶۱۹
تیمور فون	تیمو	۴	۶۲۰
ذاتی	دالی	۴	۶۳۰
برجن	سرجن	۵	۶۳۱
کس	کسی	۱۲	۶۳۴
بهی	نهی	۱۷	۶۴۰
حکومت پر	... ...	۱۹	۶۴۲
جسے	جیسے	۱۵	۶۵۰
متعلق	متعلی	۱۹	۶۵۴
Mohamedan	Mohammaden	۱۹	۶۵۴
سہولت	سہرلت	۸	۶۵۶
تعمیر	تعبیر	۱۳	۶۶۳

تعداد صفحہ	سطر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۶۶۴	۹	۱۹۵۴	۱۹۵۲
۶۷۱	۷	بں	میں
۶۷۶	۲	جا سکتیں	جا سکتی
۶۷۷	۳	انفر اد دت	افراد
۶۸۰	۲	سردی	سرمدی
۶۸۴	۸	،	اور
۶۸۵	۱۶	لدت	لذت
۶۹۳	۱۶	شکیل	تشکیل
۶۹۶	۱۰	اس	دسی
۶۹۷	۹	کوشش کی ہے	کوشش نہیں کی ہے -
۷۰۲	۶	۱۹۱	۱۹۱۰
۷۰۲	۱۸	یرو کاش	پرو کاش
۷۰۳	۹	جدام	حدام
۷۰۴	۲	زبادہ	زیادہ ہے
۷۰۶	۹	ودداگر	ودیا ساگر
۷۱۰	۱۰	تحقیق	تعلق
۷۱۴	۱۵	ٹھا کو	ٹھا کور
۷۲۱	۱	مدھی	مذھبی
۷۲۲	۱۳	حاد نیت	جاذبیت

تعداد صفحه	سطر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۷۲۶	۵	دینا	دنیا
۷۲۸	۳	هیں	همیں
۷۳۱	۳	جب	حب
۷۳۱	۱۹	گذتا	گذرتا
۷۳۳	۱۰	حاری	جاری کیا
۷۳۵	۱	انک	ایک
۷۳۶	۴	هیں	ہمیں
۷۳۸	۲	نمو ے	نمو نے
۷۴۲	۱۲	کرے	کرنے
۷۴۹	۱۰	Mysticifm	Mysticism
۷۵۱	۱	تصو	تصور
۷۵۲	۹	incongreous	incongruous
۷۵۳	۱۳	شردو	شربو
۷۵۴	۳	نہیں	نہیں
۷۵۴	۵	حیثیو ں	حیثیتو ں
۷۵۴	۷	حما ں	جماں
۷۵۵	۱۰	اپاک	پاک
۷۵۶	۱۴	دیل	نیل
۷۵۸	۱۷	حیالات	خیالات

تعداد صفحہ	سطر	غلط لفظ	صحیح لفظ
۷۶۰	۱	ارگوّ	ارگوّ
۷۶۱	۱۷	موحود	موحود
۷۷۵	۱۷	پوشای	پوشاری
۷۹۰	۵	Eliat	Elior
۷۹۴	۲	تاییں	تایں

حصۂ اول

۶۵۰—۱۲۰۰ء

بنگلا زبان کی اصل و شجرۂ السنہ

دور قدیم میں بنگلا ادب کا رخ -

بودھ مت کے مصنفیں -

چرجا گانوں کی ادبی حیثیت -

دھرم منگل—لاؤسین کی کہانی -

عوامی ادب—

کہانیاں ، مذہبی قصے ، لوریاں ،

ڈاک اور کھنا کی نظمیں ، پہیلیاں اور

ضرب الامثال -

بودھ مت کے دور میں بنگالی سماج کی تصویر -

ڈاکٹر محمد شہید اللہ —— مترجم— مولانا عبد الرحمٰن بیخود

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حصہ اول

باب اول

بنگلا زبان کی اصل

علمائے "علم الانساب" نے جس طرح دنیا کے تمام انسانوں کو حبشی، مغل، کاکیشین وغیرہ مختلف اقوام میں منقسم کیا ہے اسیطرح ماہرین علم الالسنہ نے دنیا کی تمام زبانوں کو ہند و یورپی، سامی، حامی، دراوڑی وغیرہ مختلف اصناف میں تقسیم کیا ہے۔ لیکن اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ اقوام کی تقسیم اور زبان کی تقسیم کی راہیں الگ الگ ہیں اور انھیں بالکل یکساں نہیں کہا جا سکتا۔ جس طرح ہندو بانیان مذہب کی قائم کی ہوئی ذاتیں اور علمائے "علم الانساب کی مشاہدہ و تحقیق پر مبنی ذاتیں ایک نہیں ہیں۔ اسی طرح تقسیم اقوام و ملل اور تقسیم السنہ مختلف چیزیں ہیں۔ اس لئے ایک زبان بولنے والی قوم کا نسلی طور پر مختلف اقوام سے متعلق ہونا بھی درست اور صحیح ہے۔

پاک ہند بر صغیر میں چند اصلی زبانوں کی فرعیں موجود ہیں۔ مثلاً جس طرح ہند و یورپین اصل زبان کی ایرین شاخ

میں سے نکلی ہوئـی ذیلی شاخیں داردی اور بھارتی زبانیں ہیں اسی طرح دراوڑی زبانیں جنوبی اصل زبان کی جنوبی ایشیـائی شاخ ہیں - اسی طرح چینی اصل زبـان کی تھائی چینی شاخ اور تبتی برمی اصل زبـان کی شاخیں ہمالیـن، تبتی، بورو ناگا، کوکی چیـن اور لوئی وغیرہ زبانیں ہیں -

ہند و آرین دیلی شاخ سے نکلی ہوئی مندرجۂ ذیل جدید ہند آریائی زبانیں ہند و پاکستان میں مروج ہیں - سندھی، مرھٹی، اُڑیا، میتھلی، آسامی، ہندوستانی (اُردو - ہندی) پنجابی، گجراتی، راجستھانی، نیپالی، کشمیری وعیرہ - بنگلا زبـان بھی اس فہرست میں جگہ پاسکتی ہے یا نہیں اس کا فیصلـہ ہم بعد میں کریں گے - داردی دیلی شـاخ سے نکلی ہوئی باشگلـی اور چترالی وغیرہ زبانیں شمال مغربی سر حد میں بولی جاتی ہیں - جنوبی زبان کی نوع سے نکلی ہوئی دکھنی ایشیائی شاخ سے منداری اور خاسی وغیرہ ذیلی شاخیں پاک ہند بـر صغیر کے مشرقی علاقے میں مروج ہیں - چینی زبان کی نوع سے تھائی چینی شاخ کی " آھوم " زبان کسی زمانے میں آسام میں بولی جاتی تھی - اسی نوع کی کھامتی زبان آج بھی مشرقی آسام میں بولی جاتی ہے تبتی، برمی زبان کی نوع سے نکلی ھـوئی ھمالین شاخ کی بہت سـی

زبانیں مثلاً نواری ، لپچا وغیرہ تبتی شاخ کی بھوٹانی ، لداخی وغیرہ : بورو شاخ کی بورو ، گارو اور تپرا وغیرہ ؛ ناگا شاخ کی ناگا ، میکر وغیرہ : کوکی چین شاخ کی "مے تی تھے تی" (منی پوری) اور شک لوئی شاخ سے نکلی ہوئی ادرو وغیرہ زبانیں همالیه کے جنوبی حصے اور آسام و مشرقی بنگال کے پوربی علاقے میں مروج ہیں -

یہاں تک میں نے جن ساری زبانوں کی نوعیتیں اور ان کے حالات بتائے ہیں وہ اکثر پاک ہند برصغیر کے شمالی علاقے میں رائج ہیں - جنوبی حصے میں بیشتر دراوڑ زبان سے نکلی ہوئی مختلف زبانیں مثلا تلگو اور تامل وغیرہ بولی جاتی ہیں - ان انواع السنہ میں براہوئی، کرخ اور مالتو شمالی علاقوں میں آج بھی موجود ہیں ۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا رہ جاتا ہے کہ بنگلا زبان کی اصل کیا ہے - اس سلسلہ میں ہمیں یہ بھی متعین کرنا پڑے گا کہ وہ دراصل کس صنف زبان کی شاخ ہے -

جس طرح علم الانساب کے ماہرین نے سر کی لمبائی چوڑائی، ناک کی ساخت، بالوں، آنکھوں اور جسم کے رنگ کا لحاظ کرتے ہوئے بنی نوع انسان کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا ہے اسی طرح علمائے علم الالسنہ نے بھی زبان کے قواعد، اسما وافعال کی وضع و ساخت ، کثیرالاستعمال الفاظ مثلا ضمائر ، مثلاً

اعداد - اسمائے قرابت و اسمائے جوارح وغیرہ کا مقابلہ کرکے ایک سے زیادہ زبانوں کو ایک اصل یا صنف یا اس کی ذیلی شاخوں میں داخل کیا ھے - وہ دو زبانوں کا مقابلہ کرتے وقت ھر زبان کی اصلی نوعیت کا فیصلہ علم الاصوات (Phonology) کے لحاظ سے کرتے ھیں - اکثر وہ زبان کی قدیمی صورت دیکھ کر اپنی رائے کا تعین کرتے ھیں - اسی اصول پر اب ھم بنگلا لفظ "پا" (پاؤں) کا دوسری زبانوں سے مقابلہ کریں گے - اسے سنسکرت میں پد، پدو یا پاد، آبسنان یا قدیم فارسی میں پد، پاد ؛ یونانی میں پدوس (بحالت اضافی) ؛ لاطینی میں پیوس (بحالت اضافی)؛ قدیم انگریزی میں فوت (fote)، جدید میں فت (foot)؛ جرمن میں فُس ؛ فرانسیسی میں پی-اے ؛ اسپینی میں پی-اے ؛ پرتگالی میں پے ' اطالوی میں "پی-اے دے" اور ارمنی زبان میں ھیت کہتے ھیں - یہ تمام الفاظ ایک ھی اصل یعنی ھند و یورپی زبان کے لفظ پود یا پید سے ماخوذ ھیں - یہ بات ھم مختلف زبانوں کے متعلق علم الاصوات کے ذریعہ ثابت کر سکتے ھیں -

مختصر طور پر حروف علت کا بیان نہ کرکے حروف صحیح کے بارے میں ھم کہہ سکتے ھیں کہ :-

(۱) اصل میں درمیانی مخارج کے حروف مثلاً کَ - گَ - چَ -

جؔ - تؔ - دؔ - یؔ - پؔ - اور وؔ کی آوازیں پراکرت زبان میں آکر حذف ہوجاتی ہیں - لیکن پراکرت سے بنی ہوئی جدید ہند آریائی زبانوں میں آکر وہ آوازیں باقی رہ جاتی ہیں - اسی لئے ہندو یورپین زبان کا "پود" یا آریہ زبان کا "پاد" لفظ ہی بنگلا میں آکر "پا" بن گیا ہے -

(۲) اصل لفظ کے کؔ - تؔ - پؔ - کی جگہ پر انگریزی وغیرہ کی ٹیوٹانک (tutonic) شاخ میں جو تحتی جرمنی (lower german) کی ذیلی شاخ میں ممزوج ہے - اسی زبان کے مہا پران یعنی صفیرہ (aspirate) حروف کھؔ - تھؔ - پھؔ بن جاتے ہیں اور اصل کے گؔ - وؔ - بؔ حروف کؔ - تؔ - پؔ ہو جاتے ہیں - اسی لئے پود لفظ کی جگہ فوت اور اس کے بعد فُت ہو گیا - جرمن زبان میں انگریزی الفاظ کے آخر کا "ت" "س" سے بدل جاتا ہے - اسی لئے اس زبان میں فُت کے بجائے فُس ہو گیا - ارمنی زبان میں اصل کے پؔ کی جگہ ہؔ اور دؔ کے بدلے تؔ تلفظ ہوتا ہے - اسی لئے اس کا تلفظ "ھیت" کرتے ہیں - یونانی اور لاطینی زبانوں میں کؔ - پؔ - تؔ اور گؔ - دؔ - بؔ اپنی اصلی آواز باقی رکھتے ہیں - اسی وجہ سے یونانی میں پودوس اور پیدس کہتے ہیں - فرانسیسی، اسپینی، پرتگیزی اور اطالوی وغیرہ زبانیں لاطینی زبان کی عام استعمالی صورت سے

ماخوذ ہیں - ان تمام زبانوں کے درمیانی مخارج کے حروف گَ - دَ - وغیرہ میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں -

اب ہم پاک وہند کی دو کثیر الاستعمال زبانوں کے ساتھ بنگلا زبان کا موازنہ کریں گے - اختصار کے لئے ہم مثال کے طور پر تمام اصناف زبان میں سے صرف ایک صنف کی ایک زبان کے الفاظ لیں گے- اس فہرست میں ہندوستانی کے تحت ہم قدیم آریہ بول چال کی زبان کے الفاظ لکھیں گے - ان الفاظ کی مماثلت سنسکرت کے ساتھ ہے - اس سلسلہ میں ہم کثیر الاستعمال الفاظ کا موازنہ کریں گے اور پھر نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کریں گے :—

بنگلا	ہندوستانی – اردو – سنسکرت		بنگلا	ہندوستانی – اردو – سنسکرت	
ایک	ایک	ایکَ	نوئے	نو	نو
دُئی	دو	دو	دش	د س	د ش
تین	تین	تریی	سَ	سو	شَتَ
چاری	چار	چتواری	موئی نظم میں	میں	مویا
پانچ	پانچ	پنچ	مور نظم میں	میرا	ممکاری
چھے	چھہ	شت	امی	ہم	اسمے
شات	سات	شپت	آمار	ہمارا	اسمت‌کاری
آٹھ	آٹھ	اشت	توئی	تو	توَم - توایا

بنگلا	هندوستانی – اردو	سنسکرت	بنگلا	هندوستانی – اردو	سنسکرت
تومی	تم	تشمے	اونچو	اونچا	اُچّ
هات	هاتھ	هست	دور	دور	دور
پا	پاؤں	پاد	جا	جا	جا
ناک	ناک	نسکُ	کها	کها	کهاو
دانت	دانت	دنتُ	بوش	بیٹھ	اُوپ بش
کان	کان	کرنو	مر	مر	مری
چوکھ	آنکھ	چکھو - اشی	دے	دے	دے
لوها	لوها	لوهو	موئی هوں	هم هیں	بهرامی
سُورج	سورج	سری	آمی هوئی	مں هوں	بهوئے تے
چاند	چاند	چندرو	توئی هش	تو هے	بهبسی
تارا	تارا	تارا	تومی هوؤ	تم هو	بهبهنه
آگن	آگ	اگنی	او هوئے	وه هے	بُهبتی
پانی	پانی	پانیه	تنی هون	وه هیں	بِهبنی
گھوڑا	گھوڑا	گھوتک	موئی جاؤں*	میں جاؤں	یاهی
گائی	گائے	گوی	آمی جائی	هم جائیں	یائی تے
کوکر	کتا	ککتر	توئی جاش	تو جائے	یاهی
باپ	باپ	پیرو	تومی جاؤ	تم جاؤ	یاتھ
ما	ماں	ماتا	او جائے	وه جائے	یاتی
بهائی	بهائی	بهراترک	تنی جان	وه جائیں	یانی
بون	بهن	بهگینی			

* هوں - جاؤں وغیره بنگاله میں دور وسطی کا تلفظ هے -

مادے کی صورت میں جس طرح قدیم حالت (آواز کی تبدیلی کے ساتھ) باقی رہتی ہے الفاظ کی حالت اس طرح باقی نہیں رہتی - اس میں قدیم علامت حالت کے بجائے زبان کے مابعد کی ہئیت میں علامات حالت کے لئے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے - مثال کے طور پر آرین شاخ کی ایرانی دیلی شاخ سے مرکب جدید فارسی میں ہمیں نظر آتا ہے کہ سنسکرت کی طرح قدیم فارسی میں تشکیل جمع کے لئے بہت سی حالتیں نہ پیدا ہوکر صرف دو صورتیں "آں" اور "ھا" باقی رہ گئی ہیں - علامت مفعول "را" قدیم فارسی لفظ "رادی" سے ماخوذ ہے - از، به وغیرہ حروف جار کے ذریعہ سے جدید فارسی میں حالتیں متعین ہوتی ہیں - یہ دونوں حروف آریائی "سچا" اور "ابھی" سے لئے گئے ہیں - اسی طرح قدیم ہند آرین زبان کی حالت میں بہت زیادہ تبدیلیاں پیدا نہ کر کے جدید پاک ہند آرین زبان میں بالخصوص علامات حالت الفاظ کے ذریعہ تعین پذیر ہوتی ہیں - متعدد الفاظ نے آوازیں بدلنے کی وجہ سے موجودہ زمانے میں مختلف صورتیں اختیار کی ہیں - مثال کے طور پر دیکھئے - جدید بنگلا زبان میں علامت مفعول و ظرف کے لئے لفظ "کے" مستعمل ہے - قدیم بنگلا میں ہمیں نظر آتا ہے

که وهاں حالت مفعولی (DATIVE) اور حالت ظرفی نیز حالت اضافی میں "کَ" مستعمل تھا - پالی اور پراکرت میں حالت اضافی هی کا لفظ حالت ظرفی کے لئے بھی استعمال هوتا تھا - دراصل حالت ظرفی سے "کَ" حالت مفعولی میں آیا هے - ورنه عموماً علامت مفعول محذوف رهتی هے - جیسے " تومی چاند دیکھو" اور "تومی چاند کے دیکھو"- (تم چاند دیکھو - اور - تم چاند کو دیکھو) اس دوسرے جملے میں لفظ "کے" حالت ظرفی سے آیا هے اور یہاں چاند سے مراد کوئی شخص خاص هے - لیکن اس حرف "کَ" کا ماخذ کیا هے؟ هم بودھ گاتھوں میں اضافت کے "سی" کے بجائے تعلیلی (انالوطیقا) صورت میں "کِریتُ" کا لفظ پاتے هیں - مثلاً -" رامسّ گریھم" (رام کا گھر) کے بجائے بودھ گاتھوں میں " رام کریتنگ گریھم "- پایا جاتا هے - یہی "کریتُ" پالی زبان میں "کنتو" پراکرت میں "کَ آ" قدیم بنگلا میں "کَ" اور جدید بنگلا میں "کے" کی صورت میں مستعمل هے - اسی "کریت" سے هندوستانی (هندی و اُردو) میں حالت اضافی کے لئے "کا" اور مفعول وظرف کے لئے "کو" ماخوذ هے - "رامسّ گریھم" کے بجائے جس طرح "رام کریتنگ گریھم" استعمال کیا جاتا تھا اسی طرح "رام کا رینگ گریھم"

بھی کہا جاتا تھا - یہی لفظ " کاریہؓ " پراکرت میں " کیر " اور بنگلا میں ' ایرے" سے تبدیل ہوکر اضافی حالت اور ظرفی و مفعولی گردانوں میں " ایر " ہوگیا ہے - اسی طرح ہم موجودہ پاک ہند آریائی زبان میں نئی حالتوں کی گردانوں کا ماخذ و اشتقاق متعین کرسکتے ہیں - جدید بنگلا میں قدیم ہند آریہ زبانوں کی گردان سے حرف ظرف (ادھی کرن) کا " اے " آریہ زبان سے ماخوذ ہوکر " اے " ہی رہ گیا ہے - اسی طرح حروف سببیہ کا " اے " اپوبھر نگشو زبان کے " ایں " سے ماخوذ ہوکر آریہ زبان میں "ایں" باقی رہا ہے -

قواعد کی رو سے نیز اہم اور کثیر الاستعمال الفاظ کی حیثیت سے موازنہ کرنے کے بعد جدید ہند آریہ زبان (اُردو ہندی) ہندوستانی' سندھی' مرھٹی وغیرہ زبانوں کے ساتھ بنگلا کو بھی انھیں زبانوں کی ایک بہن ماننا پڑتا ہے - یہ بات قابل قبول ہے کہ اختلاط کی وجہ سے دنیا کی ہر زبان دوسری زبان سے الفاظ مستعار لے سکتی ہے - لیکن اس کی وجہ سے اس زبان کی اصلیت تبدیل نہیں ہوسکتی - عربی زبان میں بھی یونانی زبان کے الفاظ مثلاً دینار' درہم' انجیل' قسیس' قنطار' قاموس' فیلسوف ' صابن ' ایسا غوجی' قانون وغیرہ موجود ہیں - اور زبانوں سے بھی عربی میں الفاظ مستعار لئے گئے ہیں - لیکن اس کی وجہ سے عربی

زبان سامی زبان کی صنف سے علحدہ نہیں ہوگئی - سنسکرت میں بھی دوسری زبانوں سے الفاظ مستعار لئے گئے ہیں - مثلاً یونانی سے کیندرو، ھورا، درمسو، کرمیلک، جسے مترو وغیرہ: عربی سے اوھی فین وغیرہ: دراوڑ سے نیر، بیک وغیرہ؛ دکھنی (AUSTRIC سے مویور، تنبول، اولابو وغیرہ - انگریزی زبان میں بھی فرانسیسی، یونانی اور لاطینی زبانوں سے بہت سارے الفاظ مستعار لئے گئے ہیں - دنیا کی بہت ساری زبانوں نے انگریزی سے الفاظ لے کر اپنے اپنے لغت کو وسیع کیا ہے - تمدنی یا سیاسی اختلاط کی وجہ سے کبھی کبھی عام استعمال کے الفاظ بھی دوسری زبانوں سے آکر خود ملکی زبان کے الفاظ کو بے دخل کر دیتے ہیں - جیسے مسلمانوں کی بنگلا میں پھوپھا، چچا، دادا، نانا وغیرہ الفاظ راجپوت زبان سے آئے ہیں - خالہ کا لفظ عربی سے مستعار ہے - عام بنگلا زبان میں ماجھا کانکھ تلی، بوھیتو، دشوشو، شو، ششارو، کوکرا، سائے چان، تاتا، بھونٹی وغیرہ الفاظ بے دخل ہوگئے ہیں اور ان کی جگہ بہ ترتیب کمر، بغل، جہاز، ہزار، تیر، خرگوش، مرغ، باز، گرم اور زمین وغیرہ فارسی الفاظ دخیل ہوگئے ہیں - لیکن اس کی وجہ سے بنگلا زبان ایرانی نہیں بن سکتی -

ہم نے جن الفاظ کا موازنہ کیا ہے ان میں یہ بات نظر آئے

گی کہ تمدنی ملاپ کی وجہ سے تیلگو زبان نے بھی سنسکرت سے کچھ الفاظ عاریۃً لئے ہیں - لیکن اس کی وجہ سے تیلگو زبان اپنی اصل یعنی دراوڑ زبان کی صنف سے خارج نہیں ہوئی - ان دلائل کی روشنی میں بنگلا زبان میں بھی دراوڑ یا دکھنی زبان کی اصلیت کے چند الفاظ کی موجودگی کی وجہ سے ہم بنگلا کے ساتھ ان زبانوں کے صرف اختلاط کا تو اقرار کر سکتے ہیں لیکن انھیں ایک ذات کی زبان نہیں کہہ سکتے -

فہرست مندرجۂ بالا میں ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ آمی ' تومی ' ناک اور باپ الفاظ کی اصل اسمے ' تسمے ' نسکو اور بپرو الفاظ سنسکرت کے نہیں ہیں - ساتھ ہی یہ کسی اور زبان سے بھی ماخوذ نہیں معلوم ہوتے - پالی اور پراکرت میں ان سے ماخوذ " آم ہے ' تم ہے ' نکو ' بپو " پائے جاتے ہیں - بنگلا زبان کی جدید ترین پاک ہند آرین زبان میں بھی ان کی مابعد کی صورتیں نظر آتی ہیں - مثال کے طور پر مندرجۂ ذیل جملوں کی حالت پر غور کیا جاسکتا ہے - " آمی دیکھی " (میں دیکھتا ہوں) " تومی آچھو " (تم ہو) ان کی صورتیں سنسکرت میں " ویم پشاہ " (آہنگ پشای) یویم استھہ (تم اسی) ہیں - بنگلا زبان کے یہ الفاظ کسی طرح بھی سنسکرت سے ماخوذ نہیں

کہے جاسکتے - پراکرت میں ان کی صورتیں یہ ھیں :— " ام ھے ام ھے ھنگ)' درکشتے (تسمے اچھے تھے) -

اس قسم کے بہت سے دلائل ھیں - جن سے یہ بات ثابت کی جاسکتی ھے کہ بنگلا زبان سنسکرت سے اصلاً ماخوذ نہیں ھے - بلکہ یہ سنسکرت ھی کی ھم ذات ایک قدیم ھند آریہ بول چال کی زبان سے نکل کر بارآور ھوئی ھے - واقعی طور پر ھم لفظ سنسکرت ھی سے یہ سمجھ سکتے ھیں کہ سنسکرت اصل میں بول چال کی زبان کی ایک مہذب او، شستہ صورت تھی - رامائن اور مہابھارت سے یہ اچھی طرح ثابت کیا جاسکتا ھے کہ سنسکرت زبان دراصل خاص برھمنوں کی ایک شستہ زبان کا نام تھا - رامائن میں ملتا ھے :—

" بے رحم اِلّل برھمن کا روپ دھارن کر کے سنسکرت بولتا اور شرادھ کی نیت سے برھمنوں کو مدعو کرتا "- (ارنو کانڈو - ۱۱ شرک - رامائن) - اشوک بن میں سیتا کو دیکھ کر ھنومان یہ خیال کرتا ھے :—

" اگر میں برھمنوں کی طرح سنسکرت الفاظ استعمال کروں تو شاید سیتا مجھے بھی راون سمجھ کے خوف زدہ ھوجائے گی - اس لئے با محاورہ انسانی کلام میں باتیں کرنا ھی ضروری ھے - ورنہ میں اس معصوم سیتا کو تسلی و تشفی نہ

دے سکوں گا "۔ سندر کا نڈو - ۳۰ شرگ (رامائن) -

اسی انسانی بامحاورہ کلام کو ہم نے قدیم ھند آریہ بول چال کی زبان کا نام دیا ہے - برھمن قوم اس عوامی زبان کو فحش، گندہ اور ملیچھہ زبان خیال کرتی تھی اور خود اس کے بجائے سنسکرت زبان استعمال کرتی تھی - پتنجلی کی مہابھارت میں مذکور ہے -

" اسی قسم کی گندی زبان استعمال کرکے اسور وغیرہ شکست خوردہ ہوئے تھے - اس لئے برھمن ھرگز نہ ملیچھہ بھاشا نہیں بولیں گے - وہ ناپاک زبان استعمال نہیں کریں گے - یہی زبان جسے عوام بولتے ہیں ملیچھہ بھاشا ہے -" اس کے بعد پتنجلی کہتے ہیں کہ "گؤ" ایک لفظ ہے اس کی بہت سی اپو بھر نکشو صورتیں ہیں - مثلاً گاوی ۔ گونی ۔ گوتا ۔ گو پو تلیکا وغیرہ - اسی گاوی لفظ کو بدل کر بنگلا میں گائی اور گابھی اور اردو ھندی میں گائے کہتے ہیں -

قدیم ھند آریہ بول چال کی زبان کا میدان چونکہ وسیع تھا اس لئے اس کے درمیان صوبائی اور جغرافیائی اختلاف بھی ضرور تھا - پتنجلی نے اپنی مہا بھاشیا میں لکھا ہے کہ کمبوج (فارس) میں 'شتلی' سوراشٹر میں ھمتی' وسط مشرقی علاقے میں "رنگھتی" الفاظ آریوں کے لفظ "گچّھتی" کے بجائے مستعمل تھے -

آریہ زبان میں فقط " شو" کہتے ہیں - مشرقی علاقوں میں " چھیدنا " بمعنی کاٹنا کے مستعمل ہیں - فعل " داتی " بھی اسی معنی میں مستعمل ہے - شمالی حصہ ملک میں داتی کے بجائے " داتر " بمعنی کٹار یا داس استعمال کیا جاتا ہے - جسطرح بنگلا و ہندوستانی زبانوں میں " گم " کے بجائے مصدر " جا " مستعمل ہے - مثلاً " شے جائے ' وہ جائے) اسی قیاس پر " داتی " مصدر سے فعل " داتے " استعمال کیا جاتا ہے - مندرجۂ ذیل ضرب المثل میں یہی لفظ مستعمل ہے :—

' بابار کالے نائی کو چاش * کاردھان دانیتے حاش
(باپ کے وقت تو کھیتی باڑی تھی ہی نہیں اب کس کادھان کاٹنے جا رہے ہو)

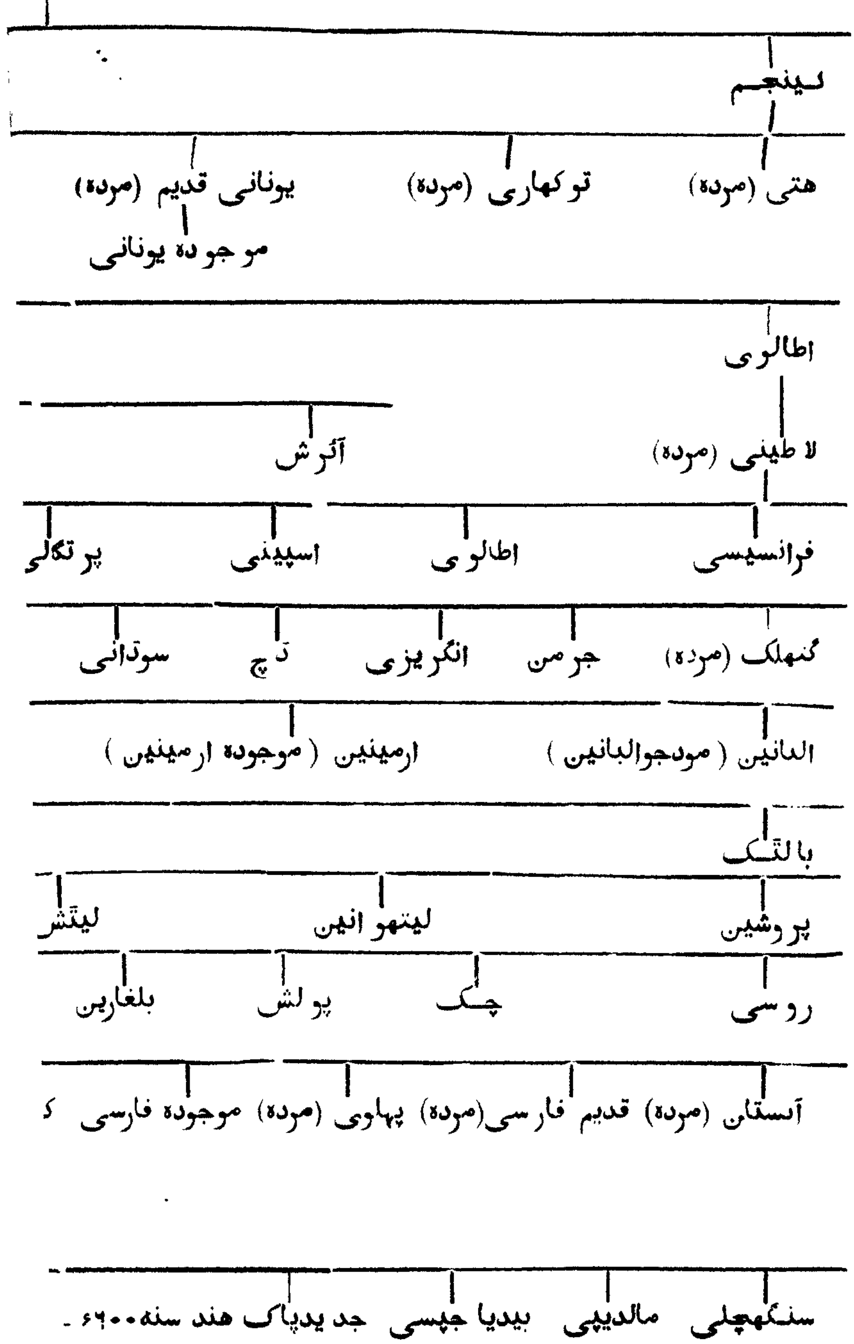
اسی " داتر " کے لفظ سے " دا ' کا لفظ بمعنی داس یا کٹار آج بھی بنگلا میں مستعمل ہے -

پانینی نے اپنی اشٹو دھائی " میں مشرقی بھارت کی قدیم زبان کا نام پراچی (مشرقی) اور شمالی ہند کی زبان کا نام اُدی چی (شمالی) تحریر کیا ہے - اس سے پہلے " یاسکو " نے بھی کمبوج یعنی شمالی مشرقی اور مشرقی و شمالی ہند کی زبانوں کا اختلاف بیان کیا ہے -

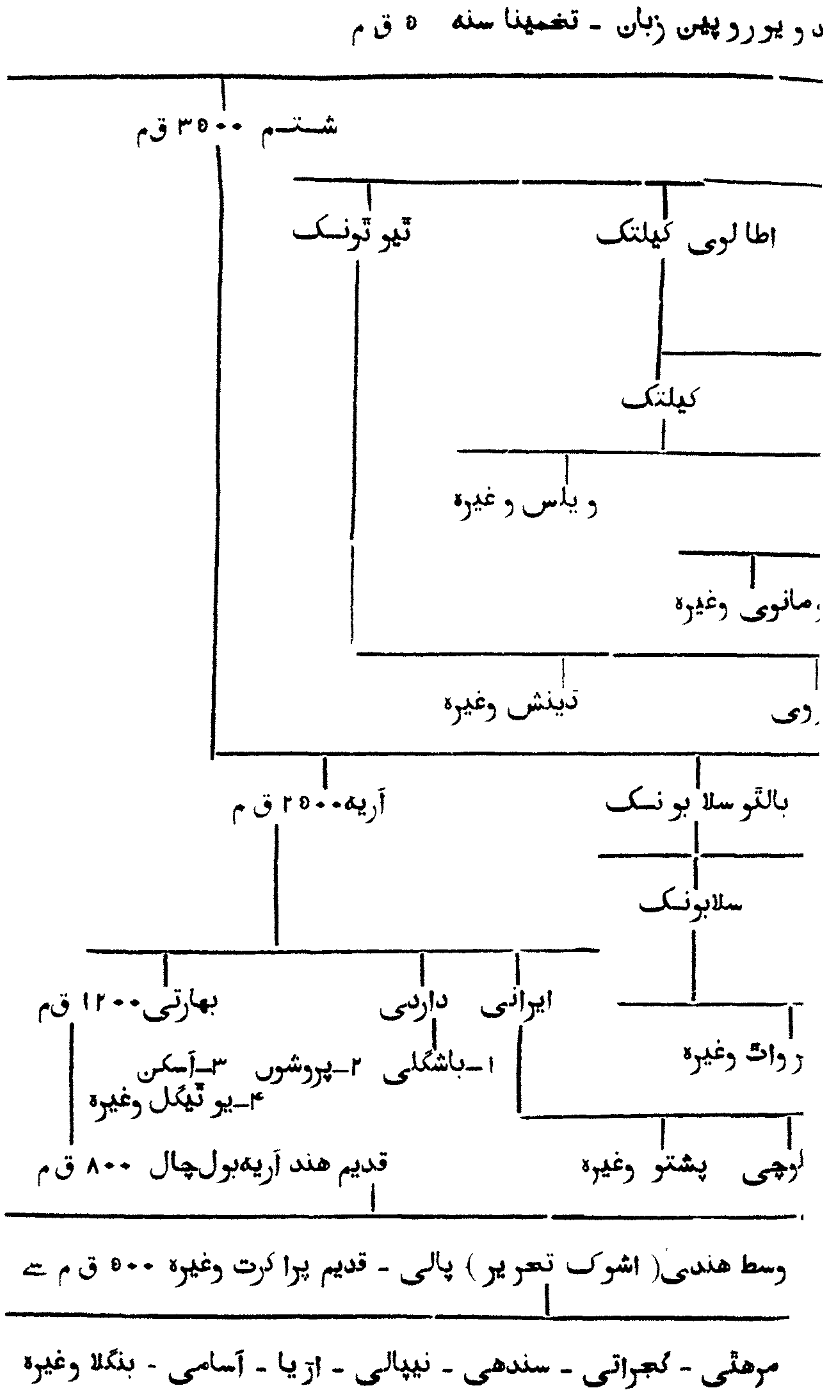
ہم اس قدیم بھارتی آریائی بول چال کی زبان کا زمانہ

سنه ٨٠٠ ق م سے سنه ٥٠٠ ق م تک متعین کر سکتے هیں -
یه زبان تدریجی طور پر پراکرت زبان میں مدغم یا تبدیل
هوگئی - وهی پراکرت جو گوڑ میں رائج تهی - اسی سے
هماری مادری بنگلا زبان سنه ٧٠٠ ع کے لگ بهگ رفته رفته
وجود میں آئی - دنڈی نے اپنے " کاؔبودرشن " میں ساتوین
صدی عیسوی میں گوڑ کی مستعمل پراکرت زبان کا نام " گوڑی
زبان " لکھا هے -

Indo European.



کا شجرہ


د و یورو پین زبان - تخمینا سنہ ہ ق م
شتم ۳۵۰۰ ق م
اطالوی کیلٹک
ٹیو ٹونک
کیلٹک
ویلس و غیرہ
رمانوی وغیرہ
ڈینش وغیرہ
ری
بالٹو سلا بونک
آریہ ۲۵۰۰ ق م
سلابونک
ایرانی
داردی
بھارتی ۱۲۰۰ ق م
۱-باشگلی ۲-پروشوں ۳-آسکن
۴-یو ٹیگل وغیرہ
رواٹ وغیرہ
لوچی پشتو وغیرہ
قدیم ہند آریہ بول چال ۸۰۰ ق م
وسط ہندی (اشوک تحریر) پالی - قدیم پراکرت وغیرہ ۵۰۰ ق م سے
مرہٹی - گجراتی - سندھی - نیپالی - اڑیا - آسامی - بنگلا وغیرہ

باب دوم

دور قدیم میں بنگلا ادب کا رخ

سنہ ۶۵۰ ع سے سنہ ۱۲۰۰ تک

نہ جانے کتنے دنوں تک بنگلا عوامی زبان ایک اجنبی دلہن کی طرح اس وسیع وطن کے گوشوں میں خاموش زندگی بسر کرتی رہی - وہ دن تاریخ بنگال میں ایک سعید اور قابل ذکر صبح کی حیثیت رکھتا ہے جس دن بزم ادب کے وسیع استیج پر اُس نے اپنا درشن دکھایا - حقیقت میں اُس دن کو بنگالیوں کیلئے دور جدید کا نوروز کہا جا سکتا ہے - اس دن اس کا مظاہرہ صرف منظوم صورت میں ہوا تھا - اس کے خرام ناز کیلئے علم عروض کی عجیب و غریب رنگین بحریں تھیں اور اس کے حلقوم میں بےحد دلکش راگنیاں رقص کر رہی تھیں - ابتداءً تو اونچی ذات والوں نے اُسے ناپاک، غیر شُستہ اور پلید کہا لیکن پھر ایسا زمانہ بھی آیا جب برہمنوں نے اپنی متمدن اور مقدس سنسکرت بھاشا کو فراموش کر دیا اور آخر بنگلا طرز ادا سے مسحور ہو کر اس کے رنگین چرنوں پر اپنا سر نیاز جھکا دیا -

جنھوں نے کبھی یہ کہا تھا ـــ" آشٹا دش پورانے رامشو چریتانی چہ - بھاشا یانگ مانبہ - شرُتّا رؤرب نرو کنگ برو جیت" - (اٹھارہ پوران اور رامائن بھاکا زبان میں سننے سے انسان رؤرب نرک (ایک خاص درجہ جہنم) میں جاتا ہے) انھوں نے تو یقینا بنگلا زبان کو خوش آمدید نہیں کہا - بخلاف اسکے برہمنی مذہب کے مخالفوں نے سناتن اصول کے پیرؤں کو مسحور کر کے وید کی مخصوص زبان سے الگ کرنے ھی کے لئے اس دل فریب بنگا لی طرز کلام کو اختیار کیا تھا - بعد میں اپنی غرض کے لئے مقامی دیوتاؤں کے پجاریوں نے بھی ان کے ساتھ تعاون کیا -

مذہبی فرقہ بندیوں کی بنا پر دنیا کی زبانوں میں ادب کی تخلیق اور ترقی تاریخ عالم میں کوئی نئی بات نہیں ہے - اسی ھندوستان میں ھم دیکھتے ھیں کہ برھمنی مذھب سے مخالفت کے باعث بدھ مت والوں نے پالی ادب کو ترقی دیا تھا - اسی طرح یورپ میں رومن کیتھلک کے ساتھ عداوت کی بنا پر مقامی ادب کو تقویت کے ساتھ ساتھ فروغ حاصل ھوا - یہ بہت دنوں کی بات نہیں ھے کہ قدیم مذاھب کے ساتھ تقابل اور تخالف کی بنا پر سکھوں کے دور میں پنجابی ادب نے جنم لیا - ھر نئے مذھب

کے مبلغ ہمیشہ اپنے نظریات وخیالات کو لوگوں کے دلوں میں موثر اور جاگزیں بنانے کے لئے مروجہ زبان ھی کا آسرا ڈھونڈا کرتے ھیں - قدیم جماعتیں بھی لوگوں پر اپنا اثر واقتدار باقی رکھنے کے لئے عام مروجہ زبانوں کے استعمال پر مجبور ہوئی تھیں - اسی طرح متقابل مذاہب کی حریفانہ چالوں اور کشمکش ھی کی بدولت بنگلا ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا -

بنگال میں برھمنی مت کے احیائے جدید سے پہلے "سہجیا بودھ مت" کے پیرو اپنے مسلک کا پرچار کرتے تھے - بنگال کے ھندؤں اور بودھ مت والوں کے باھمی مناظروں اور مباحثوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں کے باھمی تعلقات اور میل جول میں اضافے کی کوشش ہوئی - ہمسائگی کی بنا پر مغربی بنگال میں "ست دھرم" کی اور مشرقی بنگال میں "ناتھ مارگ" کی تخلیق ہوئی - بعد میں یہی ناتھ مسلک تمام ھند میں مروج ہو گیا تھا - اغلب ھے کہ اسی دور میں برھمن قوم کی حدود سے باھر بسہری، منگل، چنڈی، سیتلا اور ششٹھی وغیرہ مقامی دیوتاؤں کی پوجا کو مروج کرنے کیلئے تبلیغ کی کوششیں بھی جاری رھیں -

سہجیا بودھ اچاریہ مت کے چوراسی اشخاص میں سے

مین ناتھ، کانوپا، لوئی پا، بی روپا، دھامپا وغیرہ متعدد اشخاص سر زمین بنگال کے باشندے تھے - عالی جناب مہامہو پا دھیائے ہرپرشاد شاستری کی مرتبہ "بود ھوں گان و دوھا" کی سنسکرت شرح کے مطابق "لوئی" قدیم سدھا چاریہ ہیں - شاستری صاحب کی رائے میں ان کا زمانہ سنہ ۹۵۰ ع اور سنہ ۱۰۵۰ ع کے درمیان کا ہے - نویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک مصنف "رتن دیرتی" نے "لوئی پاد" کی کتاب کی شرح لکھی تھی * اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ لوئی پاد یقیناً نویں صدی کی ابتدا میں یا اس سے بھی پہلے موجود تھے - تاہم مختلف اسباب کی بنا پر مینا ناتھ کو سب سے پہلا سدھا چاریہ ماننا پڑتا ہے - شاستری صاحب قدیم پوتھی سے استناد کر کے انھیں چندردیپ کا باشندہ اور ماھی گیر قوم کا ایک فرد مانتے ہیں - کہا جاتا ہے کہ ایک مچھلی کے پیٹ میں رہ کر انھوں نے سمندر کی تہ سے شیو اور پاربتی کی راز کی باتیں سنیں اور وہیں سے صفائے قلب حاصل کی - نیپالیوں کے قول کے مطابق وہ سنہ ۳۶۲۳ کالبد مطابق سنہ ۵۲۲ع میں نیپال پہنچے - پروفیسر شیلبھان لیوی کی رائے کے

---

* B. keith—Buddhist Philosophy in India and Ceylone, P. 23.

۸ -

مطابق مینا ناتھ ۶۵۷ ع میں نیپال کے راجا نریندر دیو کے زمانے میں وہاں آگئے تھے - میرے نزدیک بھی یہی رائے قابل قبول معلوم ہوتی ہے -

رامائی پنڈت نے خود برھمن کی اولاد ہوتے ہوئے بھی برھمنی مت اور بودھ مذہب کو خلط ملط کر دینے کی غرض سے ست دھرم کے پرچار کی کوشش کی تھی - زمانہ ما بعد کے ناتھ اور کبیر کی طرح انھیں بھی ایک مخلوط مذہب کے بانی کی حیثیت دی جا سکتی ہے - "جاترا شدّھی تھا کرر پدّھتی" میں درج ہے— (ترجمہ)

"ھملیہ میں اس برھمن نوجوان نے جنم لیا
اس کی پیدائش بیساکھ کے نصف روشن حصے میں ہوئی
چاند کی پانچویں تاریخ تھی اور چاند اپنی دوسری منزل میں تھا
اتوار کا مبارک دن تھا جب برھمنی نے اسے جنم دیا
رامائی پنڈت بلا سکون واستراحت برابر مذھبی پوجا میں لگا رھتا ھے
اس وقت اس کی عمر پچاس سال کی ھے
اس کے بعد اس نے ھر طرف دھرم کا پرچار کیا
اور ساری دنیا میں دھرم کی قیادت کی
چھتیس ذاتوں کے گھروں میں دھرم کو قائم کیا
نرنجن (خدا) سب کی

نگیندر ناتھ باسو کی تحقیقات علمی کے مطابق رامائی پنڈت دھرمپال ثانی کے دور حکومت میں دسویں صدی کے اواخر اور گیارھویں صدی عیسوی کے اوائل میں راڑھ دیس یعنی مغربی بنگال میں ظہور پذیر ہوئے تھے۔ لیکن نگیندر ناتھ باسو والے دھرمپال ثانی دنت بھکتی ضلع مدنی پور کے راجا تھے۔ وہ گوڑ کے راجا نہ تھے۔ دھرم منڈل کے بیان کے مطابق دھرم منڈل لاؤسین کے ہم عصر ہیں اور لاؤسین کا زمانہ بارھویں صدی عیسوی کا وسطی عہد ہے (ملاحظہ ہو "شونی ناریز چیتنھی" کا تک سنہ ۱۳۵۵ بنگلہ)۔ ہمیں خود رامائی پنڈت کی مرتب کی ہوئی عہد وسطی کی دو پوتھیاں "دھرموپوجا بدھان" اور "شنو پوران" ملی ہیں۔ ان دونوں پوتھیوں میں "شری نرنجنیر رُشما" (خدا کا غصہ یا "کالی مار جلّال" (نامہ کا جلال) کے نام سے ایک باب مذکور ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ برہمنوں کے مظالم سے سب دھرمیوں کو نجات دلانے کے لئے دھرم دیوتا تبدیل ہیئت کرکے مسلمانوں کے بھیس میں اور دیوتاؤں کے ساتھ جاج پور میں داخل ہوئے تھے ملاحظہ ہو:- (ترجمہ)

" اسی طرح برھمن مخلوق کو برباد کرتے ہیں

یہ بڑی ہی نا انصافی ہے۔

بہشت میں رہ کر دھرم دیوتا نے دل ہی دل میں یہ محسوس کیا
اور محبت و شفقت کے جذبے سے وہ خند کار ہو گیا
دھرم دیوتا نے مسلمانوں کا بھیس بدلا اور سر پر سیاہ ٹوپی
اوڑھی - اور ہاتھوں کو تیر و کمان سے سجایا - وہ ایسے اچھے
گھوڑے پر سوار ہوا جسے دیکھنے سے دنیا والوں کو خوف معلوم
ہونے لگا - وہ خدا کا ایک نام پکارنے لگا -
برھما محمد ہو گیا -
اور وشنو پیغمبر ہو گیا -
شیو آدم بنا اور گنیش غازی ہوا اور کارتک قاضی ہو گیا -
اور منی سب فقیر بنے - اپنے طرز کو چھوڑ کر نارو منی شیخ بنا -
اندرا مولانا بن گیا -
چاند اور سورج وغیرہ دیوتا سب پیدل سپاہی ہو گئے
اب وہ سب مل کر ساجا بجانے ہیں -
جواب تک چنڈیکا دیوی تھیں وہ اب بی بی حیا ہو گئیں
اور پدّا بنی ہو گئیں بی بی نور
جتنے دیوتا تھے وہ سب یکجان ہو کر جاج پور میں داخل ہوئے
انھوں نے مندروں اور مورتیوں کو توڑ ڈالا
لوگوں کا مال و اسباب چھین کر آرام سے کھانے لگے
پکڑو پکڑو کی ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں
دھرم دیوتا کا پاؤں پکڑ کر رامائی پنڈت گایا گاتا ہے
اور اس سے تو عجیب فتنہ و فساد برپا ہو گیا ہے
(شنو پوران صفحہ ۱۴۱)

مذکورہ سابق " جاترا سدّھی راگیر پدّھتی " سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راماتی پنڈت نے اسّی سال کی عمر میں ایک شادی کی تھی اور ایک سو پچیس سال کی عمر میں اُن کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا تھا - راماتی پنڈت کا طویل السن ہونا قرین قیاس ہے - اغلب ہے کہ تیرھویں صدی کی ابتدا میں وہ زندہ تھے اور انھوں نے مسلمانوں کے حملۂ بنگال کا حال خود مشاہدہ کیا تھا - یہ تصور بلا سبب نہیں ہے - " شنو پوران " میں " دُکانی (دکان‌دار) ، کمر ، ہندو ، توپ ، (طوق) ، علم ، بازار ، پارچھا (پادشاہ) اور مال وغیرہ خالص مسلمانوں کے الفاظ موجود ہیں - " دھرمو پوجا بدھان " میں ہندو ، مسلمان ، موزہ ، تیر ، ترکش وغیرہ مسلمانوں کے خاص الفاظ پائے جاتے ہیں - اسی کتاب میں ہے -

" وہ ہاتھوں میں تیر و کمان لئے تھے اور پیروں میں موزہ پہنے تھے - انھیں گوڑ میں دھرم مہاراج کہا گیا " - (صفحہ ۲۱۵) - یہیں ہمیں گوڑ کے مسلمان بادشاہوں کے حالات بھی ملتے ہیں - یہ تمام دلائل و شواہد ہمارے سابق نظریات کو تقویت پہنچانے والے ہیں -

گورکھ ناتھ بودھ مت کے ایک شدھا چاریہ تھے - انھی کے پیرو ناتھ کے لقب سے ملقب ہوئے - تبتی زبان کی ایک کتاب

"پک سم جوں جنگ" میں بھی یہ ساری باتیں مذکور ہیں۔ ناتھ مت کے پیرؤں کے معتقدات کے مطابق وہ مشندرو ناتھ کے پیرو ہیں۔ اس لئے یہ صحیح ہے کہ گورکھ ناتھ کا زمانہ مسلمانوں کے حملہ بنگال سے بہت پہلے کا ہے۔ وہ در اصل مغربی ہند کے باشندے تھے۔ ہندی زبان کی بھی متعدد تصانیف ان کی طرف منسوب ہیں۔

منگل چنڈی، بسہری اور سینلا وغیرہ مقامی دیوتاؤں کی پوجا اور ان کی داستانیں اغلب ہے کہ مسلمانوں کے حملے سے پہلے ہی یہاں مدھدی کہاوتوں کے رنگ میں زبان زد تھیں۔ ان کی عظمت کے پرچار کیلئے زمانۂ مابعد کی تصنیف کردہ "منگل گان" جیسی کوئی اور کتاب بھی اُس زمانے میں تصنیف ہوئی تھی یا نہیں ہم اس سے لاعلم ہیں۔ عالی جناب دینیش چندر سین کا خیال ہے کہ بجے گپت کی منسا منگل کے مذکور * کانا ہری دت ہی "منشار منگل گان" کے مصنف ہیں اور وہ مسلمانوں کے حملے سے متصلاً سابق زمانے میں زندہ تھے۔ دینیش بابو کا یہ صرف گمان ہی گمان ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی قطعی ثبوت موجود نہیں ہے۔

* "پہلے جاہل لوگ گیت تیار کرتے تھے مگر ان میں عالی خیالی موجود نہ تھی۔ سب سے پہلے اچھے گیت کانا ہری دت نے تیار کئے۔ ہری دت کے تمام گیت امتداد زمانہ سے مٹ گئے۔ اس میں تک بندی نہیں تھی بلکہ مضمون سے دھوکا پیدا ہوتا تھا"۔ "ترجمہ"

عہد جدید کی تحقیقات سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مین ناتھ ہی بنگال کے قدیم ترین شاعر ہیں - انھی نے قدیم مذہب کی بد دعاؤں سے برباد شدہ بنگال کے باشندوں میں نئی زندگی پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنی رسیلی تانوں کا امرت دھارا بہایا تھا - "چربا چریو بی نشچے" کی شرح میں ان کا ایک بند نقل کیا گیا ہے - فرماتے ہیں :- (ترجمہ)

"گرو تمھیں اعلی معرفت حاصل کرنے کا طریقہ سکھاتے ہیں
وہ کاموں کا رنگ (اصول) اور مراقبہ کا طریقہ بتاتے ہیں -
کنول کھلتا ہے لیکن گھونگھے سے کچھ نہیں کہتا -
بھونرا کنول کا رس پینے سے نہیں تھکتا -"

جدید مت کے مبلغوں نے تجدید کے غیر معمولی جوش میں جب اپنے مسلک کا پرچار شروع کیا تو بہت سارے لوگ ان کی جماعت میں داخل ہونے لگے - بودھہ سہجیا والے پت منجری اور بنگالی وغیرہ ہر دل عزیز راگنیوں کے ذریعہ اپنے مسلک کی موافقت میں نظمیں لکھ لکھ کر اور گا گا کر لوگوں کو اپنے دھرم کی طرف مائل کرنے لگے - وہ کہتے تھے کہ تمھارے جھاڑ پھونک، تمھارے تنتر منتر اور تمھارے گیان دھیان سے کیا فائدہ ہے - آؤ آسان مذہب کی طرف آؤ (بودھو گان صفحہ ۵۳)

"سہج ہی ایک اعلی مقصد ہے - یہ بات کتّا کو معلوم ہے -

جاهل بہت سے شاستروں کو پڑھتے اور شمار کرتے ہیں مگر انہیں کچھ بھی نہیں آتا" (بودھو گان سنہ ۱۲۷) ترجمہ

لیکن سہج کیا ہے؟ اس بات کو انہوں نے یوں سمجھایا :-

" بتاؤ تو سہج کو کیسے سمجھایا جا سکتا ہے؟ یہ تو ایسی بات ہے جسے جسم، زبان اور دل نہیں سن سکتا" (بودھو گان صفحہ ۶۱)

" اچھا تو اس کی تدبیر کیا ہے؟ اس کی تدبیر خود گرو ہے۔ لوئی نے کہا کہ خود گرو سے یہ دریافت کر کے معلوم کرو۔"
(بودھو گان صفحہ ۱)

بودھو گانوں اور دوھوں میں سہجیامت کے ذریعہ سے صفائے باطن حاصل کرنے والے تیئیس آدمیوں کے پچاس گانے اور کانو و شرھو کے دوھے جمع کئے گئے ہیں۔ زمانہ حال کی چھپی ہوئی ناقص کتاب چریاچریو بی نشچے میں سینتالیس گانے موجود ہیں۔ تنتری پاد کا گانا نمبر ۲۵ نہیں ملتا۔

بودھو گان زمانہ ما بعد کے " مہاجن پدّا بولی" اور مسلمانوں کے معرفتی گانوں کی ابتدائی صورت ہے۔ ایک زمانے میں ناتھ مت والوں کے چرجا گیت تمام ہندوستان میں پھیل گئے تھے۔ فارسی ادب میں غزلوں کی ابتدائی صورت بھی چرجا گیتوں ہی کی ہے۔ زمانہ ما بعد میں ہندی زبان میں دوھے کی تصنیف نے تلسی داس اور کبیر وغیرہ کے ذریعہ بہت ترقیاں حاصل کیں۔

بنگلا زبان کے ڈاک اور کھنا کے کلام میں بھی دوھا کے کچھ نشانات پائے جاتے ہیں۔

اسی زمانے میں گورکھ ناتھ کے بعض چیلوں نے گورکھ ناتھ، ھاڑی پا اور کانو پا وغیرہ سدھا چاریہ مت کے پیروؤں کی عجیب و غریب جوگیانہ طاقت کا پرچار کر کے جوق در جوق لوگوں کو ناتھ مارگ میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ زمانہ ما بعد کے گورکھ وجے، مینامتی کے گانے اور راجا مانک چند کے گانے وغیرہ ناتھہ گیتوں ھی کی وہ قدیم صورتیں ھیں جن کا اس زمانے میں پرچار کیا گیا تھا۔ لیکن ھمیں اُس زمانے کی کوئی تصنیف یا تذکرہ دستیاب نہیں ہوتا ھے۔ اسی زمانے میں مقامی دیوتاؤں کی پوجا کے تصورات اور معتقدات نے بھی رفتہ رفتہ عوام کے دلوں میں اپنا سکہ جما لیا تھا۔ لیکن اس دور میں سناتن مت والے اپنے قدیم مذھب اور مسلک کو باقی رکھنے کیلئے کیا کیا کوششیں کر رہے تھے اس کا یقینی طور پر کچھ پتہ نہیں ملتا۔ ممکن ھے کہ یہ لوگ اپنے قدیم مذھب کے قلعہ کو ناقابل تسخیر سمجھ کر ان نئی تحریکوں کے مبلغین پر تمسخر آمیز ھنسی ھنستے رہے ھوں اور اسی دھن میں مگن ھوکر بیٹھے رہ گئے ھوں یہ بھی ممکن ھے کہ وہ لوگ شودھنا اور ششانک وغیرہ کی طرح وید کے متبع راجاؤں کے ذریعہ سے

ان جماعتوں پر مظالم ڈھاکر ھی دلی مسرتیں حاصل کر رہے ہوں - غالبا نئے حالات اور رجحانات کے خلاف انھوں نے عقل اور قلم کا استعمال قطعی غیر ضروری اور فضول سمجھا اور ان مست کر دینے والی لونگ کی نرم و نازک شاخوں کے سائے میں جنھیں لطیف اور نشاط انگیز ہواؤں کے جھونکے اپنے خرام ناز ے جھولے جھلا رہے ہوں بیٹھ کر اونگھناھی کافی سمجھا -

ایسے دور میں مذہبی ہنگاموں سے الگ تھلگ بنگلا ادب کی خاموش موجیں بنگالیوں کی گھریلو زندگیوں میں حیات کی لہریں پیدا کر رھی تھیں - انھیں موجوں میں سے ایک کا نام عوامی یا بول چال کا ادب بھی تھا - ہم نے مسلمانوں کے حملۂ بنگال سے پہلے کا کوئی مکتوب افسانہ اگرچہ نہیں پایا لیکن بہت سارے قصے جس طرح بنگال کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک ہندو اور مسلمان، اعلی اور ادنی، عالم اور جاہل مرد اور عورت میں یکساں طور پر رائج ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بلا شبہ مسلم دور سے پہلے کے ہیں - اس میں شک نہیں کہ اس ملک کے اکثر مسلمانوں کے آبا اجداد پہلے ہندو یا بودھ تھے اور بنگال کے ہندوؤں نے جن واسطوں سے ان افسانوں کو پایا ہے یہاں کے مسلمانوں نے بھی انھی ذرائع سے انھیں حاصل کیا ہے یہ کہنا ہرگز مناسب نہ ہوگا کہ مسلمانوں

نے هندؤں سے انهیں مستعار لیا هے - مثال کے طور پر میں "چروا هے کالدو کا درخت' اور سکهی سونا" کا افسانه پیش کرسکتا هوں - آج بهی بہت سارے قصے سینه به سینه زبانی طور پر عوام کے سینوں میں محفوظ چلے آرهے هیں - اکثر انهیں اس وقت بهی جمع کرلیا جائے تو بہتر هے ورنه وه همیشه کیلئے نذر طاق نسیاں هو جائیں گے -

ڈاک اور کهنا کے کلام بهی عوامی ادب هی کے اجزا هیں - ڈاک بودھ مت والوں کے دانا مرد تهے - لفظ ڈاک کی تانیث ڈاکنی هے - مذکورہ بالا " بودھو گان ودوها " کے ساتھ ایک کتاب " ڈاکرنب " موجود هے - اس سے یه ثابت هوتا هے که ڈاک بودھ مت کے پیرو تهے - جس طرح بودھ مت میں ڈاک کے بچن کی تخلیق هوئی تهی اسی طرح هندو سماج میں کهنا کے کلام نے بهی جنم لیا تها - کهنا کے بچن اس نام کی کسی صاحب علم عورت کی تصنیف نہیں هیں بلکه وه بنگالی گرهستوں کے مجرب مجموعے اور ان کے ماهرانه تجربات کے نادر جواهر پارے هیں - زمانۂ مابعد میں ڈاک اور کهنا کے بچن کے نام سے جو چیزیں لکهی گئی هیں وه زبان کی حیثیت سے بہت قدیم نه هوتی هوئی بهی تاریخی طور پر مسلمانوں کے عهد سے سابق زمانے کے ساتھ اپنا سلسله رکهتی هیں -

محاورات اور ضرب الامثال کو اس زمانے کے ادب میں امرت کے قطروں کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ " مویشی جائے کا خالی رہنا اچھا مگر شریر گائے کا ہونا اچھا نہیں" یہ کہاوت بجنسہ بودھ گانوں میں موجود ہے۔ (۸۸ - بودھوگان ص ۶۰) ۔ سری کرشن کرتن میں ہے۔ " اپنے گوشت کی وجہ سے ہرن دنیا کا دشمن ہے"۔ ص ۸۸ ۔ یہ محاورہ بھی بودھ گانوں میں مذکور ہے اور اسی محاورے کی صدائے باز گشت ہے جس میں کہا گیا ہے ـــ

"اپنے گوشت کا ہرن خود دشمن ہے"۔ آج بھی یہ محاورات زباں زد ہیں۔ مسلمانوں کے حملۂ بنگال سے پہلے تک بنگالی ادب کا یہی رخ تھا۔

——:*:——

باب سوم

بودھ مت کے مصنفین

بودھ مت کے زمانے کی جو سب سے قدیم بنگالی ادب کا نمونہ ہمیں دستیاب ہوا ہے وہ چریا چریوبی نشچے ناءتی کتاب ہے جس کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے - اب ہم قدیم بنگالی ادب کے بدھ مت والے مصنفین کا تذکرہ کریں گے - یہ بات ابتداءاً ہی ظاہر کر دینا بہتر ہے کہ ان مصنفین کے بارے میں ہماری تمام تر تحقیقات کا ماخذ عموماً تبتی زبان کی کتابیں ہیں - اک ذرا سہولت کی بات یہ ہے کہ ان کتابوں کا جرمنی یا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے - ان میں سے ایک کا نام Geschichte des Baddhismus in Indiea اور دوسری کتاب کا نام Edelsteinrsine ہے - ان دونوں کتابوں کا اصل مصنف مشہور تبتی لاما تار ناتھ ہے - تیسری کتاب کا نام Die Geschichte des Viernnd achtzig Zaubers. ہے - اور بھی دو کتابیں ہیں جن سے ہمیں کچھ خبر ملتی ہے - اس میں سے ایک کا نام "پگ سم جون زنگ" ہے اس کے مضامین کی ایک طویل فہرست انگریزی میں بھی موجود ہے - دوسری کتاب کا مصنف بوستون ہے جس کا ترجمہ انگریزی

میں بھی بنام History of Buddhism in India and Tibbet موجود ہے ۔

ہمیں جس قدر دلائل اور شواہد میسر آسکے ہیں ان سے یہ بات بہ یقین کہی جا سکتی ہے کہ مین ناتھ ہی بنگلا زبان کے سب سے قدیم مصنف ہیں ۔

مین ناتھ :— مین ناتھ بنگالی تھے ۔ ان کے دوسرے نام مین پاد ، متشندرو ناتھ ، مچھندرو ناتھ ، متشندرو پاد اور مچھندرو پاد بھی تھے ۔ "کو لوگیان نرے" نامی کتاب میں ان کا اصلی مولد چندر دیپ کہا گیا ہے ۔ "نتا دیکا نلک" (دور کتابت سنہ ۱۳۹۰ ع) میں مرقوم ہے کہ ان کا مولد و مسکن بنگی دیس یعنی بنگال تھا ۔ چندر دیپ باقر گنج ضلع کا قدیم نام ہے ۔ بنگال کی جوگی جماعت ابتداءً ناتھ مت کی پیرو تھی ۔ ایک زمانے میں تمام ہند ناتھ جماعت والوں کے زیر اثر تھا ۔ یہ اثر آج بھی کسی حد تک باقی ہے ۔ شیو سب سے پہلے ناتھ تھے ۔ اس کے بعد ہی مین ناتھ ، گورکھ ناتھ ، جالندھری ، ھاڑی پا اور کانو پا وغیرہ اس مت کے کاملین میں سے تھے ۔ ناتھ مت والے اپنے سب سے بڑے دیوتا کو ابتداءً "نرنجن" (بے عیب یا خدا) یا "شنو" (عدم) کہتے تھے ۔ پھر نرنجن کو شیو کے ساتھ ملا دیا گیا ۔ ناتھ مت کے سب سے بڑے مبلغ

5—

مین ناتھ ھی تھے - بنگالیوں کیلئے یہ امر باعث فخر ہے کہ ایک بنگالی مصلح نے پورے ھندوستان کو یہ مذھب بخشا تھا - اس ناتھ اصول ھی کا دوسرا نام " شہج سِدّھی " یعنی فطری طریقۂ حصول راہ بھی ہے - زمانۂ ما بعد میں اس طریقے نے تبت میں اپنا اثر و اقتدار قایم کیا - گورکھ ناتھ مین ناتھ کے شاگرد رشید تھے - وہ بنگال کے علاوہ کسی اور جگہ کے باشندے تھے - مین ناتھ کدلی چلے گئے دھرم کا پرچار ھی ان مقصد زندگی تھا - لیکن یہ کام کرتے کرتے وہ ایک دوسرے کام میں لگ گئے - وھاں وہ سولہ سو عورتوں کے راجا بن گئے - جپ‌تپ (عبادت و ریاضت) سب بھول بیٹھے اور صرف عیش و عشرت کے متوالے ھو گئے - گورکھ ناتھ ایک رقاصہ کے بھیس میں مین ناتھ کے دربار میں پہنچے کیونکہ کسی مرد کو وھاں جانے کی اجازت نہ تھی -

اب گرو اور چیلا میں تعارف ھوا - انھوں نے بڑی کوششوں اور تدبیروں سے سمجھا بجھا کر اس گورکھ دھندے سے انکو باھر نکالا - مین ناتھ کا کوئی تذکرہ اس واقعہ کے بعد کا ناتھ مت والوں کی کسی پوتھی میں مذکور نہیں ہے - نیپالیوں میں مشہور ہے کہ مین ناتھ کا مرو پ ھو کر آخر عمر میں نیپال تشریف لیگئے تھے اور پھر ان کی تلاش میں گورکھ ناتھ بھی وھاں گئے تھے -

تبتی زبان کی کتابوں میں مین ناتھ اور کانوپا کے حالات مذکور ھیں - کانوپا کے متعلق ایک خاص بات یہ ھے کہ ان کا وطن آڑیسہ تھا - وہ شومپوری بہار میں قیام بذیر تھے - بہت سے لوگوں کی یہی رائے ھے کہ پہاڑ پور کے کھنڈرات سے نکلی ھوئی بودھ خانقاہ کی نشانیاں ھی شومپوری بہارکہی جا سکتی ھیں - میں نے پہلے ھی یہہ بیان کیا ھے کہ بنگالی زبان کے قدیم ترین مصنف مین ناتھ ھی ھیں -

کانوپا :— یہ ایک صاحب قلم فاضل تھے - ان کی تصنیفات میں سے اپو بھرنگشو ، بھاشا میں ایک دوھا کوش اور تیرہ بنگلا گانے ھیں - " آشچرج چرجاچے " نامی کتاب میں انھیں جمع کیا گیا ھے - یہ کتاب کلکتہ کی بنگو شاھتہ پریشد کی جانب سے " ھزار سال قدیم کے بودھہ گانے اور دوھے " کے عنوان سے شائع ھوئی ھے - ڈھاکا یونیورسٹی میگزین میں ڈاکٹر محمد شہید اللہ کا مرتبہ انگریزی اور جدید بنگلا ترجمہ مع شرح بھی سنہ ۱۹۴۰ع میں شائع ھو چکا ھے - ان تیرہ گانوں میں سے صرف ایک گانے کا ورق خراب ھو گیا ھے - ما بقی بارہ گانوں کی زبان پر بحث و تمحیص کر کے بڑے بڑے ماھرین نے اسے مان لیا ھے کہ یہ سب یقینا قدیم بنگلا زبان میں لکھے گئے تھے -

اب ھمیں اس بات کا تصفیہ کرنا ھے کہ مین ناتھ اور کانوپا

کس زمانے میں تھے - مین ناتھ کا نام "کولسو گیان نرنے" نامی جس پوتھی میں پایا جاتا ہے وہ مہامہو پادھیائے ہر پر شاد شاستری کی رائے کے مطابق نویں صدی عیسوی کا وسطی زمانہ تھا - ڈاکٹر پر و بودھہ چندر باگچی کی رائے ہے کہ غالباً سنہ ۱۰۵۰ع تھا - لیکن چند حقایق کی بنا پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ مین ناتھ اس سے بہت پہلے موجود تھے کیونکہ وہ اسی پوتھی کے بیان کے مطابق گوشت اور خون والے انسانوں سے ترقی کر کے دیوتا کا یا دیوتا سے قریب تر دسی مقام کا درجہ حاصل کر چکے تھے -

"ابھی نب گپت" نے اپنی "تنترا لوک" میں "مچھند بی بھو" کے عنوان سے انھی متشندرو ناتھ کا تذکرہ کیا ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متشندرو ناتھ کے ساتھ شیو مل کر ایک ہو گئے تھے - " ابھی نب گپت " کا زمانہ غالبا سنہ ۱۰۰۰ع ہے - اس لئے مین ناتھ یقینا اس سے بہت پہلے زمانے کے شخص ہیں - اس بات کا ایک قابل و ثوق ثبوت فرانس کے ایک مشہور عالم " سلواں لیوی" نے اپنی مشہور و معروف کتاب " لی نیپال " میں دیا ہے - وہ فرماتے ہیں کہ سنہ ۶۵۷ع میں نریندر دیو کے دور حکومت میں متشندرو ناتھ نیپال آئے تھے - اس عہد کا صحیح تعین ہم دوسرے ذرائع سے بھی کر سکتے ہیں - گورکھہ ناتھ مین ناتھ کے شاگرد تھے -

اور " پدا بجرو شرھو" کورکھہ ناتھ کے شاگرد تھے - انھی کا دوسرا نام پدا شمبھب بھی ھے - اُدّ ان کے راجـا اندرو بھوتی انھی پدا شمبھب کے پرورش کنندہ باپ بھی تـھے اور شاگرد بھی۔ جرمن عالم " شلا گنت وھائت (Sehlaginte weit)" نے تحقیق کیا ھے کہ پدا شمبھب سنہ ۷۲۱-۲۲ میں متولد ھوئے تھے - اس لئے مین ناتھ کا زمانہ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں متعین دیا جا سکتا ھے - اسی قدامت ھی کی وجـہ سے ان کے تصنیف کردہ اشلوک آج ناقابل فہم معلوم ھـوتے ھیں -

کانوپـا :-- اب ھم کانھوپا یا کانوپا کا زمانہ متعین کریں گے - کانوپا کی ایک تصنیف " شری ھے بجّرو پنجیکا جوگ رتنو مالا " نامی کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ھے - اس پوتھی کے کاتب کائستھ گیا کرنے گوبند پال دیو راجا کے سنہ جلوس چودھویں بھادوں سنہ ۳۹ میں اسکی کتابت کی تھی - اس سے کتاب کی کتابت کی تاریخ سنہ ۱۲۰۰ ع معلوم ھوتی ھے - اس لئے کانوپا یقیناً اس سے بہت پہلے موجود مانے جائیں گے - دوسرے دلائل کے ذریعـہ سے ھم اور بھی قریب تر تاریخ تک پہنچ سکتے ھیں - کانوپا کے اُستاد جلندھری تھے اور اندرو بھوتی جلندھری کے گرو تھے - ان کا بھی مختصر حال ھم بیان کر چکے ھیں - ان تصریحات

کے مطابق ہم کانوپا کو آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں موجود مان سکتے ہیں -

شبری پا :- شبری پا بنگال ہی کے باشندے تھے - اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے - ابتدائے عمر میں یہ منترو یکرم پہاڑ پر ایک شکاری کی زندگی بسر کرتے تھے - ایک رائے کے مطابق " ابلوکی تیشر " نے انہیں اپنا مرید بنایا - دوسری تحقیق یہ ہے کہ ناگا ارجن نے زمانۂ اقامت بنگال میں انہیں اور ان کی دو بہنوں کو اپنا مرید کیا - بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ دو بہنیں نہ تھیں بلکہ ان کی دو بیویاں تھیں - ان کے نام لوکی اور گُنی تھے - عمل تقدیس اور بیعت کے بعد ان کے نام ڈاکینی پدابتی اور گیان بتی رکھے گئے - اس کے بعد شبری ان دونوں کو ساتھ لے کر دکن کے علاقے میں ایک پہاڑ پر رہنے لگے - بستن گیور تنجور کی فہرست کتاب سے ہم اس قدر اور معلوم کر سکے ہیں کہ انہوں نے بودھ مت کے ایک عالم کمل شیل کی ، ان کی دو کتابوں کی تصنیف میں مدد کی تھی - ان میں سے ایک کا نام " ڈاکینی بجرو گوّجو گیتی " اور دوسری کا نام " مرمو اپدیش " تھا - ان کے تبتی تراجم بھی موجود ہیں - کانوپا نے اپنے اپو بھرنگشو دوھا میں شبری پا کی بہت قصیدہ خوانی کی ہے - ان کے

دوگانے بودھوگان میں نقل کئے گئے ھیں - زبان کی حیثیت سے اس امر میں کوئی شبہہ نہیں ھے دہ شبری پا نے جو دوگانے لکھے ھیں وہ قدیم بنگلا زبان میں ھیں - اغلب احوال کی بنا پر ان کا دور حیات سنہ ۶۸۰ ع اور سنہ ۷۶۰ع کے درمیان متعین کیا جا سکتا ھے - شبری پا لوئی پا کے گرو تھے -

لوئی پا :-- لوئی پا بنگال کے باشندے تھے " بستن گیورنے " سری بھگوت ابھی شمے " نامی کتاب کے ترجمے کے آخر میں انھیں بنگال کا باشندہ کہا ھے - یہ بھی مذکور ھے کہ وہ متشندرو ناتھ کے علاوہ ایک اور شخص تھے - تبت کے مورخ لاما تسار ناتھ لکھتے ھیں کہ وہ بنگال میں گنگا کے کنارے رھا کرتے تھے - ابتداءاً وہ اُڈّان (سوات) کے راجا کے محرر تھے - اس وقت ان کا نام " شامنتو شبھ " تھا - پھر وہ بنگال آئے - انھوں نے ازیسہ کے راجاء اور وزیر کو جوگ تنتر کے ذریعہ اپنا مرید بنایا - اس کے بعد راجا کا نام دارک ھوا اور وزیر کا نام ڈینکی - دوسرے مورخین کی رائے کے مطابق راجا دارک کا سابق نام اِندرو پال تھا اور وہ شالی پُتر کے راجا تھے - آشچر جو چرجا چے میں دارک کا ایک گانا بھی مذکور ھے -

اب ھم ان کے وقت کے تعین کی کوشش کریں گے - میں نے پہلے ھی عرض کیا ھے کہ یہ شبری پا کے شاگرد تھے - اور

شبری پا کا تخمینی دور حیات سنہ ۶۸۰ ع سے سنہ ۷۶۰ ع کے درمیان متعین ہو چکا ہے - اس حساب سے لوئی پا کا زمانۂ زندگی سنہ ۷۳۰ع سے سنہ ۸۱۰ ع کے درمیان متعین کیا جاسکتا ہے -

" أبھی شمے بی بھگنو " نامی ایک کتاب کے تبتی ترجمے کے آخر میں مذکور ہے کہ اصلی کتاب کے مصنف لوئی پا تھے اور دیپنکر شری گیان نیز اتیش نے اس کا حاشیہ لکھا ہے - اسی سے فرانسیسی عالم کاردی ات (Cordier) ہر پرشاد شاستری اور ڈاکٹر باگچی نے یہ سمجھا ہے کہ یہ سب لوگ ہم عصر تھے - کالی داس کی کتاب کی شرح مُنّی ناتھ نے لکھی ہے لیکن اس کی وجہ سے ان دونوں کو ہم عصر نہیں کہا جا سکتا - میں نے پہلے ھی لکھا ہے کہ دسویں صدی کے آخر میں رندو بیرتی نے " ابھی شمے بی بھگنو " کا ایک حاشیہ لکھا Keith Buddhist Philosophy in India & Ceylone P. 23) بودھ گان میں ان کے دو گانے نقل کئے گئے ھیں جنکی زبان قدیم بنگالی ہے -

بیرو پا :— قدیم بنگلا زبان کے ایک اور مصنف کا نام بیروپا ہے - سنسکرت کے ایک مصنف بی روپ پاد بھی تھے - یہ ایک ھی نام کے دو مصنف ھیں - ایک صاحب نالند کے باشندے جے دیب پنڈت کے شاگرد تھے اس لئے انھیں ساتویں صدی عیسوی کا مصنف اور دوسرے صاحب جو جالندھری پا کے چیلا تھے انھیں ما بعد کا

مصنف کہا جائے گا - یہ بنگال کے باشندے تھے اور راجا دیو پال کی ریاست میں تری پورہ کے مقام پر متولد ہوئے تھے پھر بارندر بھومی کے مقام شومپوری بہار میں وہ ایک بھکشو بن کر مقیم رہے - جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے بہت لوگوں کی رائے ہے کہ موجودہ پہاڑ پورھی سابق میں شومپوری بہار کے نام سے موسوم تھا - ان کے شاگرد کا نام دمبی پا تھا - بجرو جوگینی کے شجرہ گرو کے مطابق بی روپا کی معلمہ لکھینکرا تھیں اور آن کے گرو اندرا بھوتی تھے - اندرا بھوتی کے گرو کا نام کُکّری پا تھا اور اُن کے گرو لوئی پا - لکھینکرا راجا اندرا بھوتی کی بہن تھیں - اس حساب سے ہم بودھوگان کے مصنف بیروپا کا زمانہ آٹھویں صدی عیسوی میں تسلیم کر سکتے ہیں - آشچر جو چر جا چے" میں بیروپا کے ایک گانے کا نمونہ بھی دیا گیا ہے - جسکی زبان بنگلا ہے -

ڈومبی پا یا ڈومبی ھیروک ملک مشرق میں تری پورہ کے راجا تھے - اجاریہ بیروپ جب وھاں تشریف لائے تو ڈومبی پا ان کے مرید ہوگئے اور انھوں نے بودھ مت قبول کر لیا - انھوں نے حسب دستور تکمیل اصلاح کیلئے ایک خوبصورت ڈومنی سے شادی کر لی - اس حرکت پر وزرا اور دیگر ارکین دولت نے برھم ھو کر انھیں حدود ملک سے باھر نکال دیا - انھوں نے حکومت چھوڑ کر اسی ڈومنی کے ساتھ جنگلوں

اور بنوں میں زندگی گزارنی شروع کی۔ اسی مناسبت سے ان کا نام تدومبی (تدومنی) ہوگیا۔ وہ جس زمانے میں جنگلوں میں پھر رہے تھے اُسی زمانے میں ان کے پیدائشی وطن میں بہت سخت قحط پڑا اور وبائیں آئیں۔ جوتشیوں اور نجومیوں نے بتایا کہ ایک پابند مذہب راجا کو بے وطن کرنے هی کی وجہ سے یہ ساری مصیبتیں نازل ہوئی ہیں۔ اب لوگوں نے پھر انھیں وطن آنے کی دعوت دی اور وہ اپنی تدومنی کو ساتھ لئے وطن واپس آئے۔ ان کی واپسی پر ملک سے بلائیں اور مصیبتیں سب دور ہوگئیں اور ملک کے سب باشندے ان کے معتقد اور مرید ہوگئے۔ انھوں نے بودھ مت کے مطابق سب لوگوں کو اپنا مرید بنا لیا اور ان سے بہتوں نے اپنا مقصد حیات حاصل کیا۔

اسی زمانے میں راڑھ دیس میں ایک ہندو راجا تھا۔ اُس نے بودھ مت کو بہت نقصان پہنچایا۔ تدومبی پا اُس کے دیس میں بھی گئے اور اپنی کرامات دکھا کر وهاں کے راجا پرجا سب کو اپنا معتقد بنایا۔ اس طرح راڑھ دیس سے هندو دھرم ختم ہوگیا۔

اس کے بعد وہ دکن کے علاقے میں کرناٹک چلے گئے۔ وهاں کے راجا کا نام " شہوچے " تھا۔ وهاں بھی تدومبی نے بہت

سی کراماتیں دکھائیں - بعد ازاں وہ ایک اور راجا کے دیس گئے -
لنگایت کی رائے کے مطابق اُس راجا نے اٹھ سوا ستوپ (بدھ مندر)
تعمیر کرائے تھے - ان کی روحانی طاقت سے وہ سب مندر
ایک ھی رات میں زمین پر اوندھے منھ کر گئے - راجا نے عہد کیا
کہ وہ بلی دان کیلئے آئندہ کسی جاندار کو قتل نہ کرے گا اس
لئے انھوں نے پھر اپنی روحانی طاقت سے دوبارہ سب مسمار
شدہ استوپوں کو حسب سابق کھڑا کر دیا اور پھر وہ مجسم حالت
میں زندہ بہشت میں چلے گئے -

البرٹ گرینویڈل نے ایک تبتی کتاب کا جرمن ترجمہ شائع کیا ھے -
اس میں چوراسی بڑے بڑے سدھیوں (صوفیوں) کے حالات زندگی
جمع کئے گئے ھیں - یہ کتاب جرمنی سے سنہ ١٩١٦ع میں شائع ھوئی
تھی - اس میں بھی ڈومبی کے حالات زندگی مذکور ھیں -
اس میں بتایا گیا ھے کہ وہ مگدھ کے راجا تھے - ان کے گرو
بیروپ تھے - انھوں نے ڈوم قوم کی ایک حسینہ مغنیہ کے
وزن کے برابر سونا اُس کے باپ کو دے کر اُسے خرید لیا تھا -
اس ڈومنی کو انھوں نے اپنا شریک حیات بنا لیا - عوام ان
کے خلاف صف آرا ھو گئے - ایسے موقع پر انھوں نے اپنے بیٹے کو
تخت نشین کیا اور خود ڈومنی کو ساتھ لے کر بن باس
لے لیا - اس کے بعد دیس پر بارہ سال تک انواع و اقسام

کی مصیبتیں آتی رھیں اس لئے انھیں اور ان کی رفیقہ ڈومنی کو قوم پھر خوشامد کر کے اپنے وطن میں واپس لائی - ان سے پھر راجا بننے کی درخواست کی گئی لیکن انھوں نے اسے قبول نہ کیا - بعد ازاں وہ او انکی رفیقہ سات دن رات آگ کے الاؤ میں رھے اور پھر نئے جسم کے ساتھ آگ سے باھر نکل آئے - سب لوگ ان کے مرید ھو گئے اور اچاریہ ڈومبی کے نام سے وہ ست لوگوں میں مشہور ھوگئے - پھر انھوں نے سب کو چھوڑ دیا اور خود مجسم بہشت میں چلے گئے -

اس تشریح اور سابق کی تشریح میں تقریبا مطابقت ھے - لیکن اس میں کہا گیا ھے کہ وہ مگدھ کے راجا تھے ان دونوں اقوال میں مطابقت کی صورت یہ معلوم ھوتی ھے کہ غالبا اُس زمانے میں تری پورا کا علاقہ بھی مگدھ کی ریاست میں شامل تھا اور اسی لئے آسے بھی مگدھ دیس کہا گیا ھے - چرجا چر یوبی نشچے میں ان کا ایک گانا نقل کیا گیا ھے - جسکی زبان بنگلا ھے - ڈومبی ایک طویل السن فاضل تھے - ان کا زمانۂ حیات تخمینا سنہ ۷۹۰ ع سے سنہ ۸۷۰ ع تک متعین کیا جا سکتا ھے -

بھوشو کو:— بودھوگان و دوھا کے پچاس چرجا پدوں میں سے تیرہ پد کرشنا چاریہ کے منظوم کردہ ھیں - تصنیف کی

کثرت کے اعتبار سے بھوشو نو کا درجہ کرشنا چاریہ کے بعد ھی ہے۔ وہ آٹھ پدوں کے مصنف ھیں۔ اب ھم اس کی تحقیق کریں گے کہ وہ کون اور کس زمانے میں تھے۔

تارناتھ* دیپکر شری گیان نے اتیش کے پانچ شاگردوں میں سے ایک کا نام بھوشو نو بھی لکھا ہے۔ ان کا زمانہ گیارھویں صدی کے وسط کا ہے۔ اغلب خیال یہی ہے کہ چرجا پد والے بھوشو کو یہی ھیں۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو شانتی دیو والے بھوشو کو اور چرجا کے مصنف بھوشو کو علحدہ علحدہ دو افراد مانے جائیں گے۔ ایک سبب سے یہ خیال بھی ھوتا ہے کہ بھوشو کو مشرقی بنگال کے باشندے تھے۔ آپ ۴۹ ریں چرجا میں فرماتے ھیں۔

"میں بجری کشتیوں پر دریائے پدما میں پھرتا رھا
اور توحید کے بنگال دیس کو لوٹتا رھا
اے بھوشو کو آج بنگالن پیدا ھو گئی
اور چنڈال تمھاری اپنی گھر والی کو بھی اٹھا لے گئے"

کشتی پر ندیوں میں پھرنا، پدما کی شاخوں میں کشتی چلا کر بنگال دیس کو لوٹنا اور چنڈالوں کی اکثریت کا ذکر دیکھ کر بھوشو کو کے دور میں یہ قرین قیاس نہیں ھو سکتا کہ کسی غیر مقامی اور بدیسی شاعر نے یہاں کی جغرافیائی

---

* کتاب مذکورہ سابق Geschichte صفحہ ۲۴۸ و ۲۲۹ -

حالت اور مقامی کیفیت کو اس طرح منظوم کیا ھو۔ اس لئے یہ ماننا ھی پڑتا ھے کہ بھوشوکو اسی سر زمین کے باشندے تھے - ان کا بنگالی ھونا ایساھی واجب القبول ھے جس طرح ان کے گرو دیپکر شری گیان اتیش کا جو بکرم پور ضلع ڈھاکا کے ایک قدیم بودھ اچاریہ تھے -

تنتری پاد کے پد چونکہ بودھ گانوں میں شکستہ صورت میں متفرق ھیں اس لئے ہم یہ بات وھاں نہ پاسکے - اب ہم باقی سولہ اشخاص کا مختصر تذکرہ کریں گے -

کُکّری پا :— یہ بنگالی تھے - ایک رائے کے مطابق ان کی پیدائش کپیل شکرو کے مقام پر ھوئی تھی - ان کی ایک رفیقہ حیات ان کے خیال کے مطابق سابق جنم میں لمبنی کے جنگل میں ایک ککری (کتیا) تھی اسی وجہ سے ان کا یہ نام مشہور ھوا - ککری پا اندرو بھوت کے دوسرے مشہور گرو تھے - لاماتارناتھ کی رائے میں ککری پا راجا دھرمپال کے ہم عصر تھے - ہم ان کا سال وفات لگ بھگ سنہ۰۷۷ع میں بتا سکتے ھیں - اُنھوں نے تین بودھ گانے منظوم کئے تھے لیکن ان میں سے ایک آجکل نا پید ھے - ان کی زبان قدیم بنگالی ھے -

کمبل امبر :— ان کا دوسرا نام کمبل بھی تھا - یہ اندرو بھوت اور جلند ھری پا کے گرو تھے - یہ کنکا رام یا کنکر کے شاہ زادے تھے -

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا وطن اُڈّان (سوات) یا اُڑیسہ تھا - کردئیے نے انھیں مشرقی ھند کا باشندہ کہا ہے - کمبل امبر نے لوئی پا کی ایک کتاب پر حاشیہ لکھا - ھم ان کا زمانہ آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں متعین کر سکتے ھیں - وہ کانو پا سے پہلے اور ککری پا کے ھم عصر تھے - آٹھہ نمبر بودھو گانا انھی کی تصنیف ہے اور اس کی زبان قدیم بنگلا ہے -

آریہ دیو :— یہ آریہ دیو وہ شاعر نہیں ھیں جن کا تذکرہ مہا جان بودھ شاستروں میں کیا گیا ہے - یہ کمبل امبر کے ھم عصر تھے - تارناتھ کی رائے ہے کہ وہ ابتدائے عمر میں میواڑ کے راجا تھے اور گورکھ ناتھ نے انھیں اپنا مرید بنایا - اکتیس نمبر کا بودھو گان انھی کی تصنیف ہے - ان کی زبان اگرچہ ایک کافی حدتک قدیم بنگالی سے مشابہ ہے لیکن اُسے اُڑیا زبان کہنا ھی زیادہ قرین صواب ہے -

کنکن :— ابتدائی عمر میں بشنو نگر (بشنو پور) کے راجا تھے - کِردئے نے اُنھیں کمبل امبر کی نسل سے بتایا ہے - اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ کمبل امبر کے شاگرد تھے - بودھو گان نمبر چوالیس انھی کی تصنیف ہے - اس کی زبان بنگالی ہے لیکن قواعد میں کسی قدر "اپو بھرنگشو" بھاشا کی آمیزش بھی نظر آتی ہے اور یہی اُس کی قدامت کی نشانی ہے -

مہی دھر :— انھیں مہیل بھی کہتے ھیں - یہ کانو پا کے شاگرد تھے - اپنے گرو کے ساتھ " چاٹی گاں " (چاٹگام) گئے تھے - انھیں مگدھ کا باشندہ اور شودر کہا گیا ھے - بودھو گان نمبر ۱۶ ان کی تصنیف ھے - انھوں نے اپنا تخلص مِہتا استعمال کیا ھے - ان کی زبان غالباً قدیم میتھلی ھے -

دھرم پاد : ان کا نام دھام بھی ھے - یہ کانو پا کے شاگرد تھے اور بکرم پور ضلع ڈھاکا کے ایک برھمن خاندان میں پیدا ھوئے تھے - بودھو گان نمبر ستائیس ان کی تصنیف ہے ھے - اس کی زبان قدیم بنگالی ھے -

بھدرو پاد :— ان کا نام بھاوے پاد بھی ھے - یہ کانو پا کے شاگرد تھے اور ان کا وطن منی بھدّرو تھا - بودھو گان نمبر ۳۵ انھی کا منظوم کردہ ھے - اس کی زبان غالبا قدیم بنگلا ھے -

جے نندی :— ان کا نام جیانند بھی تھا - یہ بنگال کے ایک راجا کے وزیر اور ذات کے برھمن تھے - چھیالیس نمبر کا بودھو گان انھی کی تصنیف ھے - اس کی زبان گوڑی اپو بھرنگشو کے ساتھ ساتھ جدید ھند آریہ زبان کی قدیمی صورت ھے - یہ زبان میتھلی، اُڑیا، بنگلا اور آسامی میں پہلے ایک ھی طرح کی تھی اور اسی وجہ سے ھم اسے قدیم بنگلا بھی کہہ سکتے ھیں -

شانتی پاد :— انھیں رتنا کر شانتی بھی کہتے ھیں - یہ

مشہور شانتی‌دیو کے علاوہ ایک اور شاعر تھے - یہ دیپنکر شری گیان اتیشر کے گرو تھے - ان کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کے آخر میں تھا - پندرہ اور چھبیس نمبر کے بودّھو گان ان کی تصنیف ہیں - ان کی زبان قدیم میتھلی ہے -

بینا پاد :- ان کا وطن گھور تھا اور یہ قوم کے کھتری تھے - ان کے گرو کا نام بودّھو پاد تھا - ان کی شاگردہ بلشّو بجرا تومبی هیروک کی هم عصر تھیں - ان کا زمانہ نویں صدی عیسوی میں متعین کیا جا سکتا ہے - ان کا مرغوب ساز بینا یا بین تھا - بودھو گان نمبر سترہ انھی کی تصنیف ہے - ان کی زبان کو هم قدیم بنگلا زبان کہہ سکتے ہیں -

دارک پاد :- یہ لوئی پا کے شاگرد تھے - مرید ہونے سے پہلے یہ شالی پُتر کے راجا تھے اور اندر پال کے نام سے مشہور تھے - هم تاریخ میں راجا اندر پال کا نام پاتے ہیں - وہ کامروپ کے راجا تھے - ان کے حصول حکومت کا زمانہ سنہ۱۰۴۸ع ہے - انھیں بنگال کے راجا بجے سین نے شکست دی تھی - اگر هم دارک کو اندر پال کے علاوہ ایک دوسرا شخص نہ مانیں تو پھر انھیں لوئی پا کا بلا واسطہ شاگرد نہیں مانا جا سکتا - یہ ممکن ہے کہ انھیں لوئی پا کے شاگردوں کے سلسلے میں تسلیم کیا جائے - بودھو گانا نمبر چونتیس انھی کی تصنیف ہے اور اس کی زبان قدیم بنگلا ہے -

شرھو:— یہ مشہور راھول بھدرو شرھو کے علاوہ ایک اور قابلِ ذکر مصنف ھیں - یہ مشرقی ہند کے راجنی مقام پر پیدا ھوئے تھے اور قوم کے برھمن تھے - یہ راجا چندن پال کے ھم عصر تھے - انھوں نے اپنی کرامات دکھا کر راجا رتن پال کو اپنا مرید بنایا تھا - اپو بھرنگشو زبان میں ان کا ایک دوھا کوش اور چار بودھو گان مذکور ھیں - (نمبر ۲۲ - ۳۲ - ۳۸ - ۳۹) -یہ کا مروپ کے راجا رتن پال کے دورِ حکومت سنہ ۱۰۴۸ع میں موجود تھے - غالبا یہ شمالی بنگال یا کامروپ کے باشندے تھے - ان کی زبان قدیم بنگلا ھے - اس زمانے میں قدیم آسامی اور قدیم بنگلا کی ایک ھی صورت تھی -

گنڈری ، چاٹلو ، ڈھنڈھن اور تاڑک بہ ترتیب چار ، پانچ ، تینتیس اور سینتیس نمبر بودھو گان کے مصنف ھیں - ان کے اور حالات کہیں نہیں ملتے - تبتی زبان کے چوراسی مہاشد ھوں کے تذکرے میں بھی ان کے حالات مذکور نہیں ھیں - جوتی رشر ٹھاکر کے برنن رتنا کر میں چاٹل اور ڈھنڈھن کے نام کتابت کی سہو کی بنا پر چاٹل اور چندھس لکھے گئے ھیں پارد ئے کے کیٹلاگ (فہرست) میں گنڈری کا نام بھی ملتا ھے - ان سب کی زبانیں قدیم بنگلا کہی جا سکتی ھیں -

باب چہارم

چرجا گانوں کی ادبی حیثیت

چرجا کے پد (بند) سدھاچاریہ جماعت کے بعرجان افراد کے مذہبی اسراری گانے ہیں - یہ سب اسرار کی معمائی زبان میں لکھے گئے ہیں - کسی اُستاد کے سمجھائے بغیر ان کی تشریحات اور مطالب کا سمجھنا دشوار ہے - مثال کے طور پر هم ان کے چند بند کے تراجم یہاں پیش کرتے ہیں -

" مادہ کچھوے کا دودھ دوہ کر کسی برتن میں رکھا نہیں جا سکتا
گھڑیال درخت کی املی کھاتا ہے " (کُکری پا)

" گنگا اور جمنا کے بیچ سے کشتی چلتی ہے
چنڈالی اس پر بیٹھکر ڈوبے ہوئں کو آسانی سے پار کرتی ہے "
(ڈومبی پا)

" بیل نے بچہ دیا اور گائے بانجھ ہو گئی
اسے برتن میں تین بار ہر روز دوھا جاتا ہے " (ڈھینڈھن پا)

" عدم ایک درخت ہے اور آسمان ایک کلھاڑی ہے
اس درخت کو اس طرح کاٹو کہ اسکی جڑ اور شاخ باقی نہ رہے "
(کانو پا)

ہم دور وسطی کے ناتھ ادب میں اس قسم کی معمائی زبان کا نمونہ دیکھتے ہیں - یہاں گورکھ بجے سے ہم کچھ نمونے پیش کرتے ہیں - (ترجمہ)

"صاف دل سے جانو کہ جمعہ کے دن ہوا بہتی ہے
گنگا اور جمنا دونوں مخالف رخ پر بہتی ہیں" ص ۱۴۰

" کانا بھائی گیت گاتا ہے اور لنگڑا بھائی سنتا ہے
اور لولا بھائی ڈھول بجاتا ہے" ص ۱۸۷

" اے گرو سمندر کے بیچ میں کوئی مچھلی پانی کے مخالف
رخ پر اُچھلتی ہے
رنگین مزاج عورت کو اس کا رنگ ہی لے بھاگتا ہے" ص ۱۸۷

بنگال کے باول فقیر وغیرہ جماعتوں کی مذہبی تاریخ کو سمجھنے کیلئے چرجاکے بندوں کا تذکرہ ناگزیر ہے - قدیم بنگلا زبان کے نمونے صرف یہی ہیں - چونکہ ہم یہاں مذہبی اسرار یا زبان کی حقیقت کا بیان نہیں کر رہے ہیں اس لئے ہم ان کی ادبی حیثیت ہی معلوم کرنے کی کوشش کریں گے -

ہم چرجاکے بندوں میں جا بجا ظاہری طور پر عاشقانہ لذت اندوزی کا تخیل بھی موجود پاتے ہیں - ان بندوں میں اصل وجود کو عدم یا نیستی سے تعبیر کرکے اس کیلئے ظاہری صور کے الفاظ جوگینی ، داری (کسبی) ڈومبی (ڈومنی) ، مہری

(عورت) وغیرہ الفاظ مجازاً استعمال کئے گئے ہیں - اس کی وجہ سے ظاہری طور پر عشق و محبت کا رس بھی ادب میں پیدا ہو گیا ہے - چند نمونے ملاحظہ ہوں -

" اے جوگینی تیرے بغیر میں ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا
اس لئے تیرا منھ چوم کر میں تیرے کنول کا رس پیوں گا "-
(گونڈری پا)

" تین دھات کی کھاٹ بچھائی گئی
شبر نے اس پر بڑے سکھ کا سیج بچھایا
شبر رند مشرب ہے اور نیرامنی (عدم) کسبی ہے
اُس نے بڑی محبت سے رات گذاری
اس نے دل کا پان اور سکھ کا کافور کھایا
پھر نیرامنی (عدم) کو گلے لگا کر مزے میں رات بسر کی "
(شبر پا)

" اے نوجوان محبوبہ کیا تیری بے انتہا محبت کے بغیر
اسی جسم میں رہ کر بودھی (نجات) حاصل ہو سکتی ہے ؟ "
(کانوپا کا دوھا)

اے ڈومنی میں تیرے ساتھ دوسری شادی کروں گا .
بےشرم کانو کپالی جوگی تو تیرا ناجائز شوھر بن ھی سکتا ہے " (کانوپا)

ایسے ہی خیالات کے مختلف رخ ہم طرز ادا کے تنوع کے ساتھ چرجا کے بندوں اور گیتوں میں موجود پاتے ہیں - ان میں پت منجری ، گنجری ، دیشاکھ ، بھیرویں ، کامود ، دھنشی ، رام کیری ، برازی ، ملاری ، مالشی ، بنگال ، شبری ، کنّو کنگجری وغیرہ مختلف راگوں کے نام ہیں - ہر بند کے آخر میں ایک نہ ایک تخلص بھی مذکور ہے - مثلاً -

" لوئی کہتا ہے کہ میں نے اصل وجود کو دھیان میں دیکھا
سانس کا مد وجزر تو صرف ایک تختے پر بیٹھا ہوا ہے "
(لوئی پا)

ڈکری پانے ایسا گانا گایا
کہ کڑوروں میں سے کسی ایک ہی کے دل میں اس کا مفہوم
سمایا " (ڈکری پا)

ہم بارھویں صدی عیسوی میں جے دیب کے گیت گوبند میں اسی قسم کے تخلص کا نمونہ دیکھتے ہیں - اس سے پہلے سنسکرت کے کسی شاعر نے کبھی تخلص کا استعمال نہیں کیا تھا - گیت گوبند کے گانوں میں ہمیں مالوہ ، گوجری ، بسنت ، رام کیری ، کرناٹ ، دیشاگ ، برازی ، بھیرویں ، بی بھاشی ، وغیرہ راگ راگنیوں کے نمونے ملتے ہیں - جے دیو سے پہلے سنسکرت کی نظموں میں ہم قافیہ و ردیف کا کوئی نشان بھی نہیں پاتے - لیکن گیت

- گوبند کے تمام اشلوکوں میں قافیہ و ردیف موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جے دیو نے تخلص اور قافیہ ردیف کہاں سے سیکھا۔ اس کا واحد جواب یہ ہے کہ انھوں نے یہ چیزیں چرجا کے پدوں یا بندوں سے حاصل کیں۔

فارسی زبان کی غزلوں کے مقطع میں ہمیں جو تخلص نظر آتا ہے اس کا ماخذ اگر ہم تلاش کریں تو شاید کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکیں۔ یہ معلوم ہے کہ فارسی نظمیں عربی کے زیر اثر اور عربی ہی کی تبعیت میں لکھی گئیں۔ لیکن عربی نظموں میں کبھی تخلص استعمال نہیں کیا گیا۔ غزلیں حقیقت میں وہ رسیلے گیت ہیں جن کے مقطع میں تخلص ہوتا ہے۔ انھیں بودھ گانوں کے ساتھ بڑی مماثلت حاصل ہے بودھ گانے آٹھویں صدی عیسوی کی تخلیق ہیں اور غزلوں کا وجود دسویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں پایا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزلوں کی اصل بھی بودھ گانے ہی ہیں۔ یہ امر تعجب خیز ضرور ہے کہ بنگال سے ایران متاثر ہو جائے تاہم تاریخی طورپر ثابت ہے کہ یہ بودھ گانے ایک وقت سارے ہند میں رائج تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت کی ابتدا گیارھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ اس سے پہلے بھی سندھ اور ملتان میں اسلامی حکومت تھی۔ پارسیوں نے چھٹی

صدی عیسوی میں ھندوستان سے " پنچو تنتر " نامی کتاب لے جا کر اس کا پہلوی (دور وسطی کی فارسی) میں ترجمہ کیا تھا اور اُس کا نام کلیلہ و دمنہ رکھا - شطرنج کا کھیل اور اعداد و شمار کے نشانات ھندوستان ھی سے جا کر فارسی اور فارسی سے عربی میں رائج ھوئے - گیارھویں صدی میں ابو ریحان البیرونی سنسکرت اور ھندو شاستروں کے ایک بڑے عالم گذرے ھیں - ملتان میں عبد الرحمن نے اپو بھرنگشو بھاشا میں کالی داس اور میگھ دوت کے تتبع میں ایک کتاب " دوت کا بو " (قاصد نظم) نامی لکھی تھی - یہ دلائل شاھد ھیں کہ بودھ گانے ھی فارسی غزلوں کی تخلیق میں بنیادی حیثیت رکھتے ھیں -

ھم دیکھتے ھیں کہ گیت گوبند بھی بودھ گانوں ھی سے تنویر پذیر ھوا ھے - یہ گیت گوبند وشنو کے متعلق منظومات (پدا بولی) کے قدیم ترین نمونے ھیں - جے دیو نے خود بھی اس لفظ " پدا بولی " کا استعمال کیا ھے -

ھم پدابولی لکھنے والے شعرا کی فہرست میں سب سے قدیم نام چنڈی داس اور بڈیا پتی کا دیکھتے ھیں - چنڈی داس کے سری کرشن کرتن میں جے دیو کی متعدد نظموں کے تراجم ھیں - چنڈی داس نے متعدد نظموں کا راگ بھی بتایا ھے اور نظم کے آخر میں اُن کا تخلص بھی مذکور ھے - ھم سری

کرشن کرتن میں براڑی ، کہوگنجری ، دیشاگ ، رام گری ، مالوا ، دھانوشی ، دیش براڑی ، کیدار ، ملار ، بھٹیالی ، للیت ، کہو کوڑا ، گوری ، بیلا بلّی ، مہاراتھا ، بسنت ، پٹھہ منجری بیبھاگ ، بنگال ، بنگال براڑی وغیرہ راگوں کا استعمال دیکھتے ہیں -

چنڈی داس اور بدیاپتی کے نمونے پر وشنو پدا بولی میں ہم مذکورہ بالا راگوں کا اور آخر میں تخلص کا استعمال دیکھتے ہیں - تخییل کی رو سے بھی وہ مماثلت رکھتے ہیں - جو چیز بودھوگانوں میں عدم یانہیستی کے نام سے موسوم ہے اسی نے وشنو کے گانوں مین رادھا کا روپ لے لیا ہے - ورنہ راگ اور تخلص مین کوئی فرق نہیں ہے - اس لئے ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح بودھ گانے ایک طرف فارسی غزلوں کی اصل ہیں اُسی طرح دوسری جانب وہ وشنو پدا بولی کے بھی سنگ بنیاد ہیں -

کبیر داس کی تصنیفات میں بھی بودھ گانوں کا تتبع پوری طرح پایا جاتا ہے - بعض جگہ تو صریح ترجمے نظر آتے ہیں - مثلا ملاحظہ ہو :—

ڈھنڈھن پا کا بودھ گانا اور (ترجمہ)

" بلد بیاء لو گبی آ با نجھے
پیڑھا دوھی اُئی تین شانجھے
نیتی نیتی پیالا شی ہے شَمَ جوجھئی
ھنڈھن پائے رگیت بیرے بوجھئی

ترجمہ بیل نے بچہ دیا اور گائے بانجھ ہوگئی
برتن میں ہر روز اُس کا دودھ تین بار دوھا جاتا ھے
ھر روز گیدڑ شیر ببر سے لڑتا ھے
دھندھن پا کا گانا کوئی شاد و نادر ھی سمجھتا ھے

کبیر صاحب فرماتے ھیں -

بیل بیائے گائے بھئی بدجھا
بچھرو دوھی اے تینی تینی سنجھا
نیت اُٹھی سِنگھو سیار شوں جوجھئی
کبیرا کا پد جن بیرلا بوجھئی

ترجمہ بیل بچہ دیتا ھے اور گائے بانجھ ھوتی ھے
گائے کا بچہ تین تین بار دوھا جاتا ھے
ھر روز شیر ببر گیدڑ سے لڑتا ھے
کبیر کی نظم کوئی شاد و نادر ھی سمجھتا ھے -

اسرار زبان اور معتقدات مذھبی کی بحث نہ چھیڑ کر بھی صرف مذکورہ بالا حیثیت سے بودھ چرجاگانوں کو بڑی ادبی حیثیت حاصل ھے -

---

باب پنجم

دھرم منگل

بنگال پر بودھ مت کے متبع پال خاندان کے بعد ھندو دھرم کے ماننے والے سین خاندان نے حکومت کی۔ بودھ مت والوں کے بعد ھندؤں کی حکومت کا مطلب یہ تھا کہ یہاں سے بودھ مت کا اقتدار ختم ہوگیا اور ھندو دھرم کا زور شروع ھوا۔ پانچ سو سال پہلے کرن شوبرن کے راجا ششانک نے بودھ مت کی پامالی کیلئے جو مساعی شروع کی تھیں وہ سین خاندان کے زمانے میں کامیابی سے ھمکنار ھوئیں۔ بودھ مت کے زمانے میں تقریبا برباد شدہ ھندو دھرم اور ھندو سماج کو سین خاندان کے راجاؤں نے از سر نو زندہ کرنا چاھا تھا اور یہی سبب تھا کہ ھم اُس زمانے میں ' آنی رُودھ ' ھلا یدھ ' پشوپتی ' ای شان ' جی موت اور باھن وغیرہ ھندو ' پوجا کی تقریبات پر' معاشرے پر اور تقسیم میراث کے اصول پر سنسکرت زبان میں لکھی ھوئی کتابیں موجود پاتے ھیں۔ یہاں تک کہ خود راجا بلال سین نے ھندو معاشرے کے بارے میں " دان ساگر" اور "ادبھوت ساگر" نامی دو کتابیں سنسکرت

زبان میں لکھی تھیں - اسی سے ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ کس لئے بلال سین نے برھمنوں اور کائستھوں کیلئے امتیازی درجہ شرافت کا پھر سے رواج دیا تھا -

سین خاندان کے راجا اسی لئے سنسکرت کو ترقی دے رہے تھے کہ انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ سنسکرت زبان کی ترقی سے دراصل ہندو دھرم کو ترقی حاصل ہوگی اور اسی شاہی سرپرستی کا نتیجہ تھا کہ اُس زمانے میں جے دیو، اوماپتی، گوبردھن، شری دھر اور ڈھولی وغیرہ سنسکرت زبان کے شعراء کو فروغ حاصل ہوا - اُس وقت بنگلا زبان سے سہجیا طریقے والے بودھ مت کے پیرو اشخاص کا گہرا تعلق تھا - البتہ سین خاندان کے راجاؤں نے اس زبان کو اپنی شفقت اور سرپرستی سے محروم رکھا - اراکین سلطنت کی مخالفت اور برھمن پروھتوں کی نفرت کے باعث سین خاندان کے زمانے میں بنگلا ادب کا شیوع تقریبا بند ہی ہوگیا تھا - چونکہ سین خاندان کی حکومت اور ترقی کا زمانہ صرف ایک سو سال کے لگ بھگ تھا اس لئے بنگلا ادب کی کوئی تحریر اس زمانے کی میسر نہ آسکنا بالکل قرین قیاس ہے -

سین خاندان کے راجاؤں کے عہد میں ایک قابل ذکر واقعہ رونما ہوا جسکے نتیجے کے طور پر زمانہ ما بعد میں بنگلا ادب

کے ساگر میں ایک نیا تموج پیدا ہوا اور وہ تھا دھرم پوجا کا انعقاد - دھرم پوجا کو مرکز بنا کر شنو پوران اور دھرم منگل وغیرہ نظمیں لکھی گئیں - سابق الذکر رامائی پنڈت اس دھرم پوجا کے بڑے ساعیوں اور مشہور مصلحین میں سے تھے - رامائی پنڈت اور ان کے ہم نوا ست دھرمی لوگوں پر برھمنوں نے بڑے بڑے مظالم کئے تھے - ان باتوں کا مفصل تذکرہ شنو پوران دھرمو پوجا بدھان اور دھرم منگل میں موجود ہے -

دھرم منگل کے سب سے بڑے ہیرو لاؤ سین تھے - اگر دھرمو منگل کے قصوں کی تاریخی طور پر کوئی بنیاد یا حقیقت ہے تو لاؤ سین کو بھی ایک تاریخی شخصیت کی حیثیت حاصل ہے نیز عوام کے اختلاط اور شعراء کی تہنیتی نظموں کی بدولت وہ اور ان کے کارنامے حیات جاوید حاصل کر چکے ہیں - لیکن بنگال کی کسی مستند تاریخ میں راجا لاؤ سین کا کوئی تذکرہ یا نام نہیں ملتا -

تمام دھرم منگل کی تحریروں کے مطابق لاؤ سین مہا راجا گوڑ کی سالی کا لڑکا تھا - لیکن یہ مہا راجا گوڑ کون تھے؟ ان کا نام کسی دھرم منگل میں مذکور نہیں ہے - گھن رام نے اپنے دھرم منگل میں لکھا ہے کہ یہ مہا راجا گوڑ دھرم پال کے ایسے لڑکے تھے جنھیں ان کی بیوی نے دوسرے مرد سے حاصل کیا تھا (دھرم منگل صـــ ۱۵۰)

اس اعتبار سے لاؤ سین راجا دھرم پال کے ھم عصر تسلیم کئے جا سکتے ھیں - وہ مہی پال کے ھم عصر نہیں ھو سکتے - لیکن حقیقت یہ ھے کہ گھن رام نے اپنے خیال یا عوام کے روایتی قصوں کی بنا پر دھرم پال کا نام لے لیا ھے - یہ اشتباہ بھی پیدا ھوتا ھے کہ شاید لاؤ سین صرف شعرا کے شاعرانہ تخیل کی اپج اور ایک غیر واقعی شخصیت یا محض ذھنی تخلیق ھے -

تبتی کتابوں میں لبو سین نامی ایک شخص کا نام ملتا ھے - یہ راجا جکھپال کے وزیر تھے پھر انھوں نے تدبیروں اور سازشوں سے راجا کو تخت سے بے دخل کر دیا اور خود ھی گوڑ کے تخت پر قابض ھو گئے (ملاحظہ ھو ڈھاکا یونیورسٹی کی تاریخ بنگال جلد اول صفحہ ۳۳۶) - بنگال کے جنتری نویس لاؤ سین کو کلی کال یعنی کل جگ کے مشہور مہا راجاؤں میں سے ایک عظیم الشان راجا مانتے ہیں - تبتی کتابوں میں مذکور لبو سین ھی کو ھم واقعی طور پر لاؤ سین مان سکتے ھیں - کتبات میں لبو سین کا نام نہیں ملتا لیکن جکھپال کا نام موجود ھے (مذکورہ تاریخ بنگال صفحہ ۱۴۹ و ۹۴ 'Indian Antiquary XVI) جکھپال رام پال کے ھم عصر ہو سکتے ہیں - تبتی مصنف تار ناتھ کی رائے کے مطابق وہ رام پال کی موت سے تین سال پہلے راجا ہوئے تھے - مہا مہو پادھیا ستیش چندر اچاریہ نے تبتی کتابوں کی مدد سے

گوڑ کے راجاؤں کی جو فہرست تیار کی ہے اُس میں راجا رام پال کے بعد راجا جکھ پال کا نام موجود ہے - انھوں نے جکھہ پال کا دور حکومت سنہ ۱۱۳۸ع سے سنہ ۱۱۳۹ع تک لکھا ہے - ملاحظہ ہو۔
History of the Mediaeval School of Indian Logic Appendix B. - رام پال کے زمانہ حکومت میں اختلاف ہے -

۱- دھاکا یونیورسٹی کی تاریخ بنگال کی جلد اول صفحہ ۱۷۷ کے مطابق سنہ ۱۰۷۷ع سے سنہ ۱۱۲۰ع تک -

۲- آنجہانی راکھال داس چند یا پادھیا کی رائے کے مطابق J. B. R. O. S XIV. 538 سنہ ۱۰۵۷ سے سنہ ۱۱۰۲ع تک

۳- سری دینیش چندر بھٹا چارجی کی رائے کے مطابق I H.Q; VI App. 167, 168 سنہ۱۰۷۸ع سے سنہ۱۱۲۰ع تک

۴- آنجہانی ستیش چندر اچاریہ کی رائے کے مطابق سنہ ۱۰۹۲ع سے سنہ ۱۱۳۸ع تک

۵- سری پرمود لال پال کی رائے کے مطابق Early History of Bengal P. 75 سنہ۱۰۸۰ سے سنہ۱۱۳۳ع تک

رام پال کے بعد جکھپال اور اس کے بعد لچھمن سین حکمراں ہوئے لہذا انھیں پال خاندان کے آخر عہد اور سین راجاؤں کے متصلا سابق عہد یا اسی زمانے میں ماننا پڑے گا - رامائی پنڈت اسی زمانے میں تھے - رامائی پنڈت بجے سین یا بلال سین یا دونوں کے ہم عصر تھے -

دھرم منگل اور شنوپوران میں راجا ھری چندر اور رانی مدنا کا ایک لڑکا بطور حصہ حاصل کرنے کیلئے دھرم پوجا کرنے کی تشریح موجود ھے - اسی بنا پر بعض لوگوں نے رامائی پنڈت کو ان کا ھم عصر مانا ھے - تاھم اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ راجا پورانوں والے ھریش چندر ھی ھیں - انھی کے لڑکے لوی چندر پورانوں کے روھی تاش یا لوھی تاشو ھیں - باپ کے نام کے تتبع کی بنا پر " اُش " کے بجائے " چندر ' لکھا گیا ھے - خصوصیت کے ساتھ اس بات کا کہیں بھی کوئی پتہ نہیں ملتا کہ رامائی پنڈت ان کے پروھت یا ھم عصر تھے - اس لئے ھری چندر کے افسانے سے رامائی پنڈت یا لاؤسین کے زمانے کا کسی طرح بھی تعین نہیں ھو سکتا -

ھم نے لاؤسین کے جس زمانے کا تذکرہ کیا ھے وہ میور بھٹا کے حساب کئے ھوئے زمانے سے بھی مطابقت رکھتا ھے (بعد میں ملاحظہ ھو) - میور بھٹا لاؤسین کے پرپوتوں کے زمانے میں موجود تھے - ان کے مورث اعلی دھرا دھر مشھور شخص " آدی شُور " کے ھم عصر تھے - اس حساب سے تیرہ نسلوں کے گذرنے میں فی صدی تین نسل کے حساب سے چار سو تینتیس برس گذرے ھوں گے - آدی شُور کی مجلس میں برھمنوں کی آمد سنہ ٦٦٨ شک مطابق سنہ ٧۴٦ ع میں ھوئی - اس حساب

ہے میور بھٹا کا زمانہ سنہ ۷۴۶ + ۴۳۳ = سنہ ۱۱۷۹ ع متعین کیا جاسکتا ہے - اس حساب سے لاؤسین کا زمانہ دسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں متعین ہو سکتا ہے - دھرم منگل کے افسانوں کی ایجاد بھی اسی زمانے میں ہوئی -

---

باب ششم

لاؤسین کی کہانی

بہت دن گذرے جب بنگال غیر ملکی اقتدار سے آزاد تھا اس وقت گوڑ پر ایک زبردست راجا کی حکومت تھی جس کے وزیر کا نام مہامد تھا - یہ وزیر رشتے میں راجا کا سالا تھا - ایک مرتبہ راجا شکارکیلئے جا رہا تھا کہ اس نے ایک زمیندار "شوم گھوش" کو عدم ادائیگی خراج کی بنا پر گرفتار دیکھا - اسے شوم پر ترس آگیا - اس نے معافی دیکر اسے اپنے ساتھ رکھ لیا اور "تری ششٹی گڑھ" کا راجا بنا دیا -

شوم گھوش کا لڑکا اِچھائی گھوش بڑا شہ زور نکلا - اس پر پاربتی دیوی کی خاص نظر عنایت تھی - اسنے راجا کے ایک عزیز کرن سین کو شکست دیکر خود مختاری حاصل کرلی اور ایک مشہور پہلوان "لوھا ڑا بجّر" (رعدآھن) کو اپنا وزیر بنا کر بڑی طاقت حاصل کی - مہا راجا گوڑ نے "اچھائی گھوش" پر فوج کشی کی مگر وہ کامیاب نہ ھوسکا - کرن سین کے بال بچے سب اس جنگ میں کام آئے اور وہ دنیا میں تنہا رہ گیا -

مہا راجا گوڑ نے مہامد کی مرضی کے خلاف اپنی سالی "رنجا بتی" کی شادی بوڑھے کرن سین سے کردی اور اسے

جنوبی بنگال میں "مینامتی" کا راجا بنا کر بھیجدیا - مہامد کو اس پر بڑا غصہ آیا مگر وہ کچھ نہ کر سکا -

عرصہ کے بعد دھرم دیوتا کی پوجا کے طفیل میں 'رنجا بتی' کے یہاں ایک لڑکا متولد ہوا جس کا نام "لاؤسین" رکھا گیا - یہ دھرم دیوتا کی عنایتوں سے غیر معمولی شہ زور نکلا - بڑے ہونے پر اپنے خالو یعنی مہا راجا گوڑ سے ملنے کا شوق ہوا اور وہ ماں کی مخالفت کے باوجود اپنے بھائی "کرپورسین" کو ساتھ لے کر گوڑ کی طرف روانہ ہوا - راستے میں بہت سے مراحل طے کرتا ہوا اور اپنی شجاعت و عصمت کے جوہر دکھاتا ہوا وہ گوڑ پہنچا - وزیر مہامد نے حسد کی بنا پر بہت سی تدبیریں انھیں دلیل کرنے کیلئے کیں لیکن دونوں بھائی بڑی عزت سے راجا کے دربار میں پہنچے اور ممتاز عہدوں پر فائز ہو گئے - مہامد نے راجا کو ترغیب دلائی کہ "لاؤسین" کو اچھائی گھوش کے مقابلے پر بھیجا جائے - یہ مقابلہ دو انسانوں کا نہ تھا بلکہ درپردہ پاربتی دیوی اور دھرم دیوتا کا مقابلہ تھا - اچھائی گھوش پاربتی دیوی کا نظر کردہ تھا اور لاؤسین دھرم دیوتا کا - جنگ بڑی سخت تھی لیکن دھرم دیوتا کی تدبیر غالب آئی اور لاؤسین کامیاب ہو کر مینا بھومی واپس ہوئے - اسی طرح وہ کامروپ کی ساحرہ دیوی پر غالب آئے اور وہاں کی

راجکماری کو اپنی رانی بنا یا ۔ غرضکہ بہت سی لڑائیوں میں کامیاب ھوکر لاؤسین نے دھرم دیوتا کو خوش کرنے کیلئے اپنے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور خود کو فنا کر دیا ۔ دھرم دیوتا نے ان کی خاطر سورج کو پورب کی بجائے پچھم سے نکالا اور انھیں پھر زندہ کر دیا ۔ وہ زندگی بھر دھرم پوجا میں لگے رہے اور آخر زندہ سرگباش ھو گئے ۔

———:*:———

باب ہفتم

عوامی ادب

ہم اپنے بچپن کی سنسان راتوں میں جب جھینگر اپنے نغموں سے فضا کو معمور بنائے رہتے تھے دیہات کے ضعیف العمر بزرگوں کی زبان سے جو قصے اور کہانیاں سنتے سنتے نیند کی آغوش میں چلے جایا کرتے تھے وہ کس قدر سکون بخش اور سامعہ نواز تھیں۔ جدید تعلیم کی عملی بدحالیوں کی رو میں وہ سب قیمتی خزانے اب سیلاب نسیاں کی تہ میں دبتے چلے جاتے ہیں۔ آجکل کی تعلیم یافتہ مائیں اپنے بچوں کو ایک چروا ہے اور لدو کے درخت کا قصہ، کسی راکشس کے محل میں مسحور شہزادی کی کہانی یا کل کے گھوڑے اور آڑن کھٹولے کا افسانہ نہیں سناتیں۔ اگر آج بنگلا زبان کے ان تمام افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہمارے ہاتھوں میں ہوتا تو کوئی عالمِ آثارِ قدیمہ تحقیقات کے ذریعہ سے یہ ثابت کرسکتا کہ بنگال کے سنسان گوشوں میں دادیوں اور نانیوں کی زبان سے نکلی ہوئی کہانیاں ہی پاکستان اور بھارت کے دوسرے مقامات، یا بیرونی دنیا مثلاً سنگچل، مالوہ، سماترا، جاوا اور کمبوڈیا وغیرہ میں رائج ہوئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایشیا کے

باھر یورپ کے ممالک میں یورروپین یا چینی قوم کی کہن سال بوڑھیاں آج بھی بعینہ انھی افسانوں کو یا کسی قدر تبدیلیوں کے ساتھ ھماری ھی کہانیوں کو اپنے خرد سال بچوں کے کانوں سے آشنا کرتی ھون -

اس میں شک نہیں کہ ان افسانوں میں بہت ساری کہانیاں عہد عتیق کی یادگار ھیں اور بہتیری بودھ مت کے زمانے میں رواج پذیر ھوئیں - ھم نے شکسپیر کی تصنیفات میں پڑھا ھے کہ راکشسوں کی خاص گفتگو یہ ھے — " Fie foh & fun.
I smell the blood of a British man. " اسی کے ساتھ مقابلہ کیجئے کہ ھمارے افسانوں میں جو " ھاؤں ' ماؤں ' کھاؤں ' مانوشیر گندھو پاؤں " (انسان کی بو پاتا ھوں) کا ٹکڑا ھے ان دونوں میں اس قدر مماثلت کہاں سے آئی - کیا ان سفید چمڑے والے انگریزوں اور سیاہ کھالوں والے بنگالیوں کے آباو اجداد کسی زمانے میں بھائی بھائی کی طرح ایک ھی خیمے میں زندگی بسر کرتے تھے ؟ معلوم نہیں یہ کس ماضی کی باتیں ھیں لیکن اسے آج کون بتا سکے -

چونکہ کہانیاں صرف عوام کی زبانوں ھی پر زندہ رہ سکیں اسی لئے ان کی زبان میں قدامت کی کوئی نشانی باقی نہ رہ سکی - لیکن اگر عام طور پر یہ افسانے سارے بنگال میں

پھیلے ہوئے پائے جائیں یا اس ملک سے باہر بھی ان کا وجود ملے تو ہمیں یہ ماں لینا پڑے گا کہ ان کی ابتدا اُس زمانے میں ہوئی جب بنگال میں بودھ مت کا زور شور تھا۔ اس قسم کے افسانے اردو اور ہندی زبانوں میں بھی مشہور تھے - میمن سنگھ گیتیکا میں کاجل ریکھا اور دیوانہ مدینہ، ملوا، مہوا، شیت، اور بسنت وغیرہ نام کے بہت سے افسانے پائے جاتے ہیں - ان قصوں سے ہمیں قدیم بنگال کے حالات اور معاشرت کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے - یہاں ہم ان میں سے دو کہانیاں اختصار کے ساتھ نمونے کے طور پر پیش کرتے ہیں -

---

کہانیاں

۱ــ کاجل ریکھا

ملک بھٹیال میں " دھنیشر ، سوداگر کے لڑکے کا نام " رتنیشر " اور لڑکی کا نام " کاجل ریکھا " تھا - دھنیشر جوا کھیل کر اپنا سارا دھن ہار بیٹھا اور قلاش ہوگیا - کاجل ریکھا گیارہ سال کی ہوچکی تھی اور اس کی شادی ضروری تھی لیکن مفلس دھنیشر کی بیٹی کو کسی نے قبول نہ کیا - اسی اثناء میں ایک سنیاسی مہمان نے اُسے ایک انگوٹھی اور بولتا طوطا دیا

جس کی بدولت اُس نے پھر سوداگری شروع کی - طوطے کی هدایت پا کر وہ کاجل ریکھا کو ساتھ لئے ایک سفر میں گیا - راہ میں ایک پرانے مندر کے قریب کاجل ریکھا کو چھوڑ کر وہ پانی لانے گیا - کاجل ریکھا نادانستہ مندر میں داخل ہو گئی اور اس کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا - کوششوں کے باوجود دروازہ نہ کھلا اور دھنیشر کاجل ریکھا کو اسی مندر میں چھوڑ کر واپس گھر چلا گیا -

دھنیشر کی واپسی کے بعد ایک سنیاسی اس مندر میں آیا اور اس نے کاجل ریکھا کو بتایا کہ مندر میں ایک مشہور راجکمار موجود ہے جس کے تمام جسم میں سوئیاں چبھی ہوئی ہیں - کاجل ریکھا اس کی هدایت کے مطابق سوئیاں نکالنے میں مشغول ہو گئی - سنیاسی نے کہا تھا کہ آنکھوں کی سوئیاں سب سے آخر میں نکالنا اور پھر چند پتے دیکر هدایت کی تھی کہ اس کا عرق مردہ راجکمار کی آنکھوں میں ڈالدینا تو وہ بھلا چنگا ہو جائے گا - اس نے یہ بھی هدایت کی تھی کہ جب تک بولتا ہوا مقدس طوطا آکر اس راجکمار سے کاجل ریکھا کا تعارف نہ کرائے وہ مصیبتیں سہہ کر بھی اپنی حقیقت ظاهر نہ کرے - یہ کہہ کر وہ سنیاسی چلا گیا -

کاجل ریکھا نے سات رات اور سات دن کی محنت سے مردہ

راجکمار کے جسم کی سب سوئیاں نکال لیں اور آنکھوں کی سوئیاں باقی رکھ کر خود غسل کرنے اور کپڑے بدلنے دریا کے کنارے گئی - راہ میں ایک بردہ فروش ملا جو ایک نوجوان داسی کو بیچنا چاھتا تھا - کاجل ریکھا نے اُسے اپنا کنگن دیکر خرید لیا اور نادانی سے سارا بھید بتاکر اسے مندر میں بھیجدیا - اس داسی نے دھات تمام راجکمار کی آنکھوں سے سوئیاں نکال لیں اور خود کو راجکماری ظاہر کرکے اس کی رانی بننا منظور کر لیا - کاجل ریکھا لوٹی تو اس نے نیا نقشہ دیکھا اور اپنی قسمت پر صبر کرکے کنگن داسی بننا منظور کر لیا - اب یہ تینوں راجکمار کے وطن گئے - کاجل ریکھا داسی بنی اور داسی رانی بن گئی -

عرصہ گذر گیا سوئی والا راجکمار کاجل ریکھا میں غیر معمولی شرافت اور مصنوعی رانی میں دناءت کے نمونے اکثر و بیشتر دیکھا کرتا تھا - رفتہ رفتہ اسے یقین ہوگیا کہ کاجل ریکھا واقعی کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے - اسی اثنا میں وہ سفر کیلئے گیا اور کاجل ریکھا کی فرمائش پر رتنیشر سے بولتا طوطا مانگ کر لایا -

مصنوعی رانی نے حسد کی وجہ سے کاجل ریکھا کو بن باس دلادیا اور بڑی مصیبتیں سہہ کر وہ اپنے بھائی کے

یہاں پہنچ گئی - اس نے بھی کاجل ریکھا کو نہ پہچانا اور خود ھی اس سے شادی کرنی چاھی - لیکن مقدس طوطے نے آکر سارا بھید کھول دیا اور سوئی راجا نے خبر پاکر کاجل ریکھا کو اپنی رانی بنایا اور اصلی کنگن داسی کو زندہ زمین میں دفن کرا دیا -

کاجل ریکھا کا یہ قصہ ھندو پاک کی دوسری زبانوں میں بھی خفیف تبدیلیوں کے ساتھ پایا جاتا ھے - اردو کی مشہور کتاب گنجینۂ اخلاق و امثال مصنفہ منیر لکھنوی میں بھی یہ قصہ موجود ھے - فرق یہ ھے کہ اس کا کیریکٹر مسلم معاشرے کا حامل ھے اور بنگلا کا قصہ ھندو تصورات کا آئینہ دار ھے - اردو کی مشہور کہاوت— " آنکھوں کی سوئیاں نکالنا باقی ھے " بھی اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتی ھے -

۲- شیت اور بسنت

ایک راجا کی دو رانیاں تھیں - شویو رانی اور دویو رانی - شویو رانی کے تین بچے بہت حقیر اور مریض جیسے تھے لیکن دویو رانی کے بچے شیت اور بسنت بڑے تنومند، خوب صورت اور ھونہار تھے - شویو نی اپنے سوتیلے بچوں سے بہت جلتی

تھی - آخر اُس نے دو یو رانی کے سر میں جادو کا ایک گنڈا باندھ دیا جس سے وہ طوطا بن کر اڑ گئی -

شو یو رانی نے ایک دن راجا سے شکایت کی کہ شیت اور بسنت اس کی آبرو کے درپے ھیں اس لئے راجا نے انھیں قتل کی سزا دی لیکن راجا کے غلام نے انھیں باھر لے جا کر چھوڑ دیا اور وہ صحرا نورد ھو گئے - ادھر راجا بہت بیمار ھوا اور اس کی موت کی خبر مشہور ھو گئی -

عرصہ کے بعد راہ میں بسنت کیلئے پانی کی تلاش میں جاتے ھوئے شیت کو سفید راج ھاتھی محل میں اٹھا لایا اور وہ محل میں آکر راجا کا جانشین ھو گیا - بسنت کو ایک سنیاسی اپنے ساتھ لے گیا اور وہ وھیں رھنے لگا -

اُس زمانے میں "روپ بتی" نامی ایک راجکماری کے حسن کا دور دور تک شہرہ تھا - شیت کی ماں طوطا بنی ھوئی اُس کے ھاتھ میں پھنسی اور طوطے کے مشورے سے روپ بتی نے یہ اعلان کیا کہ جو شخص بھی "کھیر ساگر" کے ھاتھی کو مار کر اس کے سر سے "گج موتی" لا سکے گا وھی اس کا شوھر بن سکے گا - شیت نے روپ بتی سے شادی کرنی چاھی مگر موتی نہ لاسکنے کی وجہ سے ناکام رھا اور غصے میں اُس نے "روپ بتی" کو مقید کر دیا -

بسنت نے سنیاسی کے مشورے اور اس کی مدد سے "گج موتی" حاصل کر لیا - واپسی میں اسے اپنے تینوں سوتیلے بھائی ملے جو جادو سے مچھلی بن گئے تھے - اُس نے ان مچھلیوں کو شیت کے پاس محل میں بھیجدیا - آخر شیت نے بسنت کو اور تینوں سوتیلے بھائیوں کو پہچانا اور باہم مل کر وہ خوشی کی زندگی بسر کرنے لگے - اسی اثنا میں شیت کے والد بھی جو هجوم غم سے گھبرا کر جنگل میں سنیاسی بن کر چلے گئے تھے گھر واپس آ گئے - روپ بتی نے بسنت کو شوہر منتخب کر لیا اور دویو رانی بھی جادو کا تعوید کھل جانے سے اصلی صورت میں آ گئی - اس طرح یہ سب هی عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگے -

یہ کہانی هندی زبان میں بھی شائع هوئی هے - لیکن اولیت کا سہرا بنگلا زبان هی کے سر هے - یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں هے کہ یہ قصہ نہایت قدیم زمانے کی معاشرت کا پتہ بتاتا هے اور اگر کوشش کی جائے تو اس کی قدامت کے چہرے سے پردہ اٹھانا بھی ناممکن نہیں هے -

(ب) مذہبی قصے

بنگلا زبان میں برت (مذہبی امور) کے متعلق کتنے ہی افسانے نثر، نثر و نظم یا صرف نظم میں لکھے گئے ہیں - اس کی ابتدا دراصل ہندوؤں سے ہوئی لیکن زمانۂ مابعد میں کسی قدر مسلمان شعرا بھی اس سے متاثر ہوئے - ان پڑھ مسلمانوں میں آج بھی ستیہ (سچے) پیر کی شیرینی اور نین لاکھ والے پیر کی مٹھائی کے علاوہ دوسرے مذہبی اشخاص سے متعلق بھی کہیں کہیں محفلیں منعقد ہوتی ہیں - ان سب کے متعلق بہت ساری روایات مشہور ہیں - بنگال کے مذہبی قصے ابتک یکجا نہیں کئے جاسکے - مختلف اضلاع کے مروج مذہبی افسانوں کا مقابلہ کرنے سے انکی طرز ادا کا اختلاف بھی ہمیں بہت سی باتیں سکھاتا ہے - یہاں ہم "جم پوکر برت" کے بند سے نمونے کے طور پر ایک بند کا ترجمہ پیش کرتے ہیں - یہ نظم اب بھی ہندوؤں میں مروج ہے -

ہلینچا کا ساگ اور قلمی ساگ لہلہاتا ہے -
راجا کا بیٹا چڑیاں مارتا پھرتا ہے -
وہ چڑیاں مارتا ہے اور جھیل خشک ہو جاتی ہے -
سونے کا ڈبہ اور چاندی کا قبضہ ہے -
قبضہ کھولنے میں خراش لگ گئی -

میرے بھائی اور باپ دھن اور اولاد میں لاکھ پتی ھیں -
لچھمی دیوی انھیں دعا دے کر گئی ھے -
میرے بھائی اور باپ دھن اور اولاد میں لاکھ پتی ھیں"

ھندؤں میں دھرم منگل، منسا منگل اور چنڈی منگل کی نظموں نے انھی مذھبی افسانوں کی بنیاد پر نظم کا جامہ پہنا تھا - یہ امر تحقیق طلب ھے کہ بنگال سے باھر بھی کہیں اس طرح کے مذھبی افسانے اور عقائد منظوم کئے گئے ھیں یا نہیں - منسا منگل کا بہالا اور لکھندر کے افسانے صوبۂ بہار کے ضلع چھپرا میں بھی مقبول عام ھیں - وھاں کی زبان میں بیہولا بسہری نام کی ایک کتاب بھی طبع ھوئی ھے جس میں مرقوم ھے کہ چوپائی نگر میں ایک راجا تھا جس کا نام چاندو سوداگر تھا - اس کی بیوی کا نام سونیکا تھا اور ان کے فرزند کا نام لکھندر - بیہولا کے باپ کا نام باسر سوداگر اور ماں کا نام مانیکو تھا - ان کا وطن اُجینی نگر تھا - آسامی ادب میں منسا (پدما) کا افسانہ بنگلا افسانے ھی کے مشابہ ھے - بنگلا ادب میں نہ جانے کتنی برت کی باتیں اور مذھبی افسانے قدیم زمانے سے جاری و ساری ھیں - انھیں دور قدیم سے بھی پہلے کا کہا جاسکتا ھے - ھمارے نزدیک اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ھے -

---

(ت) لوریاں

بچوں کو سلانے والی لوریاں دنیا کے تمام بچوں کے لئے ماں کے دودھ ھی کی طرح محبوب اور مرغوب ھیں - ان میں مہذب اور غیر مہذب کی کوئی تفریق نہیں - بنگلا زبان کی لوریاں ھندو مسلمان اور بودھ اقوام میں بلا تفریق ملت و مذھب یکساں طور پر مروج ھیں - یہ لوریاں کسی ایک زمانے کی پیدا وار نہیں ھیں - " لڑکا سویا سب دو بھا یا، برگی (مرھٹے) دیس میں آئے " - یہ لوری مرھٹوں کے ھنگامے کے زمانے کی ھے اس لئے ھم اسے دور جدید کی تخلیق کہہ سکتے ھیں - " ماشی پیشی بنگاؤں باشی " میں ھم یہ لوری پاتے ھیں - " ھم جائیں گے گوڑ - لائیں گے سونے کا مور " معلوم ھوتا ھے کہ یہ لوری اس زمانے میں مروج ھوئی جب گوڑ بنگال کی راج دھانی تھا - ان لوریوں میں اختلاف مقام کی بنا پر خفیف خفیف سی تبدیلیاں پائی جاتی ھیں - ضرورت ھے کہ ان کا بنگال کے باھر کی لوریوں سے مقابلہ کیا جائے - اس طرح ھم یہ اندازہ کر سکیں گے کہ بنگال کی بہت سی لوریاں اسلامی دور سے پہلے کی ھیں - نمونہ کے طور پر ملاحظہ ھو :-

برشتی پوڑے ٹاپور ٹوپور ندی تے ایلو بان
شیب ٹھاکورِ بی اے ھولو تین کنّے دان

ایک کنے راندھن باڑن ایک کنے کھان
ایک کنے ناکھی اے ساپیر باڑی جان

(ترجمہ) ٹپ ٹپ بارش ھو رھی ھے ندی میں ھے سیلاب
شیو ٹھاکور کی شادی ھوئی تین بہو کے ساتھ
ایک دلہن پکاتی اور نکالتی ھے دوسری دلہن کھاتی ھے
ایک دلہن بے دھائے بیٹھے باپ کے گھر جاتی ھے
(لوک شاھیتہ صفحہ ۱۰)

(ث) ڈاک اور کھنا کی نظمیں

ڈاک اور کھنا کا کلام منظوم طرز کا ھے - Nursery Rhyme میں بھی اس طرح کا کلام پایا جاتا ھے -

" The south wrind brings wet weather.
The north wind wet and cold together.
The west wind always brings us rain.
The east wind blows it back again."

ڈاک کسی خاص آدمی کا نام نہیں تھا بلکہ بودھ مت کے بعض سادھوؤں کا لقب تھا - ان کی باتیں ضرب الامثال کی طرح شہرت رکھتی ھیں - ان کے نمونے آسامی اور اُڑیا زبانوں میں

بھی پائے جاتے ھیں - ھم یہاں ڈاک کے کلام سے تین نمونے پیش کرتے ھیں :— (ترجمہ)

(۱) جو عورت قریب کا تالاب چھوڑ کے دور جاتی ھے
اور راہ رؤں کی طرف منہ پھیر کے دیکھتی ھے
راستے میں وہ دوسرے مردوں سے باتیں بھی کرتی ھے
ڈاک کہتا ھے کہ ایسی عورت کبھی گھر میں نہیں ٹھہر سکتی "

(۲) جو گھر کا پانی پھینک کے باھر پانی لانے جائے
اور دوسرے مردوں کو گوشۂ چشم سے دیکھے
ایسی عورت کو باعصمت نہیں کہا جا سکتا
بلکہ حقیقت میں وہ آوارہ ھے "

(۳) جس کی بیوی اور لڑکی دور چلی جائے
اور اس کے قریب ایک فاحشہ عورت بیٹھی رھے
اثنائے گفتگو میں وہ بار بار ہنستی بھی رھے
تو ڈاک کہتا ھے کہ ایسا مرد بے شک دیوس ھے "

کھنا کے بند بھی ڈاک ھی جیسے ھیں لیکن وہ خصوصیت کے ساتھ علم الید (قیافہ) جوتش اور کاشتکاری کے متعلق ھیں - کھنا کے معنی ھیں ناک کٹا - جس طرح یہ بند کھنا کے نام سے موسوم ھیں اسی طرح بہت سے بند راون کے نام سے بھی منسوب ھیں - کھنا یا راون دونوں ھی فرضی نام ھیں - کھنا کے بند آریا زبان میں

بھی پائے جاتے ھیں۔ ھم یہاں کھنا کا ایک بچن بطور نمونے کے پیش کرتے ھیں۔ ” بیس ھاتھ کا فاصلہ رکھ کر آم اور کٹھل کے درخت نصب کرو' انھیں قریب قریب رکھنا مفید نہ ھوگا کیوں کہ انمیں پھل نہ آئیں گے “۔

مجھے نہیں معلوم کہ ڈاک اور کھنا کے سب بچن مرتب صورت میں جمع ھوئے ھیں یا نہیں - شہر کے شرفا تو انھیں ایک حد تک بھول ھی چکے ھیں - البتہ دیہات کے ھوشیار کاشت کار اپنی ضرورت کے مناسب حال بندوں کو بڑی جتن سے اب تک اپنے ذھنوں میں مرتب اور محفوظ رکھے ھوئے ھیں - ڈاک اور کھنا کے بند بلا شبہہ بنگال میں بودھ مت کے عروج کی یاد گار ھیں -

---

(ج) پہیلیاں

اب ھم پہیلیوں کا تذکرہ کرتے ھیں - یہ پہیلیاں قدیم زمانے کی تخلیق ھیں - یونانی ادب میں پایا جاتا ھے کہ راکشس اسفنکس لوگوں سے پوچھا کرتی — ” وہ کون سا جاندار ھے جس کے بچپن میں چار پاؤں ھوتے ھیں' جوانی میں دو پاؤں ھوتے

ہیں اور بوڑھا پے میں تین پاؤں "؟ اس معمے کو حل نہ کر سکنے کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں نے اپنی جانیں گنوائیں۔ آخر کار " ای دی پوس" نے اس کا جواب دیا تھا کہ وہ جاندار انسان ہے اور پھر اس نے اس دیونی کو قتل کیا تھا۔ بدیس کی طویل مسافت قطع کرکے جب ہم اپنے وطن لوٹ کے آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ شاعر کنکن چنڈی کے " شاری شُک شنگباد" میں طوطا بہت سے معموں کو حل کرنے کا گرُ بتاتا ہے۔ ان مشکل معموں میں سے ایک معمہ ہم نمونۃً پیش کرتے ہیں۔

زندگی میں خاموش ہے لیکن مرنے پر خوب بولتا ہے
تقدیر کے چکر میں ہے اور جسم پر کھال نہیں ہے۔
آدمی تو ضرور اسے خوشی کے کام لاتا ہے
کوبی کنکن اسے معمے کے طور پر بیان کرتا ہے"۔

(جواب ہے " سنکھ ")

ہندوستان میں پہیلیوں کو حل کرنا بہت قدیم زمانے کی چیز ہے۔ رگ وید میں بھی اس کے بہت سے نمونے پائے جاتے ہیں۔ بنگلا زبان میں بھی بہت سی پہیلیاں صرف زبانوں پر زندہ ہیں۔ ہم چوبیس پرگنے کی مروج دو پہیلیاں یہاں پیش کرتے ہیں۔

ا۔ " آسمان گڑگڑاتا ہے اور پتھر کا گھاٹ ہے

سات سو ڈال میں دو پتیاں ہیں"۔ (جواب - چاند سورج)

۲۔ "باغ سے نکلا اک طوطا - سر پر رکھے سونے کا ٹوپا (جواب - انناس)

اگر یہ ساری پہیلیاں لکھی جائیں تو عوامی ادب میں ایک مفید اور معتدبہ اضافہ ہوسکتا ہے - ان پہیلیوں میں سے بعض بنگال میں بودھ مت کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں -

---

(ح) ضرب الامثال

اب ہم بنگلا ضرب الامثال کے متعلق کچھ باتیں بتانا چاہتے ہیں - جس طرح کسی حسینہ کی پیشانی پر سرخ رنگ کا تلک حسن کی شعاعوں کو تیزتر کردیتا ہے اسی طرح یہ محاورات اور ضرب الامثال بھی حسن کلام کو دوبالا کر دیتے ہیں - عہد قدیم کے ذہنی تاثرات اور قوموں کی تاریخ کا پس منظر بھی ان کہاوتوں سے نمایاں ہوتا ہے - پاک و ہند کی مختلف زبانوں کے محاورات کا مقابلہ کرنے سے ہمیں بہت سارے حقائق معلوم ہوسکتے ہیں - بنگلا ادب میں محاورات کا استعمال بہت قدیم زمانے سے ہوتا رہا ہے - بودھ گانوں کے مذہبی مراسم کے بیان میں (۲) شاعر بھوشوکو کہتا ہے - " اپنے

گوشت کا ھرن خود دشمن ھے" ۔ (اپنار مانگشے ھرنا بیری) یعنی اپنی خوبیاں ھی لوگوں کی دشمنی کا سبب بن جاتی ھیں ۔ سری کرشن کرتن میں ھمیں ملتا ھے ۔ " اپنار مانسے ہرینی جگتیر بیری " یعنی اپنے گوشت کی وجہ سے ھرن دنیا کا دشمن ھے ۔ مشہور نوبی کنکن کی مصنفہ کتاب چنڈی میں بھی یہی محاورہ ملتا ھے ۔ یہ محاورہ بنگال میں آج بھی بعض مقامات پر مستعمل ھے لیکن ھم اسے کسی کتاب میں لکھا ھوا نہیں پاتے ۔ موجودہ دور میں آسام کے علاقے میں اس کے استعمال کا ثبوت میجر گرڈل کی کتاب " Some Assamese proverbs " سے اس طرح ملتا ھے ۔ " ھرن کا گوشت ھی اس کا دشمن ھے " ۔

شر ھو پاد کے مذھبی مراسم کے بیان (۳۲) میں ھمیں ملتا ھے ۔ " ھا تیھ رے کا نکن نالے ؤ درپن " ۔ یعنی ھاتھ کا ننگن دیکھنے کیلئے آئینہ مت لو ۔ راج شیکھر کی کتاب " کرپورمنجری " میں بھی درج ھے ۔ " ھتھ کنکنگ کنگ پذن پک کھی ادی " یعنی ھاتھ کا کنگن کیوں آئینے سے دیکھا جائے ۔ نرنے ساگر صفحہ ۱۷ میں کوبی کنکن نے کہا ھے ۔ " کرر کنکنے نہال درپنے " ھاتھ کا ننگن آئینے سے دیکھتے ھو؟ (کلکتہ یونیورسٹی ایڈیشن صفحہ ۷۲۸) میتھیلا کے شاعر بدّیا پتی کی نظموں میں ھمیں ملتا ھے — " ھاتھک کاکن ارسی کاج؟ " ھاتھ کے کنگن کیلئے آئینے کی کیا

سرورت (بنگیو شاھتو پری شد ایڈیشن صفحہ ۲۷۱)-
ھندوستانی محاورات میں بھی ھمیں یہی بات اس صورت
میں ملتی ھے — " ھاتھ کنگن کو آرسی کیا ھے "- لہذا یہ محاورہ
یقینا بنگال میں بودھ مت کے دور سے بھی پہلے کا ھے - شرھو
کے ایک اور مقام پر (۳۹) ھمیں ملتا ھے " بُرسن گوھالی
کی مودو تَتھ بلدیں " یعنی حالی مویشی خانہ بہتر لیکن
شریر بیل سے کام نہیں - یہ بھی ایک قدیم ھم معنی محاورے
کی ترقی یافتہ صورت ھے اور ابتک یہ بنگال میں مروج ھے -

ایک اور قدیم کہاوت ھمیں ککری پاد (۲) کے ایک
مقام پر ملتی ھے — " دن کو یہو کوے سے ڈرتی ھے اور رات کو
کامروپ جاتی ھے — " اسی کے ھم معنی محاورات ھمیں سنسکرت
اور پراکرت میں بھی ملتے ھیں (بھوج پروبندو - اشلوک ۲۹۴)-

———ــ*ــ———

باب ہشتم

بودھ مت کے دور میں بنگالی سماج کی تصویر

ہمیں بودھ مت کے گانوں سے اُس زمانے کی سماجی حالت کا بھی کسی قدر پتہ ملتا ہے۔

ملک میں کپالک فقیر اور جوگینی کا وجود بہت تھا۔ کپالک برہنہ رہا کرتے تھے۔ (بودھوگان نمبر ۱۰-۳۶) - وہ کھٹانک یعنی پلنگ کے پائے جیسا چھوٹا ڈنڈا ہاتھوں میں رکھتے اور ڈگڈگی بجایا کرتے - ان کے کانوں میں کنڈل اور پاؤں میں گھونگھرو ہوا کرتے اور وہ جسم میں راکھ ملتے (بودھوگان نمبر ۱۱)

جوگنیوں میں بعض خواہشات کی ماتی اور شہوت پرست بھی ہوتیں (بودھوگان نمبر ۴-۱۸)

ڈومنیاں ناچ اور گانے میں بہت مشاق تھیں۔ وہ شہر کے باہر قیام کرتیں اور اچھوت سمجھی جاتیں۔ بعض کسبیوں کا بھی پیشہ کراتیں اور وہ تانت اور بانس کی ٹوکریاں بیچتیں۔ (نمبر ۱۰-۱۸)

هاتھی پالتو جانور تھے - وہ جس کھونٹے میں باندھے جاتے تھے اُسے "باکھوڑ" کہتے تھے - کبھی کبھی مست ھاتھی زنجیر اور کھونٹا توڑ کر کنول بھرے تالابوں اور جھیلوں میں بھاگ جاتے (نمبر ۹-۱۶)

جنگلی اونٹ پھندوں سے پھنسا لئے جاتے - اس وقت وہ بہت شور مچاتے (نمبر ۱۷)

بودھ گانوں کے مشہور مصنف شر ھو نے اپنی کتاب دوھاکوش میں بھی اونٹ کا تذکرہ اس طرح کیا ہے — " بندھی ھوئی حالت میں وہ دس سمت دوڑتا ہے - اور جب آزاد ھوتا ہے تو خاموش کھڑا رہتا ہے - اے دوستو ایسا اونٹ دیکھو - اس کی چال تو مجھے الٹی معلوم ھوتی ہے "- (بودھوگان ودوھا صفحہ ۹۹) دور وسطی کے قدیم شاعر بوڑو چنڈی داس نے بھی اونٹ کی تشبیہ دی ہے -

دور وسطی کی سولھویں صدی عیسوی کے شاعر دیوکی نندن سنگھ نے گوپال دیج میں اونٹ کی اس طرح تشریح کی ہے -

" جس کی جس طرح کی پسند ھو وہ ویسی ہی چیز چاھتا ہے
ھر ٹہنی کو چھوڑ کر اونٹ کا نٹوں ہی کو چباتا ہے "-

(ڈاکٹر شیوکمارسین - بنگلا شاھیتر اینیہاش حصہ اول صــ ۲۱۸)

خانگی استعمال کی چیزوں میں سے قفل اور کنجی ' تانگی '

کدال اور آئینہ وغیرہ مستعمل تھے (نمبر ۴- ۵-۴۵-۳۲-۵۰)

ھرن کا شکار بڑا ھی ھردل عزیز مشغلہ تھا - وہ شکاریوں کو "اھیری" کہتے تھے - کبھی کبھی وہ ھرن کو جال میں بھی پھنساتے - "اپنے گوشت کی وجہ سے ھرن خود اپنا دشمن ھے"- ایک مشہور کہاوت تھی - (نمبر ۶ ۲۳)

شطرنج کھیلنا محبوب مشغلہ تھا - بساط کو وہ "پینڑی" کہتے اور اس میں ۶۴ خانے ھوتے - شطرنج کے بادشاہ کو وہ "ٹھاکور" کہتے، وزیر کو "مونی" (منتری)، فیل کو "گ آ" (گج) اور پیادوں کو "بوڑیا" کہتے - (نمبر ۱۲)

موسیقی کے آلات میں بینا (ستار) مروج تھا - کدو پر تانت کے تار بیٹھا کر اُس میں لکڑی کی میخیں اور تکیہ لگا کر بینا بناتے - مضراب سے وہ بینا بجایا کرتے - نمبر ۱۷)

شادیوں میں بڑی شان و شوکت اور دھوم دھام دکھاتے - نقارہ، ڈھول، کرنڈ، کسالا اور دمامے وغیرہ بجایا کرتے - دولھا جہیز پایا کرتا - (نمبر ۱۹) - دولھا دلھن پلنگ پر سویا کرتے اور کافور ڈال کر پان کھاتے - (نمبر ۲۸) - سری کرشن کرتن میں کافور ملے ھوئے پانوں کا ذکر ھے "کافور ملے ھوئے پان کھاکر رادھا بیزاری سے ھنستی ھے" صــــ ۸

چھوٹی چھوٹی ندیوں پر لوگ ثواب کی نیت سے کچے

پل بنایا کرتے۔ ڈانگیوں سے درخت کاٹ کر تختے بناتے اور انھیں پل کی تعمیر میں استعمال کرتے (نمبر ۵)

عام طور پر کشتیوں کے ذریعہ سے لوگ ندی سے پار ہوتے۔ ثواب کیلئے کچھ لوگ بلا معاوضہ مفت بھی پار کردیا کرتے۔ سکّوں کے طور پر کوڑیاں اور بوڑیاں (چھدام) استعمال کرتے۔ اکثر ڈومنیاں کشتی چلاتیں — "ہم نہ کوڑی لیتے اور نہ بوڑی۔ اور آرام سے پار کر دیتے ہیں"۔ (نمبر ۱۴)

بحری راستوں سے کشتیاں چلتی تھیں۔ کشتی کے اگلے حصے میں چپو لگے رہتے۔ ملاح پتوار سنبھالتے۔ کشتیوں میں کبھی کبھی چرخیاں اور مستول بھی لگائے جاتے۔ تجارتی مال میں سونا بھی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ لنکا (سیلون) تک اپنی کشتیاں لے جاتے۔ مضبوط میخوں میں موتی رسیوں کے دریعہ وہ کشتیوں کو باندھ دیتے۔ لکڑی کے پیالوں سے وہ کشتی سے پانی نکالتے تھے۔ کبھی کبھی رسیوں کے ذریعہ کھینچ کر بھی وہ کشتیاں لے جاتے۔ سمندر کی موجوں سے ٹکرا کر کبھی کشتیاں غرقاب بھی ہوجاتیں۔ بحری راستوں میں ڈاکوؤں کے خطرات بھی تھے۔ (بود ھو گان ۸-۱۳-۱۴-۳۲ و ۳۸)

دور وسطی کے بنگالی ادب میں "کندھار" (ملاح)، "کیروال"

(چپو)' " پتوال " (پتوار)' " کھا نتو " (ڈاکو) و غیرہ الفاظ بھی' جو اس زمانے میں مستعمل تھے ' پائے جاتے ھیں -

اس زمانے میں دکان داری بھی ھوتی تھی - دکان کو وہ " پسار" کہتے اور خریدار کو " گراھک " (گاھک) - عورتیں مے فروشی کا کام کرتیں - درخت کے باریک چھلکوں سے شراب میں اُبھار یا تموج پیدا کرتے - کپا لک سادھو شراب بہت زیادہ پیا کرتے - (نمبر ۳ و ۹)

لوگ ھمیشہ زندہ رھنے کی تمنا کرتے اور کیمیا کی تلاش میں رھتے (نمبر ۲۲) -

اونچے پہاڑوں پر شکاری مرد اور عورتیں بود و باش رکھتیں - مرد تیر و کمان کے ذریعہ سے شکار کھیلتے اور ان کی عورتیں مور کے پروں کا زیور پہنتیں - گلے میں گھونگچیوں کے مالے ڈالتیں اور کانوں میں کنڈل پہنتیں (۲۸) -

وہ کامروپ سے واقف تھے - ان کا اعتقاد تھا کہ جادو گرنیاں جادو کے زور سے رات کو وھاں جایا کرتی ھیں (۲) -

پدمانڈی کی شاخوں میں کشتیاں لے جا کر ڈاکو بنگال کے دیہاتوں کو لوٹتے - (۴۹)

مشرقی بنگال کی عورتوں سے مغربی بنگال کے مرد شادی کرنا معیوب سمجھتے - (۳۸)

تنتر منتر، دھیان اور ذکر، پیشین گوئیوں اور تسبیح کا رواج تھا۔ گرو اور چیلے کا بھی دستور جاری تھا۔ (۳۴ و ۴۰)

بودھ مت کے زمانے میں بنگال کی سماجی زندگی کے حالات کا ہمیں کچھ پتہ "بندیا گھٹی شربانند" کے امر کوش کی تشریحات سے بھی ملتا ہے۔ (یہ کتاب سنہ ۱۱۵۹ع میں لکھی گئی تھی)۔

سپیرے سانپ پکڑتے تھے۔ جوا کھلانے والوں کو "سبھی ار" کہتے اور جوئے کی بازی کو "آر"۔ تیلی چمڑے کے کپڑوں میں تیل رکھتے اور اسے "کوتروا" کہتے۔ عورتیں جُوڑا باندھتی تھیں۔ وہ دوسرے زیوروں کے علاوہ کنگن اور بازو بند بھی پہنتی تھیں۔ بہت سے مرد سر پر لمبے بال رکھتے اور ایک خاص قسم کی گنبد نما ٹوپی پہنتے جسے وہ "ٹوپر" کہتے تھے۔ چھاچھ اور سمندری نمک استعمال کرتے۔ مشرقی بنگال کے عوام ایک قسم کی سکھائی ہوئی مچھلی "شُکتی مچھلی" پسند سے کھاتے۔ بڑی بڑی کشتیوں کے مستول پر بیٹھ کر کپتان بحری راستے بتایا کرتے۔

ہم ایک اور کتاب سے بھی قدیم بنگال کی سماجی حالت کا کچھ پتہ لگا سکتے ہیں۔ یہ شرھوپاد کی تصنیف کردہ "دوھاکوش" نامی کتاب ہے۔ وہ شمالی بنگال کے باشندے تھے اور

گیارھویں صدی عیسوی میں زندہ تھے - انھوں نے متعدد بودھ گانے بھی منظوم کئے تھے -

ملک میں برھمن، شیو اچاریہ، بھکشو (بودھ مت کے درویش) اور جین مت کے سنیاسی موجود تھے - برھمن وید پڑھا کرتے اور پوجا کرانے میں مشغول رہتے - وہ کوئی دوسرا کام نہیں کرتے تھے - ان میں سے بعض ایک لاٹھی والے اور بعض تین ڈنڈے والے تھے - وہ مذھبی امور سے واقف نہ ہوتے ہوئے بھی لوگوں کو مذھب کے نام پر دھوکے دیا کرتے تھے -

شیو اچاریہ سنیاسی جسم پر بھبوت ملتے - سر پر بڑی بڑی جٹائیں رکھتے - بیٹھے بیٹھے چراغ جلایا کرتے - دونے میں بیٹھ کر گھنٹے بجایا کرتے - آنکھیں بند کرکے آسن جماتے اور خیرات کی طمع میں لوگوں کے کانوں میں منتر پڑھ پڑھ کر پھونکتے - وہ بیوہ اور بیراگی عورتوں کو مذھبی تعلیم بھی دیا کرتے -

جین مذھب کے سنیاسی بڑے بڑے ناخن رکھتے - برھنہ اور گندے رہتے، جسم کے بال اُکھاڑ ڈالتے، مور کے پر پہنتے اور خیرات کی ردی غذا کھا کر زندگی کے دن گزارتے -

بودھ مت والوں میں بعض چیلا تھے اور بعض گرو - بعض بھکشو تھے اور بعض استھبیر (بزرگ) - وہ منتروں کی تشریح کرتے مہاجان مت کے بودھ مت والے اخلاق، انصاف اور مذھبی

تعلیمات کا پرچار کرتے ۔

بچے " سدّھی استو " (کامیابی ہو) کہہ کر حروف شناسی شروع کرتے (صفحہ ۱۱۵) ۔

سمندر میں جہاز چلتے جسے وہ " بوھت " کہتے (سنسکرت میں اسے بوھتر کہتے ھیں ۔ دو رِ وسطی کے بنگالی ادب میں اُسے بوھت ھی کہتے تھے) ۔

دھرم منگل کی نظموں سے ھم معلوم کر سکتے ھیں کہ کنارا اور لیکھائی وغیرہ جیسی بہادر عورتیں بھی اس دور کے بنگالی سماج میں موجود تھیں ۔ اچھائی گھوش، لاؤسین اور کرن سین جیسے بہادر سپہ سالاروں کی بھی کمی اس عہد میں نہ تھی ۔ اُس زمانے کے بنگالی جنگ جو اور جنگ آشنا تھے ۔

حصۂ دوم

۱۲۰۱—۱۸۰۰ء

دور وسطی میں بنگلا ادب کا سیاسی پس منظر

دو ر وسطی میں بنگلا ادب کی شاخیں۔

دو ر وسطی کے بنگلا ادب میں مسلمانوں کا حصہ۔

دو بھاشی پوتھی کا سب سے پہلا شاعر—غریب اللہ شاہ بھارت چندر۔

ڈاکٹر محمد شہید اللہ ——— مترجم— مولانا عبد الرحمٰن بیخود

حصۂ دوم

سنہ ۱۲۰۱ ع سے سنہ ۱۸۰۰ ع تک

باب اول

دور وسطی میں بنگلا ادب کا سیاسی پس منظر

پٹھانوں کا زمانہ۔

سنہ ۱۲۰۱ ع میں ملک اختیار الدین محمد بختیار خلجی نے بلا تعرض ندیا پر حملہ کیا اور راجہ لکھن سین بے لڑے بھڑے مشرقی بنگال کی طرف مفرور ہو گیا۔ وہاں سین خاندان کے راجاؤں اور دوسرے ہندو حکمرانوں نے تقریباً ایک سو سال تک حکومت کی۔ چند سال کے اندر ہی اندر ملک اختیار الدین نے پایۂ تخت گوڑ یا لکھنابتی کے علاوہ شمالی اور مغربی بنگال کے اکثر مقامات پر قبضہ کر لیا۔ دلی سے اس قدر مسافت پر رہتے ہوئے بھی انھوں نے ہمیشہ دھلی کے شہنشاہ کی اطاعت کی۔ سنہ ۱۴۰۶ ع میں انھی کے ایک امیر علی مردان خلجی نے انھیں شہید کر دیا۔

سلطان غیاث الدین عوض خلجی (دور حکومت سنہ ۱۲۱۳ ع تا سنہ ۱۲۲۷ ع) نے مسلم بنگال کی راج دھانی دیو کوٹ سے تبدیل کر کے سنہ ۱۲۲۰ ع میں گور یا لکھناوتی پہنچائی - انھوں نے سلاطین دھلی کا اقتدار اعلیٰ قبول نہ کیا - دھلی کے طاقتور سلطان التتمش نے بنگال کو بغاوت کی فرو کرنے کیلئے اپنے فرزند سلطان ناصر الدین محمود کو روانہ کیا اور انھوں نے سلطان غیاث الدین عوض کو جنگ میں شکست دے کر قتل کیا - یہ واقعہ سنہ ۱۲۲۷ ع میں واقع ھوا -

اس زمانے سے مسلم بنگال سلاطین دھلی کے مقرر کردہ حکام کے ذریعہ انتظام پذیر رھا - چونکہ بنگال دھلی سے کافی فاصلے پر واقع تھا اس لئے اکثر سلاطین دھلی بنگال میں اپنا اقتدار باقی رکھنے میں قاصر رھے اور یہی سبب تھا کہ بنگال کے حکمران اک ذرا موقع پاتے ھی اپنی آزادی اور خود مختاری کا علم بلند کر دیا کرتے تھے - اس باربار کی بغاوت کا ثمرہ تھا کہ بد نام ھو کر گور "بلغاکپور" یعنی باغی پور کے نام سے مشہور تھا -

دھلی کے حکمراں سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد سلطنت میں طغرل خان نے علم بغاوت بلند کیا - اس بغاوت کو فرو کرنے میں سلطان کے تین سال صرف ھوئے - انھوں نے سنہ ۱۲۸۰ع میں 'سونارگاؤں' کے ھندو راجا دنوجے رائے کے ساتھ مصالحت

کی اور پھر سنہ ۱۲۸۲ع میں انھوں نے میدان جنگ میں طغرل خان کو شکست دے کر قتل کیا اور اپنے چھوٹے فرزند شاہ زادہ بغرا خان کو لکھنا بتی کا حکمراں کرکے خود دھلی کی راہ لی - سنہ ۱۲۸۷ع میں بغرا خان نے اپنے والد کی وفات پر اپنا لقب سلطان نصیر الدین رکھا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا -

سلطان نصیر الدین محمود کے بعد ان کے فرزند سلطان رکن الدین کیکاؤس نے سنہ ۱۲۹۱ع سے سنہ ۱۳۰۱ع یعنی دس سال تک خود مختار رہ کر سلطنت کی - یہ بلبن خاندان کے آخری حکمراں تھے - ان ھی کے عہد میں تربیغی کے رھنے والے ظفرخان غازی ایک ھندی راجا کے مقابلے میں مفتوح ھوکر شہید ھوئے تھے - انھیں دراف خان بھی کہتے ھیں - اس کے بعد سلطان شمس الدین فیروز شاہ دھلی نے سنہ ۱۳۰۱ع سے سنہ۱۳۲۲ع تک بنگال پر حکومت کی - ان کے دوران حکومت ھی میں موجودہ میمن سنگھ ضلع ان کے قبضہ اقتدار میں آیا - اس زمانے میں حضرت شاہ جلال (رح) کی ھدایت کے مطابق سپہ سالار نصیر الدین اور سکندر غازی نے سلہٹ کے راجا گوڑ گوبند کو جنگ میں شکست دی اور برھمپتر کے مشرقی جانب اسلامی حکومت کو وسعت دی -

اسی زمانے میں پورا بنگال مسلمانوں کے زیر نگیں آگیا - سلطان فیروز کی وفات پر ان کے لڑکوں میں تخت و تاج کیلئے

خونریزی ہوئی اور آخر بنگال تین ٹکڑوں میں بٹ گیا - سلطان نصیرالدین ابراہیم نے لکھنا بتی ہی میں قیام کیا اور شمالی بنگال پر حکمرانی کی ۔ مشرقی بنگال پر سلطان غیاث الدین بہادر شاہ نے اپنا سکہ چلایا اور سونار گاؤں کو راجدھانی کا شرف بخشا - مغربی بنگال کا پایۂ تخت شپت گرام تھا -

بنگال کے اس افراتفری کے زمانے میں موقع غنیمت سمجھ کر دھلی کے سلطان غیاث الدین تغلق نے بنگال پر حملہ کیا - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی اور مغربی بنگال سلطان دھلی کی برتری قبول کرکے بہرام خان کی ماتحتی میں آ گیا - بہرام کا مشہور نام تاتارخان بھی تھا - یہ سلطان غیاث الدین تغلق کا لے پالک تھا - بہرام خان کے زمانے ھی میں موجودہ تری پورہ اور قسمت چاٹگام کی حکومت تخت دھلی کی مطیع ہوئی - سلطان نصیرالدین کے بعد سلطان قدر خان لکھنا بتی کے حکمراں ہوئے - غیاث الدین بہادر شاہ بغاوت کے جرم میں ماخوذ اور مقتول ہوئے - اور اس طرح بہرام خان سونار گاؤں پر پوری طرح مسلط ہو گئے -

فخرالدین عرف فخرا بہرام خان کا سلاح دار تھا - بہرام خان کی وفات کے بعد اس نے اپنا نام غیاث الدین مبارک شاہ رکھ کر سنہ ۱۳۳۸ ع میں مشرقی بنگال پر حکمرانی شروع کی

اور خود مختاری کا علم بلند کیا ۔ اس نے لکھنا بتی سے راجدھانی تبدیل کر کے پانڈوا (مغربی بنگال) کو اپنا دار الحکومت قرار دیا ۔ اس وقت پانڈوا کا نام فیروز آباد تھا ۔

اس زمانے میں علی شاہ کے کوکا زادے حاجی الیاس بعض اسباب کی بنا پر دھلی سے بھاگ کر بنگال آگئے ۔ حاجی الیاس نے سنہ ۱۳۴۲ ع میں سازشوں کے ذریعہ علی شاہ کو قتل کرا یا اور خود شمالی بنگال پر سلطان شمس الدین الیاس شاہ کے نام سے حکومت شروع کر دی ۔

اب فخر الدین مبارک شاہ بے خوف ھوکر حکومت کرنے لگے ۔ ان کا کوئی دشمن باقی نہ رھا تھا ۔ انھوں نے سات سال تک شیٹ گرام اور سونار گاؤں میں اپنا سکہ چلایا ۔ انھی کے زمانے میں شمالی افریقہ کے مقام تنجہ کے رھنے والے مشہور سیاح عالم ابن بطوطہ سنہ ۱۳۴۹ ع میں بنگال آئے تھے اور پھر سلہٹ جاکر انھوں نے حضرت شاہ جلال کی قدمبوسی کی تھی ۔

شمالی بنگال میں شمس الدین الیاس شاہ نے صرف اپنی خود مختاری کے اعلان ھی پر اکتفانہ نہ کیا تھا بلکہ انھوں نے ایک بڑی فوج مرتب کی اور اُڑیسہ پر حملہ کیا ۔ وھاں کا راجا مغلوب ھوکر مجبوراً ان کا باج گذار بنا ۔ پھر وھی فوج همراہ لے کر انھوں نے صوبہ بہار میں ترھُت کا علاقہ

فتح کیا۔ یہانتک کہ مغرب کی طرف بڑھتے بڑھتے انھوں نے مشہور ھندو تیرتھ گاہ کاشی (بنارس) تک اقدام کیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد سنہ ۱۳۳۹ ع سے سنہ ۱۳۵۲ ع کے دوران میں فخرالدین مبارک شاہ کے وارث سلطان اختیارالدین غازی شاہ کی وفات پر شمس الدین نے سونار گاؤں پر بھی قبضہ کرلیا اور مشرقی و جنوبی بنگال میں اپنی حکومت کا دائرہ وسیع کیا۔ اس کے بعد انھوں نے کامروپ کا علاقہ فتح کیا۔ اس طرح مشرق میں سلہٹ سے لےکر مغرب میں بنارس تک اور مکمل شمالی اور مشرقی بنگال کو ملاکر سنہ ۱۳۵۴ ع میں سلطان شمس الدین الیاس شاہ نے بنگال میں ایک آزاد الیاس شاھی حکمران خاندان کی بنیاد رکھی۔

اس وقت تک بنگال جنگ اور غارتگری کی وجہ سے پرامن و پرسکون نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس دورمیں یہاں ادب کا چرچا صرف برائے نام ھوتا رہا۔ حقیقت امر یہ ھے کہ بنگال میں مسلمانوں کی حکومت کی ابتدا سے اس دور تک کی کوئی ادبی بنگلا تصنیف ھم تک نہیں پہنچی ھے۔ ھم سنہ ۱۲۰۱ ع سے سنہ ۱۳۵۳ ع تک کے زمانے کو بنگلا ادب کیلئے دور وسطی کا ایک خاموش زمانہ کہہ سکتے ھیں لیکن اعلان آزادی کے ساتھ ھی ساتھ الیاس شاھی حکمرانوں نے یہ سمجھ لیا تھا

کہ بوقت ضرورت سلطنت دھلی سے جنگ اور اپنی مدافعت نیز انتظام سلطنت کی بہبودی و استواری کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ لازمی اور لابدی ہے کہ اس ملک کی لاتعداد ہندو رعایا سے واقفیت پیدا کی جائے اور ساتھ ھی ان کی ھمدردی حاصل کی جائے * یہی سبب تھا کہ وہ ملکی ادب کی حوصلہ افزائی کیلئے بھی آگے بڑھے - بنگال کے مشہور شاعر چنڈی داس اسی زمانے میں ظاھر ھوئے - ھندؤں کی دیکھا دیکھی مسلمان ادیبوں نے بھی بنگلا زبان میں اپنی ھمت کا قدم آگے بڑھایا - ان کے پیش نظر یہ تھا کہ ھندؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق ترقی پا سکے - یہی سبب ہے کہ تصورات اور نظریات کے اختلاف کے باوجود زبان میں وہ ھندؤں ھی کے منبع تھے - حقیقۃً بنگلا ادب کا اسی وقت سے بنگال کے دور وسطی میں آغاز کہا جا سکتا ہے -

---

* مورخ ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاھی میں لکھا ہے کہ الیاس شاہ کے ساتھ ھندو راؤ' رانا اور زمینداروں کو بڑی موانست اور محبت تھی - یقیناً انھی کی امداد و اعانت کی وجہ سے وہ اور ان کے فرزند سکندر شاہ دھلی کے شاھنشاہ کی فوج کو شکست دینے میں کامیاب ھوئے تھے -

محمد تغلق کی وفات کے بعد سلطان فیروز تغلق دھلی کے تخت و تاج کا مالک ھوا - وہ الیاس شاہ کی خود مختاری ختم کرنے کیلئے ایک جرار فوج لے کر عازم بنگالہ ھوا - سنہ ۱۳۵۳ع میں اپنی تمام تر طاقت مجتمع کرکے وہ اکدالا کے قلعہ کا محاصرہ لئے پڑا رھا - لیکن جب برسات شروع ھوگئی تو مجبورا اس نے محاصرہ اٹھا لیا اور دھلی واپس چلا گیا - سنہ ۱۳۵۷ع میں الیاس شاہ کی وفات پر ان کے فرزند سکندر شاہ وارث تخت و تاج ھوئے -

سنہ ۱۳۵۹ع میں فیروز تغلق نے پھر بنگال پر حملہ کیا - سکندر نے اکدالا کے قلعہ میں پناہ لی - فیروز تغلق اُسے جنگ میں شکست نہ دے سکے اور آخر مجبور ھوکر اُن سے مصالحت کرلی اور اس طرح انھوں نے بنگال کی خود مختاری تسلیم کرلی - اس کے بعد کچھ اوپر دو سو برس تک دھلی کے کسی شاھنشاہ کو یہ حوصلہ نہ ھوا کہ وہ بنگال کی خود مختاری کو ختم کرنے کا خواب دیکھتا - سکندر کے دور حکومت (سنہ ۱۳۵۷ع سے سنہ ۱۳۹۳ع) ھی میں پانڈوا کی مشہور آدینہ مسجد تعمیر ھوئی تھی -

سکندر کے فرزند سلطان غیاث الدین اعظم شاہ (وفات سنہ ۱۴۲۰ع) بڑے ھی انصاف پسند پرشکوہ اور علم پرور حکمراں تھے - انھوں نے ایران کے مشہور شاعر حافظ شیرازی کو اپنے دارا لحکومت سونار گاؤں

میں مدعو کیا تھا ۔ شاعر نے خود تو حاضری سے معذرت چاہی لیکن بطور نذر عقیدت ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں وہ فرماتے ھیں ۔

شکر شکن شوند همه طوطیان هند
زین قند پارسی که به بنگاله می رود
حافظ ز شوق مجلس سلطان غیاث‌دین
غافل مشو که کار تو از ناله می رود

میتھلی زبان کے شاعر بدیا پتی اسی سلطان کی تعریف میں کہتے ھیں : —

" معلوم ھے صاحب زمانہ کو جو غیاث الدین سلطان ھیں کہ وہ ھمیشہ زندہ رھیں گے "۔ بنگلا زبان کے مسلمان شاعر شاہ محمد صغیر اپنی کتاب یوسف زلیخا میں غالبا انھی کی طرف اشارہ کرتے ھیں ۔

" تیسری بار میں راج کے مالک کو سلام کرتا ھوں "۔
(جس کے انصاف پسندانہ فیصلے سے) شیر اور بکری ایک گھاٹ بے خوف ھوکر پانی پیتے ھیں ۔
یہ تمام بادشاھوں میں ایسا دین دار اور عالم ھے کہ
دنیا کے سب لوگ اسے دیوتاؤں کا اوتار سمجھتے ھیں
انسانوں میں جیسے دھرم اوتار۔

بڑا بادشاہ غیاث دنیا میں سب سے اعلیٰ ہے
دنیا کے سب بادشاہ جابجا اپنی فتح چاہتے ہیں
لیکن اپنے فرزندوں اور شاگردوں سے شکست ہی چاہتے ہیں
انھوں نے حکماء کے اس قول کی تصدیق کیلئے
بنگال اور گوڑ میں بیٹھ کے اپنا راج پاٹ قایم کر لیا ہے"

سنہ ۱۴۱۴ ع تک الیاس شاہی خاندان کے حکمرانوں نے بلا شرکت غیرے بنگال پر حکمرانی کی - اسی خاندان کے ایک حکمران کو ایک ہندو زمین دار نے مکرو فریب سے شہید کر کے خود بنگال کی حکومت پر قبضہ کیا تھا - اس زمیندار کا نام راجا گنیش تھا - اس کا عہد حکومت چونکہ بہت مختصر اور فتنہ و فساد سے لبریز رہا اس وجہ سے اُسے ادب کی سرپرستی کا موقع نہ مل سکا -

راجا گنیش کے مرنے پر اُس کے فرزند جادو راجا نے بنگال کے تخت تاج کو زینت بخشی - وہ مسلمان ہوگیا اور اس کا اسلامی نام جلال الدین محمد شاہ ہوا - اس کا عہد حکومت سنہ ۱۴۱۸ ع سے سنہ ۱۴۳۱ ع تک تھا - وہ منصف حکمراں اور علم پرور تھا اُس نے راج دھانی پانڈوا سے منتقل کر کے پھر گوڑ کو زینت بخشی - وہ سنسکرت زبان کے ایک پنڈت برہسپتی کا مربی اور سرپرست تھا اور اُسے " رائے مکٹ " یعنی

زینت تاج اور ملک الشعرا کا خطاب عنایت کیا تھا - اس کے دربار کو اکثر ھندوؤں سے زینت حاصل تھی *

اغلب ھے کہ کیرتی باش نے انھی کی حوصلہ افزائی سے راماٸن کا بنگلا میں ترجمہ کیا اور غالب انھی کی تعریف میں کیرتی باش نے کہا ھے—

" یہ پنچ گوڑ پر قبضہ کر کے گوڑ کے شاھنشاہ ھوئے ھیں ان کے محامد اوصاف کا تذکرہ عین اوصاف کی مدح خوانی ھے "

ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند احمد شاہ نے عنان سلطنت سنبھالی - لیکن اس کے مظالم سے رعایا چیخ اٹھی - آخر اُسی کے ایک زرخرید غلام نے اس کی زندگی کا خاتمہ کیا - اسی پر گنیش خاندان کی حکومت کا خاتمہ ھوگیا اور پھر دوبارہ الیاس شاہ کے خاندان ھی کے ایک فرد محمود شاہ نے اپنی خاندانی میراث پر قبضہ کیا - یہ واقعہ سنہ ۱۴۴۲ع میں واقع ھوا -

اسی خاندان میں شمس الدین یوسف شاہ (دور حکومت سنہ ۱۴۷۴ع تا سنہ ۱۴۸۲ع) ایک بڑے علم پرور حکمراں گذرے

---

* ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر محمد حسن دانی فرماتے ھیں :—

All these evidences convincingly prove that in the court of Jalaluddin Hindu influences were not less tnan those of the Muslims. (S, R. A. S. B XVIII page 163)

ھیں - انھوں نے سری کرشن بجے کے مصنف شاعر مالادھر بوس کو " گن راج خان کا لقب دیا تھا - اغلب ھے کہ انھی کے زمانے میں ا شاعر زین الدین نے " رسول بجے " نامی کتاب منظوم کی او ر غالبا زین الدین نے انھی کی تعریف میں کہا ھے :—

" عزت مآب یوسف خان بادشاہ صاحب اوصاف حمیدہ ھیں -
وہ خوش خلق، دانشمند اور خوش قامت ھیں
رسول بجے نظم سن کر وہ بہت مسرور ھوتے ھیں
اس نظم نے سب کے دل میں مسرت پیدا کردی ھے "

الیاس شاھی سلاطین افریقہ سے زرخرید حبشی غلام منگوا تے تھے - ان غلاموں نے شاھی عنایات سے بڑی بڑی جھگیں حاصل کی تھیں - لیکن بعد میں انھی غلاموں نے ایسے فتنوں کی بنیا دیں رکھیں کہ ان کے مظالم سے راجا اور پرجا سب کا سکون غارت ھو گیا - نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ الیاس شاھی خاندان کے آخری حکم راں کا سنہ ۱۴۸۷ع میں انھی کے ھاتھوں خاتمہ ھوا - انھی حبشیوں میں سے ایک شخص نے مظفر شاہ کے نام سے بنگال کی حکومت پر بھی قبضہ کر لیا تھا - اس کے مظالم کی وجہ سے عام رعایا اس کے خلاف صف آرا ھو گئی - اس کے ایک وزیر کا نام سید حسین تھا - اس نے بھی باغی رعایا کا ساتھ دیا - ظالم راجا اور غضبناک پرجامیں سخت مقابلہ ھوا اور آخر مظفر شاہ مغلوب اور مقتول ھوا -

سنہ ١٤٩٣ع میں مظفر شاہ کے خاتمے پر بہ اتفاق رائے سب لوگوں نے سلطان علاء الدین حسین کو بنگال کے تخت پر بٹھایا - مشہور ہے کہ بچپن میں ان کی پرورش ایک ہندو سردار بودھی رائے نے کی تھی اور اغلب ہے کہ وہ خود بھی بنگلا زبان سے واقف تھے - " چیتنّہ چریتا مریت " میں ہے :-

" ابتداءً ا حب شو بودھی رائے صاحب اقتدار تھا اس وقت حسین رائے سید اس کی ملازمت میں تھے - (حصہ وسطی صفحہ ٢٥ - ١٠٥)

حسین شاہ جیسا قابل اور لائق سلطان بنگال کو بہت کم نصیب ہوا - انھوں نے کامروپ ، کامتا ، جاج نگر (اُڑیسہ) اور بہار کے بہت سے حصے فتح کر کے بنگال کی خود مختار سلطنت کی حدود کو بہت وسیع کر دیا تھا - وہ بڑے ہی منصف مزاج تھے - ان کی ماتحتی میں بڑے بڑے ہندو حکام بھی تھے - ان کے وزرا میں روپ اور سناتن کے نام بہت مشہور ہیں -

حسین شاہ کے دور حکومت ہی میں بنگال میں سری چیتنہ دیو وشنو دھرم کے بانی اور مشہور مصلح پیدا ہوئے تھے - اراکین حکومت میں سے روپ اور سناتن ان کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے - حسین شاہ کے زمانے میں بنگالی ادب نے بڑی ترقیاں حاصل کیں - منسا منگل کے دو شاعر بجے گپت اور بپسر داس ان کے عہد میں

موجود تھے - انھوں نے بھی حسین شاہ کے محامد اوصاف کے گن گائے ھیں -

حسین شاہ کے سپہ سالار پراگل خان نے ابیندر پرمیشور شری کرنندی شاعر کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مہا بھارت کا بنگلا زبان میں ترجمہ کریں - کبیندر پرمیشور ان کی توصیف میں اس طرح رقم طراز ھیں :—

" شہنشاہ حسین شاہ بے حد دانشمند ھیں
پنجم گوڑ میں ان کی غیر معمولی شہرت ھے
وہ اسلحۂ جنگ کے بڑے ماھر اور بڑی شان والے ھیں
وہ ایسے ھیں جیسے کل جگ میں کرشن اوتار تھے "-

پراگل خاں کے فرزند چھتی خاں بھی بنگلا ادب کے بڑے سرپرست تھے - وشنو کے متعلق بہت ساری نظموں میں بھی حسین شاہ کا تذکرہ ملتا ھے - شاعر جشراج خاں اُن کی تعریف میں فرماتے ھیں :—

شری جگت حسین
دنیا کیلئے بمنزلہ زیور کے ھیں
وہ اسی رس کو پہنچانتے ھیں
وہ پانچ گوڑ کے شہنشاہ ھیں
اور عیش پسندی میں اندر کی طرح ھیں
یہ بات جشراج خاں کہتے ھیں

قطبن اور جسودھر نامی دو ہندی شاعروں نے بھی ان کے محامد اوصاف بیان کئے ہیں ۔ سنہ ۱۵۱۹ ع میں سلطان حسین شاہ نے وفات پائی ۔ ان کے بعد ان کے فرزند سلطان نصرت شاہ بنگال کے فرماں روا ہوئے ۔ انھوں نے بھی بنگلا ادب کی سر پرستی کی ۔ کوبی شیکھر نے اپنے کلام میں ان کا ذکر کیا ہے :—

"کوبی شیکھر کہتا ہے کہ ایک عدیم المثال حسن دیکھ کر راجا نصرت کی اطاعت کنول جیسے چہرے والیوں نے بھی کی"

انھوں نے گوڑ کی مشہور سونا مسجد اور قدم رسول مسجد تعمیر کرائی ۔ اپنی عزت اور سلطنت کو صدمہ پہنچائے بغیر انھوں نے بابر، شاہنشاہ ہند سے مصالحت کر لی ۔ سنہ ۱۵۳۲ ع میں قصر سلطانی کے خواجہ سراؤں نے انھیں شہید کیا ۔ ان کے بعد ان کے فرزند فیروز شاہ نے صرف تین ماہ تک حکومت کی ۔ دیج شری دھر شاعر نے "بدیا سندر" نظم میں انکی اس طرح تعریف و توصیف کی ہے :—

"نصیر شاہ، بادشاہ کے خوش جمال فرزند
ہر طرح کے فنون میں اس طرح ماہر ہیں جیسے کنول میں شہد کی مکھی ۔

شاہ شری پیروز شاہ مشہور و معروف ہیں
دیج شری دھر شاعر راجا شناس ہے"

انھیں قتل کر کے نصرت شاہ کے بھائی غیاث الدین نے گوڑ کے تخت پر جلوہ فرمائی کی - اس خاندان کے یہ آخری حکمران تھے - انھی کو مغلوب کر کے شیر شاہ نے سنہ ۱۵۳۸ ع میں بنگال پر اپنا علم حکومت بلند کیا تھا - پھر شیر شاہ نے همایون شاہ دھلی کو شکست دے کر سلطنت هند حاصل کر لی -

شیر شاہ کی وفات پر انھی کے ایک عزیز محمد خان سور بنگال کے حکمران مقرر ہوئے - لیکن تھوڑے ھی زمانے میں انھوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا - سور خاندان کے حکمران سنہ ۱۵٦۴ ع تک بنگال پر قابض رہے - اس خاندان کا آخری بادشاہ اپنے دشمنوں کے ھاتھ سے مقتول ھوا اور پھر جنوبی بہار کے حاکم سلیمان کرانی نے بنگال پر قبضہ کر لیا - ان کے سپہ سالار کالا پہاڑ نے اڑیسہ اور آسام کے راجاؤں کو مغلوب کر کے فتح حاصل کی - سلیمان نے گوڑ کو چھوڑ کر تنڈا میں اپنی راج دھانی قائم کی - سنہ ۱۵۷۲ ع میں سلیمان کی وفات کے بعد ان کے فرزند بایزید بنگال کے حکمران ھوئے - ان کے قتل ھونے پر ان کے برادر صغیر داؤد خاں تخت نشین ھوئے - سنہ ۱۵۷٦ ع میں وہ شاھنشاہ اکبر کے سپہ سالار کے مقابلے میں مغلوب ھوئے - اس واقعہ کے بعد بنگال سلطنت مغلیہ کا ایک حصہ بن گیا -

اس طرح دو سو اڑتیس سال تک آزاد و خود مختار رهنے کے بعد سلطنت بنگاله پھر حکومت دهلی کے زیر نگیں آ گئی -

بنگلا زبان نے حکمرانان گوڑ کی سر پرستی کھونے کے بعد بنگال کی سرحدوں پر راجگان اراکان کی حمایت اور سر پرستی حاصل کر لی - سلاطین گوڑ کے ساتھ ان کے قدیمی مراسم اور تعلقات تھے - وہ خود گوڑ دربار سے متاثر بھی تھے . اسی لئے هم دیکھتے هیں که راجگان اراکان اور وزرا کی سر پرستی میں دولت وزیر' الاول اور ماگن وغیرہ پھل پھول کر همارے لئے اساسهٔ ادب چھوڑ گئے هیں - گوڑ کی شان شوکت بنگال کے شمالی اور مشرقی حدود میں دور مغلیه کے اندر بھی باقی رهی - سلاطین گوڑ کے زمانے میں هندو اور مسلمان مصنفین کے طرز و انداز کلام میں کوئی فرق نمایاں نه تھا - اصل کلام کی صحیح حیثیت یہاں پیش کرنا ممکن نہیں کیونکه اس کا لطف اصل زبان هی میں حاصل هو سکتا ہے - شاہ محمد صغیر اور زین الدین وغیرہ کے کلام سے اس پر پوری طرح روشنی پڑتی ہے -

دو ر مغلیہ :—

داؤد خان کی شکست کے بعد بھی سارے صوبہ بنگالہ نے مغلوں کا اقتدار او ر قبضہ قبول نہیں کیا - عیسیٰ خان قُتلو' لوھانی ' عثمان خان و غیرہ پٹھان سرداروں نے مغلوں کی پیش قدمی کی روک تھام کیلئے اپنے تن‌من کی بازی لگا دی - تقریباً دس سال تک جنگ کر نے کے بعد شاھنشاہ اکبر کے سپہ سالار خان جہاں راجا مان سنگھ او ر شہباز خان و غیرہ نے پورے بنگالے پر مغلیہ سلطنت کا پھریرا بلند کیا تھا - اس کے بعد بارہ بھیاں کو مغلوب کر نے میں کچھ او ر زمانہ صرف ھوا - پہلے پہل بنگال کی راج دھانی ٹنڈا نامی مقام پر تھی - راجا مان سنگھ نے پایۂ تخت وھاں سے تبدیل کر کے راج محل کو دارالحکومت قرار دیا - اکبر کی مذھبی پالیسی میں وسعت او ر بلند نظری کی وجہ سے اس نے ھندؤں سے بہت کچھ خراج تحسین وصول کیا - بنگال کے شاعر مادھب اچاریہ نے اس کی تعریف میں لکھا ھے :—

" پنچ گوڑ تمام روئے زمین کا خلاصہ ھے
او ر اکبر نامی راجا ارجن او تار کی طرح ھے
شان و شوکت میں وہ آفتاب اور عقل میں عطار د ھے
کل جگ کے رام‌کی طرح آج زمین خود پرجا کی پرورش کر رھی ھے"

اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر نے تخت مغلیہ کو رونق بخشی - مگوں او ر پرتگیزی ڈاکوؤں کے مظالم کی روک تھام کیلئے جہانگیر نے

اسلام خاں کو بنگالے کا صوبہ دار بنا کر بھیجا - اسلام خاں نے مگوں اور پرتگالیوں کے استیصال کیلئے اپنی راج دھانی راج محل سے تبدیل کی اور ڈھاکا کو دارالحکومت قرار دیا - یہ واقعہ سنہ ۱۶۰۸ء میں ہوا - ان بحری لٹیروں کا قلع قمع کر کے اسلام خاں نے یہاں کے مشہور بارہ زمینداروں کو مسخر کیا - یہ بارہ خاندان کے زمیندار تھے اور آج تک تاریخ میں بارہ بُھیاں کے نام سے شہرت رکھتے ہیں - بنگال میں مغلوں کا اقتدار انھوں نے تسلیم نہیں کیا تھا - اگر بنگال کا پایۂ تخت ڈھاکے کو منتقل نہ ہوا ہوتا تو ان باثر زمینداروں کی وجہ سے ادھر کے علاقے پر قبضہ رکھنا مغلوں کیلئے ممکن نہ ہوتا -

جہانگیر کے بعد دھلی کے تخت پر شاہ جہاں کو عروج حاصل ہوا - پھر اورنگ زیب نے اورنگ حکومت کو زینت بخشی - سنہ ۱۶۶۳ء میں شائستہ خاں بنگال کے صوبے دار ہوئے - انھوں نے مگوں اور پرتگالی بحری لٹیروں کے ہاتھ سے اپنے ملک کی حفاظت کے پیش نظر اراکان کے حکم رانوں سے چاٹگام اور سندیپ کے علاقوں کو فتح کر لیا - یہ فتح سنہ ۱۶۶۶ء میں حاصل ہوئی -

اورنگ زیب کے آخر دور میں ان کے پوتے عظیم الشان کو بنگال کی صوبے داری ملی - اس وقت مرشدقلی خاں بنگال کی دیوانی پر فائز تھے - وہ بھی ڈھاکے ہی سے

15—

معاملات انتظامی کی انجام دهی کرتے تھے - پھر مرشدقلی خاں نے حکومت کا دفتر دیوانی ڈھاکے سے منتقل کرکے سنہ ۱۷۰۵ع میں گنگا کے کنارے مقصود آباد میں لا بٹھایا - کچھ دنوں کے بعد عظیم الشان کو بھی شاھی حکم کی بنا پر ڈھاکے سے ھٹنا پڑا - عظیم الشان کے بعد مرشد قلی خاں بنگال کے صوبہ دار ہوئے اور انھوں نے اپنے نام پر مقصود آباد کو مرشد آباد سے سے بدل کر اُسے بنگال کا دارالحکومت قرار دیا - وہ خود وھیں سے سارے بنگال پر احکام جاری کرتے رہے - اس کے بعد جبتک بنگال کی حکومت مسلمانوں کے ھاتھوں میں رھی مرشد آباد ھی ان کا دارالحکومت رھا - شائستہ خاں اور مرشد قلی خاں کے دور میں بنگال کی رعایا دولت آسائش سے مالا مال اور مرفہ الحال رھی - اس وجہ سے اورنگ زیب کی نیک نامی میں بھی یہاں بہت اضافہ ہوا - بنگال کے شاعر کرشن رام نے لکھا ھے :—

" اورنگ بادشاہ زمین کا پرورش کنندہ اور دشمنوں پر عزرائیل فرشتہ جیسا ھے
ہر شخص یہی کہتا ھے کہ یہ رام راجیہ کا زمانہ ھے "۔

دولت وزیر بہرام خاں کی کتاب لیلی مجنوں میں اورنگ زیب کے محامد اوصاف اس طرح مذکور ھیں :—

"اورنگ شاہ دھلی کا مالک بڑا ھی ذکی ھے -
وہ گھوڑوں، ھاتھیوں اور سارے انسانوں کا مالک ھے -
هزاروں چتر و تاج رکھنے والے اس کے ماتحت ھیں -
دنیا میں وہ سب کا ستودہ حکمراں اور بڑا طاقت ور ھے -
اس کی افواج ھر قسم کی سوار اور پیادہ همیشه ہنگامے کرتی رهتی ھیں
اس کی سپاہ کی کچھ انتہا نہیں اور وہ سب جنگجو ھیں
هم کس قدر ان کی بڑائی بیان کریں -
وہ ایسے مہربان اور پرھیزگار ھیں کہ ان کا کوئی مثل ھی نہیں ھے"

مرشد قلی خاں کے بعد نواب شجاع الدین کو شاھنشاہ دھلی نے بنگالے کی صوبہ داری پر مامور کیا - شجاع الدین کی وفات پر ان کے فرزند سرفراز خان نے اپنے باپ کی جگہ سنبھالی - لیکن تھوڑے ھی دنوں کے بعد نواب علی وردی نے بغاوت کردی اور جنگ میں سرفراز خاں کو شکست دے کر خود ھی بنگال کی مسند حکومت پر قبضہ کرلیا - پھر بہت کچھ تحائف پیش کرکے شاھنشاہ دھلی محمد شاہ کی طرف سے بنگالے کی صوبہ داری کی سند اور مہابت جنگ کا خطاب بھی حاصل کرلیا - شاعر بھارت چندر نے " انودا منگل " میں اسے اس طرح بیان کیا ھے :-

" شجاع خاں نواب کے فرزند سرفراز خاں
اور دیوان عالم چندر رائے رہسان تھے

علی وردی خان پٹنے کے نواب تھے
الھوں نے آکر جنگ کی اور سب کو باندھ لیا

اس کے بعد علی وردی نواب ہوئے
بادشاہ نے انھیں مہابت جنگ کا خطاب دیا''

لیکن اس کے بعد علی وردی خان نے بادشاہ کو خراج کا ایک پیسہ بھی نہ دیا اور خود مختاری کے ساتھ بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اپنا سکہ چلاتے رہے ۔ سنہ ۱۷۵۶ع میں اسی سال کی عمر میں علی وردی خاں نے وفات پائی اور ان کے نواسے نواب مرزا سراج الدولہ کے نام سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی مسند نوابی پر قدم رکھا ۔ سنہ ۱۷۵۷ع کے ماہ جون میں انگریز سپہ سالار کلائیو کے ساتھ مصالحت کے انقطاع کی وجہ سے سراج الدولہ کی جنگ ہوئی اور ۲۳ ۔ جون کو پلاسی کے میدان میں برائے نام جنگ کے بعد سراج الدولہ نے اپنوں ہی کے ہاتھوں شکست کھا کر راہ فرار اختیار کی ۔ کلائیو نے میر جعفر کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کا ناظم مقرر کر دیا ۔ سراج الدولہ گرفتار ہوئے اور میر جعفر کے ناخلف فرزند میرن کے اشارے سے محمدی بیگ نے بے رحمی کے ساتھ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا ۔ اس طرح بنگال کے آخری آزاد حکمراں نواب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ۔

کلائیو نے مکرو حیلے سے صوبہ بنگال کے نواب سراج الدولہ کو پلاسی کے معرکے میں شکست دے کر واقعی طور پر نوابی کی طاقت خودھی حاصل کر لی تھی - سنہ ۱۷۶۵ع کے آخر میں کلائیو نے سالانہ چھبیس لاکھ روپیہ خراج کی ادائیگی منظور کر کے شاہ عالم بادشاہ دھلی سے بنگال بہار اور اڑیسہ کے اختیارات دیوانی یعنی اقتدار وصولی محاصل، حاصل کر لئے - ادھر نواب کو انھوں نے ترپن لاکھ روپئے دیکر ان کے سارے اختیارات سلب کر لئے - فوج کی مدد سے حفاظت ملک کی ذمہ داری کمپنی نے پہلے ھی سنبھال لی تھی -

اسی وقت سے واقعی اور آئینی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس ملک کے مالکانہ حقوق حاصل کر لئے - سنہ ۱۷۷۳ع کے آخر میں کمپنی کے انگریز مالکان نے جو انگلستان میں تھے ادائیگی خراج کا بار خود اپنے اوپر لے لیا اور اسی وجہ سے انھوں نے وارن ھیسٹنگز کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا - اس وقت سے ملک پر پوری طرح انگریزی قوانین کا نفاذ ہونے لگا - تاھم نظام حکومت انھوں نے حسب سابق رکھا - فارسی ھی سرکاری زبان رھی اور اس کی وجہ سے بنگالی ادب انگریزی اثرات سے محفوظ رھا -

بنگال کی راج دھانی چونکہ مرشد آباد میں تھی اس لئے بنگلا ادب پر خارجی اور داخلی اثرات پڑے - اسی وقت میں "دو بھاشی بنگلا" جس کے متعلق بھارت چندر نے کہا ھے کہ

"بھاشا جابونی * مشالو" یعنی مسلمانی بھاشا سے زبان مخلوط جاری ہوئی۔ اس زبان میں اکثر مسلمانوں نے شاعری شروع کردی۔ ان کی تصنیفات کو پوتھی ادب کہا جاتا ہے۔ ہندو مصنفین بھی اس دوبھاشی بنگلا کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ہمیں جہاں تک معلوم ہے شاہ غریب اللہ ہی اس دوبھاشی پوتھی ادب کے امام اور اس کے سب سے قدیم موجد ہیں۔ ان کے متعلق اٹھارھویں صدی کے آخر میں شاعر سید حمزہ نے فرمایا ہے :-

بنگلا

" اللہر مقبول شاھا غریب اللہ نام
بالیا حافظ پور جاھار مقام
اچھلو روشن دل شاعری زبان
جاھا کے مدد غازی شاھا بڑے خان "

ترجمہ

اللہ کے مقبول بندے شاہ غریب اللہ نام
بالیا حافظ پور جس کا مقام تھا
وہ روشن دل اور شاعری کی زبان رکھنے والے تھے
جنکی مدد غازی شاہ بڑے خان نے کی۔

---

* یہ بات قابل ذکر ہے کہ متعصب ہندو مسلمانوں کو "جابونی" یعنی ناپاک یا ملیچھ کہا کرتے تھے۔ بھارت چندر اور رنگ لال وغیرہ کے بیان میں اس کا تفصیلی ذکر ہوگا۔

اٹھارھویں صدی کے ھندو شاعروں کے لفظوں میں بھی کافی عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش پائی جاتی ھے - یہاں ھم گھنرام کی " دھرم منگل " اور بھارت چندر کی " انودا منگل " کا نام بطور نمونہ پیش کر سکتے ھیں -

سنہ ۱۷۷۲ع کے آخر میں مہاراج نند کمار کے لکھے ھوئے خطوط میں بھی اس قسم کی زبان کا نمونہ ملتا ھے - سنہ ۱۷۷۸ع کی تصنیف کردہ بنگلا قواعد کے مقدمہ میں جناب ھال ھیڈ صاحب لکھتے ھیں :—

" At present those persons are thought to speak this Compound idiom with the most elegance who mix writh pure Indian words, the greatest number of Arabic & Persian nouns. "

(دینیش چندر رسین کے بنگو بھاشا شاھتو سے ماخوذ) -

سنہ ۱۸۰۰ع میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے افتتاح کے بعد سے بنگلا زبان کا رخ فارسی کی طرف سے بدل کر سنسکرت کی طرف چلا گیا - اس وقت تک صرف نظمیں ھی بنگلا ادب کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ھوئے تھیں - لیکن اس کے بعد سے نثر نے ادب کا سب سے اھم کردار ادا کیا اور اس طرح دور وسطی نے نو تزک و عہد جدید کو جنم دیا -

باب دوم

دور وسطی میں بنگلا ادب کی شاخیں

دنیا کے اور ملکوں کی طرح دور وسطی میں اس ملک کا ادب بھی مذھبی مرکزیت رکھتا تھا - ھندؤں اور بودھمت والوں کے درمیان دور قدیم ھی سے مذھبی جھگڑا جاری تھا - ھندؤں میں بھی فرقہ وارانہ جنگ و جدال کا سلسلہ باقی تھا - اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ھی ساتھ پیروں، فقیروں اور مشائخ کے ذریعہ اشاعت اسلام ھونے لگی - اس کا نتیجہ یہ ھوا کہ ھندو سماج میں بھی مذھبی احساس تیز ھوگیا - بودھ مذھب کے پیرو حکومت کی پشت پناھی نہ ھونے کی وجہ سے کچھ تو ھندؤں میں مدغم ھوگئے اور اکثر نے اسلام قبول کر لیا - اس طرح بنگال میں بودھ دھرم ایک چراغ بے روغن کی طرح مدھم ھوتے ھوتے آخر بجھ گیا - لیکن ھندؤں کے مختلف فرقوں نے اپنے اپنے دیوتاؤں کی عظمت کو برقرار رکھنے کیلئے ان کی مافوق العادت باتیں مبالغہ آمیزی کے ساتھ نظموں میں منضبط کر کے ھندو سماج کو بیدار رکھا - حقیقت میں اسلامی حکومت سے پہلے ھندو کسی ایک مشترکہ قومیت یا مذھب کے نام سے موجود نہ تھے - برھمن اور

شودر وغیرہ قدیم رنگی نسل یا سونار، لوہار، پارچہ باف وغیرہ صنعتی ذاتیں تھیں- لیکن هندو کسی قوم یا ذات کا نام نہ تھا - یہ نام بھی مسلمان بادشاهوں هی کی بدولت انہیں حاصل هوا- جس طرح هندو کوئی ذات نہ تھی اسی طرح هندو کوئی دھرم بھی نہ تھا- اگر کوئی دھرم تھا تو وہ شئیبہ (شیو کا پجاری)، شاکھتہ (شکتّی دیوی کا پجاری)، بشنب (وشنو کا پجاری)، سوریہ (سورج کا پجاری) یا گانپتیہ (گنیش کا پجاری) وغیرہ فرقہ وارانہ دھرم تھا- ان میں شئیبہ، شاکھتہ اور بشنب زیادہ قوی اور اهم فرقے تھے- انھیں پورانوں کا مذهبی فرقہ کہا جاتا تھا- ان کے علاوہ مقامی دیوتاؤں کے عقیدت مند بھی بہت سے لوگ تھے- مقامی دیوتاؤں میں چنڈی، بشہری یامنشا بہت طاقت ور دیوتا سمجھے جاتے تھے- "چینّنہ بھاگوت" مصنفہ سنہ ۱۵۷۳ ع میں همیں ملتا ہے-

ترجمہ — "مذهبی کاموں میں لوگ صرف اس قدر جانتے تھے کہ منگل چنڈی کا گانا سن کر رات گذارتے- کوئی تو فخر کے ساتھ بسہری کی پوجا کرتا اور بہت سے لوگ روپیہ صرف کر کے مورتیں بناتے"-

اسمیں همیں یہ بھی ملتا ہے :—

" بہت سارے تحائف پیش کرکے کوئی تو بانسری کی پوجا کرتا اور کوئی شراب اور گوشت کی نذر دیکر " پکشا " کی پوجا کرتا ۔ ہمیشہ ناچ گیت اور باجوں کی وجہ سے ہنگامہ بپا رہتا ۔ کرشن جی کا نام جسمیں اعلی درجے کی حرکت تھی کہیں نہیں سنا جاتا تھا "۔ (آدی کھنڈ)

غالباسین راجاؤں کے زمانے میں سہج یہتھی کے " بودھو ناتھ " لوگ ھندو سماج میں شامل ہوگئے تھے ۔ لیکن وہ اچھوت اور کُوذات سمجھے جاتے تھے ۔ دور وسطی میں ان میں سے اکثر مسلمان ھوگئے تھے ۔ مسلمان ھوجانے کے باوجود ان میں قدیم عقاید و مراسم کی حو بو باقی رھگئی تھی ۔

بودھ دھرم کے اثرات سے ھندو سماج میں دھرم پوجا کی جو تحریک سین راجاؤں کے زمانے میں شروع ھوئی تھی اس کا تذکرہ پہلے ھی ھوچکا ھے ۔ دور وسطی میں دھرم ٹھاکور کے پجاریوں کی بھی کمی نہ تھی ۔ ھندؤں کے نچلے طبقے (غیر آریہ سماج) میں دھرم پوجا کا کافی رواج تھا ۔

پٹھان حکومت کے آخر دور میں ھندؤں اور مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرانے کی غرض سے ستّیہ پیر کی پوجا رواج پذیر ھوکر عام لوگوں میں بہت مقبول ھوئی ۔ اسی زمانے میں چیتنّہ دیو (ولادت سنہ ۱۴۸۶ع و فات سنہ ۱۵۳۳ع)

نے وشنو مت کی اشاعت شروع کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدامت پسند ہندو سماج میں ایک نئی دینی تحریک شروع ہوئی - پنڈتوں میں اکثر لوگ اس نئے مذہب کے سخت مخالف رہے - لیکن عام ہندوؤں میں چیتنّہ کے بھگتوں کی کمی نہیں ہوئی - ہم " چیتنّہ بھاگوت " میں پاتے ہیں :-

ترجمہ -

" چنڈال وغیرہ پربھو کی ثنا و صفت میں ناچتے ہیں - بھٹاچاریہ، مصر اور چکرورتی وغیرہ اسے برا سمجھتے ہیں "

(مدھو دھیٹو)

سلطان علاء الدین حسین شاہ کے زمانے میں ان کے دو بڑے ہندو وزیر روپ اور سناتن جن کا درباری نام یا خطاب شاکر مالک اور دبیر خاص تھا چیتنّہ دیو کے مرید ہوگئے اور انھوں نے ترک علائق کر لیا -

جوان ہری داس کی طرح چند مسلمانوں نے بھی وشنو مت اختیار کر لیا تھا - پنڈت طبقے نے بھی چیتنّہ دیو کو بھگوان کا بھگت مان لیا تھا - ان لوگوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ چیتنّہ بھگوان کے بھگت ہیں - یہ نہ تو پورے اوتار رہیں اور نہ جزوی اوتار - لیکن چیتنّہ کے بھگتوں نے انھیں خدا سمجھ کر ان ہی کی پوجا شروع کر دی - ان کی مشہور کردہ رادھا اور کرشن کی محبت کا

افسانہ سن کر اور اس سے متاثر ہوکر بہت سے ہندو اور مسلمان شاعروں نے "بشنب نظم یا گانے" بھی تصنیف کئے۔

ہندؤں کی مذہبی تبلیغ کا انفعالی اثر مسلمانوں پر بھی ہوا اور مسلمانوں سے مذہبی جہالت دور کرنے کے لئے باخدا مسلمان شاعروں کی ذات سے اسلامی مذہبی ادب کی ابتدا ہوئی۔ مقامی دھرم کے پجاریوں نے اپنے معبود دیوتاؤں کی فوقیت اور عظمت ثابت کرنے کیلئے مروجہ عوامی کہانیوں کا ذریعہ اختیار کیا۔ بشنب مت والوں نے چیتنّہ دیو کی زندگی کو بھی خارق عادت صفتوں سے مزین کرکے انھیں اپنی نظموں کا ہیرو بنا لیا۔ مسلمان شاعروں نے بھی اگرچہ کہیں کہیں ہندو شعراء کا تتبع کیا ہے لیکن انمیں سے پابند مذہب مصنفوں نے بنگلا مذہبی نظموں کے دریعہ سے تبلیغ اسلام کی بھی کوشش کی۔ اس طرح دورِ وسطی میں مذہبی ادب کے الگ الگ دھارے مختلف راہوں سے بہہ نکلے۔ ہندو سماج میں مروجہ مذہبی نظموں کو "منگل کابّو" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جن عوامی مروجہ کہانیوں کی بنیاد پر منگل کابو کی تصنیف ہوئی تھی ان میں ایک تو لاؤسین کی کہانی تھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

متعدد شاعروں نے لاؤسین کے موضوع پر منظوم کتابیں لکھیں جن میں سب سے قدیم مصنف "میور بھٹ" مانے جاتے ہیں۔ یہ غالبا

سترھویں صدی عیسوی میں موجود تھے - پہلے بھی ان کا ذکر ھو چکا ھے - میور بھٹ کے بعد دور وسطی کے سب سے قدیم شاعر " کھیلا رام " ھیں' جنکی تصنیف کا سال سنہ ۱۰۴۷ع ھے - یہ کتاب ھم تک نہیں پہنچ سکی - اس داستان کے ایک اور قدیم شاعر " سری شیام پنڈت " ھیں - ان کی تصنیف میں قدامت کی علامتیں موجود ھیں لیکن تاریخ تصنیف مذکور نہیں اس عنوان پر ایک اور شاعر کا نام " روپ چکرورتی " ھے - ان کی کتاب سنہ ۱۶۴۹ع میں مرتب ھوئی - اس مضمون کے چند اور شعراء " رام داس آدک " (سال تصنیف سنہ ۱۶۶۳ع)' سیتارام داس (سال تصنیف سنہ۱۶۹۸ع)' گھنرام (سنہ ۱۷۱۱ع)' رام چندر برھمن (سنہ ۱۷۳۲ع)' نرسنگھ بوسو (سنہ ۱۷۳۷ع)' پربھو رام (تقریبا سنہ ۱۷۴۸ع)' اور مانک‌رام گنگول ھیں جنکی تاریخ تصنیف سری جوگیش چندر رائے کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۷۸۱ع ھے - ان کے علاوہ کنت رائے' سہدیو چکرورتی وغیرھم نے بھی اس موضوع پر منظوم کتابیں تصنیف کی تھیں -

دوسرا موضوع کلام کال کیتو کی کہانی تھی اور تیسرا دھن پتی سوداگر کا قصہ - یہ دونوں افسانے " چنڈی منگل کابو " کا موضوع بنے - معلوم ھوتا ھے کہ پہلے چنڈی منگل میں صرف ایک ھی کہانی تھی لیکن زمانۂ مابعد میں دوسری کہانی کا بھی اضافہ کیا گیا - چنڈی منگل کے قدیم ترین شاعر " مانک دت "

تھے جن کا زمانہ تقریبا چودھویں صدی عیسوی میں تھا۔ مانک دت کے بعد جن شعرا سے ہم واقف ہو چکے ہیں ان میں " دیج مادب اچاریہ " قدیم ترین شاعر ہیں جنھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا - یہ چاٹگام کے باشندے تھے اور سنہ ۱۵۷۹ع میں انھوں نے اپنی کتاب مرتب کی تھی - انھوں نے اپنی کتاب میں شاھنشاہ اکبر اعظم کی مدح و ثنا بھی کی ہے جس کا تذکرہ پہلے گذر چکا ھے - اس موضوع کے سب سے مشہور شاعر " مکندو رام چکرورتی " ھیں - ان کا لقب " کوبی ککن " تھا - انھوں نے اپنی کتاب میں راجا مان سنگھ عامل بنگالہ کی ثنا و صفت بیان کی ھے - سال تصنیف سنہ ۱۵۹۴ع سے سنہ ۱۶۰۰ع کے درمیان ھے - مکتا رام سین نے سنہ ۱۷۷۴ع میں ایک کتاب اسی موضوع پر تصنیف کی - یہ چاٹگام کے رھنے والے تھے - ضلع ڈھاکا کے باشندے جے نارائن سین نے بھی اسی عنوان پر ایک کتاب سنہ ۱۷۷۲ع سے کچھ پہلے لکھی تھی - پھر بھوانی شنکر نے سنہ ۱۷۷۹ع میں ایک کتاب لکھی - " جناردن " نامی ایک قدیم شاعر نے بھی اسی موضوع پر ایک مختصر کتاب منظوم کی تھی لیکن اس کی تاریخ تصنیف معلوم نہ ھو سکی - اس کی زبان سے اندازہ ھوتا ھے کہ یہ اب سے تقریباً تین سو سال پہلے کی تصنیف ھے -

چوتھا موضوع کالم ندیا و سندر کا افسانہ تھا - یہ قصہ بنگال

کے باھر سے لایا گیا تھا - سنسکرت میں " وررو چی " کے نام سے منسوب ایک نظم ملتی ہے - آنجہانی دینیش چندر سین کی رائے میں اس کے قدیم ترین بنگالی زبان کے مصنف ضلع میمن سنگھ کے ایک شخص کنک نامی تھے - یہ چینڈیدہ دیب کے ہم عصر تھے - لیکن یہ فقط قیاس ہے - ہمیں یقینی طور پر معلوم ہے کہ گوڑ کے سلطان فیروز شاہ کے حکم سے سری دھر نامی ایک برھمن نے اس قصے کو بنگلا میں منظوم کیا تھا - اغلب ہے کہ سری دھر ھی بنگلا میں سب سے پہلے اس قصہ کو منتقل کرنے والے ھوں - شاعر کنک نے ایک مسلمان بزرگ کی ھدایت سے اپنی نظم تصنیف کی تھی - اس نظم میں ستّیہ پیر کی عظمت و جلال کا تذکرہ ہے - لیکن ان کے سوا دوسرے شاعروں نے کالی دیوی کی عظمت کے اظہار کیلئے اس قصے کو بھی اپنا موضوع کلام بنایا - ایک مسلمان شاعر سابرید خاں (شاہ بریدخاں) نے بھی اس موضوع پر ایک نظم لکھی تھی - یہ نظم شاعر " سری دھر " کی نظم سے بہت مماثلت رکھتی ہے - اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں انھیں " کالیکا منگل " کہتے ھیں - کالیکا منگل کے بعض قابل ذکر شعراء مندرجہ ذیل ھیں - پران رام چکرورتی جنھوں نے سنہ ۱۶۶۶ع میں اپنی منظوم کتاب مرتب کی - سنہ ۱۶۷۶ع

و ۷۷ ع میں کرشن رام داس نے بیس سال کی عمر میں اپنی نظم منضبط کی - اسی موضوع پر پرام رام چکرورتی نے ایک کتاب اٹھارھویں صدی عیسوی میں لکھی - ان کا سال تصنیف مذکور نہیں ہے - گوبند داس کی کالیکا منگل سنہ ۱۷۴۵ع سے سنہ ۱۷۵۵ع کے درمیان لکھی گئی - اس موضوع کے سب سے مشہور شاعر بھارت چندر رائے ھیں - انھوں نے سنہ ۱۷۰۲ع میں اپنی نظم مرتب کی - ان کے بعد بھی متعدد شعراء نے اس عنوان پر قلم اٹھایا جن میں رادھا کانت مصرا، رام پرشاد سین، کبیندر چکرورتی اور نیدھی رام اچاریہ وغیرہ قابل ذکر ھیں -

پانچواں موضوع نظم بیہورا اور لیکھندر کا قصہ تھا - منسا منگل یا پدا پوران کا ماخذ یہی ہے - ایک سو سے زاید شعراء نے اسی قصے کو اپنا موضوع سخن بنا کر نظمیں لکھیں - میتھیلا کے مشہور شاعر بدّیا پتی نے بھی پندرھویں صدی عیسوی میں سنسکرت زبان میں اسی موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی - حال ھی میں بہار کی زبان میں اسی موضوع پر ایک قصہ مرتب ھوا ہے - اس مضمون کا قدیم ترین شاعر غالبا کانا ھری دت ہے - ایک اور شاعر بجے گپت سنہ ۱۴۹۴ع میں تھے - انھوں نے بھی اِن کا نام لیا ہے - گپت کے بعد منسا منگل نظم کے شاعر بپرّداس ھیں - انھوں نے سنہ ۱۴۹۰ع میں اپنی نظم

تصنیف کی - پھر دوسرے شعراء مثلاً نارائن دیو ، دیم بنگش داس ، ششتھیبر دت ، رام جیو بدّیا بھوشن ، حانکی ناتھ ، بوئیدو جگناتھ ، راجا راج سنگھ ، گوپال دت مجمدار وغیرہ نے اسی موضوع پر طبع آزمائیاں کیں - اب تک ہمیں اس موضوع کے ایک سو سینتالیس شعراء کے نام معلوم ہو سکے ہیں جن میں سے اکثر مشرقی بنگال کے باشندے تھے -

منگل کابو کے علاوہ ناتھ پنتھ کے گروؤں کے قصور کو موضوع سخن بنا کر غالبا دور قدیم ہی میں چند نظمیں تصنیف ہوئی تھیں لیکن وہ ہم تک نہ پہنچ سکیں - دور وسطی میں مشرقی و مغربی بنگال نیز اس سے باہر ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور دوسری زبانوں میں جو نظمیں ناتھ پنتھ کے گروؤں سے متعلق تصنیف ہوئیں وہ ہمیں میسر آسکی ہیں - ناتھ گرو مثلا مچھندر ناتھ ، گورکھ ناتھ ، چورنگی ناتھ ، جالندھری پا کانو پا وغیرہ سبھی جسم و خون رکھنے والے تاریخی انسان ہیں - جالندھری پا کے چیلا مہر پور پاٹی کیرا کے راجا گوپی چاند کے سنیاس اور ان کی ماں مینامتی کے مافوق الفطرت افسانے ناتھ گروؤں کی عجیب و غریب کہانیوں کے ساتھ ناتھ نظموں میں مذکور ہیں - ناتھ قصوں کو موضوع سخن بنا کر بنگلا زبان میں شیخ فیض اللہ ، عبد الشکور محمد ، بھوانی داس اور

دُرلبھ ملک و غیرہ متعدد شعراء نے نظمیں لکھیں -

چیتنّہ دیو کی معجزانہ زندگی کو موضوع ـ سخن بنا کر بند یا بن داس (تاریخ تصنیف غالبا سنہ ۱۵۷۳ع - بنگالی زبان میں یہ اس موضوع کے قدیم ترین مصنف ھیں) ـ جا یا نند ، لو چن داس (سنہ ۱۵۷۵ع ،) کرشن داس کبیراج (سنہ ۱۶۱۵ع) و غیرہ نے نظمیں لکھیں - و شنو پد کے شعراء میں بدو چنڈی داس ، دیج چنڈی داس ، گیان داس ، بلرام داس ، گو بند داس ، کو بی شیکھر و غیرہ دو سو سے زاید شعراء کے نام اور ان کی نظمیں ملتی ھیں - تقریبا ایک سو مسلمان شعراء نے بھی و شنو پد کے متعلق نظمیں لکھی تھیں - ان میں شاہ اکبر ، نصیر محمود ، فقیر حبیب ، سید مرتضی ، سال بیگ (صالح بیگ) ، کبیر ، شیخ لال ، فتن ، اور شیخ بھیکن کی نظمیں و شنو نظموں کے مجموعہ میں جمع کی گئی ھیں - ان مسلمان شعراء میں سے چند نے کرشن اور رادھا کو خدا اور روح انسانی یا روح اور جسم کی تمثیل کے طور پر استعمال کیا ھے - ان میں سے بعض غالبا و شنو مت کے پیرو بھی تھے -

کتنے ھی مسلمان شعراء نے اسلامی موضوعات پر بھی نظمیں لکھیں - ان نظموں کو ھم چار قسموں میں منقسم کر سکتے ھیں -

۱- مرشدی گانے

۲۔ معرفتی گانے

۳۔ زاری گانے

۴۔ وجود یہ گانے

ان اسلامی نظموں اور گانوں میں بھی وشنو پد اور باؤل گانوں کی تاثیر نمایاں ہے -

ستّیہ (سچے) پیر کی عظمت اور بزرگی کی داستانوں سے معمور نظمیں جو دور وسطی کے آخری زمانے میں تصنیف ہوئی تھیں ان کے نام کا جز " پیر " خود ھی ان کے اسلامی ہونے پر دال ہے - ان نظموں کے مضامین بھی ان کی حقیقت پر شہادت دیتے ھیں - ھر منگل کابو کا موضوع کلام ایک ھی ہے - مختلف شعراء نے ایک ھی قصے کو اپنی منگل کابو میں نئے انداز سے بیان کیا ہے - لیکن ستیہ پیر کے موضوعات کلام مختلف ھیں -

ھم نے پہلے ھی بتایا ہے کہ کوبی کنکن نے بدیا و سندر کے قصے کو ستیہ پیر کی عظمت کے اظہار کیلئے اپنا موضوع کلام بنایا ہے - ھم نے ابتک راجشر بھٹاچاریہ، فقیر رام داس، اجودھیا رام رائے کوبی چندر، شری کوبی بلبھ وغیرہ باون شعراء کی منظوم کتابیں "ستّیہ پیرر پانچالی" کے نام سے قطعات کی صورت میں مرتب پائی ھیں - ان میں گورکھ بجے کے مصنف شیخ فیض اللہ اور عارف دو مسلمان شاعر ھیں - دور وسطی کے خاتمے سے پہلے ھی

ھندو مصنفین نے ستیہ پیر کو "ستیہ نارائن" میں تبدیل کر دیا تھا۔

مسلمان شعراء نے جو سب مذہبی نظمیں منظوم کیں ان میں پیغمبروں کا تذکرہ، حضرت محمد (ص) کی سوانح حیات، کربلا کے واقعات وغیرہ موضوعات اسلامی تاریخ سے لئے گئے تھے۔ بعض نے صحیح اور غلط روایات کو مخلوط کر کے اسلام کے تاریخی واقعات کی تبعیت میں امیر حمزہ، حنیفہ کی جنگ، ابو شحمہ وغیرہ موضوعات کو اپنا کر نظمیں مرتب کیں۔ بعض شعراء نے اسلامی مذہبی اصول کے متعلق بھی کتابیں منظوم کیں۔ انھی میں سے بعض نے پیروں اور بزرگوں کی پیروی کے بارے میں تبلیغی کتابیں بھی مرتب کیں۔

دور وسطی کے آخر میں اردو فارسی سے مخلوط دو بھاشی بنگلا میں بہت سی مذہبی کتابیں نظم میں قلمبند ہوئیں۔ اس کا سلسلہ دور وسطی سے ابتک جاری ہے۔

دور وسطی میں مذہب سے الگ ہو کر مقامی اور غیر مذہبی ادب کی تقلید میں شعرائے یوسف زلیخا، لیلی مجنوں، سیف الملوک بدیع الجمال وغیرہ منظوم کتابیں تصنیف کیں۔ بعض بعض مسلمان شاعروں نے عوامی قصوں یا تواریخ کی تبعیت میں بھی نظمیں قلمبند کیں۔ دولت قاضی کی "ستی مینا او رلورچند رانی" کا ماخذ ایک عوامی قصہ ہے۔ ان میں سے بعض مصنفین نے مستقل

تخلیقی افسانے بھی منظوم لئے ھیں - ھم میمن سنگھ گیتیکا اور پور بو بنگو گیتیکا میں تاریخی عوامی قصے اور کلیتہً آزاد تخلیقی نظمیں بھی پاتے ھیں - بعض ھندو مصنفین نے بھی اس طرز پر مقامی نظمیں غالباً مسلمان شعراء کی تبعیت ہی میں مرتب کیں -

اس قسم کی مقامی نظموں کے سلسلوں کے علاوہ ھم دور وسطی کے ادب میں تراجم بھی موجود پاتے ھیں - لیکن یہ لفظی تراجم نہیں ھیں بلکہ اکثر و بیشتر تخیل اور مواد مستعار لیا گیا ھے اور قدیم غیر بنگالی بنیادوں پر عمارتیں استوار کی گئی ھیں - انھیں ھم مختلف حیثیتوں سے مستقل تصانیف کی فہرست میں شمار کر سکتے ھیں - ھندو شعراء نے عام طور پر مذھبی کتب مثلاً مہابھارت، رامائن، سری مد بھاگوت وغیرہ سنسکرت کتابوں کے منظوم تراجم بنگلا میں کئے - بعض ھندی کتابوں کے تراجم بھی بنگلا میں پائے جاتے ھیں - مسلمان شعراء نے عموماً فارسی سے مذھبی اصول یا صرف افسانوی اور رومانوی قسم کی کتابوں کے تراجم کئے تھے -

ھندو مترجمین میں سے جن لوگوں نے رامائن کا بنگلا نظم میں ترجمہ کیا ان میں کیرتی باس سب سے قدیم ھیں - انھوں نے خود ھی بیان کیا ھے کہ گوڑ کے راجا کے زیر ھدایت انھوں نے اس کتاب کی تکمیل کی تھی - انھوں نے خود راجا کا نام نہیں

بتایا ہے لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ وہ جلال الدین محمد شاہ تھے - ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے - بابو جوگیش چندر رائے کی تحقیق کے مطابق کیرتی باس کی پیدائش سنہ ۱۳۹۸ع میں ہوئی تھی - لہذا عام خیال کے مطابق راجا گنیش کے دربار میں ان کا جانا اور ان کی ہدایت سے اس کتاب کا تصنیف کرنا تاریخی طور پر درست نہیں ہو سکتا - مہابھارت کا ترجمہ کرنے والے شعراء میں سب سے قدیم کبیندر پرمیشور مانے جاتے ہیں - انھوں نے سلطان علاء الدین حسین شاہ کے سپہ سالار پراگل خاں کے حکم سے مہابھارت کا بنگلا میں ترجمہ کیا تھا - غالباً کبیندر و پرمیشور ان کا لقب تھا کیونکہ اس کے معنی ملک الشعراء کے ہیں - دراصل ان کا نام سری کرنندی ہے - سری کرنندی نے پراگل خاں کے فرزند چھوتے خاں کے حکم سے جیمنی بھارت کا ترجمہ بنگلا زبان میں کیا تھا - مہابھارت کے سب سے مشہور مترجم کاشی رام داس ہیں - تاریخ تصنیف سنہ ۱۶۰۳ و ۴ع ہے تلسی داس کی رامائن کی طرح بنگالی ہندؤں میں کیرتی باس کی رامائن اور کاشی رام کی مہابھارت مقبول عوام ہے - سری مد بھاگوت کے اس حصے کا ترجمہ جس میں کرشن کی سوانح عمری اور ان کی معاشقانہ زندگی اور رنگ رلیوں کا تذکرہ ہے سب سے پہلے مالادھر بوسو نے کیا تھا - ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے -

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دور وسطی کا ادب خصوصیت
کے ساتھ مذہبی مرکزیت سے متاثر، بعض مذہب سے غیر
متعلق ادب پر مبنی اور معدودے چند تراجم پر مشتمل تھا -

———o———

باب سوم

دور وسطی کے بنگلا ادب میں مسلمانوں کا حصہ

اس سے پہلے مذکور ہوچکا ہے کہ قدیم ہندوستان کی مختلف زبانیں مثلا پراکرت، پالی آپوبھرنگشو وغیرہ کی طرح بنگلا زبان نے بھی برھمنوں کے حلقۂ اثر سے باھر رہ کر ترقی حاصل کی تھی۔ سنہ ۶۵۰ع کے لگ بھگ ناتھ مت کے بانی متشندرو ناتھ نے مشرقی بنگال میں سہجیا مت کی اشاعت کی تھی۔ اس کے بعد گورکھ ناتھ اور ان کے ماننے والے مختلف جوگیوں نے اس کی توسیع کیلئے کوششیں کیں۔

دور وسطی کے بارے میں لوگوں کا عام خیال یہی ہے کہ اس کے ابتدائی مصنفین ہندو تھے۔ لیکن اب تحقیقات سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ اس دور کے ایک قدیم مصنف شاہ محمد صغیر بھی تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "یوسف زلیخا" میں غیاث الدین اعظم شاہ (دور حکومت سنہ ۱۳۷۷ع سے سنہ ۱۴۱۰ع تک) کی تعریف و توصیف کی ہے۔ متذکرہ بالا کتاب بنگلا

زبان میں لکھی گئی ہے۔ شاہ محمد صغیر کے بعد متعدد ھندو مصنفین مثلاً کیرتی باش ' چنڈی داس اور مالا دھر بوسو وغیرہ نے سلاطین گوڑ کی سر پرستی اور حوصلہ افزائی سے متاثر ھوکر اپنی مادری زبان اور ادب کی خدمت کے شوق میں کتابوں کی تصنیف شروع کی۔ اپنے ھم مذھبوں اور ھم وطنوں کو اپنے مذھبی احکام سے با خبر کرکے باعلم بنانا بھی ان کا مقصد تھا۔ مسلمانوں کی ادبی تصنیفات کا بھی یہ ایک اھم مقصد تھا۔ اب ھم خصوصیت کے ساتھ مسلمان مصنفین کے مختصر حالات قلمبند کرتے ھیں۔ مسلمان مصنفین کے متعلق خامہ فرسائی کی خاص وجہ یہ بھی ھے کہ ان کی مطبوعہ تصانیف تعداد میں بہت کم نیز کم یاب بلکہ نایاب ھیں۔ مختصر اور چند تحریریں جو دستیاب بھی ھوئی ھیں وہ قلمی مسودات کی صورت میں مخصوص افراد کی ذاتی ملکیت ھیں۔

مذھبی نظمیں :—

ابتداءاً ھم مذھبی ادب کا تذکرہ کریں گے۔ گوڑ کے علم پرور سلطان شمس الدین یوسف شاہ (سنہ ۱۴۷۳ع سے سنہ ۱۴۸۱ع تک) کی زیر سرپرستی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سوانح حیات موسوم بہ " رسول بجے " چاٹگام کے ایک شاعر زین الدین نے لکھی تھی۔ سید سلطان نے اسی کا تتبع کرتے ھوئے حضرت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیا کے قصص منظوم کئے ۔ ان کی اور بھی دو منظوم تصنیفات " شب معراج " اور " وفات رسول " کے نام سے مرتب ہوئیں ۔ شب معراج سنہ ۱۵۸۴ع میں تصنیف ہوئی تھی اور وفات رسول اس کے بعد مرتب ہوئی ۔ شاہر ید خاں اور شیخ چاند نامی اور بھی دو شاعروں نے زین الدین ہی کے تتبع میں رسول بجے نامی کتابیں منظوم کیں اور ان میں حضرت سرور کائنات (صـ) کی سوانح حیات کا تذکرہ کیا ۔ اس کے ماسوا شاہر ید خاں نے ایک منظوم افسانہ بنام " بدّ یا سندر " تصنیف کیا جس میں ایک راج کمار سندر کو ھیرو اور ایک راج کماری بدّیا کو ھیروئن دکھایا گیا ھے ۔ بعد میں بہت سے ھندو شعراء نے اس موضوع کو اپنی منظومات کا سنگ بنیاد بنایا اور اسی طرز کو قبول کر لیا ۔ شاہرید خاں (شاہ سرید خاں) نے محمد حنیفہ اور کیرا پری کے عجیب و غریب رومانی واقعات بھی بیان کئے ھیں ۔

شیخ چاند نے سنہ ۱۱۲۲ (بدگلا) مطابق سنہ ۱۷۱۵ع میں ایک کتاب قیامت نامہ منظوم کی ۔ اُنھوں نے شاہ دولہ نامی ایک بڑے درویش سے بیعت لی اور ان کے وعظ اور نصائح کو " شاہ دولہ پھر " یا طالب نامہ کے نام سے منظوم کیا ۔ " ھرگوری شنگباد " نامی ایک دوسری منظوم کتاب بھی ان کی تصنیفات میں سے ھے ۔ ان دونوں کتابوں میں تصوف کے ساتھ جوگ کے مضامین کی

آمیزش نظر آتی ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مبتدع فقیروں کے متبع تھے -

اسلامی موضوعات کو پیش نظر رکھ کر جن شعراء نے کتابیں منظوم کیں ہم ذیل میں ان کے متعلق بحث کریں گے -

کربلا کے دل خراش واقعات پر مشتمل ایک منظوم کتاب محمد خاں نے سنہ ۱۰۵۶ بنگلہ مطابق سنہ ۱۶۳۵ و ۳۶ع میں بنام مقتول حسین یا مقتل حسین مرتب کی - محمد خاں متذکرہ بالا سید سلطان کے شاگردوں میں سے تھے - اس کی گیارھویں فصل میں " شیش بچار" (آخری فیصلہ) کے نام سے قیامت کا تذکرہ ہے - عہد ما بعد میں یعقوب علی اور جناب علی نامی دو شعرا نے اُن کا تتبع کیا - واقعات کربلا کے سلسلے میں شیرباز نے قاسم کی لڑائی اور سکینہ کی فریاد کے عنوان سے سترھویں صدی میں ایک طویل نظم لکھی تھی -

سنہ ۱۰۹۶ بنگلہ مطابق سنہ ۱۶۸۴ع میں عبد النبی نے امیر حمزہ نامی کتاب لکھی - حضرت محمد صلعم کے چچا حضرت حمزہ کے محیر العقول واقعات شجاعت اور فرضی جنگوں کے نقشے اس میں درج ھیں - بہت سارے شعراء نے اس موضوع کی تقلید کرتے ہوئے منظوم کتابیں لکھی ھیں - اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں بلیا حافظ پور (مغربی بنگال) کے باشندے

غریب اللہ نے امیر حمزہ کا پہلا حصہ نظم کیا۔ پھر ضلع ہوگلی کے پرگنہ بھُرسٹ میں موضع اُدنا کے رہنے والے سید حمزہ نے سنہ ۱۲۰۱ بنگلہ مطابق سنہ ۱۷۹۴ و ۹۵ع میں اس کتاب کا دوسرا حصہ مکمل کیا۔ سید حمزہ سنہ ۱۱۳۹ بنگلہ مطابق سنہ ۱۷۳۲ یا سنہ ۱۷۳۳ع میں پیدا ہوئے تھے اور سنہ ۱۴۱۴ بنگلہ مطابق سنہ ۱۸۰۷ یا سنہ ۱۸۰۸ع میں راھی ملک عدم ہوئے - ان کی اور تصانیف کے بارے میں ہم پھر بحث کریں گے۔ ضلع رنگ پور میں گھوڑا گھاٹ سرکار کے سولنگ باک دوار پرگنہ کا موضع جھاڑبی شیلا شاعر محمود کا وطن ہے۔ انھوں نے بہت ساری کتابیں تصنیف کیں۔ سنہ ۱۱۳۰ بنگلہ مطابق سنہ ۱۷۲۳ و ۲۴ع میں کربلا کے غم فزا واقعات کو موضوع کلام بنا کر انھوں نے ایک کتاب موسوم بہ جنگ نامہ تصنیف کی - ان کی دوسری تصنیفات ایک سنسکرت کتاب "ھیتواُ پدیش" کے فارسی ترجمہ سے ماخوذ (چتّو اتّھان) سنہ ۱۱۳۹ ب مطابق سنہ ۱۷۳۲ و ۳۳ع، اسلامی مذھبی اصول میں (ھیتو گیان بانی)۔ مصنفہ سنہ ۱۱۰۳ ب مطابق سنہ ۱۷۰۳ و ۴ع اور سوانح انبیا (انبیا بانی) مصنفہ سنہ ۱۱۶۵ ب مطابق سنہ ۱۷۵۸ و ۵۹ع وغیرہ دستیاب ہوئی ھیں -

نصر اللہ نے حضرت علی (رض) کی شجاعت کے پیش نظر

ان کے حربی کارناموں کو فرضی قالب میں ڈھال کر ایک منظوم کتاب بنام جنگ نامہ تصنیف کیا اور " موسارسوال " (موسیٰ کے سوالات) کے نام سے اسلامی مذہبی اصول کو منظوم صورت میں مرتب کیا ۔ اغلب ہے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں وہ چاٹگام میں موجود تھے ۔ حضرت علی (رض) کی سوانح حیات سے متعلق جس قدر افسانے شہرت پذیر ہوئے انھیں بہت سے شعراء نے اپنا موضوع سخن بنایا ۔ حضرت علی کے احوال زندگی سے متعلق نصر اللہ کا جنگ نامہ نقش اول کا مقام رکھتا ہے ۔ اور خلیل احمد کی نظم " بھانو متیر لڑائی " (بھانو متی کی لڑائی) اس کا نقش ثانی کہا جا سکتا ہے ۔

شاہ بدیع الدین کی کتاب " فاطمار صورت نامہ (فاطمہ کا صورت نامہ) حضرت علی (رض) اور حضرت فاطمہ (رض) کے متعلق ایک افسانوی طرز کی نظم کا مجموعہ ہے ۔ انھوں نے بہت سے گانے بھی مرتب کئیے تھے ۔ شاعر شیر تنو نے اسی نام سے ایک دوسری کتاب لکھی تھی ۔ شمالی بنگال کے ایک شاعر برھان اللہ ھیں ۔ ان کے قیامت نامے میں قیامت کے متعلق حالات مذکور ھیں ۔ یہ پوتھی غالباً اٹھارھویں صدی عیسوی میں مرتب ہوئی تھی ۔ اسلامی اصول مذھب پر شاعر نور الدین نے چار کتابیں لکھیں ۔

راحت القلوب، دقائق، موسار سوال اور قیامت نامہ - ان کتابوں کی تصنیف کا زمانہ معلوم نہ ہو سکا - سنہ ۱۱۷۰ع بنگلا مطابق سنہ ۱۸۲۰ع میں کسی صاحب نے راحت القلوب کی نقل کی تھی - اس سے یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے مصنف ہیں اور ان کا وطن چاٹگام تھا -

اسلامی اصول مذہب پر مطلب سے کتاب کفایۃ المصلین لکھی- عبدالکریم شاھتو بشارد مرحوم کی رائے ہے کہ یہ کتاب سنہ ۱۵۵۱ع میں لکھی گئی تھی - اس نام اور اسی موضوع پر چاٹگام کے رہنے والے محمد علی نے اور بھی ایک پوتھی مرتب کی تھی - اس پوتھی کی تصنیف کا بھی صحیح زمانہ ہمیں معلوم نہ ہو سکا -

نور قندیل کے مصنف میر محمد شفیع ہیں - انھوں نے نور محمدی سے کل عالم کی تخلیق اور قیامت کے دن تمام کائنات کی مادی بربادی کا تذکرہ کیا ہے - عبدالکریم، عبدالحکیم اور شیخ پران وغیرہ شعرانے بھی اس موضوع کو بڑے عزت و احترام کے ساتھ اپنایا ہے اور نور قندیل، نورنامہ وغیرہ کے نام سے کتابیں لکھی ہیں - شاعر عبدالحکیم بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں - ان کا نصیحت نامہ ایک مذہبی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے - ان کا تذکرہ پھر کیا جائے گا -

حضرت علی (رض) اور ان کے فرزند محمد بن حنیفہ کے متعلق

بھی بہت سے فرضی افسانے شہرت رکھتے ھیں - اس موضوع پر بھی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں - ہم نے شابرید خاں کی تصنیف محمد حنیفه اور کیر اپری کا تذکرہ پہلے ھی کیا ھے - سولھویں صدی عیسوی میں دولت وزیر نے محمد حنیفه کی جنگ سے متعلق داستانیں لکھیں - حادثات کربلا کے بعد محمد بن حنیفه کی یزید کے ساتھ جنگ اور اس کے متعلق معاربات کے تذکروں پر مشتمل ایک کتاب شیخ منصور نے بنام "امیر جنگ" لکھی - اٹھارھویں صدی کے آخر میں شاعر غریب الله نے حنیفه کا جنگ نامه لکھا - ایک داستان میں یه کہا گیا ھے که محمد حنیفه نے چھه راج کماریوں کو جنگ میں مغلوب کر کے ان سے شادیاں رچائیں - اُن کے نام مالکه آکار، جےگن (زیتون)، سمرت بھان، سونا بھان، پدن کماری اور سورج اُجال تھے - یه تمام افسانے خالص افسانوی رنگ کے ھیں - اس قسم کے افسانے بنگال سے باھر اردو وغیرہ مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں بھی پائے جاتے ھیں - سید حمزہ کی جے گن (زیتون) پوتھی سنه ۱۲۰۴ بنگلا کی تیئیسویں ماہ آسن (کنوار) مطابق سنه۱۸۱۷ع میں لکھی گئی - اس میں مذکور ھے که حنیفه کے ساتھ راج کماری جےگن کی متعدد لڑائیاں ھوئیں - حنیفه کے ساتھ ہی جنگی داستانوں سے معمور اور دو کتابیں یعنی "سورج اجال بی‌بی" اور "سونا بھان" بھی منظوم ھوئی تھیں - "سورج اُجال بی‌بی" کے

مصنف ارادت علی ھیں اور "سونا بھان" کے مصنف کی حیثیت سے سید حمزہ کا نام لیا جاتا ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس کے مصنف متذکرہ بالا غریب اللہ ھی ھیں۔

اسلامی مذھبی اصول اور تصوف کے روحانی تصورات کے مطابق حصول ترقی کے طریقے سکھانے کیلئے شعراء نے نصائح آموز قصص اور کہانیاں بھی منظوم کی تھیں۔ اسی قسم کی ایک کتاب موسوم بہ "ملکار ھزار سوال" یعنی ملکہ کے ھزار سوال یا فقرنامہ کے مصنف سابق الذکر شاعر شیرباز تھے۔ سنہ ۱۱۳۸ ب مطابق سنہ ۱۷۳۲ع میں نقل کیا ھوا اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ گدا ملک کی پونھی کے مصنف شیخ سعدی کے نام سے مشہور ھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی کم درجے کے شاعر نے ان کا تتبع کرکے ان کے نام سے اپنی کتاب کو زیادہ موقر بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ شہر روم میں ایک راجکماری تھی جس کا نام ملکہ تھا۔ اس ملکہ نے اسلامی اصول و عقاید کے بارے میں ایک شخص عبد اللہ سے ایک ھزار سوالات کئے۔ عبد اللہ نے اُسے تشفی بخش جوابات دئے جس پر مطمئن ھوکر اُس نے اسلام قبول کیا اور عبد اللہ سے شادی کرلی۔ سعدی نے اپنی پوتھی موسوم بہ "گدا ملکہ" میں بجائے عبد اللہ کے گدا عبد العلیم کا نام

استعمال کیا ہے - مظفر کی ملک یونان والی پوتھی سنہ ۱۸۲۳ء کی مرتبہ ایک مذھبی قسم کی تصنیف ہے - سلطان جمجمہ کی پوتھی کے مصنف محمد قاسم ھیں - یہ کتاب ایک مکالمے کی صورت میں مرتب کی گئی ہے - اس میں مرقوم ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ) نے ایک مردہ شاہ جمجمہ کو زندہ کر کے اس سے گفتگو فرمائی تھی -

حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے بالا کوٹ کی جنگ میں سنہ ۱۸۳۱ء میں جام شہادت نوش فرمایا تھا ان کے شاگردون اور معتقدوں کے ذریعہ سے بنگال میں اسلام کی تجدید و اصلاح سے پہلے یہاں ایک غلط قسم کا تصوف مروج تھا اور وھی فقیری مت اسلامی شعار کے ساتھ مخلوط ھوکر ملک میں پروان چڑھتا رھا - شرک اور بدعت نے ترقی پا کر ملک کی صحیح اسلامی بنیادوں کو تقریباً متزلزل کردیا تھا - یہ اختلاط مقامی غیر مسلم اور نو مسلم مسلمانوں کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آیا تھا - اس قسم کے فقیری مت کے مطابق لکھی ھوئی شیخ چاند صاحب کی دو تصنیفات کا ھم پہلے تذکرہ کر چکے ھیں - مزمل اور محمد شفیع کے سات نامے بھی اسی قسم کی تصنیفات میں داخل ھیں - اس میں نحس نشانیوں اور ازیں قسم غلط عقیدوں کے متعلق عنوانات اور

ابواب درج ھیں - ان کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۱۷۰۷ع ھے - مذکورہ بالا سید سلطان نے بھی اس قسم کے عنوانات پر مشتمل ایک کتاب "گیان پرودیپ" یعنی شمع عقل لکھی تھی - سید سلطان کو ھم "ابلیس نامہ" اور "جیکُم راج لڑائی" کے مصنف کی حیثیت سے بھی دیکھتے ھیں - حضرت رسول خدا کے ساتھ راجا جےکُم کی جنگ کا حال بیان کر کے عقیل احمد نے بھی ایک پوتھی تصنیف کی تھی - درویشی مت کے مشہور مصنف اور شاعر علی رضا ھیں جو "کانو فقیر" کے نام سے شہرت رکھتے ھیں - سترھویں صدی کے اواخر میں وہ چاٹگام میں زندہ موجود تھے - ان کی تصنیفات میں "گیان ساگر' سراج قلوب' جوگ قلندر' شٹ چکر و بھید اور دھیان مالا نامی کتابیں موجود ھیں - سراج القلوب کے نام سے محمد قاسم نے بھی ایک پوتھی تصنیف کی تھی - اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۷۹۰ع متعین کیا گیا ھے - ایک غیر معروف شاعر کی ایک پوتھی موسوم به "تن تلاوت" بھی پائی گئی ھے - اس پوتھی کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۱۷۹۴ع ھے - اس میں بھی جوگ اور تصوف کا اختلاط پایا جاتا ھے -

سچے پیر کی معجزانہ زندگی پر متعدد شعرا نے طبع آزمائی کی ھے - اس فقیری مت کی تہ میں یہ کوشش مخفی تھی کہ

ہندو اور مسلمان ایک ھی طرح کی پرستش اور خوش اعتقادی
کے ذریعہ باھمی اختلاط اور ھم آھنگی کی بنیادیں استوارکریں -
ستیہ پیر (سچے پیر) کے متعلق نظموں کے سب سے قدیم مسلمان
مصنف فیض‌اللہ ھیں - انھوں‌نے سنہ۱۵۴۵ع میں "شتو پیر" نامی کتاب
لکھی - اس سے پہلے انھوں نے ناتھ شدّھا چاری گورکھ ناتھ کی سوانح
حیات مرتب کرکے "گورکھ بجے" اس کا نام رکھا - انھوں نے ایک
اور کتاب بنام "غازی بجے" اسماعیل غازی کے احوال زندگی کے
متعلق بھی تصنیف کی تھی - حضرت اسماعیل (رح) سنہ ۱۴۴۸ع
میں شہید ھوئے تھے - ان کے بعد عارف اور واجد علی نامی دو
شاعروں نے زمانہ ما بعد میں سچے پیر کے قصوں کو مجتمع کرکے
نظمیں مرتب کیں - ناتھ افسانوں کے ایک اور مسلمان مصنف
بھی پائے جاتے ھیں - "گوپی چاندر سنّیاس" کے مصنف عبدالشکور
محمد ھیں - یہ شمالی بنگال کے باشندے تھے -

اور بھی کتنے ھی مصنفین نے فقرا کی کرامات سے متعلق منظوم
کتابیں لکھیں - ھم نے شیخ فیض اللہ کی کتاب غازی بجے کا
ذکر پہلے ھی کیا ھے - حضرت شیخ جلال الدین تبریزی تیرھویں
صدی عیسوی کے آخرمیں مشرقی بنگال آئے تھے - ان کے خوارق
عادات پر مشتمل ایک کتاب سنسکرت زبان میں لکھی گئی تھی -
اس کتاب کا نام "شیک شو بھودے" تھا -

بنگال کے شیوخ اور فقرا کے متعلق اور بھی متعدد شعرا نے منظوم کتابیں اور پوتھیاں مرتب کیں۔ عبدالغفور نے کالو غازی کا قصہ بنام "کالو غازی چمپاوتی" منظوم کیا۔ ھالو میاں نے بھی اسی قسم کی ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام غازی منگل تھا۔ عبدالحلیم نے "غازیر پوتھی" لکھی۔ مانک پیر، یک دل شاہ، مبارک غازی، پھرگورا چاند اور دوسرے پیروں کے بارے میں کہانیاں اور افسانے دور جدید کے مصنفوں کیلئے آج بھی موضوع سخن بنے ہوئے ہیں۔

گیتوں کے مصنفین :ـــ

اب ہم گیتوں کے متعلق کچھ لکھیں گے۔ یہ سارے شعراء وشنومت کے شاعروں سے متاثر ہوئے تھے۔ لیکن اس کی بنا پر ہم انھیں وشنومت کا پیرو نہیں کہہ سکتے۔ صرف مروجہ طرز سخن کے مطابق انھوں نے بھی عام ڈگر قبول کی تھی۔ ان میں سے بعض بعض فقرا اور مشائخ کے حلقہ بگوش بھی تھے۔ انھی میں سے بعض نے رادھا اور کرشن کو انسان نہ مان کر روح اور خدا بھی مان لیا تھا۔ رادھا اور کرشن سے بعض نے جسم اور روح مراد لے کر بھی گیت تیار کئے تھے۔ یہ بھی ناممکن نہیں ھے کہ ان میں سے بعض نے چیتّنہ کے شاگرد رشید هری داس کی طرح وشنومت بھی قبول کرلیا تھا۔

یہاں ہم بطور نمونہ غیاث خاں کے ایک گیت کا ترجمہ پیش کرتے ھیں جس میں انھوں نے حضرت سرور کائنات کی دایہ حلیمہ سعدیہ کے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے ھیں۔

وہ فرماتے ھیں - ترجمہ :—

" اے حلیمہ تیری قسمت بڑی خصوصیت رکھتی ھے -
اللہ کے محبوب نے انسانی صورت والے بچے کے بھیس میں تیرا دودھ پیا
راجا کی بے عیب کنواری نیک خصلت آمنہ بی بی نے نبی کی روشنی دیکھی -

اس صورت کو دیکھ لینے کے بعد پھر گھر جانے کو دل نہ چاھا
اس لئے انھوں نے اس چاند سے مکھڑے پر بوسہ دیا -
نبی کے منھ کی ھنسی ایسی تھی جیسے بے پردہ چاند یا مہرتاباں
اور خوبصورت ناخن ایسے تھے جیسے ھلال عید - شرم کی وجہ سے اندھیرا دور بھاگ گیا -
نبی کے جسم کی خوبصورتی سے آسمان میں روشنی ظاھر ھوئی -
سرخ آفتابِ صبح ان کے قدموں تلے روپوش ھوگیا (اور اسی سے ان کے پاؤں میں سرخی آئی)

خان غیاث عربوں اور قریشیوں سے کہتا ھے
کہ وہ ان کے سرخ پیروں کی بندگی کریں (قدمبوس ھوں)"

ھم نے ایک سو سے زیادہ بنگالی گیت لکھنے والے شعرا کی تحقیق ھے - سنہ ۱۷۱۷ء ایک مجموعہ (راگ مالا) میں

ہمیں مندرجہ ذیل تیرہ گیت کے مصنفین کا کلام ملتا ہے
سید مرتضی - سید عین الدین - نصیر الدین - سید افضل - خان غیاث - عبد المعالی - طوفان الدین - سر تاج - منور - سید سلطان - نور محمد - محمد ہاشم اور فتح خاں - ان کے علاوہ ہم آلاول ' علی رضا ' سال بیگ ' نصیر محمود ' چاند قاضی ' اکبر ' فیض اللہ اور بدیع الدین وغیرہ کے نام بھی اس فہرست میں داخل کر سکتے ہیں -

بارہ مارسی :—

کتنے ہی مسلمان شعرا نے بارہ ماسی نظمیں لکھیں - ایک فراق زدہ محبت کرنے والی عورت کی بارہ مہینوں کی دکھ بھری داستان ہی ان نظموں کا بنیادی موضوع ہے - بارہ ماسی نظموں میں مندرجہ ذیل لائق ذکر ہیں - قمر علی کی " رادھار بارو ماشی " (رادھا کی بارہ ماسی) - شیخ جلال کی " شکھیر بارو ماشی " (سکھی کی بارہ ماسی) ہری پنڈت کی " جےگونیر بارو ماشی " (جے گن کی بارہ ماسی) ' مطیع اللہ کی " رش رنگیر بارو ماشی (رس رنگ کی بارہ ماسی)' محمد علی کی " مرشد یر بارو ماشی " ' صادق علی کی " رام چندر یر بارو ماشی " ' اور ہاشم کی " رادھیکار بارو ماشی "- نیز زیب الملک شمع رخ ' تمیم گلال چُترن سِلّال اور دوسری پوتھیوں میں بارہ ماسی

گیت پائے جاتے ہیں - یہ بارہ ماسی گیت ہندی شعراء کے تتبع میں لکھے گئے تھے -

چونتیسا :—

ایک اور طرح کی نظمیں بھی بنگلا میں لکھی گئیں جنھیں چونتیسا کہتے ہیں - اس کی ہر نظم میں چونتیس حروف صحیح میں سے ایک ایک حرف سے ایک ایک مصرعہ شروع کیا جاتا ہے - اور چونتیس ہی مصراعوں پر ایک نظم اختتام پذیر ہوتی ہے - ایک نا معلوم شاعر کی نظم " زینب ایر چونتیسا " اور گیان پرودیپ کے مصنف متذکرہ بالا سید سلطان کا " گیان چونتیسا " ہمارے خزینۂ ادب میں موجود ہے -

رومانی نظمیں :—

دور وسطی کے بنگالی ادب میں مسلمانوں کی فیاضانہ خدمات سب سے زیادہ رومانی نظموں کے متعلق لائق ذکر ہیں - یہ نظمیں مثنوی کے طرز پر عشقیہ داستانوں سے معمور ہیں - سب سے پہلے مسلمان شعراء ہی نے اس میدان میں اپنی جولانی طبع دکھائی تھی - اس میں شک نہیں کہ انھوں نے فارسی شعراء کے فیوض سے اپنا دامن بھرا تھا - شاہ محمد صغیر کا تذکرہ ہم پہلے ہی کر چکے ہیں - ان کی تصنیف " یوسف زلیخا " بنگلا زبان میں سب سے پہلی رومانی نظم ہے - فارسی زبان

میں اس نام سے متعدد نظمیں منضبط ہوئی تھیں - سب سے پہلی مثنوی مشہور شاعر فردوسی نے مرتب کی تھی - (وفات سنہ ۱۰۲۵ع)- نظام شاہ سوروالی چاٹگام کے دور حکومت میں دولت وزیر بہرام خان نے لیلی مجنوں کے نام سے ایک عشقیہ داستان منظوم کی تھی - اس نام سے کم از کم چار کتابیں مشاہیر شعرائے فارسی نظامی ' امیر خسرو ' جامی اور ہاتفی نے اس سے پہلے منظوم کی تھیں - یوسف اور زلیخا کی عشقیہ داستان سے متعلق اور بھی متعدد کتابین چند شعراء نے سلک نظم میں منضبط کی تھیں - اس موقع پر عبد الحکیم اور غریب اللہ کے نام قابل ذکر ہیں - عبد الحکیم کے نور نامہ اور نصیحت نامہ کا تذکرہ ہم پہلے ہی کرچکے ہیں - مذکورہ دو کتابوں اور یوسف زلیخا کے علاوہ انھوں نے لال متی سیف الملک نامی ایک مستقل تصنیف بھی نظم میں مرتب کی تھی - نواکھالی کا سودھارام مقام ان کا وطن تھا اور وہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں موجود تھے - شریف کی " لال متی سیف الملک ' کو دراصل عبد الحکیم کی نقالی کہا جا سکتا ہے - رزاق نے اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایک عاشق سیف الملک اور اس کی معبوبہ لال بانو کے متعلق ایک مثنوی لکھی تھی - ناممکن الوقوع داستان امیر حمزہ کے مصنف غریب اللہ کا تذکرہ پہلے ہی کیا جاچکا ہے -

ریاست اراکان کے حکمران سری شودھاما (سنه ۱۶۲۲ع تا سنه ۱۶۳۸ع) کے ایک درباری کی حوصله افزائی سے قاضی دولت نے "ستی مینا و لور چند رانی" نامی ایک کتاب منظوم کی - اس پوتھی کی تکمیل سے پہلے ھی انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا -

دور وسطی کے سب سے مشہور مسلمان شاعر الاول ھیں - جنھوں نے سنه ۱۶۷۱ع میں وفات پائی -

یه ضلع فرید پور (مشرقی بنگال) کے پٹھان حکمران مجلس قطب کے وزیر زادے تھے - کسی بحری سفر میں اپنے والد کی ھمرکابی میں ان کے والد پرتگالی بحری ڈاکوؤں کے ھاتھوں سے شہید ھوگئے تھے - الاول مجروح ھوکر اراکان پہنچے - راجا کے دربار میں رشک وحسد کا بازار گرم تھا اس لئے انھیں کوئی امتیازی جگه حاصل نه ھو سکی - مجبوراً راجا کے شه سواروں میں انھیں ایک جگه مل گئی - رفته رفته انھوں نے چند درباریوں کی سرپرستی حاصل کرلی - جب شاہ شجاع اراکان آئے تو الاول کا ان سے تعلق پیدا ھوگیا - راجا کے حکم سے جب شاہ شجاع بے دردی کے ساتھ قتل کئے گئے تو ان کی مصاحبت کے الزام میں الاول کو بھی پچاس دنوں کیلئے قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں - رھائی کے بعد دربار سے تعلقات منقطع ھوگئے - گیارہ سال کے بعد مہاراجه اراکان کے ایک علم

20—

دوست درباری کی سرپرستی میں پھر اس شاعر کا ستارۂ اقبال چمکا - لیکن اس کے تھوڑے ھی دنوں کے بعد ان کا آفتاب عمر غروب ہو گیا - اغلب ہے کہ الاول سنہ ۱۵۹۲ع میں پیدا ہوئے تھے اور سنہ۱۶۷۳ع میں اکاسی سال کی عمر پا کر رہ گرائے عالم جاودان ہوئے - ستی مینا اور لور چند رانی کی تکمیل کے علاوہ انہوں نے ھندی شاعر ملک محمد جائسی کی پدماوت کو "پدابتی" نام دے کر بنگلا زبان میں ایک مثنوی کی صورت میں مرتب کیا - نظامی گنجوی کی مثنوی ھفت پیکر اور سکندر نامہ کا بنگلا نظم میں ترجمہ کیا - یوسف گدا کی اصل فارسی کتاب کو بنگلا میں منظوم کر کے تحفہ نام رکھا اور سیف الملک بدیع الجمال نامی ایک مستقل کتاب تصنیف کی - اس میں بھی انہوں نے غالبا فارسی یا دکنی اردو سے مدد لی تھی - الاول فارسی، سنسکرت، پراکرت، ھندی، بنگلا اور اغلباً عربی زبان کے جیّد عالم تھے - وہ کتنے ھی گانوں کے بھی موجد تھے - اس کے علاوہ وہ سنگیت، رقص، جوگ، شہ سواری، پولو اور فنون اسلحہ کے بھی بڑے کامیاب ماھر تھے - انہوں نے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی (الاول کا تفصیلی بیان پھر آئے گا -)

الاول کے تتبع میں دونا غازی چودھری نے بھی سیف الملک بدیع الجمال نامی ایک پوتھی مرتب کی تھی - براھم (ابراھیم)

نامی ایک اور شاعر نے بھی اسی نام سے ایک پوتھی منظوم کی تھی - زمانہ ما بعد میں منشی مالِ محمد نے بھی سنہ ۱۸۲۸ع میں اسی موضوع پر ایک منظوم کتاب مرتب کی تھی -

ذیل میں ہم چند مشہور رومانی نظموں کے مرتب شعرا کا نام درج کرتے ھیں -

مَردن کا مرتبہ " نصیر نامہ " اراکان کے راجا شری شودھرما کے دورحکومت (سنہ ۱۶۲۲ع تا سنہ ۱۶۳۸ع) میں تیار ہوا - محمد اکبر نے " زیب الملک شمع رخ " نامی کتاب لکھی - اس میں چنوری شاہ زادہ زیب الملک کے ساتھ ایک پری شمع رخ کے افسانہائے محبت قلمبند ھیں - اغلب ھے کہ یہ شاعر سولھویں صدی میں تری پورہ کے مقام پر زندہ موجود تھے -

ایک اور شاعر رفیع الدین نے بھی محمد اکبر کا تتبع کیا ھے - یہ تری پورہ کے باشندے تھے - اغلب ھے کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں یہ موجود تھے - قریشی مائن نے " چندراوتی " نامی پوتھی مرتب کی - ان کا دوسرا نام " مائن ٹھاکر " تھا - یہ اراکان کے راجا کے وزیر اور الاول کے مربی تھے -

زینت علی کی مرتبہ پوتھی کا نام " سورج جمال بھانو متی " ھے - محمد انیس نے " لال گہر " نامی ایک پوتھی مرتب کی - اس پوتھی کی نقل ثانی سنہ ۱۸۲۵ع میں کی گئی -

تھی - شاہ فارس بہرام گور اور اس کی محبوبہ حسن بانو کے حیرت انگیز افسانہائے محبت کو محمد جبین نے ایک پوتھی کے قالب میں ڈھالا اور اس کا نام " بانو حسن بہرام گور" رکھا - پراگل کی مرتبہ پوتھی کا نام " شاہ پری قصہ " تھا - مولوی عبد الکریم صاحب مرحوم کی رائے یہ ہے کہ پراگل الاول کے بھائی تھے -

اٹھارھویں صدی کے آخر حصے میں جو شعرا بہت ساری کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوئے تھے - ان میں سید حمزہ سب سے نمایاں تھے - اسلامی افسانوی نظموں کے مصنف کی حیثیت سے پہلے ھی ان کا تذکرہ ھو چکا ھے - اردو زبان سے افسانوں کے خاکے حاصل کرکے انھوں نے دو رومانی مثنویاں لکھی تھیں - منوھر اور مدھو مالتی کا مشہور افسانۂ محبت انھوں نے " مدھو مالتی " نامی پوتھی میں منتقل کیا - انھوں نے یہ کتاب سنہ ۱۱۹۵ بنگلہ مطابق سنہ ۱۷۷۸ - ۷۹ع میں مرتب کی - مدھو مالتی سید حمزہ کا پہلا شاھکار تھا - محمد جائسی نے اپنی پدماوت میں اسی قصے کا ذکر کیا ھے - ھندی شاعر منجھن نے بھی اسی مضمون پر مشتمل ایک منظوم کتاب مرتب کی ھے - سید حمزہ سے پہلے محمد کبیر نے " منوھر مدھو مالتی" نامی ایک پوتھی لکھی تھی - وہ چاٹگام کے

باشندے تھے - رنگ پور کے رہنے والے شاعر شاکر محمود نے اسی نام سے ایک پوتھی سنہ ۱۱۹۷ ب مطابق سنہ ۱۷۸۰ع میں مرتب کی - چاٹگام کے باشندے نور محمد نے " مدن کمار مدھو مالا " کتاب لکھی - سنہ ۱۲۱۰ ب مطابق سنہ ۱۸۰۴ع کے پھاگن مہینے میں سید حمزہ نے اپنی کتاب " حاتم طائی" مرتب کی - یہ ان کی آخری تصنیف تھی -

پچھلی صدی سے پہلے مسلمان شعراء نے منظوم افسانے نظم کی بندشوں میں رہ کر قلمبند کئے تھے - ان کی بعض بعض نظمیں آج بھی مسلمانوں میں مروج ہیں - کلکتہ یونیورسٹی کی مالی امداد اور سرپرستی کی وجہ سے مشرقی بنگال کے اضلاع میمن سنگھ اور چاٹگام کی بہت ساری رومانوی پوتھیاں منضبط اور مجتمع ہو چکی ہیں - ان میں سے ابتک چون ۵۴ پوتھیاں حلہ طبع سے مرصع بھی ہو چکی ہیں - ان میں سے اکثر نامعلوم شعراء کی تصنیفات ہیں - لیکن ان کے داخلی مضامین نمایاں شہادت دیتے ہیں کہ انمیں سے اکثر کے مصنف مسلمان شعرا تھے - کلکتہ یونیورسٹی کی جانب سے ان پوتھیوں کے مرتب آنجہانی رائے بہادر دینیش چندر سین نے بھی اعتراف کیا ہے کہ ان میں سے بتیس کتابوں کے مصنف مسلمان شعرا تھے - امریکہ اور یورپ کے تنقید نگاروں نے ان کتابوں

کی اشاعت پر اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مصنفین اور ناشرین کو خراج عقیدت پیش کیا ہے - کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر جناب ڈبلیو - وی - ایلن فرماتے ہیں :—

" In these Mymensingh ballads I found an instinct for original thinking, countless instances of individual sawaraj and a high ualue attatched to deeds in contrast to Passiveness— all of which confirmed my conviction on reading history that India could never have reached such age unless bearing within it the roots of unweakening youth. "

ان ہی تمام پوتھیوں میں سے ایک کا نام دیوانہ مدینہ ہے - مدینہ میں شوہر کی معتوب بیوی ہے - شوہر نے ظالمانہ طور پر قطع تعلق کرکے اسے طلاق دیدیا ہے - اس دردناک اور رحم آفریں قصے پر " دیوانہ مدینہ " کی بنیاد ہے - مسٹر این ' رونما ' رونلا اس کتاب کے متعلق فرماتے ہیں :—

I was specially delighted with the touching story of Muslims, which although only two centuries old, has an antique beauty and a purity of sentiment which art has rendered faithfully without changing. "

متوقع ہے کہ ڈھاکا یونیورسٹی اور راجشاھی یونیورسٹی، جو مشرقی پاکستان کے مراکز تعلیم ھیں ان تمام بے بہا ادبی ذخیروں کی فراھمی اور اشاعت میں کلکتہ یونیورسٹی سے پیچھے نہیں رھیں گی۔

تاریخی نظمیں :—

مسلمان شعراء نے اپنی نظموں میں مقامی تاریخ کو بھی قلمبند کیا ہے۔ میمن سنگھ گیتیکا (گیت) میں ھم عیسیٰ خاں، دیوان فیروز شاہ، دیوان بھانیا، دیوان منوھر خاں، آدھواسندری اور صورت جمال کے حالات مذکور پاتے ھیں۔ دیوان منوھر خاں کی نظم میں ھم بد نصیب شاہ شجاع کی سوانح حیات اور دیوان منوھر خاں کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم کا تذکرہ پاتے ھیں۔ دیہاتی پہلوان شمشیر علی کے تہورانہ کارناموں کا ذکر کرتے ھوئے شیخ منوھر نے "شمشیر غازیر گان" (شمشیر غازی کے گانے) مرتب کئے ھیں۔ بنگال کے نواب علی وردی خاں نے بے وفائی سے ان کا خاتمہ کیا۔

زین الدین کے مسند علی گیت :—

ضلع مدنی پور (مغربی بنگال) کے مقام ھجلی کے صاحب ریاست تاج خاں ھی مسند علی کی منظوم کہانی کے ھیرو ھیں۔
اس مختصر تذکرے میں ھم نے ستانوے مصنفین اور ایک

سوانحیس تصنیفات کا حال بیان کیا ہے ۔ ان میں سے صرف چھوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں ۔ دور وسطی کے ادب یا تجدید ادب کا تذکرہ کرتے وقت ہم عصر مسلمان شعرا اور مصنفین کا تذکرہ بھی لابدی اور ضروری ہے ۔ متذکرہ بالا بحث و تذکرے سے یہ اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے کہ دور وسطی میں مسلمانوں کی ادبی خدمات ہندو ادیبوں سے کسی حیثیت سے بھی کم نہ تھیں ۔ بلکہ انسانیت عامہ اور عنوانات ادب کے تنوع میں مسلمانوں نے اپنی ادب نوازی اور خدمت ادب کا دائرہ ہندؤں سے کہیں زیاد وسیع رکھا تھا ۔

باب چہارم

الاول

الاول دور وسطیٰ کے سب سے بڑے بنگالی شاعر ھیں - ان کا مختصر تذکرہ دوسرے شعراء کے عمومی تذکرے میں گذر چکا ھے - اب کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان کے متعلق بحث کی جائیگی -

یہ بتایا جا چکا ھے - کہ ان کا مولد فریدپور تھا - وہ غالباً سنہ ۱۵۹۲ع میں پیدا ھوئے تھے اور سنہ ۱۶۷۳ع میں راھی ملک عدم ھوئے - گردش زمانہ سے انھیں اپنے قیمتی لمحات حیات اراکان میں گذارنے پڑے - ان پر آرام کے دن اور تکلیف کی گھڑیاں دونوں ھی گذریں اور ھر طرح کے حالات میں انھوں نے اپنے علمی کاموں سے گہری دلچسپی کا ثبوت دیا - سنسکرت، بنگلا، عربی، فارسی اور ھندی زبانوں میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی - اپنے عہد میں وہ اپنی قابلیت اور لیاقت میں یکتا تھے - ان کا ایک سنسکرت اشلوک ملاحظہ ھو:—

"مرکُھا نانگ پروتیما دیبہ بپرو دیبو ھوَتا شنہ
جوگی نانگ پرا رتھنا دیبو دیبو دیبو نرنجنہ"-

انھوں نے خود ھی اس کا بنگلا میں ترجمہ کیا ھے:—

مورکھو شکلیر دیبو پَرَتیما شے شار

براھمن شبیر دیب اگنی ابوتار

جوگی شکلیر دیب آپتو مہاجن

شکل دیبر دیب پربھو نرنجن"

یعنی جاھلوں کے دیوتا بت اور تصویریں ھیں

برھمنوں کی دیوی اگنی اوتار ھے

سب جوگیوں کے دیوتا قابل اعتبار اور بڑے کامل ھیں

لیکن سب دیوتاؤں کے دیوتا پربھو نرنجن (خدائے قدوس) ھیں"۔

وہ پراکرت پنگل، جوگ شاستر، تصوف، علم العب، موسیقی اور شہ سواری وغیرہ علوم و فنون میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ایسی جامعیت کا کوئی دوسرا شخص اس زمانے میں ھمیں نظر نہیں آتا۔

الاول نے فارسی سے سکندر نامہ "وھفت پیکر" کے منظوم تراجم کئے تھے۔ تحفہ نامی مذھبی کتاب کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ ان کی "پدماوتی" ھندی "پدماوت" کا ترجمہ ھے ان تراجم کے علاوہ انھوں نے شاعر دولت قاضی کی ناتمام "ستی میناو لور چند رانی" نامی منظوم کتاب کی تکمیل کی تھی۔ خود بھی انھوں نے ایک مستقل کتاب "سیف الملوک بدیع الجمال" کے نام سے تصنیف کی تھی۔ اس قدر کثیر التصانیف شاعر بھی ھمیں

دو ر و سطی میں کوئی دو سرا نظر نہیں آتا ۔

الاول نے "بشنو پد" کے تتبع میں بھی نظمیں لکھی تھیں ۔ جس کا ایک مختصر اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے ۔ اس میں شریمتی رادھیکا او ر ان کی نند کے مابین سوال و جواب دکھا یا گیا ہے ۔ رادھا ایک صبح سو یرے جمنا سے پانی لانے گئی تھیں ۔ و ھاں کرشن کے ساتھ رنگ رلیوں میں وہ سارا دن گنوا بیٹھیں ۔ مانگ کا سیندو ر او ر آنکھوں کا کاجل سبھی مٹ گیا ۔ جسم کے خاص مقامات پر دست دراز یوں او ر پیش دستیوں کے نشانات دکھائی دینے لگے ۔ اس پر نندنے ان سے جواب طلب کیا ۔ لیکن چالاک رادھیکا نے انہیں ڈھٹھائی سے بر محل جو جوابات دئے ملا حظہ ہوں :—

" اے محبت کے رس کی لذت سے واقف نند تیرا طنز میں بر داشت نہیں کر سکتی "۔

سوال— " گھر والی بیوی او ر دنیا کی حسینہ ! تو تو صبح سو یرے جمنا ندی گئی تھی لیکن دن ختم کرکے رات آنے پر لوٹی ۔ بتا تو کس کام میں اتنی تاخیر کی ؟"

جواب " صبح صادق کے وقت میں نے کنول کے پھول دیکھے اور انہیں توڑنے کیلئے پانی میں اتری ۔ کنول توڑنے کی وجہ سے دن نکلتے وقت بھونرے نے مجھے ڈس لیا او ر میں بے چین ہو گئی ۔

کنول کے زھریلے کانٹوں میں میرے ھاتھ کا کنگن گسر گیا

اب کنگن کی تلاش میں غوطے لگاتے لگاتے میرا سارا دن ختم ہو گیا
اس طرح مانگ کا سیندور اور آنکھوں کا کاجل سب ہی
پانی میں بہہ گیا۔
یہ دیکھ میرا سارا جسم کنول کے خار دار درخت سے گھائل ہو گیا ہے۔
اے اعلیٰ گھرانے کی لڑکی اور اعلیٰ خاندان کی نشانی!
تیرا خاندان میں کوئی جواب نہیں۔"

مانگن ٹھاکور کا عقیدت مند الاول یہ کہتا ہے کہ دنیا کیلئے من موہنی رادھا (عورت) ہے"

الاول کے خلاف صرف ایک ہی بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ مترجم شاعر تو تھے لیکن مستقل موجد شاعر نہ تھے۔ لیکن دور وسطیٰ کے تمام تر شاعر مترجم ہی تھے۔ مستقل موجد شاعر کہیں بھی نہ تھے۔ اس لئے یہ الزام الاول کے درجے کو گھٹا نہیں سکتا۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان کے تراجم میں اصل کی شان نظر آتی ہے اور یہ کہیں بھی نہیں معلوم ہوتا کہ انہیں کسی دوسری زبان سے منتقل کیا گیا ہے۔ اس طرح کے موجدانہ تراجم بھی کچھ کم قابل تعریف نہیں ہیں۔ علاوہ بریں سیف الملک بدیع الجمال کو ان کا تخلیقی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس کا بنیادی خاکہ بھی انہوں نے فارسی شعرا ہی سے حاصل کیا تھا۔

هم ان تصانیف میں اس مسلمان شاعر کی بے مثال خالص اور اعلی درجے کی زبان کا استعمال دیکھ کر حیران رہ جاتے ھیں۔ اور اسی کی بنا پر ھمیں اس کی شاعرانہ عبارت آرائی اور اعلی لیاقت کا اعتراف کرنا پڑتا ھے۔

یہ امر قابل اطمینان ھے کہ الاول کی زندگی کے حالات ھمیں خود شاعر ھی کے ذھن و قلم سے مرتب کئے ھوئے دستیاب ھوئے ھیں۔ انھوں نے سکندر نامہ میں اپنے متعلق سب کچھ تفصیل سے فرمایا ھے۔ اس تشریح سے ھمیں معلوم ھوتا ھے۔ کہ ان کے والد فتح آباد کے حکمران مجلس قطب کے وزیر تھے۔ وہ اپنے والد کے ھمراہ کسی بحری سفر میں جا رھے تھے کہ راہ میں پرتگالی بحری لٹیروں نے ان کے والد کو شہید کر دیا اور وہ خود کسی طرح زخمی ھو کر راجا اراکان کے دربار میں پہنچے۔ راجا کے دربار میں پرتگالی امیر البحر انگلیس کا بہت اثر تھا اور اسی کی وجہ سے الاول کو اُس دربار میں کوئی مناسب جگہ نہ مل سکی۔ راجا کے گھوڑ سواروں میں انھیں ایک عہدہ ملا۔ اراکان کے مسلمان باشندے ان کا بہت احترام کرتے تھے اور وھاں وہ ایک گونہ آرام کی زندگی بسر کرتے رھے۔ وھاں کے رؤساء کے گھر پر وہ ڈراموں کے گیت اور موسیقی بھی سکھایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے

بہت ساری کتابیں تصنیف کیں ۔

الاول کی خوش اقبالی کا دور تھا کہ شاہ شجاع بنگال سے مفرور ہوکر اراکان کے دربار میں پناہ گزیں ہوئے ۔ بعض اسباب کی بنا پر شاہ شجاع سے راجا ناراض ہوگیا اور اس نے انہیں قتل کرا دیا ۔ غلط الزامات کی بنا پر الاول بھی معتوب ہوئے اور انھیں پچاس دنوں تک کیلئے قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں ۔ سیف الملک بدیع الجمال کے مقدمے میں وہ فرماتے ھیں کہ پچاس دنوں کیلئے انھوں نے بھی سنت یوسفی کا شرف حاصل کیا تھا ۔ قید سے رھائی کے بعد الاول کو معاشی دشواریاں پیش آئیں ۔ انھوں نے ایک بزرگ سید سعود شاہ کے دست مبارک پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی تھی ۔ پھر انھیں اپنے شیخ سے خلافت بھی حاصل ہوئی ۔ شاہ شجاع کی شہادت کے نو سال بعد انھوں نے ''سیف الملوک بدیع الجمال'' کی تصنیف مکمل کی اور گیارہ سال کے بعد راج وزیر مجلس نبراج کی زیر سرپرستی انھوں نے پھر اقبالمندی کا خوش آیند چہرہ دیکھا ۔

شاہ شجاع سنہ ۱۶۶۱ع کی ابتدا میں اراکان تشریف لائے تھے ۔ الاول کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ھے کہ اس واقعہ کے گیارہ سال بعد بھی وہ بقید حیات تھے ۔ انھوں نے اپنے اشعار

میں کبر سنی کا شکوہ کیا ہے - "تحفہ" کی تصنیف کے وقت بھی انھوں نے ضعیفی کی شکایت کی ہے - سیف الملوک میں وہ فرماتے ھیں -

"برِدھّو کا لے گر نتھو کرمو اُچت ناھوئے"- یعنی "ضعیفی میں تصنیف و تالیف نامناسب ہے"- سکندر نامے میں فرماتے ھیں— "تبے آمی نی بے د یلو ھوئیلو برِ دّھو کال"- یعنی "تب میں نے عرض کی کہ میری اب ضعیفی آگئی"- ھفت پیکر میں لکھتے ہیں - "جُداپی وُ جراجِر نو چنتا کول چت" یعنی "اگرچہ میں سال خوردہ اور متفکر ھوں"- اس سے معلوم ھوتا ہے کہ ضعیف العمری میں انھوں نے وفات پائی تھی -

شاعر کے ذاتی بیان سے یہی معلوم ھوتا ہے کہ ان کا سابق وطن فتح آباد کے موضع جلال پور میں تھا - پد ماوتی میں ھمیں ملتا ہے—

"ملک فتح آباد گوڑ تے پرودھان
تتھا تے جلال پور اتی پُنّو استھان"

یعنی مملکت گوڑ میں فتح آباد ایک نمایاں مقام ہے اور اس میں جلال پور بہت ھی مبارک جگہ ہے -

یہ فتح آباد موجودہ ضلع فرید پور میں ایک پرگنہ تھا - شاعر بجے گپت نے سنہ ۱۲۹۴ع میں فتح آباد کا تذکرہ کیا ہے - اس

پرگنہ فتح آباد کا موضع جلال پور رھی اغلباً شاعر الاول کا مرزبوم تھا - " بہارستان غیبی " میں فتح آباد کے حدود میں جلال پور کا نام مذکور ھے - خداھی جانے آج بھی وہ جلال پور زمین پر باقی ھے یا پدما ندی کی موجیں اسے بہالے گئیں -

شاعر الاول کے والد مجلس قطب کے وزیر تھے - " بہارستان غیبی " میں مجلس قطب کے حالات مذکور ھیں - صوبہ دار بنگالہ اسلام خاں کے حکم سے ان کے سپہ سالار شیخ حبیب اللہ نے مجلس قطب کی سلطنت فتح آباد پر دریا کی جانب سے حملہ کیا تھا - بھوشنا کے زمیندار " شتّر و جیت " نے بھی ان کا ساتھ دیا - لیکن مغل فوجیں فتح آباد پر قابض نہ ھو سکیں - (صفحہ ۵۹-۶۰) اسلام خاں نے پھر دوبارہ اپنے سپہ سالار حبیب اللہ ' شترو جیت اور متعدد دوسرے سرداروں کو فتح آباد کی فتح کیلئے جلال پور بھیجا مجلس قطب نے عاجز آکر ہتھیار ڈال دئیے لیکن پھر اسلام خاں نے ان کا علاقہ انھیں بخش دیا (صفحہ ۸۸) -

الاول نے یہ لکھا ھے کہ پرتگالی امیر البحر انگلیس کی وجہ سے انھیں کوئی بڑا عہدہ نہ مل سکا - اکولیس یا انگلیس دراصل گنگلیس کا بگڑا ھوا تلفظ ھے - اس کا پورا نام " Sebastio Gonsalve Tibau " تھا - اس نے سنہ ۱۶۱۰ع میں جزیرۂ سندیپ پر قبضہ کر لیا تھا - اسی زمانے میں انھیں سلیم شاہ نواب اراکان (Mang Radzagai ,

(دور حکومت سنہ ۱۵۹۳ع تا سنہ ۱۶۳۲ع) نے امیرالبحر مقرر
کیا تھا - لیکن اس کے بعد اُس نے غداری کی (ملاحظہ ہو
History of portugees in India by G. G. A. campos) -
اغلب ہے کہ الاول سنہ ۱۶۱۰ع میں پرتگالی ڈاکوؤں سے بچ کر
اراکان آئے تھے کیونکہ وہی زمانہ کنگلیس کے درباری اقتدار
کا تھا - غالب گمان یہ بھی ہے کہ انھوں نے اکیاسی سال
کی عمر میں سنہ ۱۶۷۳ع میں وفات پائی - اس حساب سے
ان کا سال پیدائش سنہ ۱۵۹۲ع ہوتا ہے -

شاعر الاول کی سب سے عظیم الشان تصنیف " پدماوتی "
ہے - ملک محمد جائسی کی ہندی " پدماوت " سے ترجمہ
کرکے الاول نے اسے اپنایا ہے - جائسی کی پدماوت کا سال تصنیف
سنہ ۹۴۷ھ مطابق سنہ ۱۵۲۰ع ہے - یہ زمانہ شیر شاہ کی
حکومت کا تھا - الاول نے اراکان کے راجا "کھدو منتار" کے
زمانہ (سنہ ۱۶۴۵ع تا سنہ ۱۶۰۲ع) میں یہ کتاب تصنیف کی تھی -
سیف الملوک بدیع الجمال کی تصنیف کا زمانہ سنہ ۱۶۵۸ع انھوں
نے خود ہی متعین کیا ہے -

پدماوتی الاول کی ضعیفی سے پہلے کی تصنیف ہے - اس
کی ترتیب کا تخمینی زمانہ سنہ ۱۶۴۶ع کہا جاسکتا ہے -

الاول کی دوسری اہم تصنیف " سیف الملوک بدیع الجمال "

ھے - یہ فارسی افسانوں کے تتبع میں لکھی گئی ھے - الاول نے ماگن ٹھاکر کی حوصلہ افزائی سے سنہ ۱۶۵۸ع میں اس کی تصنیف شروع کی - لیکن ماگن کی وفات کی وجہ سے دل شکستہ ھوکر انھوں نے یہ کتاب ویسی ھی بے کار رکھ چھوڑی - پھر سید موسیٰ نامی ایک رئیس کی ھمت افزائی سے الاول نے وہ کتاب مکمل کی - اس کی تاریخ تکمیل اغلباً سنہ ۱۶۷۰ع ھے - اس کتاب میں ایک شاھزادہ سیف الملوک اور ایک پری شاھزادی بدیع الجمال کے عشق کی داستان بیان کی گئی ھے -

الاول کی تیسری کتاب " ستی مینا و لور چندرانی " کا آخری یا تکمیلی حصہ ھے - اراکان کے راجا شری شودھرما ، کے دور حکومت (سنہ ۱۶۲۲ تا سنہ ۱۶۳۸ع) میں دولت قاضی نامی ایک شاعر نے اس کتاب کی تصنیف شروع کی تھی - لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ھی وہ راھی ملک عدم ھوئے - الاول نے راجا اراکان شری چندر شودھرما کے وزیر سلیمان کی حوصلہ افزائی سے سنہ ۱۰۷۰ھ مطابق سنہ ۱۶۵۹ع میں اس کتاب کی تکمیل کی -

ماگن ٹھاکور کی وفات کے بعد الاول غالباً کسی مسلمان رئیس کے سایۂ عاطفت میں آگئے تھے - اس نظم میں رانی مینا ستی، راجا لور

اور راج کماری چندرانی کے عشق و محبت کے افسانے بیان کئے گئے ھیں - بڑے بڑے امتحانات کے باوجود رانی مینامتی کی شوھر سے بے نہایت محبت کا حال بڑے ھی دلکش انداز میں بیان کیا گیا ھے -

شاعر الاول کی چوتھی تصنیف " ھفت پیکر " ھے - اصلی کتاب سنہ ۱۱۹۹ع میں مولانا نظامی گنجوی نے فارسی نظم میں تحریر کی تھی - اغلب ھے کہ سنہ ۱۶۶۰ع میں شاہ شجاع کے بہیمانہ قتل سے پہلے ھی الاول نے اس کا ترجمہ منظوم کیا تھا - اس داستان میں ایرانی شہریار بہرام اور ان کی سات ملکاؤں کے حالات مذکور ھیں - اراکان کے راجا شری چندر شودھرما کے زمانہ (سنہ ۱۶۲۲ع تا سنہ ۱۶۳۸ع) میں ان کے وزیر افواج محمد خاں کے حکم سے الاول نے یہ تصنیف مرتب کی -

شاعر الاول کی پانچویں تصنیف " تحفہ " کا ترجمہ ھے - یہ ایک مذھبی کتاب ھے - اصلی کتاب یوسف گدانے سنہ ۷۹۰ھ مطابق سنہ ۱۳۹۳ع میں تصنیف کی تھی - الاول کے ترجمہ کرے کی تاریخ سنہ ۱۰۷۳ھ مطابق سنہ ۱۶۶۳ع اور تکمیل کی تاریخ روز دو شنبہ - ۱۴ - شعبان سنہ ۱۰۷۶ھ ھے -

شاعر الاول کی چھٹی اور شاید آخری تصنیف " سکندرنامہ "

ہے۔ اصلی کتاب سابق الذکر مولانا نظامی کی تصنیف ہے۔ اس نظم میں یونان کے بادشاہ سکندر اور ایران کے بادشاہ دارا کے درمیان معابارت کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ سب سے آخر میں سکندر کی فتح دکھائی گئی ہے۔

الاول نے غالباً سنہ ۱۶۷۲ء میں اراکان کے راج وزیر مجلس نبراج کی حوصلہ افزائی سے اس کتاب کا ترجمہ شروع کیا۔ اس کتاب میں مقطع سے پہلے اکثر مقامات پر مندرجہ ذیل صوفیانہ طرز کا شعر ملتا ہے :—

" آئشو گرو پریم شورا دیو مورت بھری
جار پانے مترو لابھ اپنا پاسری "

یعنی اے گرو آؤ مجھے شراب محبت سے بھرا ہوا پیالہ پلاؤ جسے پی کر میں اپنے آپ کو بھول جاؤں اور محبوب کو حاصل کر لوں۔

غالب گمان ہے کہ الاول نے اور کتابیں بھی تصنیف کی تھیں لیکن ان کتابوں کا کوئی سراغ ابتک دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔

باب پنجم

دو بھاشی پوتھی ادب کا سب سے پہلا شاعر غریب اللہ شاہ

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ گوڑ کے الیاس شاہی سلاطین کے عہد سے دور وسطی کے بنگالی ادب کی نشو و نما ہوئی تھی - اس وقت سے شروع کر کے پٹھان حکومت کے آخر تک ہندو اور مسلمان شعرا کی ادبی زبان ایک ھی طرح کی تھی - مغلیہ سلطنت کی ابتدا سے بنگلا زبان فارسی اور اردو سے متاثر ہونے لگی - تا ہم سنہ ۱۷۰۰ع تک ملک بنگال میں گوڑ کے سلطانی دربار کی تاثیر برقرار رھی -

اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں جب مرشد آباد صوبہ بنگال کا دارالسلطنت ہوا تو بنگلا زبان میں بکثرت فارسی اور اردو الفاظ کی آمیزش شروع ہوئی - البتہ ابتداءً بات چیت کی زبان (روز مرہ) ہی اس سے متاثر ہوئی - اُس زمانے کے تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان اپنی گفتگو میں فارسی و اردو سے مخلوط بنگلا بے تردد استعمال کرتے تھے - ہندو مصنفین سنسکرت سے متاثر ہو کر اپنی ادبی زبان میں حتی المقدور مسلمانوں کے مخصوص الفاظ کے استعمال سے محترز رہتے تھے - لیکن مسلمان شعرا بے دریغ عام

گفتگو کی زبان سے ادب کے دامن کو سنوارتے تھے - اسی طرح دوبھاشی (دو زبانیں - مسلمانی اور بنگالی) پوتھی ادب کی ابتدا ہوئی - ہمیں جس قدر شواھد مسیر آئے ھیں ان کی بنا پر ہم کہہ سکتے ھیں کہ غریب اللہ شاہ اس ادب کے اول ترین مصنف ھیں -

غریب اللہ شاہ بلیا حافظ پور کے باشندے تھے - ان کے والد کا نام شاہ ُدندی تھا - اغلب ھے کہ یہ مقام معربی بنگال میں ضلع ھوڑہ کے حدود میں واقع تھا - غریب اللہ ایک مشہور پیر بڑے خاں کے عقیدت مند تھے - انھوں نے امیر حمزہ کی داستان مرتب کی لیکن اسے مکمل نہ کر سکے - سید حمزہ نامی ایک اور شاعر نے اسے تکمیل تک پہنچایا - اس کتاب کی اصل کوئی اردو یا فارسی داستان ھوگی اسلئے کہ وہ خودھی اس کے مقر ھیں " ادھین غریب کہے کتاب دیکھیا" یعنی فقیر غریب اللہ کتاب دیکھ کر کہتا ھے - یہ بتا دینا ضروری ھے - کہ یہ داستان حضرت امیر حمزہ کے متعلق فرضی اور خیالی واقعات شجاعت پر مبنی ھے لیکن اس کا انداز بیان اور معاربات کے حالات بڑے دلکش اور عام پسند انداز میں بیان کئے گئے ھیں - اس کے علاوہ غریب اللہ کی اور بھی تصنیفات ھیں لیکن مطبع والوں نے دوسروں کے نام سے انھیں منسوب کر دیا - یہ بات کتاب کے مضمون اور دوسری اندرونی

شہا دتوں سے معلوم ہوتی ہے -

۱- یوسف زلیخا - منسوب بہ شاعر منشی فقیر محمد صاحب - اس میں مروجہ طور پر حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کا قصہ بیان کیا گیا ہے - زلیخا کے حسن کا بیان بڑے دلکش انداز میں کیا گیا ہے - کتاب کے ضمیمے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے اوائل میں لکھی گئی تھی -

۲- جنگ نامہ - یہ کتاب شاعر یعقوب علی مرحوم کی طرف منسوب ہے - اس کتاب میں واقعات کربلا کا ذکر ہے اور مصنف نے خود عتراف کیا ہے کہ اس کتاب کے مضامین ایک فارسی کتاب موسوم بہ مقتل حسین سے ماخوذ ہیں - کتاب میں مصنف کے والد کا نام کہیں کہیں شاہا دُندی بتایا گیا ہے اور پیر بڑے خاں غازی کی بھی مدح کی گئی ہے - اس سے یہ بات متیقن ہوتی ہے کہ اس کتاب کے مصنف دراصل غریب اللہ ہی ہیں - اس کتاب میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بیان بہت درد انگیز عبارت میں کیا گیا ہے - نموناً ترجمہ ملاحظہ ہو :-

"جب کافر سینے پر بیٹھا
اور امام کا سر جسم سے الگ کیا
بہشت و دوزخ وغیرہ

عرش کرسی لوح قلم کے ساتھ مِل کر رونے لگے

آسمان، زمین، پہاڑ اور باغ و غیرہ

کربلا کے میدان میں رو رو کر بے قرار ہو گئے

آفتاب ماهتاب - سب سیاہ ہو گئے

جانور، ہرن اور پرندے سب رونے لگے

غم کی وجہ سے بچے نے ماں کا دودھ چھوڑ دیا

امام کی جدائی سے سب لوگ مایوس ہو گئے

شیر، ریچھ، بھینس اور گینڈے سب رونے لگے

زار زار رو کر انھوں نے اپنے بچوں کو دودھ نہیں پلایا

گائے نے اپنے بچھیڑوں کو دودھ پلانا بند کر دیا

بچھیڑوں نے بھی دل میں غم کی وجہ سے کھانا پینا چھوڑ دیا

شہر کی مکھی اور بھونرا اُداس ہو کر رونے لگے

گھر کی بہو کونے پر گھڑے رکھ کر رونے لگی

مالی اور مالن بال پریشان کر کے اور یہ کہہ کے رونے لگے

" افسوس کہ امام گذر گئے اب ہم کسے پھول دیں گے"

یزید کی فوج میں بھی جتنے مسلمان تھے

امام کی شہادت پر زار زار رونے لگے -"

گذشتہ صدی کے مشہور مصنف میر مشرف حسین نے اپنی

"بشاد شیندھو" کتاب (جس میں کربلا کے واقعات بیان کئے گئے ہیں)

میں بعض حصے اس جنگ نامے سے بھی اخذ کئے ہیں -

۳- سونا بھان - یہ کتاب شاعر سید حمزہ کی طرف منسوب کی گئی ہے لیکن سید حمزہ کی کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ہے- اس کتاب میں محمد حنیفہ کے ساتھ تنگی شہر کی رانی سونا بھان کی جنگوں کے حالات درج کئے گئے ہیں - عوام میں مشہور ہے کہ محمد حنیفہ نے لڑائی میں اسے مغلوب کر کے زیگون (زیتون)' ملیکا آکار' سمر تو بھان وغیرہ پہلوان خواتین دو مسلمان کیا اور انھیں اپنے عقد نکاح میں لائے - یہ بتانا لا حاصل ہے کہ یہ سارے افسانے محض فرضی اور خیالی ہیں جن کا اصلیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں -

شتو پیر ر پوتھی - یہ منشی واجد علی صاحب کی طرف منسوب ہے - اس کتاب میں بنگال کے ایک فرضی پیر مشہور بہ " ستیہ پیر" کی کہانی بیان کی گئی ہے - ہم نے پہلے ھی عرض کیا ہے کہ ستیہ پیر کا قصہ سولہویں صدی عیسوی میں فیض اللہ نے مرتب کیا تھا - ان کے تتبع میں چند اور مسلمانوں نے بھی یہ قصہ لکھا ہندؤں میں کثرت سے اس کے مصنف پائے جاتے ہیں - ایک زمانے میں ستیہ پیر کے عقیدت مند ہندو اور مسلمان دونوں ھی کثرت سے تھے -

شاہ غریب اللہ نے جس طرز ادا ' عبارت آرائی اور زبان کی ابتدا کی تھی وہ اگرچہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی بنیاد کے

بعد سے تعلیم یافتہ طبقے میں رفتہ رفتہ معدوم ہوکر رہ گئی لیکن عام مسلمانوں میں اس کا رواج ابتک باقی رہا اور ہے - آج بھی وہ داستان امیر حمزہ یا رستم کا افسانہ پڑھ کر جوش میں آ جاتے ہیں - کبھی شہدائے کربلا کا بیان پڑھ کر عقیدت کے آنسو پیش کرتے ہیں - اسی طرح کبھی حاتم طائی کی سخاوت کے بیانات سے متاثر ہو کر ان کا دل رحم و کرم اور فیاضی کے جذبے سے معمور ہو جاتا ہے اور سامعین کھانا پینا' آرام و آسائش اور دنیا داری یا اپنی معاش کی فکروں سے بھی کچھ دیر کیلئے آزاد ہو جاتے ہیں -

باب ششم

بھارت چندر

دور وسطی کے آخری بہترین شاعر " بھارت چندر رائے گنا کر "
ہیں ۔ وہ قسمت بردوان میں بھرست پرگنہ کے موضع پینڑو میں
تقریبا سنہ ۱۷۱۲ع میں پیدا ہوئے تھے - ان کے والد ایک
زمیندار تھے جن کا نام راجا نریندرو نارائن رائے تھا ۔ یہ اپنے
والد کے سب سے چھوٹے فرزند تھے ۔ مہاراجا بردوان کے ساتھ
جھگڑے کی وجہ سے نریندرو رائے نے اپنا سب کچھ کھودیا -
بھارت چندر نے اپنا آبائی مسکن ترک کر کے ماموں کے گھر
پناہ لی - یہاں کے قیام میں انھوں نے سنسکرت زبان سیکھی -
چودہ سال کی عمر میں انکی شادی ہوگئی - ان کے بڑے
بھائیوں نے انھیں اس بات پر ملامت کی کہ وہ سرکاری زبان
سے منھ موڑ کر سنسکرت کی طرف کیوں مائل ہوگئے - انھوں
نے اس رنج میں اپنا گھربار چھوڑ کر ہوگلی کے قریب
دیبانند پور آکر وہاں کے مشہور فارسی داں منشی رام چندر
کے گھر پر قیام کیا اور فارسی زبان سیکھی - اسی زبان میں
انھوں نے ستیہ نارائن کی عظمت اور عقیدت سے متاثر ہوکر
دو نظمیں بنگلا زبان میں لکھیں - بیس سال کی عمر میں

فارسی زبان سے بہرہ وافر لے کر وہ اپنے وطن واپس آئے - اس زمانے میں ان کے والد کو مہاراجا بردوان سے کچھ جائداد اجارے پر ملی تھی - ان حالات میں بھارت چندر اپنے والد اور بھائیوں کی طرف سے مختار عام ہوکر بردوان راج کے دربار میں نمائندہ مقرر ہوگئے - لیکن سرکاری محاصل کو بر وقت نہ ادا کرنے کی وجہ سے مہاراجا بردوان کی طرف سے وہ زمینداری سے بے دخل کر دئے گئے اور اس جرم میں بھارت چندر کو مہمان زنداں بھی ہونا پڑا - کسی تدبیر سے وہ قید خانے سے رہائی پاکر مرھٹوں کے زیر سایہ کٹک پہنچے - وہاں بھیس بدل کر انھوں نے پندرہ سولہ سال گذارے - پھر چالیس سال کی عمر میں وہ نودیپ کے راجا کرشن چندر کی مصاحبت میں آگئے اور انھیں چالیس روپیہ ماہوار مشاھرہ ملنے لگا راجا نے ان کی شعر گوئی کی مہارت سے متاثر اور مسرور ھوکر انھیں " رائے کوناکر " کا خطاب دیا - راجا کی ہدایت سے انھوں نے "انّو دا منگل" نامی ایک منظوم داستان لکھی - اس میں بھوانند مجمدار کا قصہ تھا جس میں بدیا و سندر کی کہانی بھی ذیلی طور پر بڑھائی گئی - یہ بھارت چندر کی بہترین تصنیف ھے - بھوانند مجمدار کے قصے کے ضمن میں شاھنشاہ اکبر کے سپہ سالار مان سنگھ کے ساتھ بنگال کے راجا پرتا پا دیتیہ کی جنگوں کے حالات بھی

مذکور ھیں - اس کتاب کی تاریخ تصنیف سنہ ۱۷۵۲ء ھے - بھارت چندر نے ایک اور منظوم کتاب "رسو منجری" کے نام سے مرتب کی - ان دو کتابوں کے علاوہ انھوں نے بنگلا ، ھندی اور سنسکرت میں چھوٹی چھوٹی منظوم کتابیں لکھیں - انھوں نے ایک ڈراما کی تشکیل بھی شروع کی تھی جس کا نام "چنڈی ناٹک" تھا لیکن یہ مکمل نہ ھو سکا - یہ ھندی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں لکھا گیا تھا - بھارت چندر نے سنہ ۱۷۶۰ء میں وفات پائی -

بھارت چندر نے بہت ساری بحریں اپنی نظموں میں استعمال کی ھیں - اس مناسبت سے انھیں علم عروض کا بادشاہ کہا بھی مبالغہ نہ ھوگا - دور وسطیٰ کے کسی شاعر نے بھی علم عروض والی بحروں کا اس کثرت کے ساتھ استعمال نہیں کیا -

واقعات اور اس کے متعلق اشخاص کی عکاسی کے فن میں انھیں صرف دو ہی مکند مکندو رام کے مماثل کہا جا سکتا ھے - انودا منگل کے پہلے حصے میں انھوں نے شیو اور درگا کی کہانی بیان کی ھے لیکن انھیں بالکل انسانی روپ میں پیش کیا ھے - ھم انھیں ایک بنگالی شریف گرھست کی صورت میں ایک مفلوک الحال اور کثیر العیال انسان جیسا پاتے ھیں - ان کے حالات پڑھ کر ھم انھیں دیوتا کے بجائے ایک انسان سمجھنے پر مجبور ھوتے ھیں - مثال کے طور پر ملاحظہ ھو :- (ترجمہ نظم)

میرا بوڑھاپا ہے کوئی روزگار نہیں جانتا
کاشتکاری اور کاروبار بھی نہیں ہے

سب لوگ احمق کہتے ہیں دھوکا دیکر سب لے لیتے ہیں
فقط نام ہی باقی رہ گیا ہے

میں جس قدر کماتا ہوں کچھ باقی نہیں رہتا
مگر پھر بھی بھوک باقی ہی رہتی ہے

اس گھر میں رہ کر کیا خوشی ہے
یہہ کہہ کر شیو بیل پر سوار ہوئے
اور بھیک مانگنے کیلئے نکلے

شیو کی یہ حالت دیکھ کر دُرگا نے غصے میں آ کر کہا
میں اکیلی گھر پر رہ کر کیا کروں گی

میں بھی خواہ مخواہ دکھ جھیلتی ہوں
بہتر ہے کہ میں بھی باپ کے گھر چلی جاؤں
گنیش اور کارتک بھی میرے ساتھ چلیں

جس گھر کا گھر والا ہی ایسا ہے
اس گھر کی گھر والی کیوں رہے گی
گھر میں کچھ بھی نہیں ہے مگر سب ہی طرف سے کیا کھاؤں کیا
کھاؤں کی آواز آتی ہے۔

صرف سو کھڑ پنے سے کیا آنا جاتا ہے

جب کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جھمیلا لگاھی رھتا ہے

لچھمی تو آتی ہے لیکن اس گھر میں قدم نہیں جماتی

ایشوری ملاحن اور ھیرا مالن وغیرہ کے کیرکٹر بھی تصویر کی طرح نمایاں ھیں - لڑائی ، طوفان ، کھانا پکانا ، بڈیا کے سراپا کا تذکرہ وغیرہ سب ھی بیان بہت عمدہ طریقے سے کیا گیا ہے ۔ ان کی تصنیفات سے ھر طرح کے صنائع لفظی و معنوی کی عمدہ مثالیں ملتی ھیں -

بھارت چندر نے اپنی تصنیفات میں بہت سے ضرب الامثال استعمال کئے ھیں جس سے ان کی عبارت دلکش اور عوام پسند ہوگئی ہے کہیں کہیں ان کے مستعمل کلمات ھی نے بعد میں ضرب الامثال کی صورت اختیار کر لی ہے - نمونہ ملاحظہ ہو :—

الف ۔ بد نصیب کی نظر پڑنے سے دریا بھی سوکھ جاتا ہے -

ب ۔ یا تو مقصد حاصل کرنا یا مرجانا (تخت یا تختہ)

ج ۔ بھینڑے کی سینگ میں پھنس کر ھیرے کی دھار بھی ٹوٹ جاتی ہے -

د ۔ بڑوں کا پیار ریت کے تیلے کی طرح ہے - کبھی ھاتھ میں رسی اور کبھی ھاتھ میں چاند -

ہ۔ جس کا کام اُسی کو بھاتا ہے - دوسرے کیلئے لاٹھی بجتی ہے -

و۔ لالچ دے کر اگر جال پھیلا یا جائے تو جانور، پرند، سانپ اور مچھلی میں سے کوئی بھی نہیں پھنسے گا -

ان کی تصنیفات سنسکرت وغیرہ وغیرہ علم البیان کے معروف نورس سے معمور ہیں - اس اعتبار سے اگر انھیں رس ساگر کا لقب دیا جائے تو نہایت موزوں ہوگا - بعض لوگ انھیں عریاں نگاری کا ملزم قرار دیتے ہیں لیکن انھیں جاننا چاہئے کہ کام شاستر (کوک شاستر) ہندوستان کا ایک قدیم علم ہے - ایک شاعر کیلئے اس کو جاننا قابل تعریف ہی کہا جاسکتا ہے اور ہم اسے قابل مذمت نہیں کہہ سکتے - کالی داس نے جس طرح دشمنت اور شکنتلا کی خفیہ شادی کا حال بیان کرکے اسے حاملہ کی صورت میں پیش کیا ہے اسی طرح بھارت چندر نے بھی سندر اور ودّیا کے حالات پیش کئے ہیں - اس خفیہ شادی کو قدیم ہندو شاستر میں "گندھرب بیباہو" (Gandharva vivaha) کہتے ہیں - اور ان کے نزدیک یہ جائز تھا - اس وجہ سے بھارت چندر کی عریاں نگاری انکے شاستر اور دھرم کے خلاف نہیں کہی جاسکتی - البتہ زن و شو کے پوشیدہ تعلقات اور معاملات کا کھلم کھلا اظہار اِس زمانے کے مذاق کے خلاف ہے - تاہم بھارت چندر کے زمانے

میں مذاق مختلف تھا - اس لئے اِس زمانے کے اخلاقی پیمانے سے بھارت چندر کو ناپنا مناسب نہیں ہو گا - ہم جانتے ہیں کہ وہ خود مذہبی اور اعلی کیرکٹر کے انسان تھے - اس وجہ سے ان کے عریاں بیانات پر ہم ان کے کیرکٹر کو قیاس نہیں کر سکتے - آنجہانی دینیش چندر سین نے کہا ہے کہ بھارت چندر کی عریاں نگاری اور ہیرا مالن کٹنی (دلالہ) کیلئے فارسی ادب ذمہ دار ہے - لیکن جو لوگ سنسکرت ادب سے خاصی واقفیت رکھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس عریاں نگاری اور دلالہ کی آورد کیلئے بھارت چندر کو بھارت سے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی - جو لوگ خوب صورت برہنہ تصاویر اور مورتوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں وہ عریاں نگاری پر کیا حرف زنی کر سکتے ہیں - دونوں ہی میں صنعت اور خوبی کی ضرورت ہے - اور بھارت چندر میں اس کی کثرت پائی جاتی ہے - ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ بھارت چندر نے راجا، راجا کے مصاحب اور نوجوانوں کی دلجوئی اور تسکین نفس کیلئے بد یا سندر کا قصہ مرتب کیا تھا - یہ کتاب کسی نابالغ بچے کیلئے نہیں لکھی گئی تھی - بھارت چندر میں ایک نقص ضرور ہے کہ ان میں محاسن لفظی کی حد تک محاسن معنوی کی گہرائی نہیں ہے -

بھارت چندر کی عبارت آرائی پر اب ہم کچھ تبصرہ کریں گے - ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ سنسکرت کے علاوہ فارسی اور ھندی (اردو) میں بھی مہارت رکھتے تھے اور ان کے زمانے میں چونکہ مرشد آباد صوبۂ بنگال کی راجدھانی تھا اسلئے اسی اطراف کے بنگالی ادب میں درباری اثر سے عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش بہت کثرت سے ہو رہی تھی - یہی سبب تھا کہ بردوان ڈیویزن میں دو بھاشی (عربی، فارسی و اردو مخلوط) پوتھی ادب کی ایجاد ہوئی جس کے قدیم ترین مصنف غریب اللہ شاہ تھے - غریب اللہ شاہ کے متبع شاعر سید حمزہ بھی بھارت چندر کی طرح بھرسٹ پرگنہ کے باشندے تھے - ہم یہاں بطور نمونہ انکی عبارت کا کچھ حصہ پیش کرتے ہیں :—

مان شنگھو جوڑ ھاتے انجلی باندھیا ماتھے
کہے جہاں پناہ سلامت
رام جی ر قدرتے مہم ھوئیلو فتح
کیبل تو ماری کرامت
حکم شاھنشاھی آر کچھو ناھی چاھی
زیر ھوئیلو نمک حرام

غـــلام غـــلامی کوئیلـــو ظالم قیـــد ھـــوئیلـــو
بھـــادری صاحبیـــر نـــام

پادشا ھوئیلا خـــوشی کہیتے لاگیـــلا توشی
کہـــو رائے کی چاھـــو انعـــام

کہے مان شنگھـــو رائے غـــلام انعـــام چائے
انعـــام شے جـــاھے رھے نـــام

گیا چھینـــو بنـــگلائے تھے کچھو نو بـــتروائے
سات روز دارن بادلے

دستر لشکـــر ھوئیلـــو ابـــو شیش جاھا روئیلـــو
اوپـــو باشی شھـــودل بلـــے

بھبا نند مجمـــدار نـــام خـــوب ھـــوشیار
بنـــگالی بامھن اے ئی جن

شپنا ھو خـــوراک دیلـــو شکلـــے رے بانچائیلـــو
فتـــح ھوئیلـــو ایھـــاری کارن

مذکورہ بیس مصـــرعـــوں میں تیس عربی اور فـــارسی
الفاظ مستعمل ھیں ۔

اگر پلاسی کے میدان میں بنگال کی قسمت کا ستارہ غروب
نہ ھوا ھوتا تو ممکن تھا کہ یہی مخلوط زبان بنـــگال کے

ھندؤں اور مسلمانوں کی متعدد کوششوں سے ادب کی زبان جیسی ھو جاتی - لیکن دور مغلیہ کی اس عربی و فارسی و اردو مخلوط زبان کا پائدار نقش مسلمانی دو بھاشی پوتھی کے ادب میں ھی باقی رہ گیا ھے - انقلاب حکومت کی وجہ سے زبان کا موڑ اردو و فارسی کی طرف سے پلٹ کر پٹھانوں کے دور کی طرح سنسکرت کی طرف آگیا - اب اس دوسرے انقلاب حکومت سے زبان کا رخ کس طرف مڑے گا اُسے مستقبل ابھی اپنے دامن میں چھپائے ھوئے ھے -

---

حصۂ سویم

پہلا باب

برطانوی دور میں بنگلا ادب کا
سیاسی و سماجی پس منظر

محمد عبد الحی ——— مترجم —مولانا عبد الرحمٰن بیخود

پہلا باب

سیاسی اور سماجی پس منظر

اٹھارھویں صدی کے بہت پہلے ھی سے یورپ کی متعدد قومیں تاجرانہ اغراض سے پاک بھارت برصغیر میں آگئی تھیں - ان قوموں میں پرتگالی، ولندیز، انگریز اور فرانسیسیوں کے نام نمایاں طور پر قابل ذکر ھیں - ڈنمارک اور جرمنی کے باشندے بھی ان کے دوش بدوش دیکھے جاتے تھے - بنگال، بہار اور اڑیسہ کی تجارت پر اجارہ داری کی نیت سے یورپ کی ان اقوام نے اٹھارھویں صدی کے وسط میں باھمی رقابت کا بھی اچھی طرح مظاھرہ کیا تھا - اس ملک کے حاکمانہ انتظامات کی کمزوری اور یہاں کے بے دست و پا عوام کی قوم پرستی اور اُن کی وطنیت کے جذبے میں اضمحلال سے فائدہ اٹھا کر سنہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کی آڑ میں شکار کھیلنے والے ھوشیار اور چالاک انگریزوں نے اس ملک پر غیرمتوقع طور سے سیاسی اقتدار اور دور رس اختیارات حاصل کر لئے - پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کی شکست نے صرف ایک حکمراں کی بیخ کنی اور دوسری سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط ھی نہیں کیا بلکہ اس برصغیر کی ہزار سالہ تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا - کلائیو جیسے

چالاک لوگوں نے لڑائی میں فتحیاب ھوتے ھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار بڑی مضبوط اساس پر قائم کرنے کیلئے تمام تر راستوں کو ہموار اور ان میں حائل ہونے والے پتھروں کو مسمار کیا۔ اور اس طرح یہاں کے بسنے والوں کی روز مرہ معاشرت میں ایک ھمہ گیر تغیر واقع ھو گیا۔

سنہ ۱۷۵۷ع میں کلائیو نے اگرچہ نواب سراج الدولہ کو شکست دیکر میرجعفر کو نام کیلئے نواب بنایا تھا اور وصولی محاصل کی ذمہ داری خود اپنے ھاتھوں میں رکھی تھی، تاھم محب وطن اور آزادی پسند انسانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنجۂ اقتدار سے نجات حاصل کرنے کیلئے کوششوں میں دمی نہیں کی - اس مقصد کیلئے میر قاسم نے انگریزوں سے متعدد لڑائیاں لڑیں۔ محدود طاقت اور رکاوٹوں کے باوجود یہ بات ھمیں نظر آتی ھے کہ میر قاسم نے بنگال کی آزادی کیلئے ھر طرح کی جد و جہد کی۔

میر قاسم کے خاتمے پر سنہ ۱۷۶۵ع میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی نظامت خود اپنے ھاتھوں میں سنبھال لی۔

بنگال کو اس وقت "ملک زریں" کہا جاتا تھا غیر منقسم بنگال جیسے وسیع خطے پر اقتدار حاصل کر کے دولت کے بندے یعنی مالکان کمپنی کے دست حرص و آز اور پنجۂ ھوس کی بھوک حدود عدل وانصاف سے بہت آگے بڑھ گئی اور ساتھ ھی عوام

الناس کے دکھ درد کی مصیبت بھی بے قیاس حدتک زیادہ ہو گئی۔ سنہ ۱۷۶۶ع کا مشہور قحط بھی اس انقلاب ھی کا نتیجہ تھا ۔ بنکم چندر کی " آنند مٹھ " نامی کتاب میں اس کی طرف کچھ اشارے پائے جاتے ھیں ۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس ملک کا اقتدار اعلیٰ اپنے ھاتھوں میں لینے کے بعد ھی یہاں کی زمین داری اور کاشت کاری کی اصلاح کی جانب قدم بڑھایا ۔ سنہ ۱۷۸۸ع سے سنہ ۱۷۹۳ع تک اصلاح زمین کے سلسلے میں جو کوششیں ھوئیں ان کے غیر معمولی اثرات سنہ ۱۷۹۳ع کے بندوبست استمراری میں ھمیں نمایاں نظر آتے ھیں لیکن اس پر بھی زمین کا بندوبست کرنے والے حکمراں مطمئن نہ ھوئے ۔ بنگال کی ساری زرعی زمین کے مقابلے میں اُسوقت لاخراج زمین کی حیثیت بہت معمولی نہ تھی ۔ اس کی آمدنی بھی بہت وافر تھی ۔

سنہ ۱۷۹۷ع میں لارڈ کارنوالس نے تفصیلی طور پر یہ اعلان کیا کہ موجودہ حکومت کی منظور کردہ لاخراج زمینوں پر مالکانہ استحقاق سب سے زیادہ کمپنی کو حاصل ہے ۔ لیکن اُس وقت کی طاقتور حکومت بھی اپنے اعلان کے بل پر لاخراج زمینوں کو اپنے قابو میں نہ لا سکی ۔ تقریباً ایک چوتھائی صدی اسی حالت میں غیر مطمئن طور پر گذر جانے کے بعد سنہ ۱۸۲۸ع میں، منتظمین

اور حکمرانوں نے بہ اتفاق ساز باز کر کے مختلف ناجائز اور ناروا مقدمات دائر کئیے اور اس پر آٹھ لاکھ پونڈ خرچ کرنے کے بعد حکومت کو سالانہ تین لاکھ پونڈ کی مستقل آمدنی کا مالک بنایا - اس تمام لاخراج زمین کی آمدنی بنگال کے مسلمانوں ھی کے گھروں سے وصول کی گئی تھی کیونکہ ایسی زمینوں کے مالک صرف وھی تھے -

اس زمانے تک اس علاقے کی سرکاری زبان فارسی تھی - لارڈ بینٹنک کے دور حکومت میں لارڈ میکالے کی سفارش پر فارسی کے بجائے سرکاری زبان انگریزی تسلیم کی گئی - ملک کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں اس کے اثرات بہت دور رس ظاھر ھوئے - زبان اور ادب کے لحاظ سے یہ کتنا بڑا انقلابی حادثہ تھا اُس کا تاریخ ادب کی تحقیق سے پورا پورا اندازہ ھو سکتا ھے -

انگریزوں نے مسلمانوں کے ھاتھ سے اس ملک کی حکومت چھین لی اور یہی سبب تھا کہ ایک صدی سے زاید عرصے تک مسلمانوں نے بھی انگریزی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا - انگریزوں نے بھی اسی طرح مسلمانوں کو شک اور شبہے کی نظر سے دیکھا - تا ھم یہ حقیقت ھے کہ کوئی حکومت خواہ وہ کتنی ھی طاقتور کیوں نہ ھو محکوم ملک کے

عوام کی تائید کے بغیر بہت دنوں تک استحکام پذیر نہیں ہو سکتی - جس وقت انگریزوں کا مسلمانوں کے ساتھ یہ معاندانہ رویہ تھا اُسوقت انھوں نے یہاں کے ہندوؤں کو خوش کر کے ان کے دلوں کو اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوششیں جاری رکھیں -

ایک جانب تو مسلمانوں نے اپنی حاکمانہ طاقت کھودی اُدھر یہاں کا اقتدار حاصل کرتے ھی یہاں اپنی بنیاد زیادہ مستحکم کرنے کیلئے اور گھر پر (انگلستان میں) انگریزوں کی مالی حالت درست کرنے اور انھیں ترقی پذیر کرنے کیلئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنوں نے جو متعدد انقلابی اصلاحات جاری کیں وہ سب کی سب مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچانے والی تھیں - بندوبست استمراری کے اجرا اور لاخراج زمینوں سے بےدخلی کی بنا پر مالکان زمین یعنی مسلمان تباہ حال اور تنگ دست ہو گئے - پرجا اور مسلمانوں کے درمیانی کارپرداز یعنی تحصیل دار، نائب، محرر، اور گماشتے وغیرہ جو سب کے سب ہندو ملازمین تھے انگریزوں کے زیر سایۂ عاطفت تھوڑے ھی عرصے میں زمینوں کے مالک اور زمین دار بن بیٹھے - مزید برآں سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی ہونے کی وجہ سے ملازمت پر

زندہ رہنے والے بے بس مسلمانوں کیلئے بھی روزی کے دروازے بند ہو گئے - بنگال کی اقتصادی زندگی کی اصلی بنیاد زمین ہے اور اس کی معاون ملازمت - یکے بعدد یگرے ان دونوں سے محروم ہو کر مسلمانوں کی مالی تباہی کی کوئی حد نہ رہی -

فارسی کے بجائے سنہ ۱۸۳۵ع میں انگریزی کو سرکاری زبان کی حیثیت ملنے کے بہت پہلے ہی سے ہمیں بنگال کے ہندؤں میں انگریزی سیکھنے کا بڑا شوق نظر آتا ہے - حالات کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اور انگریزوں کے ساتھ موالات کرنے کے لئے انیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں بنگال کے ہندؤں کو راجا رام موہن نے دعوت عام دی - معاشرت اور مذہبی اصلاح میں سیاسی مہارت رکھنے والے رام موہن نے اس وقت جس دوربینی اور ہوشیاری کا ثبوت دیا - جدید ہندو بھارت میں اس کی نظیر بہت کم ہے - سنہ ۱۸۰۱ع میں انگریز سویلین ملازمین کو اس ملک کے حالات اور رسم ورواج سے باخبر کرنے اور اس ملک کی زبان یعنی بنگلا کی تعلیم کے لئے فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھی گئی اور سنہ ۱۸۱۶ع میں ہندو کالج قائم ہوا - یہی کالج آج پریسیڈنسی کالج کے نام سے موسوم ہے - فورٹ ولیم کالج میں معلمی کی خاطر اور بنگلا نثر کی ترویج کے پیش نظر یہاں کے کچھ ہندو بھی انگریزوں کے ہم صحبت ہوگئے - اس کے بعد ہی سے ہندو

عالم میں بنگالی ہندؤں کو بھی حصول تعلیم میں منہمک
دیکھا گیا - ان پیوستہ واقعات سے یہ معلوم ہوتا ھے کہ
انیسویں صدی کی ابتدا ھی سے ہندؤں نے انگریزوں کے ساتھ
عملی تعاون کیا تھا - اصلاح زمین کے نتیجے میں انگریزوں
کو غیر معمولی اور غیر متوقع منافع حاصل ہوئے - اسی
وقت ہمیں یہ بھی نظر آتا ھے کہ بنگال کی خام دولت
اور خام سامان کی بدولت انگلستان میں لندن، برمنگھم
مانچسٹر وغیرہ تجارتی اہم شہروں کو غیر معمولی وسعت
اور ترقی حاصل ہوئی - بنگال کے ہندؤں کی قسمت بھی
اس کی بدولت کچھ کم تبدیل نہ ہوئی - اسی کا نتیجہ
تھا کہ خوش نصیب ہندو زمین داروں کو نصف صدی ھی
میں دیہاتوں سے نکل کر کلکتہ میں آباد ہوتے دیکھا گیا -

پلاسی کی جنگ سے پہلے تک بنگال کی راجدھانی مرشد آباد
تھی اور یہی پورے بنگال کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا -
حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مرشد آباد کی مرکزی
تہذیبی زندگی کا خاتمہ ہوگیا اور نو تعمیر دارالحکومت
یعنی کلکتہ میں نئے سرے سے اس کے منتشر دانے سلک
ترقی میں منضبط ہونے لگے - اتنے دنوں تک مرشد آباد کو
مرکز بنا کر مسلمانوں کی جس تہذیب نے ترقی حاصل

کی تھی اس کا کلکتے کی مرکزی تہذیب میں کہیں نام و نشان بھی موجود نہ تھا۔ مالی اور معاشرتی تبدیل شدہ حالات میں جس وقت ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کیلئے اقدام کیا بالکل اسی وقت یعنی جنگ پلاسی کے بعد ہی سے تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصے تک انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان شدید ذہنی کشا کش اور عدم موالات کا جذبہ کار فرما رہا۔

جنگ پلاسی کے بعد اٹھارھویں صدی کے آخر میں اس عدم تعاون نے غیر منقسم بنگال میں میر قاسم کے ساتھ اور میسور میں شیر دکن حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے ساتھ خونریز جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ ان مجاہدین اعظم کی جنگ، شکست اور شہادت کے بعد بنگال ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر ہند کے مسلمان کچھ دنوں کیلئے دل شکستہ اور مفلوج ہو کر رہ گئے اس ذہنیت ہی کا نتیجہ تھا کہ مذہب کی طرف کشش ان میں زوردار ہوگئی۔ یہ بات ان کے ذہن میں راسخ ہوگئی تھی کہ مذہب سے بے تعلقی اور غلط مراسم کی پابندی ہی کی وجہ سے برصغیر ہند میں وہ دن بدن بد حال ہوتے جارہے ہیں۔

بھارت کی گذشتہ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم آریہ کے فاتحانہ داخلے کے زمانے سے شک، ہون اور یونانی وغیرہ

جو قومیں ہندوستان میں آئی تھیں انھیں بھارت کی تہذیب اور مذہب نے اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔ بھارت کی تاریخ میں صرف اسلام ھی باھر سے آکر اس اصول سے مستثنیٰ رھا۔ مسلمانوں نے اپنا نام و نشان کھو کر بھارت کی ہندو تہذیب اور مذھب میں اپنے آپ کو مدغم نہ کیا۔ مذھبی حیثیت سے اس کے عدم انجذاب کا سبب یہ تھا کہ اسلام میں انقلابی تحریک کی رو سے استحکام تھا اور سماجی حیثیت سے اس نے انسانوں کی روز مرہ زندگی کے مشاہدات مقتضیات اور تجربات کو تسلیم کیا تھا۔ اخوت، مساوات اور آسان انسانی حوائج کے مقتضیات کی بنیاد نیز قابل فہم تصورات کی اساس پر اس مذھب کا قیام تھا۔ بھارت میں اگرچہ اسلام نے اپنا نام و نشان نہ مٹنے دیا۔ تاھم مفتوح قوم کی روایات اور تہذیب نے بھارت کے مسلمانوں پر نمایاں اثر ڈال کر کچھ نہ کچھ انتقام ضرور لیا۔ شمالی، مغربی اور وسطی بھارت میں اس تاثر کے تاریخی اسباب میں مغل حکمرانوں کی فیاضانہ وسیع النظری بھی شامل تھی اور بنگال میں اس کا خاص سبب یہ تھا کہ یہاں کے اکثر باشندوں نے مکمل حیثیت سے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ بنگال بلکہ بھارت میں اسلام نے عہد وسطیٰ سے جو ہندوانہ تاثرات

قبول کئے ھیں ان کا کچھ نمونہ پاک بھارت میں موجودہ
محرم کے جلوس وغیرہ سے نمایاں ھوتا ھے ۔ مسلمانوں کی
قومی تقریبات میں مذھب اسلام ھی کی طرح ایک گونہ
ضبط نفس اور سنجیدگی کا مضبوط مظاھرہ پایا جاتا ھے ۔
تاھم محرم میں جو شان و شوکت اور شادکامی نیز جلسے
جلوس کا مظاھرہ ھوتا ھے وہ ھندؤں کی تقریبات پرستش
سے ماخوذ معلوم ھوتا ھے ۔ علاوہ بریں ان کی تعزیہ سازی
اور عاشورہ کی منزل متی بھی دُرگا پوجا کی مورت سازی
اور دسویں کو دریا برد کرنے کے مشابہ ھے ۔ ھندؤں کا گرو پوجا اور
مسلمانوں کی پیر پرستی، پیروں کے مزار پر عرس اور اولیائے کرام کے
مزارات کی زیارتوں میں شدت نے اسے ھندؤں کے تیرتھ استھان
جیسی چیز بنا دیا ھے ۔ بنگال کے بے علم اور دیہاتی مسلمانوں
میں بھی ھندؤں کے پورانوں والے سمندری دیوتا کی طرح خواجہ
خضر کے متعلق عقیدت مندی کا وجود۔ ان کیلئے فاتحہ خوانی
وغیرہ ایسی ھی چیزیں ھیں جیسی ھندو اپنے اسلاف کی
یاد میں دریا میں پیسے اور شیرینی وغیرہ بہاتے ھیں ۔ خونخوار
جنگلی جانوروں پر بھی بزرگوں کی کرامات کا اثر تسلیم کرکے
پیروں کی مدد سے انھیں پر سکون رکھنے کی کوشش اور
ان کی ھلاکت خیزیوں سے بچنے پر اظہار مسرت وغیرہ

مراسم در حقیقت هندی مسلمانوں پر هندوانه اثرات هی کے رهیں منت هیں - بنگال کے سندربن کے علاقے میں مسلمانوں کے زندہ غازی اور کالو غازی نامی دو پیر مانے جاتے هیں - هندؤں کی نیچ ذاتوں میں مسلمانوں کے مذکورہ کالو غازی شیر کے دیوتا کی حیثیت سے بنام کالو رائے موسوم هیں - هیضه اور چیچک کی تباہ کاری کو دور کرنے کیلئے نیچ ذات کے هندؤں میں اولا بی بی اور سیتلا دیوی کی پوجا مروج تھی - ان کی نحوست اور سوئے نظر سے بچنے کیلئے هندؤں میں یه دیکھا جاتا هے کہ گاؤں سے باهر اور گاؤں کے سامنے برگد اور پیپل کے درختوں کی جڑوں میں کچے ناریل کا رس، کدو اور اسی قبیل کے وہ کھانے جن سے معدہ ٹھنڈا رهے بطور نذرانے کے پیش کئے جاتے هیں - دیویوں کو خوف زدہ کرنے کیلئے ایک اونچے بانس پر بکری کی کھال میں دهان کی بھوسی اور گھاس پھوس بھر کر باندھ دیتے هیں - مسلمان بھی ان چیزوں کا اعتقاد رکھتے اور اپنے پڑوسی هندؤں کی تقلید میں مصیبت کے زمانے میں ان بری رسموں پر عمل درامد کرتے تھے - وہ گھر کے پالتو جانور گم هو جانے سے انھیں دوبارہ حاصل کرنے کیلئے منت مانتے - دریا میں سفر کے وقت وہ دریا کے پانچ پیر اور پیر بدر کے نام لیتے - بنگال کے کرتا بھجا

(جماعت) اور آؤل باؤل (جماعت) وغیرہ' نیزلا تعداد نیڑا شہڑا (سر منڈے فقیروں کی جماعت) بھی عرصہ دراز سے اس اثر اندازی میں معین رہے ہیں - دور وسطی کے بنگالی شاعر اور ادیبوں کی بہت سی تحریرات میں ان تمام چیزوں کے متعلق خوش اعتقادی ظاہر ہوتی ہے - "کرتا بھجا" اور باؤل جماعت کے گانوں میں اس ذہنیت کے نشانات بہت نمایاں ہیں - اس کے علاوہ سید سلطان کی کتاب "نبی بنگشو" میں "برھما اور شیو" وغیرہ ہندو دیوتاؤں اور دیلی دیوتاؤں کو بھی نبی کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے - بنگال نے سری کرشن بجے کی تقلید میں "نبی بنگشو" کی تصنیف بھی صراحۃً ہندو اثرات ہی کی آئینہ دار ہے - مسلمانوں کی شادیوں میں "پن" دینے کا رواج اور روپیہ پیسے کا لین دین بھی ہندؤں ہی کی تقلید کا نمونہ پیش کرتا ہے -

بنگال بلکہ تمام بھارت بالخصوص مسلمان قوم میں اس قسم کے ہندو اثرات مسلمانوں کے دور حکومت ہی سے داخل ہوگئے تھے - مسلمانوں کے ہاتھ سے حاکمانہ اقتدار نکل جانے کے بعد تعلیم اور تبلیغ کی بد نظمی کے سبب سے ان میں یہ کورانہ ذہنیت اور برے رسم و رواج تیزی کے ساتھ ترقی پاتے رہے - ان کا ایسی ہندوانہ تہذیب سے لگاؤ کس حدتک پہنچ گیا تھا اس کا صریح اندازہ سر محمد اقبال کے اس قول سے ہو سکتا ہے ۔

Surely we have out Hindued the Hindu himeslf; we are Suffering from a double cast system, sectarianism and the social cast system, which we have learned or inherited from the Hindus. This is one of the quiet way in which the consequent nations revenge themselves on their conquerors. (Quoted from the Hindustan Review in census of India Report : 1911, XIV Punjab, ptI, page 165)

اس لئے سماج اور ذات پات کے متعلق دلیل اور غیر اسلامی یا ہندوانہ اثرات کو ھی مسلمان اپنی تمام تر بدنصیبیوں کا سبب سمجھنے لگے تھے - انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ ان کی خوش قسمتی کا آفتاب اسی وقت طلوع ہو سکتا ہے جب وہ حضرت محمد (ص) اور خلفائے راشدین کے زمانے سے ما بعد کی تمام بدعات اور مشرکانہ رسوم سے نجات حاصل کر کے ابتدائی اور خالص اسلام کو حیات نو بخشیں گے - اسی اذعان و یقین کی بنا پر اُس زمانے کے مسلمانوں نے اپنی مذہبی اصلاح کی طرف توجہ کی - اس سلسلے میں بنگال کی فرائضی تحریک اور پورے ہندوستان کی وھابی تحریک کا تذکرہ بھی قابل ذکر ہے -

سترھویں صدی کے آخر میں عرب کے ایک بہادر فرزند عبد الوھاب نے ملک عرب میں حضرت محمد (ص) کے خالص اسلام کے اجراء اور قیام کیلئے جو جد و جہد شروع کی تھی وہ تاریخ

اسلام میں وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ عبدالوہاب کے بعد ان کے فرزند محمد نے اس تحریک کو زندہ اور جاری رکھا۔ وہابی تحریک کے عرب سردار سیاسی طاقت کے حصول میں بھی کامیاب ہوئے اور سنہ ۱۸۰۳ع میں انہوں نے مکہ شریف پر قبضہ کر لیا۔ ترکوں نے اگرچہ جنگ کر کے وہابیوں کو وہاں سے بے دخل کیا اور دوبارہ مکہ معظمہ پر دخل حاصل کیا۔ لیکن اس سے وہابی تحریک کا خاتمہ نہیں ہوا۔

شمالی ہند میں رائے بریلی کے رہنے والے مذہبی مقتدا حضرت سید احمد بریلوی اور مشرقی بنگال کے فرائضی رہنما حاجی شریعت اللہ نیز مغربی بنگال کے فرائضی لیڈر نثار علی عرف تیتو میر حج کے سلسلے میں مکہ معظمہ گئے اور وہاں انہوں نے وہابی تحریک سے واقفیت حاصل کی۔ وطن واپس آنے کے بعد وہ ہندوستان میں تجدید اور اصلاح مسلمین میں بیش از پیش زور و شور سے مشغول ہو گئے۔

مشرقی بنگال میں فرائضی تحریک کے بانی حاجی شریعت اللہ تھے۔ وہ ضلع فریدپور میں موضع بندر کھولا کے باشندے تھے۔ ابتدائی عمر ہی میں وہ مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور سنہ ۱۸۲۸ع کے لگ بھگ باشعور ہونے کے بعد وطن واپس آئے۔ وہ عیسائی انگریزوں کے پنجۂ اقتدار میں محصور ہندوستان کو دارالحرب

مانتے تھے اور چونکہ دارالحرب میں مسلمانوں کیلئے عیدین اور جمعہ کی نماز ممکن اور جائز نہیں ہے اس لئے حاجی شریعت اللہ نے اپنے اس مسلک کی تبلیغ کی ۔ محرم کے مجلسے جلوس کو بھی انہوں نے ہندوؤں کے درگا پوجا کے مماثل سمجھ کر اس کی شدید مخالفت کی اور اسے ایک قبیح خلاف اسلام عمل قرار دیا ۔ پیر پرستی کی مخالفت کر کے انہوں نے استاد اور شاگرد کے تعلق کا تصور استوار کیا اور اسی حیثیت سے پیر اور مرید کے تعلق رکھنے پر زور دیا ۔ حاجی شریعت اللہ کی وفات کے بعد ان کے وارث کی حیثیت سے اس تحریک کی سربراہی ان کے فرزند محمد محسن عرف دودو میاں پر آپڑی ۔ دودو میاں کے زمانے میں یہ تحریک صرف ایک مذہبی اور اصلاحی تحریک ہی نہ رہی بلکہ حالات کی تبدیلی سے اس تحریک نے مقامی ہندو زمینداروں کی اعانت سے ایک بڑی اقتصادی تحریک کی صورت اختیار کر لی ۔ فرید پور اور بازی سال کے اضلاع کو مختلف علاقائی حصوں میں تقسیم کر کے دودو میاں نے وہاں اپنے خلفا مقرر کئے ۔ ان علاقوں پر ان کا اقتدار انیسویں صدی کے وسط تک قائم رہا ۔

مشرقی بنگال کی فرائضی تحریک کے سربراہوں کی اصلاحی جد و جہد کے دور میں مغربی بنگال میں بھی یہ تحریک بڑے زور وشور سے جاری تھی ۔ مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ

اور ندیا کو مرکز بنا کر نثارعلی عرف تیتو میر اس جد و جہد کو تیز رفتاری سے چلا رہے تھے - باراسات ضلع کا محکمۂ بشیر ہاٹ ان کا وطن تھا - تقریباً سنہ ۱۷۲۸ع میں حج سے فارغ ہوکر وہ وطن واپس آئے اور بنگالی مسلمانوں کی شرک و بدعت کی رسموں کے خلاف انھوں نے ایک گونہ جہاد شروع کیا - حاجی شریعت اللہ ھی کی طرح وہ بھی پیر پرستی کے مخالفت تھے - ہندؤں سے مسلمانوں کے خصوصی امتیاز کو نمایاں کرنے کیلئے انھوں نے داڑھی رکھنے اور اسلامی لباس کے استعمال کو بہت ضروری خیال کیا - مُردوں کے نام پر فاتحہ اور غریبوں کو فاتحے کا کھانا کھلانا نیز پختہ مزار کی تعمیر کو وہ شریعت کے خلاف سمجھتے تھے -

ان اصلاحی تحریکات میں شریک ہونے کی وجہ سے تیتومیر کو ہندو زمینداروں سے جنگ میں مبتلا ہونا پڑا - یہ جنگ رفتہ رفتہ زیادہ خطرناک صورت اختیار کر گئی - جو مسلمان تیتو میر کے ہم نوانہ ہوئے ان سے بھی ان کے متبعین کی کشاکش شروع ہو گئی - اس تحریک کو چلانے میں حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ اُس وقت کی مقامی حکومت کے اقتدار کونہ مان کر انھوں نے نارکل باڑی میں ایک آزاد متوازی حکومت قائم کی - اُسوقت کی انگریزی حکومت اس سے بہت گھبرا گئی - باراسات کے جوائنٹ مجسٹریٹ الیکزنڈر بھی تیتو میر کی

سر کوبی کیلئے جاکر خود ہی ان کے ہاتھوں شکست خوردہ اور مصائب کا شکار ہوئے - بارانسات اور کرشن نگر کے حکام ضلع تیتو کی سر کوبی کیلئے ناکام ثابت ہوئے اور ان کی اعانت کیلئے کلکتے سے میجر اسکوٹ کی ماتحتی میں ایک پیادہ فوج کی بٹالین آئی - تیتو میر نے بانسوں سے ایک قلعہ نما عمارت تعمیر کی اور مسلح انگریزی فوج کے ساتھ باقاعدہ بہادری کے ساتھ جنگ کر کے ۲۲-نومبر سنہ ۱۸۳۱ع کو شہادت پائی - ان کے پچاس متبعین بھی ان کے ساتھ شہید ہو گئے -

حالات کی تبدیلیوں کی وجہ سے مغربی اور مشرقی بنگال کے فرائضی جماعت والے اگرچہ حکمرانوں سے نبرد آزما ہوئے - لیکن ان کی یہ لڑائی کسی ہمہ گیر سیاسی تحریک میں تبدیل نہ ہوسکی - ان کی اصل تحریک مذہبی اصلاح کے متعلق ہی تھی - لیکن فرائضی تحریک کی وجہ سے بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں جد و جہد کی بدولت اسوقت جو جوش پیدا ہوگیا تھا اسی نے اس وقت اور اس کے مابعد کے دور میں ایک عظیم اور ہندوستان گیر تحریک کی شکل اختیار کرلی -

اصولی حیثیت سے فرائضی تحریک کے متبعین اگرچہ وہابی تحریک میں کلی طور پر شریک نہ تھے تاہم وہ ان کی جماعت سے منسلک ضرور تھے - فرائضی اور وہابی جماعتوں کے مقاصد

ایک ھی تھے - مذھبی اصلاح اور اسلام قدیم کا احیائے ثانیہ دونوں کے پیش نظر تھا - ان میں جو فرق نظر آتا ھے وہ صرف طریقۂ عمل کا - وھابی حصول مقصد کیلئے جان و دل سے جنگ کے قائل تھے - انکا عقیدہ تھا کہ جہاد جس طرح ایک جانب اصلاح نفس کرتا ھے اسی طرح تمام غیر حق سے جنگ کیلئے نفس کو دائمی بیداری بخشتا ھے - جہاد یا مذھبی جنگ کے معاملے میں وھابی ھر وقت جان دینے اور قربانیاں برداشت کرنے کیلئے تیار رھتے تھے - وہ اس معاملے میں غیر متزلزل اور اٹل تھے - تمام عمر جہاد میں مشغول رہنے اور اسکے واسطے بوقت ضرورت ہجرت کیلئے بھی وہ آمادہ رھتے تھے - جہاد کے معاملے میں وہابیوں کو ایک گونہ ترقی پسند فرائضی جماعت کا مثیل کہا جاسکتا ھے ورنہ بھارت کے اسلام کی اصلاح اور شرک و بدعات سے اُسے پاک کرنے کے مقاصد میں فرائضی اور وہابی دونوں ھی ھم رائے تھے -

بھارت میں مذھبی اصلاح کی بنیاد مولانا شاہ ولی اللہ (سنہ ۱۷۰۲ع - سنہ ۱۷۶۰ع) نے رکھی - امام غزالی کی طرح فلسفیانہ بنیادوں پر انھوں نے اسلام کی تشریح کی - شاہ ولی اللہ کے اصول کی تبلیغ ان کے بھتیجے شاہ عبد العزیز نے کی - آزاد ھندوستان میں آزاد اسلام کے قیام کیلئے دلی میں اتھاہ سوزش حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندانی مرید حضرت سید احمد بریلوی نے محسوس کی -

وہ ۲۴ - اکتوبر سنہ ۱۷۷۶ع کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے تھے - وہ اصول پروری میں گہرائی کے مالک تھے - ان کا اعتقاد تھا کہ روحانی زندگی دنیاوی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے - ان معاملات میں وہ اپنے ھندی اور عربی اساتذہ سے بھی آگے بڑھ گئے - اصول کو واقعی شکل میں لانے کے متعلق جس طرح کارل مارکس کیلئے لینن کی حیثیت تھی یا رام کرشن پرم ہنسو کیلئے جو حیثیت ویویکا نند کی تھی وہی حیثیت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز کے نزدیک سید صاحب کی تھی - سید احمد کی اصول پروری کے ساتھ ساتھ ان کی حقیقت پروارانہ ذھانت' بیدار اور حساس دل' غیر معمولی قوت عمل' ناقابل تسخیر جذبہ اور بے نہایت حوصلہ بھی ان کے ہم رکاب تھا -

پنجاب اُس زمانے میں سکھوں کے زیر حکومت تھا - سکھوں کے راجا رنجیت سنگھ نے مسلمانوں کو نماز' اذان اور قربانی وغیرہ مذھبی حقوق سے جبراً روک دیا تھا - اُن اسباب کی بنا پر سید احمد نے سنہ ۱۸۲۶ع سے ۱۸۲۷ع تک سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کیا - حضرت شاہ عبدالعزیز رح کے دو قریبی عزیز مولانا اسماعیل رح اور مولانا عبدالحی رح نے سید احمد رح کے آخری ایام حیات تک ان کے اصول کی تبلیغ کی اور جہاد میں ان کا ساتھ دیا - سید احمد رح نے ھندوستان اور افغانستان تک

اپنے مقاصد و اصول کی تبلیغ کیلئے سفر کیا - بھارت اور افغان کے مسلمانوں نے اس وقت استحکام دین اور قیام صداقت کے پیش نظر سید احمد رح کو اپنا امام تسلیم کرلیا - صوبۂ سرحد میں انھوں نے ایک آزاد حکومت کی بنیاد رکھی اور پنجاب کے رنجیت سنگھ کے ساتھ بہت سی لڑائیاں لڑ کے آخر مئی سنہ ۱۸۳۱ع میں بالاکوٹ کی جنگ میں انہوں نے اور ان کے عقیدت مند شاگرد مولانا اسماعیل اور دوسرے بہت سے رفقاء نے شہادت پائی -

سید احمد رح کی زندگی میں وہابی تحریک نے انگریزوں کے خلاف صف آرائی نہیں کی - آزاد ہندوستان میں آزاد اسلامی حکومت اگرچہ سید احمد رح شہید کا خواب تھا لیکن بیک وقت سکھوں اور انگریزوں کے ساتھ جنگ کیلئے وہ تیار نہ ہوئے - اس سے ان کی حقیقت پسندی اور دوربینی کا پتہ چلتا ہے - پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد سید احمد رح کے متبعین نے انگریزوں کے ساتھ بھی معاندانہ کارروائیاں شروع کیں اور انکی اس تحریک میں انگریزوں کی مخالفت کا سلسلۂ سنۂ ۱۸۵۷ع کے ہنگامۂ جنگ آزادی کے بعد بھی دس سال تک باقی رہا -

وہابی تحریک درحقیقت کس قدر منظم اور دیر پاتھی اس کی تاریخ بہت حیرت انگیز ہے - اس انقلاب میں میدان جنگ صوبہ سرحد اور ستانہ تھا - تبلیغ اور عمل کا مرکز صوبہ بہار میں

پٹنہ تھا اور سامان ' سرمایہ اور مجاھدین کی تیاری کا مرکز
بنگال - ڈھاکہ ' میمن سنگھ ' باقرگنج ' فرید پور ' نوا کھالی '
ندیا ' چوبیس پرگنہ ' پبنا ' بوگرا اور راجشاہی وغیرہ بنگال کے
اضلاع نے ایک طویل زمانے تک بےشمار دولت اور ہزاروں رضاکار
امدادی طور پر بھیج کر انگریزوں کی مخالفت کیلئے ایک مثال
قائم کی تھی - بنگال تجدید پسند ملک ھے اور بنگالی اس قدر
جذباتی قوم کے افراد ھیں کہ ایک مرتبہ ان پر جو نشہ چڑھ جاتا ھے
اس نشے میں وہ پروانہ وار اپنی شمع تخیل پرنثار ہوتے رہتے ھیں -
ورنہ پچاس سال سے بھی زیادہ مدت تک بنگال کے غریب اور
کم علم دسان اور مقہور و مغلوب تحتانی طبقے کے دیہاتی
مسلمانوں کو اس تحریک میں جوق درجوق والہانہ طور پر شریک
ہوتے ہوئے نہ دیکھا جاتا - بنگال کے مسلمانوں کا مذھبی جوش
کس قدر تیز اور تموج خیز تھا اس کا صریحی ثبوت وہابی تحریک کی
تاریخ سے ملتا ھے - ولیم ہنٹر صاحب کی کتاب Our Indian
Musalmans ; are they bound to owe allegiance to the
Queen ? کے صفحہ ۱۱۰ میں ایک تعجب خیز تشریح ملتی ھے وہ
فرماتے ھیں : "مشرقی بنگال کے تقریباً ہر ہر ضلع سے وہابیت کے
مبلغین نے بیس سال سے کم عمر کے بھولے بھالے نوجوانوں کو اکثر
ان کے والدین کی لا علمی میں یقینی موت کے راستے کی طرف ڈھکیل

دیا - لاکھوں غریب کسان خاندان میں اس تحریک نے غربت اور غم پیدا کردیا - مستقبل کی تمناؤں کے مرکز یعنی نوجوانوں کے متعلق ان کے اھل خاندان کے دلوں میں ایک مستقل تشویش پیدا ہوگئی - جس وہابی باپ کا لڑکا ھوشمند یا زیادہ مذھبی ہوتا اُس کے متعلق اُس کے والدین قطعی لاعلم تھے کہ وہ کب اپنے گاؤں سے لا پتہ ہو جائے گا - اس طرح پر جن نوجوانوں کو ان کے گھروں سے لا پتہ کیا گیا تھا ان میں سے اکثر بیماری' بھوک اور تلوار کے زخموں سے برباد ہو گئے" -

ہندی اسلام سے شرک و بدعت کو دور کرکے خالص اسلام کا قیام ہی اس تحریک کا اِبتدائی مقصد تھا لیکن وقت اور حالات کی تبدیلی سے اس انقلابی تحریک نے کچھ ایسی مذھبی' سماجی اور سیاسی صورت اختیار کرلی کہ ان وہابی تحریک کے متبعین نے آخر انگریزوں کے ساتھ موت و حیات کی جنگ شروع کر دی - انھوں نے انگریز حکمرانوں کے خلاف عدم تعاون کا علم بلند کیا' لوگوں کو انگریزی تعلیم سے دور رکھا اور انگریز نیل کے کارخانہداروں کے خلاف نیل کی کاشت کرنے والوں کو دادنی کی رقم تک لینے نہ دی - وہابی کسانوں نے نیل کے زمینداروں کا کام بند کرکے خود ان سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور موت کو بازیچۂ اطفال سمجھا - اس انقلاب کی تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی

لیکن یہ بات صحیح ہے کہ بیسویں صدی کی مغربی تعلیم کی روشنی حاصل کرنے والے لوگوں کے ذریعہ سے جو تحریک عدم موالات چلائی گئی تھی اور تخویف و دہشت انگیزی کی پالیسی پر عمل کرنے والوں نے انگریزوں سے آخر ہار منوائی تھی اس علمی دور کی تحریک اُس سابق وہابی تحریک کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی -

وہابیوں کی اخلاقی جرئت اور مذہبی جنگ کے نام پر اپنی زندگی قربان کرنے کا عزم ، سچائی ، سردی' گرمی اور خور و نوش کے جذبات پر فتحیابی اور بنگال سے صوبہ مغربی شمالی سرحد تک ہزاروں میل کی مسافت کو پیادہ پا مدت دراز تک طے کرتے رہنا کس جانبازی' قربانی اور ہمت کا کارنامہ ہے اُس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی - اپنی قوم ' سماج ' تہذیب اور مذہب کو بچانے کیلئے اور ایک دار الحرب میں دار الاسلام قائم کرنے کیلئے ان کی یہ قربانی درحقیقت اوراق تاریخ کا زریں باب کہی جاسکتی ہے -

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ذریعہ سے انگریزوں کے خلاف ہندؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ پہلی تحریک شروع ہوئی اور پروان چڑھی - یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکمراں عمال کی چند غلطیوں نے اس تحریک کو ہوا دی تھی - یہ انقلابی جد و جہد جس طرح وقتی تھی اُسی طرح تھوڑے ہی

دنوں میں اس کا خاتمہ بھی وقوع پذیر ہوا تھا - اس کی پشت پر کوئی طویل مدت کا منصوبہ اور بہت دنوں کی جد و جہد کارفرما نہ تھی - اس تحریک آزادی اور وہابی تحریک میں اگرچہ بلا واسطہ کوئی تعلق نہ تھا لیکن اس میں حضرت سید احمد شہید کے ہاتھوں سے تیار کئے ہوئے بہت سے مجاہدین شامل ہوگئے تھے - اس تحریک کے خاتمے کے بعد بھی انگریز حکمرانوں کو وہابیوں سے تقریبا دس سال تک مقابلہ کرنا پڑا - اس تحریک سے ہوشیار اور تجربہ کار ہوکر انگریزی حکومت نے وہابیوں پر اچھی طرح تیغ ستم کی آزمائش شروع کی اور سنہ ۱۸۶۴ اور ۶۵ء میں وہابیوں کے مقدمات کے فیصلے کے وقت آخری طور پر انہیں پست کر کے ختم کر دیا گیا -

وہابیوں کے جذبات اور اُن کے اخلاص کا تذکرہ تنقید سے بالا تر ھے تاہم یہ سچ ھے کہ کم علمی اور جذباتی ہونے کی وجہ سے انھوں نے انگریزوں کے حاکمانہ اقتدار سے باخبر ہوکر ناقابل انکار تاریخی حقائق کو تسلیم نہیں کیا - مسلمانوں کی طرف سے یہ تحریک دراصل ایک انتقامی جذبے کے ماتحت تھی - حاکمانہ اقتدار سے محروم ہوکر کئی پشت سے بنگال کے مسلمانوں نے اپنی اقتصادی برتری کھو دی تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اپنی علمی اور ثقافتی عظمت کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا - اس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ ان میں کو رانہ جوش اور بے عامی نے ترقی پائی اور اسی جوش کے زیرسایہ وہ انگریزوں کے خلاف سخت مقابلے کیلئے کمربستہ ہوگئے ۔ بنگال میں دو ایک خاندانوں کے علاوہ عام طور پر انیسویں صدی میں بنگال کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی طرف عام رجحان نہیں پایا گیا ۔ تحریک آزادی اور وہابی تحریک کے فوراً ہی بعد شمالی ہندوستان میں سر سید احمد نے انگریزوں کے ساتھ مصالحانہ رویہ اختیار کیا اور مسلمانوں دو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی طرف مائل کیا ۔ سر سید کی یہ تحریک علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ علی گڑھ میں اینگلو محمڈن کالج قائم ہوا ۔ یہی کالج ترقی پا کر آج علی گڑھ یونیورسٹی کی صورت میں موجود ہے ۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں سر سید کی تحریک علی گڑھ اور علی گڑھ کالج کی خدمات شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ ترقی میں جس طرح تعجب خیز ہیں اسی طرح قابل ذکر بھی ہیں ۔

انگریزی میں سید امیر علی اور صلاح الدین خدابخش کی تہذیب اسلامی کی تشریحات اور نواب عبد اللطیف کی معاونت اور مساعی سے بنگلا زبان کے ذریعہ اگرچہ بنگالی مسلمانوں میں انگریزی کا کچھ چرچا ہوا تا ہم بنگال کے مسلمانوں میں سر سید

احمد جیسے دوراندیش اور فہیم لیڈر پیدا نہ ہوئے - انگریزوں اور مسلمانوں کے باہمی ناموافق اور مشکوک تعلقات کی بنا پر حکمراں انگریز اور محکوم مسلمانوں کے تعلقات میں یوماًفیوماً ابتری ہی پیدا ہوتی گئی - اس موقعہ پر انگریزوں نے اپنی تمام تر توجہات اور عنایات کا مرکز یہاں کے ہندوؤں کو بنایا - انیسویں صدی کے شروع ہی میں ہندو سماج کو خوش نصیبی سے رام موہن رائے جیسا زیرک، تیزنگاہ اور دور اندیش رہنما مل گیا تھا جس نے اپنی عقل، اپنی ذہانت اور قوت فیصلہ کی مدد سے ہندوؤں اور انگریزوں کے درمیان استوار بنیادوں پر دوستانہ رویہ پیدا کرانے میں مدد دی - ان مصالحانہ اور نفع بخش تعلقات کی بناھی پر سنہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد پڑنے کے باوجود انیسویں صدی کے آخر تک ان دونوں قوموں کے درمیان موالات اور مصالحت کا اصول کارفرما رہا - بیسویں صدی کی ابتدا یعنی سنہ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کو رد کرنے کیلئے ہندوؤں نے جو تحریک چلائی اسی میں ان کی انگریزوں سے علانیہ مخالفت کی بنیاد پڑی - سنہ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کے خلاف تردیدی اعلان اگرچہ شائع ہوگیا تھا لیکن آزادی ملک کیلئے اُسی وقت سے ہندوؤں نے جس تحریک کی ابتدا کی وہ گاندھی جی کی تحریک عدم موالات اور تحریک خلافت کی صورت میں نمایاں ہوئی -

یہی تحریک بنگال کے نوجوانوں کی تحریک تخویف اور کانگریس کی ماہ اگست سنہ ۱۹۴۲ع والی تحریک کی صورت میں مختلف روپ اختیار کرتے ہوئے آخر سنہ۱۹۴۷ع میں تقسیم ہند اور پاکستان و ہندوستان میں دو آزاد حکومتوں کے قیام کی صورت تک میں گوناگوں شکلیں دکھاتی گئی -

ہندؤں نے انگریزوں کے ساتھ جو تعاون شروع کیا تھا وہ انیسویں صدی کی ابتداھی سے تھا لیکن مسلمانوں نے وہ تعاون تقریبا ایک صدی کی طویل مدت کے بعد یعنی سنہ ۱۹۰۶ع میں قیام مسلم لیگ کے بعد شروع کیا - بے بس مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں نے جو غیر منصفانہ طریقہ سنہ ۱۹۰۹ع سے ۱۹۳۱ع تک جاری رکھا اس کی زد سے بچنے کیلئے بار بار نئے قوانین کی منظوری اور خصوصی اصلاحات و مراعات حاصل کرکے مسلمانوں نے جب کسی قدر حالات کی درستگی کے لئے کوششیں کیں تو ہندؤں کے دل میں مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں - اسی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی تھوڑی بہت انگریزی تعلیم پھیلنے کی وجہ سے حصول ملازمت میں ہندؤں کو جب کسی قدر دشواریاں پیش آنے لگیں تو بنگال کے ہندؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک حدتک کشاکش میں مزید اضافہ ہوگیا - ان حالات کے پیش نظر ہندؤں اور مسلمانوں کے طریقۂ فکر اور جنگ آزادی

کیلئے انداز جد و جہد نے مختلف راستے اختیار کئے ۔ آخر کار مسلم لیگ او ر قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ہندؤں کے آزاد بھارت کے بالمقابل ہم نے بھی آزاد پاکستان حاصل کیا ۔

انگریزو ں نے ہندوستان کو فتح کر کے وہاں کا نظام حکومت جس طرح آہستہ آہستہ مستحکم کیا تھا اسی طرح اُنہوں نے اپنے اقتدار کو پائدار بنا نے کیلئے اس ملک میں گو نا گوں عنوان سے یہاں کی تہذیب و تمدن پر غلبہ حا صل کر نے یا Cultural Conquest کے لیئے بھی مختلف تدابیر اختیار کی تھیں - اولاً یہاں کے باشندوں کو انگریزی زبان سکھائی - ثانیاً انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے عیسائی مشینریو ں کی مدد سے یہاں کے لوگوں کو عیسا ئیت کی طرف مائل کرنا شروع کیا او ر اس طرح انہیں عیسائی بنانے کی جد و جہد کا آغاز کیا ۔ اس ملک میں جس طرح انگریزی تعلیم کا بہتر ثمرہ انگریزوں کی طرف سے ملا اسی طرح بر صغیر پا کستان او ر بھارت کے بسنے والوں کیلئے یہ ایک عظیم منفعت کا باعث بھی ہوا - انگریزی کے خرینۂ علم او ر مغربی علم و حکمت نیز دلکش آرٹ کے تمام تر دفینوں نے ہمارے ملک کے باشندو ں کی چشم بصیرت کھول دی - انگریزو ں کی تہذیبی فتح یہاں کے باشندو ں کیلئے ایک نا محدود برکت کا سبب بھی ثا بت ہوئی - اس سے لوگوں کے نظریات بدل گئے - زندگی کی

قدریں نئے طور پر متعین ہو گئیں - نیز بنگال کی صنعت ادب میں نئی زندگی پیدا ہوئی - مذہبی حیثیت سے یہ سچ ہے کہ کچھ لوگ عیسائی بن گئے لیکن اس برصغیر بالخصوص بنگال میں عیسائیت کی تردید کرنے کیلئے اپنے سماج اور مذہب کی جس طرح اصلاح کرکے اُسے منقح کرنا پڑا اس سے بنگال کے ھندؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں نیا مذھبی احساس اور شعور بھی پیدا ھوا - اس کے ساتھ ھی ساتھ اپنی روایات کا تصور باقی رکھنے والی قوم کے ھاتھوں اس صدی کا نیا ادب وجود میں آیا - عیسائیت کا مقابلہ کرنے کی غرض سے انیسویں صدی کی ابتداھی میں رام موھن کی کوششوں سے برھمو دھرم کی بنیاد پڑی - مذکورہ صدی کے وسط میں کیشب چندر کے "نبو بسی دھان" اور رام کرشن پرم ھنگش کے ذریعہ ھندو مذھب کی نئی تشریحات نیز بی بیکا نند کے ذریعہ ھندو مت کی تبلیغ کا احراء ھوا - عیسائیت کی کشش نے جس قدر ھندؤں کو انیسویں صدی میں محو حیرت بنا دیا تھا اور جس طرح انھوں نے اس مذھب کو لبیک کہا تھا اس طرح کا جواب اس کو مسلمانوں کی طرف سے نہیں ملا - اس کے اسباب ہمیں بنگال کی فرائضی اور وہابی تحریک کی تاریخ ہی میں ملیں گے - لیکن اس تحریک کے بعد

انیسوی صدی کے آخر میں بالخصوص مغربی بنگال کے مسلمانوں میں بھی عیسائی ہونے کی طرف ایک خاص میلان پایا گیا - اس مصیبت سے اس زمانے میں بنگال کے مسلمانوں کو منشی مہر اللہ نے بچایا تھا - انیسوی صدی کے چند آخری عشرے اور بیسوی صدی کی ابتدا میں وہ مسلمان بنگالیوں کیلئے رام موہن رے جیسے مذھبی رھنما تھے - اس کم تعلیم یافتہ بزرگ انسان نے اُس زمانے میں بنگال کے ایک ایک دیہات میں مسلمانوں کو باخبر اور ھوشیار کرنے کیلئے جس وعظ اور قومی جذبات کا طوفان کھڑا کیا تھا اُس کی قدر و قیمت آج بھی متعین نہ ہو سکی - اُنھی کی صحبت میں آکر اُس زمانے کے پادری ضمیر الدین نے اسلام قبول کیا اور انکا نام منشی ضمیر الدین رکھا گیا - منشی ضمیر الدین نے انھی کے شاگرد کی حیثیت سے تبلیغ اسلام کیلئے اپنی زندگی وقف کر دی - اس ایثار پسند جوان اور زبردست مقرر منشی مہر اللہ نے قومی احساس پیدا کرنے والے اور اسلام کا اپنا نقش بیٹھا دینے والے نیز اسلامی پیغام کے حامل ادب کی خدمت کیلئے مسلمانوں کو اُبھارا تھا - میر مشرف حسین اگرچہ مہر اللہ سے کسی قدر سابق العہد تھے لیکن اُنھیں ہم عصر کہا جا سکتا ھے - اُنھوں نے بھی ادب اور آرٹ کے نظریات کی رو سے مسلمانوں کی روایات اور مذھبی موضوعات پر اپنے ادب کی بنیاد

رکھی تاہم میر مشرف حسین نے منشی مہر اللہ کے ذہنی اصلاح کرنے والے ادب کے معیار پر ادبی خدمت نہ کی - اس کیلئے بعد میں کیقباد، شیخ عبد الرحیم، ریاض الدین احمد اور مزمل حق وغیرہ ادیبوں کی ضرورت لاحق ہوئی تھی - انہوں نے اسلامی ادب کا جو نہ بجھنے والا چراغ روشن کیا تھا وہی بنگالی مسلمانوں کیلئے قبل پاکستان کے دور کا خالص نجی ادب بن کر آج بھی اُنکی رہنمائی کر رہا ہے -

انیسویں صدی کی سیاسی اور سماجی تاریخ کے پس منظر میں مسلمانوں کا تیار کردہ کوئی عظیم اور ترقی یافتہ ادب ہمیں نظر نہیں آتا - اسلئے کہ یہ ان کیلئے ممکن بھی نہ تھا - وہابی تحریک کے نظریات نے انکی نگاہوں کو ماضی ہی کی طرف منعطف کر رکھا تھا - لیکن یہ بات کہ مسلمانوں کے قابل فخر ماضی کی داستانیں یاد کرکے وہ صرف ایک رومانی شاعر کے دل خوشکن خوابوں کی دنیا ھی میں سوئے رہے اور اس پر انھوں نے نگاہ حسرت و عبرت نہ ڈالی یہ بات درست نہیں - تاہم یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے سماجی اور بنگال کی وطنی زندگی کے متعلق ادبی خدمات سے اپنا پہلو تہی رکھا - انگریزی علوم سے ناواقف اور نیم خواندہ شعراء نے اس پوری صدی میں صرف دوبھاشی پوتھی ہی کی تصنیف میں وقت گذارا - ایک جانب انگریزوں کی

مسلم دشمنی اور دوسری جانب هندؤں کے متعصبانہ جذبۂ قومیت پرستی کے احیائے ثانیہ کے مقابلے میں صف آرائی کی کوشش - اور دونوں کے درمیان دوبھاشی پونھی کے مصنفین کے نظریات ان کا طرز ادا تخییل، اور استعمال الفاظ یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ سب وهابی تحریک هی کا رد عمل تھا - انیسویں صدی کے پہلے هی سے اس ادب کی تخلیق هوئی تھی - لیکن صرف انیسویں صدی کے اندر تمام ملک بنگالہ میں اس ادب کے حیرتناک پھیلاؤ سے اس زمانے کے بنگالی مسلمان عوام کے نظریاتی رحجان کا عجیب و غریب طور سے اندازہ هوتا ہے - تمام ملک کے عام مسلمانوں میں اصلاحی تعلق قائم کرنے کیلئے اس طرح کے عوامی ادب کی تخلیق کسی اور ملک میں بھی اس وسعت کے ساتھ وجود میں آئی ہے یا نہیں اس کی تاریخ ادب میں همیں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی - انیسویں صدی میں شریف بنگالی ادب کی بدولت یہ ادب اگرچہ ایک اچھوت ادب بن گیا تھا اور اس نے صرف برگد کے درختوں کے سائے هی میں پناہ پائی تھی تاهم آج بھی مختلف موضوعات پر لکھی هوئی کم و بیش دس هزار پوتھیوں کا همیں نشان ملتا ہے - اس ادب میں مذهبی کتابیں، تاریخ، سیرت، منظومات، رومانی افسانے وغیرہ

موضوعات پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ھیں - ان ادیبوں کے نظریات اگرچہ ماضی کی گود میں پل رھے تھے اور وہ خود ساختہ مراکز ھی کو محور بنائے ہوئے تھے - بلکہ اغلب ھے کہ ملک کے سیاسی اقتدار پر قابض جماعتیں اپنا قبضہ جمائے رھنے کے پیش نظر بیرونی دنیا کے معاملات سے انھیں بے تعلق رکھ کے اسی تخیل سے متلذذ کرنے اور ان پر غفلت کا ایک پردہ ڈالے رھنے ھی میں اپنی کامیابی کا خواب دیکھتی تھیں - اس نظریے کا ثبوت اس ادب کے استعمال الفاظ اور طرز ادا سے بھی ملتا ھے - اس میں زیادہ تر عربی و فارسی کے الفاظ کو بنگلا کا جامہ پنھاکر داھنی جانب سے (اردو کی طرح) استعمال کیا گیا ھے - اس سے ایک طرف تو مذکورہ صدی میں ھندؤں کے تیار کردہ ادب سے لاعلمی اور بے خبری کا وجود پایا جاتا ھے اور دوسری طرف اپنی متمدن زبان کو دنیا کے سامنے پیش کرکے حصول مسرت کا جذبہ بھی کارفرما نظر آتا ھے - اس کا ثمرہ یہ ھوا کہ مکمل انیسویں صدی میں پوتھیوں کے علاوہ بنگال کے مسلمانوں کے ذریعہ کسی اور ادب کی تخلیق ممکن نہ ھو سکی -

اس تخیل سے گلو خلاصی کیلئے صرف میر مشرف حسین اور کیقباد ھی پہلے مسلمان تھے جنھوں نے "ودّیا ساگر" بنکیم چندر، مدھوشودن اور ھیم نوبن وغیرہ بنگالی ھندو ادیبوں کی

تحریک پر مغربی تاثرات سے لبریز جدید بنگالی ادب کی تخلیق کیلئے راستہ ہموار کیا - ان کے بعد انیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں اپنی خالص روایات کو زندہ کرنے کے لئے حساس ادیب شیخ عبدالرحیم اور پنڈت ریاض الدین مشہدی وغیرہ چند مسلمان ادیب منصۂ وجود پر آگئے تھے - حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی چند حضرات نے ہمیں بھی حساس بنایا ہے -

انگریزوں کی دشمنی اور انگریزی زبان کی طرف سے ایک صدی تک بے توجہی اور مختلف تحریکات کی وجہ سے مسلمان پسماندہ رہ گئے لیکن انگریزی تعلیم یافتہ اور انگریزوں کے دعا گو ہندؤں ہی میں سے مغربی تخییل سے مشرف اور جدید تخیلات کے حامل ایسے کتنے ہی ادب کے خلاق وجود میں آئے جس سے اس ملک نے رفتہ رفتہ دور انگریزی کا اعلی ترین سرمایہ اور مغرب و مشرق کے اتصال کا واحد ذریعہ یعنی عظیم بنگالی ادب میراث میں پا یا - میر مشرف حسین اور نذر الاسلام کو چھوڑ کر ہمیں یہی نظر آئےگا کہ موجودہ بنگالی ادب کا وہ اعلی ترین حصہ جس میں انسانی بلند تخییل کی تصویر بنگلا زبان میں کھینچی گئی ہے اُس کا تمام تر جز بنگال کے ہندؤں ہی کا رہین منت ہے *

مندرجه ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا :—

(۱) ڈبلیو، ڈبلیو، ہنٹر— Our Indian Musalmans

(۲) اے، آر، ملک— The development of the Muslims of Bengal and Bihar (1813—1856) Ph. D. Thesis 1953.

(۳) قاضی عبد الودود — "شاشتــو بنگو (معکوم بنگال) پہلا ایڈیشن سنہ ۱۳۵۸ ب -

حصۂ سویـم

دوسرا باب

دو بـھاشی پوتـھی

کــــوبــــی گان

بــاؤل

سید علی احسن ــــــــ مترجم :ــ مولانا عبد الرحمٰن بیخود

دوسرا باب

دو بھاشی پوتھی

(بنگلا میں مخلوط زبان کی کتابیں)

سنہ ۱۷۶۰ع میں بھارت چندر کی وفات کے ساتھ ساتھ بنگلا ادب کے دور وسطی کا خاتمہ ہوا - اس کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شستہ اور مہذب لٹریچر بھی اپنے اختتام کو پہونچا - اس کے بعد شاعر ایشور گپت کے اثرات کے استیلا سے پہلے تک بنگالی ادب پر ایک غیر معمولی خاموشی طاری رہی - اگر ہم سنہ ۱۸۰۸ع تک اس دور کی حد متعین کر لیں (کیونکہ یہی ایشور گپت کا سال وفات ہے) تو ہمیں ماننا پڑیگا کہ تقریباً ایک سو سال تک جمود اور عدم جد و جہد کا زمانہ بنگال پر مستولی رہا - اس طویل عرصے میں سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور تمدنی تمام تر رکاوٹوں سے گذر کر بنگال کے عوام نے بہ مشکل اپنا وجود ہی باقی رکھا - اس ملک کے شعراء نے بھی فن شاعری سے ناواقفیت اور کم علمی کی وجہ سے جدید علوم بالخصوص انگریزی تعلیم کے حلقۂ اثر سے باہر رہ کر بہ مشکل اپنا تعلق ماضی کے ساتھ برقرار رکھا - ایک طویل

زمانے تک انھی شعراء نے عوام کو اپنے ادب کے ذریعہ سے سکون بخشا اور اس میدان میں عوام کی خدمت اور اعانت کی بدولت ھی وہ زندہ رہ سکے - باوجود تمام تر ناکارگیوں کے انھوں نے اپنے مضامین اور طرز ادا کے ذریعہ اپنے ابنائے وطن کے مزاج اور خیالات بےکام و کاست پیش کئے اور اپنے حتی المقدور اپنے دور کو زندہ رکھنے کی سعی کی - اس لئے ھم ان کی کمزوریوں کے باوصف ان سے مکمل بے اعتنائی نہیں برت سکتے -

انیسویں صدی کے شروع میں بنگالی ادب نے دو رخ قبول کئے - ایک غیر ملکی جیسے ھم مغربی تصورات سے متاثر اور مخلوط کہہ سکتے ھیں اور دوسرا خالص وطنی اور ملکی - یہ ملکی ادب صرف عوام کے رجحان اور قبول عام کی وجہ سے بچا رھا - اس کے پس پردہ عوام کا جذبۂ عیش پسندی اور سہل کوشی کارفرما رھا اور ساتھ ھی بھارت چندر کے شہری ادب کا لذت آفریں تخیل لوگوں کو تھپکیاں دیتا رھا - مغربی تاثرات کی بنا پر نثر نے ترقی پائی اور ملکی اثرات کی وجہ سے قدیم تخیلات زندہ رہ سکے - اس طرح "کوبی والا" فرقہ یعنی وہ شعرا جو جلسوں میں فی البدیہہ منظوم کلام پڑھتے تھے نیز دو بھاشی پوتھی کے مصنفین اپنا قدم آگے بڑھاتے رھے -

بھارت چندر کی وفات کے بعد سے سنہ ۱۸۰۰ع تک بنگال کی

کلچرل زندگی کو انھی "کوبی والا" اور دوبھاشی پوتھی کے مصنفین نے زندہ رکھا تھا - اس وقت سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام کی برہمی کے باوجود وہ بہت ھی آسان طریقے اور سستی قیمت پر عوام کی لذت اندوزی کا سامان فراھم کر رہے تھے - سنہ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد اگرچہ انگریزوں کی حکومت اس ملک پر قائم ہو چکی تھی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت پورے ملک میں امن و امان بھی قائم ہو گیا تھا - سنہ ۱۷۶۵ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیوانی کی سند حاصل کی لیکن ساتھ ھی ساتھ ملک کی انتظامی حالت میں کوئی نظام امن قائم نہ ہو سکا - اس کا نتیجہ تھا کہ ہم سنہ ۱۷۶۹ء کے بعد ملک کو سخت قحط کا شکار پاتے ھیں - اس قحط کی وجہ سے ملک کی مالی حالت اپنے کمال انحطاط تک پہنچ گئی تھی - سر ولیم ہنٹر کی رائے کے مطابق سنہ ۱۷۷۰ء کے بعد ھی سے زیریں بنگال کے تقریباً دو تہائی اعلی اور دولت مند گھر والوں نے اپنی دولت اور قدیم شان و شوکت کو خیر باد کہہ دیا تھا - ایسی عام تباھی کے زمانے میں علم و فن کی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا - تا ھم جن لوگوں نے ایسے نازک دور میں قدیم ادب اور شاعری کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بجھنے سے بچا رکھا تھا ھم انھیں کسی طرح فراموش نہیں کر سکتے -

فنی محاسن اور بلندی تخیل کے لحاظ سے کوبی گان اور دوبھاشی پوتھی خواہ کتنی ہی ناقابل توجہ کیوں نہ ہو لیکن قدیم شاعری کی بجھتی ہوئی شمع کے مدھم سائے ہمیں اس شاعری میں متحرک نظر آتے ہیں - اس کی وجہ سے ادب کی تاریخ کا سلسلہ اب تک باقی رہا ہے - بھارت چندر کی وفات کے فوراً بعدھی شاعری میں جدید رجحان رونما نہیں ہوا - اس قسم کی اچانک بیداری فطرۃ ممکن بھی نہ تھی کیونکہ کسی زبان کی نظم تدریجی تبدیلی کے سوا فوری تغیر کی متحمل نہیں ہوسکتی - علاوہ بریں کسی بڑے شاعر کی وفات کے بعد عموماً اس کے تلامذہ اور متبعین ایک خاصی مدت تک اس کے تتبع اور تقلید ھی کو اپنے لئے طرہ امتیاز سمجھتے رھا کرتے ھیں - بھارت چندر کے زمانےھی سے دوبھاشی پوتھی نے قوم میں رواج پایا تھا اور اگرچہ یہ پوتھیاں انیسویں صدی میں لکھی گئی ھیں بلکہ آج بھی لکھی جا رھی ھیں پھر بھی ایشور چندر گپت کے بعد نہ تو کوئی تبدیلی پیدا ہو سکی اور نہ کوئی صاحب طرز مصنف جو اس میدان کا شہ سوار بن سکے جنم لے سکا -

دو بھاشی پوتھی کی وجہ تسمیہ صرف یہی ہے کہ یہ پوتھیاں بنگلا زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے مخلوط کرکے ایک نئی زبان میں لکھی گئی تھیں - چونکہ اس دور میں سرکاری زبان

فارسی اور مذہبی زبان عربی تھی نیز وسطی اور شمالی ہند میں اردو زبان بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اس لئے بنگلا زبان بھی ان زبانوں کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی - اس سلسلے میں ہمیں اسکی بھی تحقیق کرنی ضروری ہے کہ یہ دوبھاشی بنگلا عوام میں مروج تھی یا نہیں -

جو لوگ دفاتر یا عدالتوں میں کام کرتے تھے یا جو لوگ تجارت کے نفع بخش میدان کو اپنائے ہوئے تھے وہ باہمی گفتگو عربی و فارسی سے مخلوط بنگلا ہی میں کرتے تھے - ہم مختصرا اس دوبھاشی زبان کو عدالتوں یا کائستھوں کی زبان بھی کہہ سکتے ہیں - اُس زمانے میں تجارکو کائستھ بھی کہتے تھے - مسلمانوں کی فتوحات کے بعد ہی سے عربی و فارسی الفاظ بنگلا زبان میں مخلوط ہونا شروع ہو گئے تھے - عام طور پر عوام ایسی زبان کے موجد تھے لیکن اقتضائے حال کی بنا پر یہی زبان ادب میں بھی قبولیت عوام کی خاطر داخل ہو گئی تھی - کوبی کنکن کی مصنفہ چنڈی میں ہمیں ملتا ہے کہ بنگلا نظموں میں بے حساب عربی و فارسی الفاظ مخلوط ہو گئے ہیں - اس اختلاط نے فارسی زبان کو بھی ایک نئے روپ میں ڈھال دیا تھا - اس زمانے کی بنگلا زبان میں عربی و فارسی الفاظ کا اختلاط کوئی نئی بات نہیں ہے - دور وسطی کی ہر پوتھی اور ہر زبان

میں اس قسم کا اختلاط پایا جاتا ھے -

ان پوتھیوں کا ایک معتد بہ حصہ کلکتے میں مرتب ھوا تھا - کلکتہ اس زمانے میں ایک بین الصوبہ جاتی شہر کی حیثیت رکھتا تھا جہاں مختلف زبانوں کے جاننے والے بود و باش رکھتے تھے - کثیر التعداد پوتھیاں دیہاتوں میں بیٹھ کر بھی لکھی گئیں - ان پوتھیوں کی ترتیب و تدوین کا واحد مقصد یہ تھا کہ مخلوط زبانوں کے جاننے والے اپنی فرصت کے اوقات میں اس طرح کی نظمیں سن کر تفریح حاصل کریں - ان پوتھیوں کے مضامین بھی سطحی مسرت بخشنے والے، تعجب خیز اور رومان پرور تھے - اس مخلوط زبان کی ترویج کے پیچھے ایک بڑا جذبہ یہ بھی کارفرما تھا کہ مسلم تہذیب و ثقافت سے عوام الناس کو روشناس کرا دیا جائے اور دور وسطی کے کارناموں کو منظوم و مقبول صورت میں ذھن نشین کرایا جائے -

یہ ماننا پڑتا ھے کہ یہ اختلاط بھی ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا گیا تھا کہ عوام نے اسے بے تکلف طور پر قبول کیا - مسلمان شعراء کے علاوہ ھمیں غیر مسلم شعراء کے یہاں بھی ایساھی اختلاط نظر آتا ھے - دور وسطی میں شاعر بھارت چندر راجا کرشن چندر کے دربار میں ملک الشعراء اور سنسکرت کے بڑے ماھر محقق تھے - لیکن اس کے باوجود وہ عربی و فارسی

زبان سے مخلوط دو بھاشی بنگلا کی محبت نہ چھوڑ سکے۔
ان کی کتاب " انودا منگل " نظم کے تیسرے حصے میں جس کا نام
مان شنگھو ہے شاھنشاہ جہانگیر کے ساتھ راجا مان سنگھ کی
گفتگو کے سلسلے میں مذکور ہے ۔

مان شنگھو پادشار ھوئیلو جے بانی
اُچت شے پارشی عربی ھندوستانی
پڑیا چھی جے ئ شو برنی بارے پاری
کنتو شے شکل لوکے بو جھی بارے بھاری
نارُبے پروشاد گُن ناھو بیرشال
اتوایب کہی بھاشا جابونی مشال

ترجمہ —

مان سنگھ اور بادشاہ میں جو گفتگو ھوئی
وہ ضرور ہے کہ عربی فارسی اور ھندوستانی میں ھوئی
میں نے جیسا پڑھا ہے ویساھی لکھہ بھی سکتا ھوں
مگر سب لوگوں کا اسے سمجھنا مشکل ہے
نہ اس میں لذت ھوگی اور نہ دل کشی
اسی لئے میں مسلمانوں کی مخلوط زبان استعمال کرتا ھوں
جناب ھیل ھڈ صاحب اپنی بنگلا قواعد کے مقدمے میں
فرماتے ھیں —

" اس زمانے میں وهی لوگ معزز زبان بولتے هیں جو بنگلا افعال کے ساتھ فارسی و عربی اسماء زیادہ تر مخلوط کرتے هیں " - یه قواعد سنه ۱۷۷۸ع میں لکھی گئی تھی - اس قواعد کے آخری حصے سے هم اُس زمانے کی ایک بنگلا درخواست کا نمونه پیش کرتے هیں —

شری رام ! غریب نواز
شلامت - آمار زمینداری
پرگنه کاگ جول - تاهار دوئی
گرام دریا شکستی هوئیاچھے -
شے ای دوئی گرام پیوستی
هوئیاچھے - اکبر پوریر سری
هری کرشتو رائے چودهری آج
زبردستی دخل کریبا بھوگ
کریتےچھے - آمی مال گذاری
سر برا هوتے مارا پڑیتےچھی -
امیدوار سرکار هوئیتے آمی
و اک چوپدار سرزمینے تے
پهنچیا طرفین کے طلب دیا
عدالت کریا حق دلائیا دین -

شری رام ! غریب نواز
سلامت میری زمینداری
پرگنه کاگ جول میں هے -
اس کے دو گاؤں دریا شکست
هو گئے هیں - اور دونوں
مل کر ایک هو گئے هیں -
اکبر پور کا سری هری
کرشتو رائے چودهری آج
زبردستی دخل کرکے اُس سے
نفع حاصل کر رها هے - اور
میری مال گذاری سال به
سال ماری جا رهی هے -
امیدوار که سرکار کی
طرف سے میں اور ایک چوبدار

ایتی سنه۱۱۸۵ بنگلا - تاریخ اگیا روی شرابن - فدوی جگت دھیر رائے -

سر زمین پر پہنچ کر او ر طرفین کو بلا کر فیصله کرکے حق دلا دین فقط - سنه۱۱۸۵اب - تاریخ گیارھویں ساون - فدوی جگت دھیر رائے -

یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ھے که دوبھاشی پوتھی کے مصنفین نے بلا تکلف و بلا مبالغه ھزاروں عربی و فارسی کے الفاظ نقل کرکے افسانوی اور مذھبی ادب کو زندہ رکھا تھا۔ لیکن زمانۂ حال میں جس ماحول سے متاثر ہو کر بنگلا نظم نے ترقی کی ھے اُس کے ساتھ ان پوتھیوں کا کوئی تعلق نہیں ھے -

اب ھم مختصر طور پر پوتھی کی تاریخ کا تذکرہ کریں گے -

ہوڑہ اور ہوگلی کی سرحد پر بھرشٹ پرگنه واقع ھے - یہاں سے قریب ھی موضع بسنت پور بھارت چندر کا وطن تھا - اسی بھرشٹ مندارن میں اسماعیل غازی کی وجه سے سولھویں صدی عیسوی کے آخر ہی سے ایک خانقاہ بن گئی تھی - سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں دھرمو منگل اور منسا منگل کے مرتب کرنے والے شعراء نے اس صوفی پیر کی تعریف میں سلام منظوم کیا ھے زمانۂ ما بعد میں صوفی اسماعیل غازی "بڑے خان' کے لقب سے مشہور ہو گئے - اٹھارہویں صدی عیسوی میں اسی بڑے خان

غازی کو موضوع سخن بنا کر بھرشت مندارن میں دوبھاشی پوتھی کا ایک مستقل ادارہ قائم ہو گیا - اس مرکز ادب سے دو شعرا قابل ذکر اٹھے - یہاں کے قابل ذکر پہلے مصنف غریب اللہ ہیں اور دوسرے مصنف سید حمزہ - غریب اللہ کے والد کا نام شاہ دُندی تھا - ان کی پیدائش موضع بلیا حافظ پور میں ہوئی - یہ ابتدا ہی سے پیر بڑے خاں کے دل سے معتقد تھے - ان کی پیدائش اور وفات کا صحیح زمانہ متعین نہ ہو سکا - امیر حمزہ پوتھی جس کے یہ خود مصنف ھیں اس کے دوسرے حصے کی تکمیل سید حمزہ نے سنہ ۱۷۹۲ع میں کی تھی - اس سے اندازہ ہوتا ھے کہ غریب اللہ کی امیر حمزہ پوتھی اس سے بہت پہلے لکھی گئی تھی - یہ کتاب اردو کی داستان امیر حمزہ کے تتبع میں لکھی گئی -

غریب اللہ کی دوسری منظوم کتاب یوسف زلیخا ھے - "امیر حمزہ" میں ایران کے بادشاہ نوشیرواں کے ساتھ امیر حمزہ عم رسول کے معاربات کا ذکر ھے - ایسی کتاب اردو میں بھی موجود ھے - اس کا ذکر لطف سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت امیر حمزہ کی شیر خوارگی ہی میں نوشیرواں وفات پا چکا تھا - اس لئے یہ ظاہر ھے کہ اس پوتھی میں صرف افسانوی حیثیت کا لحاظ رکھا گیا ھے اور اسے واقعیت یا تاریخ سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے - اردو میں بھی امیرحمزہ سے متعلق معاربات پر بڑی ضخیم اور داستان در داستان کتابیں لکھی گئی

ہیں جن میں داستان امیر حمزہ ، طلسم ہوش ربا، طلسم نور افشاں، طلسم حیرت، ایرج نامہ ، باختر نامہ ، تورج نامہ وغیرہ وغیرہ متعدد جلدوں میں موجود ہے - اغلب ہے کہ غریب اللہ نے اردو ہی سے اس کا مواد حاصل کیا تھا -

یوسف زلیخا میں غریب اللہ نے فارسی شعراء سے استفادہ کیا ہے - یہ پہلے ہی مذکور ہو چکا ہے کہ کم و بیش چار مشہور فارسی شعراء نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے - غریب اللہ کی یوسف زلیخا انہی کی تقلید میں لکھی گئی ہے - بنگلا میں یوسف زلیخا منظوم اور شعراء نے بھی مرتب کی تھی جن میں سب سے پہلا نام شاہ محمد صغیر کا پایا جاتا ہے -

غریب اللہ کی اور کتابیں بھی ہیں جنہیں دوسرے چالاک شعراء نے اپنا لیا ہے - انہی میں سے ایک "جنگ نامہ" ہے جو محمد یعقوب علی کی طرف منسوب ہے - ان کی دوسری کتاب " شونا بھانیر پوتھی" ہے جو انہی کے نام سے منسوب ہے - " شتو پیرر پوتھی" کے مصنف کی حیثیت سے بھی ہم غریب اللہ کو دیکھتے ہیں -

غریب اللہ کے بعد عبد الحکیم نے بھی ایک منظوم یوسف زلیخا سنہ ۱۸۷۴ع میں لکھی تھی - اس کے بعد فقیر محمد نے سنہ ۱۸۷۶ع میں ایک کتاب اسی نام سے منظوم کی -

غریب اللہ کے بعد سید حمزہ دو بھاشی پوتھی کے ایک مشہور

شاعر گذرے ھیں - بھارت چندر کی ضعیفی کے وقت یہ نوعمر اور نو مشق تھے - بھارت چندر کا وطن موضع اُدنا تھا - وھاں سے چار میل کے فاصلے پر موضع بسنت پور میں سید حمزہ نے مدت تک اپنی زندگی گذاری تھی - اسی زمانے میں بنگال حکومت دھلی کے اثر سے آزاد ھوکر خود مختار بن گیا تھا - یہ بنگال کے نواب علی وردی خاں کا زمانہ تھا - سید حمزہ کی پیدائش سنہ ۱۷۳۳ع میں ھوئی تھی - وہ مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف ھیں - مدھو مالتی - امیر حمزہ جلد دوم - جیگون پوتھی - حاتم طائی -

سید حمزہ دو بھاشی پوتھی کے مصنفین میں بلا شبہہ سب سے بلند مقام کے مالک ھیں - ان کی زبان ' تشبیہات ' نشست الفاظ اور خوبی ادا بنگالی ادب میں بے نظیر ھے - انھوں نے جن قصوں کو اپنایا ھے ان میں اور دوسرے شعراء میں وحدت موضوع کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں - انمیں ذکر عجائب و غرائب ' محیر العقول واقعات ' غیر معمولی حادثات اور جن و پری وغیرہ کی داستانیں کثرت سے ملتی ھیں - واقعی طور پر انھوں نے انسانی ضروریات' فطری کیفیات اور انسانی فطرت یا حوائج و محسوسات زندگی کے متعلق کوئی نظم نہیں لکھی - لیکن با ایں ھمہ سید حمزہ کی نظموں میں بلندی و رفعت' دل کشی و ندرت اور شکوہ

و عظمت کے دفینے ملتے ھیں ۔ انتخاب الفاظ اور طرز ادا میں انھوں نے با سلیقگی اور رفعت تخیل کا کافی ثبوت دیا ھے ۔ ہمیں ان کی نظموں میں زندہ انسانی دلوں کی دھڑکنیں بھی باربار سنائی دیتی ہیں ۔

سید حمزہ کی مدھو مالتی حقیقت میں دوبھاشی پوتھی نہیں ھے ۔ کیونکہ اس میں عربی و فارسی الفاظ کم استعمال کئے گئے ھیں ۔ قدیم زمانے کے پوتھی نگار شعرا مثلاً الاول نے اپنی پدماوتی میں اور دوسرے شعراء نے اور ساری پوتھیوں میں جس طرح سنسکرت کے الفاظ سے زبان کو مزین کیا ھے اسی طرح سید حمزہ نے بھی ان کی تقلید میں اپنی مدھو مالتی کو سنسکرت الفاظ سے وقیع کیا ھے ۔ لیکن جہاں تک محاسن شاعری، ندرت تخیل وغیرہ کا تعلق ھے سید حمزہ اپنے سابق شعراء سے بوجوہ افضل و ارفع نظر آتے ہیں ۔ ایک تمثیل سے یہ امر زیادہ واضح ہو سکے گا ۔ یہ دیکھا جاتا ھے کہ قدیم پوتھی نگاروں نے اپنی تصنیفات میں محبوبہ کا سراپا بیان کیا ھے ۔ اس سراپا میں ہم محبوبہ کے ظاھری حسن اور اس کے اعضاء کی تشریح کے سوا اس کی سیرت، کردار، دلی کیفیات اور معنوی محاسن سے واقف نہیں ہو سکتے ۔ الاول نے پدماوتی کے حسن کی تشریح کرتے ہوئے اس کے سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخن تک ہر عضر کی خوبصورتی بیان کی ھے ۔

الگ الگ مثالیں، تشبیہات اور استعارات سے نظم کو موتیوں کی مالا بنا دیا ہے لیکن اس میں محبوبہ کی سیرت عنقا ہے ۔ ایک جگہ فرماتے ہیں " پدو نکھ کی با تار ششی زنش کلنکو " یعنی اس کے پاؤں کے ناخن بے داغ چاند جیسے ہیں ۔ یہ بیانات اور ایسی تشریحات ہمیں محبوبہ کی صحیح حیثیت اور واقعی محاسن سے جس حد تک دور کر دیتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہے ۔ لیکن سید حمزہ میں ہم ایسے بیانات سے بے تعلقی اور نئے صحیح تر خیالات کی ایسی تخلیق پاتے ہیں جن سے محبوب کے محاسن معنوی کے ساتھ حقیقت حسن آشکار ہوتی ہے ۔ یہ بات بے تکلف کہی جا سکتی ہے کہ دور وسطی میں سید حمزہ ہی نے سب سے پہلے بیان حسن صوری کے ساتھ تذکرہ محاسن معنوی کو ہم ساز بنایا تھا ۔ جس طرح قدیم شاعری ہمیں کسی حسن کامل سے روشناس نہ کرا کے اعضا و جوارح سے الگ الگ واقف کراتی تھی اُسی طرح سید حمزہ کی شاعری ہمیں اعضاء سے الگ کرکے حسن کامل کی رعنائیوں کی طرف لے جانے میں معین ہوتی نظر آتی ہے ۔ یہاں ہمیں ایک مجموعہ کا تذکرہ ملتا ہے اور ہم ان کی بیان کردہ محبوبہ کو واقعی جسم و جان رکھنے والی محبوبہ کی شان میں دیکھتے ہیں ۔ مدھومالتی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

" نانا ھاشو پری ھاشے　　　مالتیر آشے پاشے
روپوشی گائن گان گائے

جوبوگن کوتوھولی　　　کیہو دے کرو تالی
کیہو کیہو کھنجنی باجائے

لوئیا شوبر نوجھاری　　　آنندے کوتک کوری
کیہو کیہو دے جلو دھار

ناری گن آنندے تے　　　آتی شورو گامچھا تے
بدن موچھن کورے تار

نوائیا مالتی رے　　　دیتیو پیتار پُرے
بوشائیلو موچھائیا بدن

دوئی چاری شکھی میلے　　　شبے اوتی کوتوھلے
کیہو تار بَدَلے بوشن

کولے کری لوئیا　　　دولی چائے بوشائیا
ناری گن بوشی لو بیڑیا

توری تو منجری رانی　　　بسترو اُولنکار آنی
جو گائیلو مالتی لاگیا

شہجے روپیر بھارے　　　اپونی چلیتے نارے
نبن جوبن تاھے بھار

روپیر موراری بالی　　　کھیانو مدّ ھے پڑے ڈھولی
کیمنے بوھی بے اولونکار

چندریـــر جینیا روپ   شورجیـــر جیمن دھوپ

ابھورنے کی بـا پرو یوجن

اے اوراؤ انّے جتو   دیشر چلـــن متـــو

آنیلـــو کنچت آبھورن

ترجمہ --

بڑی ھنسی اور دلگی کے ساتھ مالتی کے چاروں جانب
حسین مغنیہ عورتیں گانا گانے لگیں

جوان عورتیں متعجب اور مسرور ہو ہو کر - بعض انمیر سے تالیاں
بجانے لگیں

اور بعض بعض کھنجن باجا بجانے لگیں

سونے کا آب پاش لے کر - خوشی اور مسرت سے بیخود ہو ہو کر
بعض بعض اس پر پانی لنڈھانے لگیں

عورتیں ہنسی خوشی سے - بڑی نـرم و نـازک تولـئے سے
اس کا جسم خشک کرنے لگیں

مالتی کو غسل دلانے کے بعد - دوسری چوکی پر
اس کا جسم سکھا کر بیٹھایا گیا

دو چار سکھیوں نے مل کر - سب نے بڑی مسرت اور خوشی سے
اس کا لباس تبدیل کرایا

اُسے گود میں لے کر اور سب عورتیں اُسے گھیر کـر بیٹھ گئیں

جلدی ھی منجری رانی (ماں) نے - کپڑے اور زیور
مالتی کے لئے لا موجود کئے

بہ آسانی اپنے حسن کے وزن ی وجہ سے - وہ خودھی نہیں چل سکتی
اور اس کی نو خیز جوانی خود ھی اس پر ایک مزید بوجھہ ھے
وہ لڑکی جو حسن کی پُتلی ھے - اور اپنی جوانی کے بوجھہ سے
خود ھی لچکتی جاتی ھے
کیسے زیوروں کا بوجھہ سہار سکتی ھے
جو چاند کا مثیل ھے - ابسی تاباں ھے جیسے سورج کی شعاع
اس دیلئے زیور کی ضرورت ھی کیا ھے .
دوسری عورتوں سے مل کر مشا طاؤں نے بھی - ملک کی رسم کے مطابق
کچھ نفیس کپڑے اور زیور لا موجود کئے "

اس نظم میں ھمیں یہ نظر آتا ھے کہ شاعر نے حسن کا توضیحی تذکرہ نہیں کیا ھے لیکن حسن کا ایک اجتماعی تذکرہ موجود ھے - شاعر نے مالتی کے اعضاء کے بجائے اس کے مجموعی جسم و جان کا حسن بیان کیا ھے اور اسی وجہ سے یہ انداز بیان بہت وقیع ھو گیا ھے - حسن زبان اور محاسن طرز بیان کی رو سے " مدھو مالتی " کی اگرچہ دوسری دو بھاشی پوتھیوں کے ساتھ کوئی مماثلت نہیں ھے لیکن افسانوی حیثیت اور طرز ادا کی رو سے " مدھو مالتی اور دوسری دو بھاشی پوتھیوں میں

یکسانیت کی بہت سی وجہیں موجود ھیں - مثلاً سب سے پہلے ھمیں دوسری پوتھیوں کی طرح اس میں بھی واقعات کی ایسی روانی اور شگفتہ تسلسل نظر آتا ھے جس کے نتایج یکے بعد دیگرے آخر میں ظاھر ھوتے ھیں - دوسرے یہ معلوم ھوتا ھے کہ غیر معمولی، ناممکن اور غیر واقعی حوادث کچھ ایسی بے تکلفی سے وقوع پذیر ھوتے جاتے ھیں کہ دھن بہ بار نہیں ھوتے اور طبیعت انھیں بے تردد قبول کرتی جاتی ھے - تیسری بات یہ ھے کہ ان پوتھیوں میں انسان کی زندگی سے متعلق واقعات، عادات و اطوار، روز مرہ کے حالات اور سماجی کیفیات کو زیادہ وقعت اور اھمیت نہیں دی گئی ھے - بلکہ صرف ذکر واقعہ برائے واقعہ اور اس کا اجتماعی طور پر ناممکن الوقوع اور مافوق الفطرت ھونا ھی مقصود نظم نگاری ھے - اس طرح یہ بات بھی ظاھر ھے کہ اس افسانے میں بنگالی سماج اور مراسم سے اجنبیت برتی گئی ھے اور ایسا معلوم ھوتا ھے کہ یہ افسانہ غیر بنگالی دنیا کا ھے - چوتھی بات یہ تھی کہ مدھو مالتی بھی اور پوتھیوں کی طرح علم العروض کی رو سے "پویار" کی بحر میں لکھی گئی ھے -

بنگلا پوتھیوں کی بحر کے متعلق اس قدر سمجھ لینا ضروری ھے کہ دور قدیم کی ساری بنگلا پوتھیاں صرف ایک ھی بحر

" پو یار" میں لکھی گئی ہیں - فارسی اور اردو میں جس طرح بحروں کا دار و مدار اوزان 'ور ارکان پر ہے اور اوزان کا تعین تعداد حروف' حرکات اور اصوات سے ہوتا ہے اسی طرح بنگلا زبان میں بھی بحریں متعین ہیں - انھی بحروں میں سے ایک قدیم بحر " پو یار" ہے - اس بحر میں عموماً چودہ حروف صحیح سے ایک مصرعہ کی تشکیل ہوتی ہے - حروف علت جو کسی حرف صحیح کے بعد آتے ہیں وہ شمار نہیں کئے جاتے - البتہ اگر وہ ابتدائے لفظ میں آئیں تو شمار کئے جائیں گے - قرءت میں ابتدائی آٹھ ارکان کے بعد ایک ذرا سکتہ ہوتا ہے اور پھر بعد کے چھہ ارکان کسی قدر زیادہ زور دے کر ادا کئے جاتے ہیں جس سے زور ادا اور قوت کلام میں اضافہ ہو جاتا ہے - مثال کیلئے مندرجہ ذیل دو مصرعے ملاحظہ ہوں :-

را	جا	بو	لے	شو	نو	مو	رِ '	را	جسّیر	پرو	دھا	ن
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴

کو	ما	رے	بـدا	ئے	کـرو '	کـری	یـا	سـا	مـا	ن
۱	۲	۳	۴ ۵	۶	۷ ۸ '	۹ ۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴

———:•*•:———

مدھو مالتی کا قصہ

مدھو مالتی کا مختصر قصہ یہ ہے کہ کنکر نگر میں سورج بھان نامی ایک راجا تھے - ان کی رانی کا نام کملا اور فرزند کا نام منوھر تھا - منوھر جب جوان ھوا تو ایک رات وہ باہر سویا ھوا تھا - اتفاقاً چند پریاں پرواز کرتی ہوئی جا رہی تھی - منوہر کا حسن اور جوانی دیکھ کر انھیں خیال پیدا ھوا کہ اس کا جوڑ روپ منجری کی لڑکی مالتی سے بہت مناسب معلوم ھوتا ھے - وہ پریاں منوہر کو مع پلنگ کے اٹھا لے گئیں اور اسے مالتی کے قریب چھوڑ کر چلدیں - وہاں ان دونوں نے تمام دن ایک دوسرے سے بات چیت کی اور اتنے ہی وقفے میں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے - پھر آپس میں انگشتری بھی تبدیل کر لی - دوسری شب پریوں نے دوبارہ منوہر کو اس کے گھر پہنچا دیا -

دونوں ہی صبح اٹھ کر جدائی کی آگ میں جلنے لگے - منوہر گھر سے رخصت ہو کر مالتی کی تلاش میں روانہ ہوا - بے شمار مصائب جھیلنے اور جان جوکھوں میں پڑنے کے بعد وہ ایک ویران قلعے میں پہنچا جہاں ایک حسین راجکماری پریما کو کسی دیو نے قید کر رکھا تھا - منوہر نے دیو کو قتل کر کے پریما کو رھائی دلائی - پریما سے اسے معلوم ہوا کہ وہ مالتی کی سکھی ھے - منوہر

پریما کے ساتھ اُس کے گھر گیا اور پھر پریما مالتی کو اپنے گھر لائی - مالتی کے ساتھ اُس کی ماں روپ منجری بھی پریما کے گھر آئی - باغ میں مالتی کی منوہر سے ملاقات ہوئی - دونوں نے ایک دوسرے سے اپنے مصائب کی داستان کہی اور مستقبل کی تکلیفوں سے بے خبر ہمکنار ہو کر پریما کے محل ہی میں ایک جگہ سو رہے - انھیں مالتی کی ماں نے اس حالت میں دیکھ لیا اور غصے سے بے اختیار ہو کر مالتی پر سحر کا پانی چھڑک دیا جس سے وہ طوطا بن کر اڑ گئی - منوہر پھر مالتی کیلئے دیوانہ ہوکر باہر نکلا اور اُسے تلاش کرنے لگا - اُدھر مالتی طوطا بنی ہوئی اڑتے اڑتے ایک دوسرے راجا تارا چاند کے باغ میں ایک درخت پر آ بیٹھی تھی کہ راجا نے اسے دیکھا اور تدبیروں سے گرفتار کر لیا - اب وہ نئی جگہ قید و بند کی زندگی گزارنے لگی - اس کی ماں کو معلوم ہوا تو اس نے آ کر پھر سحر دفع کیا اور اس طرح مالتی پھر اپنے اصلی روپ میں آ گئی - تارا چاند نے اُس سے شادی کرنی چاہی لیکن مالتی نے اپنی داستان محبت تارا چاند کو سنا دی اور اس نے کوشش کرکے منوہر کو تلاش کراکے اپنے یہاں بلا لیا - آخر بڑی مصیبتیں جھیلنے کے بعد ان دونوں کی شادی ہو گئی اور ساتھ ہی تارا چاند کی شادی پریما سے ہوئی -

اس داستان میں مصنف نے بار بار ایسے واقعات پیش کئے ہیں

جن کی وجہ سے تعجب خیزی، ندرت اور دلکشی میں اضافہ ہو گیا ہے ۔ ہر ہر معرکے کو مصنف نے چوٹی تک پہنچا کے پھر اس کے سر کرنے کی تدابیر پیدا کی ہیں اور اس طرح ہر مصیبت کے منھہ سے ہیرو بچتا ہوا کامیابی کی منزل سے ہمکنار ہوا ہے - اس طرز نگارش کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کو انجام کی چاٹ میں پوری کتاب پڑھنے کی ہوس پیدا ہوتی ہے اور یہی داستان کا مقصود اعلی ہے - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوبھاشی پوتھی کے لکھنے والوں نے اپنے افسانوں میں نہ تو ہیرو کے کیرکٹر اور اس کے محاسن معنوی سے تعرض کیا ہے اور نہ سماجی حالات اور معاشرے کے محاسن و مصائب سے بحث کی ہے بلکہ ان کا مقصد ہر طرح واقعے کی رنگینی اور دلکشی میں صرف اضافہ ہے اور بس -

سید حمزہ کی دوسری قابل ذکر پوتھی "صحیم جیگونیر پوتھی" (صحیم زیتون کی پوتھی) ہے - اس میں حضرت علی کے فرزند حضرت حنیفہ کے ساتھ ارم شاہ کی بیٹی جیگون (زیتون) کی داستا نہائے شجاعت و جنگ درج ہے - اس افسانے میں ہیروئن ایک ہندو راجکماری ہے اور مصنف نے اس میں حضرت حنیفہ کی شجاعت کے مافوق الفطرت حالات بیان کر کے در اصل اسلام کی فتح اور مسلمانوں کی کامیابی و شجاعت کی داستان کا رنگ اُجا گر کیا ہے -

حقیقت میں دو بھاشی پوتھی میں مصنفین نے اپنی مفروضہ داستانوں کے ھیروؤں کو عموماً کوئی بڑا مسلمان متعین کر کے عجیب و غریب واقعات اور حالات کو ان کے ساتھ منسوب کیا ھے۔ بڑے بڑے معرکوں اور عظیم الشان جنگوں میں ان کی کامیابی کا منظر پیش کر کے انھوں نے مسلمانوں کی فتح سے خود لطف اٹھانے اور مسلمانوں میں اپنے اسلاف کے حالات سے نیا جوش شجاعت اور شوق جرأت پیدا کرنے کی کوشش کی ھے - اسی طرح ایک اور پوتھی میں حضرت علی کے ساتھ ھنومان کی جنگ کے افسانے لکھے گئے ھیں اور حضرت علی (رض) کی بے مثال بہادری اور آخر میں غلبہ کا حال دکھایا گیا ھے - اس کی مثالیں اردو زبان کے طویل افسانوں اور مشہور داستانوں میں بکثرت ملتی ھیں - بوستان خیال، داستان امیر حمزہ، جنگنامۂ حضرت علی، جنگ نامۂ مقاتل و حنیفہ وغیرہ اسی قسم کی کتابیں ھیں -

"صحیح جیگو نیر پوتھی" کی خصوصیات مندرجہ ذیل ھیں :—

۱- عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش بہت زیادہ ھے - یہ آمیزش کہیں کہیں نامناسب اور ادق نیز غیر فصیح ہونے کی وجہ سے ثقیل بھی ھو گئی ھے - بیشتر آسان اور مروج بنگلا الفاظ کو ترک کرکے ثقیل عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش کی گئی ھے جس سے زبان نا مانوس ھو گئی ھے - مثلاً قدرت، قوت، کمال، ذات پاک،

کن ، عظیم ، ذرہ ، صورت ، قد ، دندان ، ہوشمند ، سہیلی ، بدعت، اندیشہ ، نزاع ، تیغ ، یقین وغیرہ الفاظ استعمال کئے ھیں - جہاں اسلامی اصول بتائے گئے ھیں یا دوسروں کے خیالات نقل کئے گئے ھیں وھاں بے شک مناسب اور مانوس الفاظ استعمال کئے گئے ھیں اور اسے قابل قبول سمجھا جا سکتا ھے لیکن جابجا بے ضرورت غیر زبان کے ثقیل الفاظ کا استعمال نا مانوس معلوم ھوتا ھے - مثلاً :-

سلام کریا کہے تمام سردار   تقصیر کرو ھو معاف اما شبا کار
لڑیا تومار شاتھ نا ھوئینو فتح   آخر ھوئیلو دائے جان باچائینے
ایکھن تومار پناہ لیاچھی آشیا   اما شبا کار ترے راکھو نوا زیا
بی بی بولے جودی شبے باچائینے جان   کلمہ پڑھیا تبے ھو مسلمان
اللہ کے یقین جانو ھوئیا مومن   خوشی تے قبول کرو محمدی دین

ترجمہ :-

تمام سرداروں نے سلام کرکے کہا
ھم سب لوگوں کی تقصیر معاف کیجئے
آپ کے ساتھ جنگ کرکے ھم فتحیاب نہ ھوں گے
آخر ھمیں تدبیروں سے جان بچانی پڑی
اب ھم نے آکر آپ کی پناہ حاصل کی ھے
اس لئے ھم سب کو آپ نواز کر رکھئے

بی بی نے کہا کہ اگر تم سب جان بچانی چاھتے ھو

تو سب کلمہ پڑھ کے مسلمان ھو جاؤ .

اللہ پر یقین رکھو اور مومن ھو جاؤ

(اور) خوشی سے محمدی دین قبول کرو

اس نظم میں ایسے بہت سارے الفاظ مستعمل ھوئے ھیں جو مسلمانوں کے مذھبی تصورات اور متعقدات سے مل کر اس طرح زبان زد ھو چکے ھیں کہ ان کی غرابت ختم ھوگئی ھے اور اس وجہ سے ان کے بجائے بنگلا زبان کے الفاظ استعمال نہ کرنے سے بھی کوئی ثقالت یا غرابت پیدا نہیں ھوتی -

۲ - عربی اور فارسی اسماء کو تقلیبی طور پر افعال میں تبدیل کر دیا گیا ھے - بنگلا قواعد میں اسے "نام دھاتو" کہتے ھیں - مثلاً :—

رات گذاریا گیلو - (رات گذار کر گیا)

خوشحالیتو من - (خوش حال طبیعت)

نوازیا راکھو خدمتے - (نواز کر خدمت میں رکھو) وغیرہ

۳ - اردو یا ہندی مصادر استعمال کئے گئے ہیں - مثلاً :—

توڑی لو (توڑ سے)، اُتاریا (اُتار سے)، کھینچیلو (کھینچ سے)، ڈالیلو (ڈال سے)، چُنیا (چُن سے)، اسی طرح منگائیا ، بھیجیا، دلا یلو وغیرہ مختلف مصادر کا امتزاج پا یا جاتا ھے -

۴ - عربی ، فارسی اور اردو الفاظ کا بے محابا استعمال - صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ بعض مقامات پر مرکب الفاظ نیز اجزائے کلام بھی مستعمل ہوئے ہیں - مثلاً - ایسا ، کیسا ، تیسا ، دلا سا ، دونوں ، ایک ذرہ ، ایسے ، تیسے ، تھوڑا ، تیرا ، بیحال ، آنسو ، زارزار ، دوسرا ، تیسرا ، گرے ، بے حال ، جیو ، مری جان ، گھڑی ، بھلا برا ، معلوم ، بیٹی ، مجھے ، درجہ ، بات ، چودہ ، تک ، بھی ، ابھی ، اتّا ، جتّنا ، تجھے ، اُسے ، چوگان وغیرہ -

۵ - آسان تشبیہات اور استعارات کا استعمال - مثلاً :-

الف - غصہ ورے ھانکیا چلی لو ایک کالے
با گھہ جینو شند ھا ایلو چھا گولیر پالے
کماریر چاک جیسا گھورے چاری دیکے
ھیبت پڑیا گیلو کافر لوکے
میدانے ھوئیلو کھڑا دوئی دلے لشکر
موجا ترنلو جینو دریا اوپر
کہنو بر مردا نا بوجھیا اپنا کے
میگھیر گرجن جینو ایسا ہانک ہانکے
اپنا کے بوجھا تومی پہاڑ شمان
آمی بوجھی تومی ایک خلال پرومان
لشکرے لشکرے جودی ھوئیلو مقابلا
میدانے پڑیلو جینو چوگانیر کھیلا

"وہ غصہ ور کچھ دیر تک تیزی سے اس طرح چلا جیسے کوئی شیر شام کو بکریوں کے ریوڑ پر جا پڑتا ہے۔

جیسے کمہار کا چاک پھرتا ہے اس طرح وہ چاروں طرف پھرنے لگا اور کافروں میں ایک ہیبت پیدا ہو گئی۔

دونوں جماعتوں کا لشکر میدان میں اس طرح کھڑا ہوا جیسے دریا پر موجوں کی ترنگ ہوتی ہے۔

کہتا تھا کہ آپ کو مرد سمجھتا تھا۔ وہ اس طرح چنگھاڑتا تھا جیسے رعد کڑکے۔

تم اپنے آپ کو پہاڑ جیسا سمجھتے ہو مگر میں تو تمھیں ایک خلال جیسا حقیر سمجھتا ہوں۔

دونوں لشکروں میں جب مقابلہ ہوا تو ایسا معلوم ہوا جیسے میدان میں چوگان کا کھیل ہو رہا ہے۔"

پوتھی کے مصنف شعرا نے صرف زبان ہی میں تصرفات نہیں کئے تھے بلکہ زبان کے قواعد میں بھی بےشمار تصرفات کئے تھے۔ جس طرح انہوں نے بنگلا الفاظ کے ساتھ عربی و فارسی کے سوابق ولواحق کی آمیزش کی ہے اسی طرح قواعد پر بھی دست تصرف دراز کیا ہے۔

یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ پوتھی لکھنے والے سب مصنفین قواعد زبان کے ماہر نہ تھے اور اس

عدم مہارت کی وجہ سے استعمال الفاظ میں اکثر ان سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں - ان اغلاط کی وجہ سے پوتھی کی زبان ساقط الاعتبار ہو گئی ہے - بعض غلطیوں کے نمونے اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں -

" ہوئیلو حنوفـــا بی بی آگ برابر" - اس مصرعہ میں " آگ برابر" لفظ خلاف محاورہ و قواعد ہے -

" عالمیر بیچے تیرا کیسیر حرمت " - یہ جملہ مضحکہ خیز ہے - خصوصاً لفظ " بیچے " بہت ہی غیر مانوس ہے - صوت کے اعتبار سے بھی بنگلا زبان میں یہ لفظ نا مناسب اور رکیک ہے - دو بھاشی پوتھی میں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں -

ان مصنفین نے جس طرح قواعد کی خلاف ورزی کی ہے اسی طرح بسا اوقات دور وسطی کے پوتھی لکھنے والوں کی تبعیت کا بھی مظاہرہ کیا ہے - مثلاً :

۱- ایک ہی لفظ کو مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے - یہ طریقہ دراصل سنسکرت سے ماخوذ ہے - جیسے - "کریس خاطر داری بی بی ر خاطر" یہاں پہلا خاطر تواضع و خدمت کے معنی میں مستعمل ہے اور دوسرا "واسطے" کے معنی میں - (اس طرح کی مثالیں اور زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں - مثلاً اردو میں کسی نے کہا ہے - " جو پہنچی آپ نے بھیجی تھی

وہ پہنچی نہیں پہنچی" - یا "رخ پہ خط آئے تو خط آنے لگے") -

۲- بعض خاص حروف والے الفاظ کی ایک ھی مصرعہ میں باربار تکرار جسے "انوپراس" کہتے ھیں "پرستانے شاھا پری بادشاہ شے پریر" - اس میں ر، پ اور ش کی تکرار ھے -

"آمی تار پیٹھ پرے اچھی پوست پنا (پشت پناہ)"

اس میں "پ" کی تکرار ھے -

"اِرم شاھیر بیٹی حنیفار حلال (ہ ح - ر)"

دوبھاشی پوتھی میں خاص طور پر کسی ھیرو، کسی خاص جنگ یا کسی اھم تاریخی واقعے کو ایک بنیادی حقیقت یا موضوع کلام بنا کر باربار کتابیں لکھی گئی ھیں - اس طرح ایک ھی ھیرو پر متعدد مصنفین نے طبع آزمائی کی ھے اور اس طرح نا معلوم تعداد میں پوتھیاں عالم وجود میں آئیں - ان پوتھیوں پر ھندوؤں کے پوران اور پانچالی نیز فارسی و اردو کی طویل داستانوں کے اثرات پڑے ھیں -

پوتھی کے مصنفیں نے انبیائے کرام کے واقعات زندگی حضرت محمد (ص) کی سوانح حیات اور ان کے ما بعد کے اسلامی مبلغین کے اصول زندگی، ان کے کفر سوز اور ایمان افروز کارناموں سے متعلق بھی متعدد منظوم پوتھیاں لکھیں - اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشہور کتاب قصص الانبیاء ھے جس کے

مصنف رضاء اللہ، امیر الدین اور اشرف علی تھے ۔ رضاء اللہ نے حضرت آدم (علیہ) سے حضرت نوح (علیہ) تک کے واقعات لکھے ۔ امیر الدین نے حضرت نوح کے بعد سے حضرت رسول (ص) خدا کی حضرت خدیجہ سے شادی کے پہلے تک کے واقعات لکھے اور اشرف علی نے آنحضور (ص) کی شادی سے حضرت علی (رض) کے آخر زمانے تک کے حالات منظوم کئے ۔ سب سے پہلے یہ کتاب سنہ ۱۸۶۰ع میں شائع ہوئی تھی ۔

اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دور وسطی میں بھی حضرت رسول کریم (ص) کی سوانح حیات پر مشتمل متعدد پوتھیاں منظوم کی گئیں ۔ سید سلطان، زین الدین، شیخ چاند اور حیات محمود نے اس موضوع پر متعدد پوتھیاں مرتب کی تھیں ۔

اس طرح جنگ نامہ حضرت علی اور ان کے بہادر فرزند حضرت حنیفہ وغیرہ کے مافوق الفطرت کارناموں پر مشتمل متعدد جنگ نامے لکھے گئے اکثر جنگ ناموں میں واقعات کربلا کو درد ناک انداز سے پیش کیا گیا ہے ۔ بعض ایسے جنگ نامے بھی پائے جاتے ہیں جن میں دکھایا گیا ہے کہ حضرت حنیفہ نے ایران کی مملکت فتح کی ۔ جنگ نامہ کی سب سے قدیم کتاب سنسکرتی بنگلا میں لکھی ہوئی سنہ ۱۶۴۶ع میں محمد خان نے مرتب کی تھی ۔ اس کتاب کا نام مقتل حسین تھا ۔

سنۃ ۱۸۸۷ع میں ایک ہندو شاعر بابو رادھا رمن گوپ نے بھی ایک جنگ نامہ بنام " اِمامیر جنگ " (امام کی جنگ) منظوم دیا تھا - سب سے آخری جنگ نامہ انیسویں صدی کے آخر میں سعدؔ علی اور عبد الوھاب کا مرثیہ بنام " شہید کربلا " ھے -

ہندؤں کے بعض دیوتاؤں اور دیویوں کی پر عظمت داستانوں کو اسلامی صورت میں ڈھال کر ان ما فوق الفطرت قصوں کو اسلامی رنگ میں پیش کرنے کی بھی بار بار کوشش کی گئی ھے - بعض پوتھیوں میں پیروں اور بزرگوں کی داستانیں بیان کی گئی ہیں - ان میں مانک پیر اور شتو پیر وغیرہ کے متعلق بہت سی پوتھیاں لکھی گئیں - اس عنوان پر پوتھیوں کے مصنف اکثر غیر مسلم ھندو ہیں - ان میں مانک پیر، شتو پیر، پیر مسند علی، بڑو خان غازی، پیر کالو شاہ اور پیر گورا چاند زیادہ شہرت رکھتے ھیں - موازنہ کرنے سے ہمیں صاف صاف نظر آتا ھے کہ ان پوتھیوں میں نام کی تبدیلی کے ساتھ ایک ھی طرح کے واقعات مختلف پیروں اور دیوتاؤں کے باہم مماثل لکھے گئے ہیں - مثلاً مانک پیر اور " چھدو بیش دھاری شیو کے افسانے باہم مماثل ہیں - اسی طرح پیر مسند علی اور مچھندر وناتھ خفیف تبدیلوں کے ساتھ اھم آہنگ نظر آتے ہیں - ایسی پوتھیوں کے مصنف ھندو اور مسلمان سبھی ھیں - ان مصنفین نے یہ کوشش کی تھی کہ ھندؤں اور مسلمانوں کے مذھبی

رسومات اور معتقدات میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کریں - اس لئے وہ کبھی پیروں کو دیوتاؤں کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور کبھی ہندو ٹھاکوروں کو مسلمان درویشوں کے روپ میں دکھاتے ہیں - بردوان اور چوبیس پرگنہ کے پیر گورا چاند اسی قسم کے پیر ہیں - بعض بعض پوتھیوں میں آیات قرآنی کے تراجم، صوفیانہ معتقدات و ظالف، دعائیں اور دینیات کی باتیں نیز عقائد وغیرہ بھی بیان کئے گئے ہیں - یہ بات البتہ قابل لحاظ ہے کہ ایسی پوتھیوں کا شمار نہ عمدہ نظموں میں ہے اور نہ ادبی لیٹریچر میں -

رومانونی افسانوں کی پوتھی میں لیلی مجنوں کی پوتھی سب سے زیادہ مشہور ہے جسے سنہ ۱۸۶۴ع میں شاعر محمد خاطر نے مرتب کیا تھا - ان کا ایک اور بڑا کارنامہ شاہنامۂ فردوسی کا بنگلا ترجمہ ہے - دوسری رومانوی کہانیوں میں سے گل و صنوبر، چہار درویش اور حاتم طائی کے مصنف محمد دانش ہیں - یہ انیسویں صدی کے وسط میں تھے - اسی طرح نورالدین کی "دافعۃ الحکایات"، مال محمد کی "احکام الجمعہ"، جناب علی کی حقیقۃ الصلوۃ، محمد صادق کی "جمالۃ الفقرا" وغیرہ کتابیں قابل ذکر ہیں -

غریب اللہ اور سید حمزہ کی پوتھیوں کے علاوہ اور تمام دوبھاشی پوتھیاں انیسویں صدی عیسوی میں لکھی گئی ہیں - ان کے اکثر

مصنفین کلکتہ کے قرب و جوار کے باشندے تھے - انیسویں صدی کے وسط میں شہر کلکتہ بہت سارے سستے مطابع کا مرکز بن گیا تھا جن کے مالک اور ناشر اکثر و بیشتر مسلمان تھے اور انہی کی حوصلہ افزائیوں سے دوبھاشی پوتھیاں اور اسلامی طرز کی ادبی کتابیں وہاں سے اشاعت پذیر ہونے لگی تھیں -

ان پوتھیوں کے پڑھنے والے اور ان کی قدر کرنے والے اکثر کم علم اور کم فہم مسلمان تھے اس لئے دیہاتوں سے شہر میں آنے والے ملاح، مزدور، تجارت پیشہ اور ملازمت کرنے والوں ھی میں اس قسم کی پوتھیاں زیادہ تر رائج اور اشاعت پذیر ہوئیں-

اس موقع پر یہ سوال پیدا ھوسکتا ھے کہ ان پوتھیوں کی تصنیف اور اشاعت کا کیا مقصد ھو سکتا ھے ؟ حقیقت یہ ھے کہ کلکتہ ایک بین الاقوامی شہر تھا جہاں اندرون بنگال کے باشندے اور غیر بنگالی مسلمان سبھی مخلوط طریقے پر بود و باش رکھتے تھے - اس لئے یہ پوتھیاں بھی در اصل ان کی بے فکری کی مجلسوں میں سستے ذوق کی تسکین اور فطری اسلامی لگاؤ کی بھوک کو کم کرنے کیلئے عالم وجود میں آئیں اور انھی کے ذریعہ سے ان پوتھیوں کی ترویج و ترقی ہوئی -

اس سلسلے میں یہ بات یقینا قابل ذکر ھے کہ ان پوتھیوں کے مصنفین نہ تو حقیقت میں شاعر تھے اور نہ ادبی رجحانات اور اُن

لسانی معاسن سے باخبر تھے جو انیسویں صدی میں انگریزی زبان کے ذریعہ ادب میں داخل ہوئے - وہ ایک ہی لکیر کے فقیر تھے اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو کر انھوں نے اپنے سستے کاموں کو تقریباً ایک صدی تک زندہ رکھا - انیسویں صدی میں انگریزی کے اختلاط اور استیلا سے نیز اس کی تبعیت میں بنگلا زبان نے جو کچھ ادبی سرمایہ جمع کیا اس سے پوتھی ادب کو دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے - بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پوتھی ادب نے مسلمانوں کو واقعی اور زندگی بخش ادب سے دور رکھنے میں ایک بڑی حد تک معاونت کی اور اس کی وجہ سے مسلمان حقیقی ادب سے دور رہ کر پس ماندہ ہو گئے -

———:•*•:———

کوبی گان (مشاعرے)

اٹھارھویں صدی کی ابتداء سے انیسویں صدی کے وسط تک بنگال میں مشاعروں کا رواج تھا - اٹھارہویں صدی سے پہلے بھی کہیں کہیں مشاعروں کا پتہ ملتا ہے لیکن وہ قابل ذکر نہیں ہے - مذکور الصدر بھارت چندرکی وفات کے بعد بنگال میں مشاعروں کو بہت عروج حاصل ہوا - اس لئے ہم اس کے ارتقا کا سنہ ۱۷۶۰ء سے سنہ ۱۸۶۰ء تک کا متعین کر سکتے ہیں - سنہ ۱۸۳۰ء کے بعد ہی سے اس کی مقبولیت میں کمی شروع ہوئی اور بہ ظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اس زمانے کے بعد ہی سے مشہور شعراء نے اس میں حصہ لینا کم کر دیا تھا - ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے شعراء کو "کوبی والا" کہا جاتا تھا - یہ حقیقت میں بلند پایہ اور قابل ذکر شاعر نہ تھے اور اسی لئے ان لوگوں نے محاسن شاعری اور لفظی خوبیوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی - تاہم ان میں سے بعض بعض شاعر بڑی شہرت اور مقبولیت کے مالک ہوئے - ان مشاعروں کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان میں اشعار پہلے سے لکھ کر نہیں پڑھے جاتے تھے بلکہ جلسوں میں با ذوق شعراء فی البدیہہ اپنا کلام منظوم کرکے مسلسل لوگوں کو سناتے جاتے تھے - ایسے جلسوں میں یہ عموماً کھڑے ہوکر فی البدیہہ

اپنے ذہنی کمال کا ثبوت پیش کرتے اور اسی مناسبت سے انھیں بنگلا میں '' دانـڑا کوبی '' (ایستادہ شاعر) بھی کہا جاتا تھا ۔ ایسے مشاعروں میں عموماً دو بالمقابل جماعتیں بن جاتیں اور عام کھیلوں کی طرح وہ ایک ایک شاعر کی پشت پناہی کرتیں ۔ موضوع کلام وقتی طور پر منتخب کر دیا جاتا اور فریقین کے شعراء ان میں اپنا اپنا کمال اور زور دھن دکھاتے ۔ ہم ایسے مقابلوں کو مشاعرے کے بجائے زور طبع کے مظاہرے بھی کہہ سکتے ہیں ۔ ایسے مشاعروں کے انعقاد اور ان کی ترقی کے چند اسباب بتائے جاسکتے ہیں ۔

یہ بات پہلے ہی بیان کی جا چکی ہے کہ اٹھارہویں صدی میں بنگال سیاسی طور پر ایک انقلاب عظیم سے دو چار ہوا تھا ۔ جس کے نتیجے کے طور پر سماجی عدم تنظیم نے ایک متمدن سوسائیٹی کی جگہ لے لی ۔ اس تبدیلی اور بد نظمی کی حالت میں ادب کی خدمت کا ملک میں کوئی امکان نہ تھا ۔ یہ زمانہ بنگال کیلئے ادبی جمود اور انحطاط کا زمانہ تھا ۔ غور و فکر کرنے والے ادیبوں اور شاعروں کا فقدان تھا ۔ تاہم عوام کی دہنیتیں چونکہ عموماً عیش پسند اور سکون کی طالب ہوا کرتی ہیں لہذا اُنھیں سکون بخشی اور ان کی فطری عیش پسندی کے ذوق کی تسکین کے لئے سستے قسم کے شعراء نے اس طرح کی محافل نظم یا

مشاعروں کی مجلسوں سے گرم کرنے کا رواج دیا تھا -

دوسرا سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دور سابق میں جس طرح شعراء شاہی دربار میں اپنی نظمیں پیش کر کے خراج تحسین اور انعامات لائقہ سے معزز و ممتاز ہوا کرتے تھے وہ بات انقلابی دور میں ختم ہو چکی تھی - شاعر بھارت چندر خود راجا کرشن چندر کے درباری شاعر تھے - مسلمانوں کی حکومت کے آخری دور میں قدیم زمینداروں اور جاگیرداروں کے حالات بھی ابتری کی طرف مائل ہو گئے تھے - یہاں تک کہ برطانوی عہد کی ابتداء میں وہ عملا تباہی کی آخری منزل تک پہنچ گئے - ایسے وقت میں جاھل اور نسبتًہ غیر شریف طبقہ ترقی پا کر قدیم شرفاء کی املاک پر قابض ہو رہا تھا - ایسی ناقدر شناسی کے زمانے میں اعلی درجے کے ادب کی ترقی چونکہ قرین قیاس نہیں اس لئے یہ گھٹیا درجے کا ادب عوام کی پسند کے مطابق وجود میں آیا - عام طور پر ایسے مشاعروں میں سامعین بھی معمولی طبقے کے بنیا، سیٹھ اور تجارت پیشہ لوگ ہوتے تھے - یہ لوگ نہ تو اعلی درجے کی شاعری اور لطیف ادب کے سمجھنے کا دماغ رکھتے تھے اور نہ ان کے پاس علمی کاموں کیلئے کافی وقت تھا - یہ سستے قسم کا آسان ادب پسند کرتے تھے اور اسی قسم کے شعراء کی حوصلہ افزائی بھی کرتے - لہذا ان کے نا ترقی یافتہ شعور کی تسکین کیلئے اس درجے کا غیر

ترقی یافتہ ادب ان مشاعروں کے ذریعہ عالم وجود میں آیا ۔ ان مشاعروں میں پھکڑ بازیاں، ادنی درجے کی اخلاق سوز ظرافت و استہزا اور مہذب مجلس کے نا قابل تخیلات منظوم صورت میں پیش کئے جاتے اور انھی کی حوصلہ افزائی ہوتی - اردو ادب میں بھی اٹھارہویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے شروع میں بعض ایسے پست خیال شعرا کا وجود پایا جاتا ہے لیکن انھیں کوئی ادبی مقام حاصل نہ ہو سکا ۔

اگرچہ شاعری کی ابتدا رادھا اور کرشن کی لازوال محبت کے رس بھرے پریمی گیتوں سے ہوئی تھی لیکن زمانۂ ما بعد میں لوگوں کی بدمذاقی نے اُسے ایسے روپ میں ڈھال دیا جو بجائے قابل تعریف ہونے کے لائق تضحیک بن گیا ۔ اس لئے ہم ان مشاعروں کے عوامی ادب کو عوام کی تفریح کا سامان تو سمجھ سکتے ہیں اور باوجودیکہ سماجی تاریخ میں اُسے اس وجہ سے کسی قدر اہمیت بھی حاصل ہے کہ ہم اس کی وساطت سے اس دور کی سماجی حالت کا ایک خاکہ قائم کر سکتے ہیں تاہم بزم ادب میں اسے کوئی مقام نہیں دیسکتے ۔

ان مشاعروں میں پہلی جماعت جس موضوع پر اپنے کلام کی ابتدا کرتی اسے "چاپان" اور جواب دینے والوں کو "اوتور" کہا جاتا تھا ۔ ان کوبی گانوں میں بھی دوبھاشی پوتھیوں کی طرح

سماج اور حقائق زندگی سے نا واقفیت پائی جاتی ہے - حقیقت بھی یہ ہے کہ ان گانوں کے مرد ان کار اُن ضروریات سے نا واقف بھی تھے جنھیں ہم جان ادب سمجھتے اور روح شاعری کہتے ہیں -

ان مشاعروں کی نظموں میں اگرچہ بے فکری، تخییل سے بے نیازی، مضامین سے بے توجہی، عدم توازن، واقعیت کا فقد ان اور ترتیب میں بے ربطی نظر آتی ہے لکین یہ شعراء عوام کے نبض شناس ہونے کی وجہ سے عام دلکشی پیدا کرنے والے طریقوں اور عوام کی توجہ کو جذب کرنے والی تدابیر سے اس حدتک واقف تھے کی ان کے معائب پر لوگوں کی نظریں کم ہی پڑتی تھیں اور ستسی واہ واہ انھیں حاصل ہو جاتی تھی - یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اس زمانے میں حقیقی ادب شناس افراد بھی عنقاصفت تھے اس لئے معائب سخن کی جانب نہ توجہ دلانے والے سامعین ہی پائے جاتے تھے اور نہ انھیں سمجھنے والے شعرا ہی وجود رکھتے تھے - ان تدابیر داد طلبی میں سے بعض یہ تھیں -

۱- کسی خاص عام پسند لفظ پر زیادہ زور دے کر اسے باربار دھراتے اور داد حاصل کرتے -

۲- ایک ہی لفظ کو مختلف معانی میں باربار استعمال کر کے ایک تعجب خیز کیفیت پیدا کرتے -

۳۔ اشعار میں ایسے الفاظ جمع کرتے جن میں بعض خاص حروف کا بار بار اعادہ ہوتا۔

ان محفلوں کو گرم رکھنے والے چند مشہور شعراء یہ تھے۔

رگھو موچی۔ ھُرو ٹھاکور، رام بوشو، اینٹونی فرنگی، نتائی بیراگی وغیرہ۔ یہ بات قابل لحاظ ھے کہ ایسے شعراء عموماً غیر مسلم اور سماج میں ھندؤں کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض روایات سے معلوم ھوتا ھے کہ دوبھاشی پوتھی کے مشہور مصنف سید حمزہ نے بھی اس طرح کے اشعار کہے تھے لیکن ان کا کوئی نمونہ قطعی ثبوت کے ساتھ ھمیں نہیں ملتا۔ اس بد ذوقی کے دور میں ھمیں صرف ایک ایسا شاعر ملتا ھے۔ جس کے کلام میں کسی قدر جاذبیت معلوم ھوتی ھے۔ اس کا نام رام نیدھی گُپت تھا۔ ٹپا کے مصنف کی حیثیت سے بھی نیدھو بابو مشہور رہیں۔ انھیں عام بد مذاق اور پھکڑ باز شعراء کی فہرست میں رکھنا واقعی ظلم ھوگا۔ انھوں نے بہت سی نظمیں خیال اور ٹپا کے قسم کی مرتب کی تھیں۔ ان کے گانے بھی کوبی گانوں سے علحدہ حیثیت رکھتے ھیں۔ ان کے بعد سری دھر کتھک وغیرہ نے پریم اور فراق وغیرہ پر مشتمل ٹپا، پانچال وغیرہ نظمیں مرتب کیں۔

ھم متذکرہ بالا دور یعنی بھارت چندر کی وفات کے بعد سے ایشور چندر گپت کے زمانہ عروج تک کے اندر دوبھاشی پوتھی اور

کوبی گان کے علاوہ جو نظمیں پائے ہیں انمیں قابل ذکر یہ ہیں :—

۱۔ رام پرشاد کے متبع لوگوں کی نظمیں موسوم بہ " کالی بندنا"

۲۔ بھارت چندر کے متبع شعراء کی نظمیں -

۳۔ ان مصنفین کی تصنیفات جنھوں نے دور قدیم یا عہد وسطی کی پیروی کی مثلاً جے نارائن گھوسال اور رگھو نندن گوشوامی وغیرہ کی کتابیں، کاشی کھنڈ اور " شری کرونا نیدھان بیلاش وغیرہ -

۴۔ پانچالی اور جاترا گانوں کے مصنفین کی نظمیں -

۵۔ شاری اور زاری گان - یہ گانے مشرقی بنگال میں مروج تھے - ان کا کسی قدر رواج اب بھی باقی ہے -

باؤل

بنگال میں باؤل کا رواج بہت دنوں سے تھا۔ لیکن اس کے حدود کم علم دیہاتیوں تک محدود تھے ۔ معزز اور تعلیم یافتہ سماج میں اسے کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ باؤل گانوں سے ہماری مراد وہ معرفتی گانے ہیں جن کی طرف ہمیں بعض صوفیوں کی غزلوں یا مثنویوں میں اشارات نظر آتے ہیں۔ باؤل گانوں میں ہمیں معرفت اور تصوف کا حقیقی رنگ کسی حد تک مجازی صورت میں ملتا ہے ۔ اس کی تشبیہات مجازی ہیں لیکن مراد اور مقصود وہی حقیقت منتظر ہے جس کے ترانے ہمارے صاحب دل اور اہل معرفت فارسی و اردو شعراء نے بھی گائے ہیں۔

ایسے گانوں کی ابتداء فقرا اور صوفیاء سے ہوئی لیکن بعد میں بعض بلند مرتبہ اور ادیب شعراء نے بھی اس سے متاثر ہوکر اس کو اپنا لیا اور اس میں لطافت، دلکشی اور شستگی پیدا کی۔ جس طرح بنگالی پوتھیوں میں بزرگوں کے حالات اور ان کی کرامات کا تذکرہ ہے اسی طرح باؤل گانوں میں بھی صوفیانہ مذاق کی باتیں ہیں۔ اگرچہ اس کی تخلیق بہت، بعد کی ہے لیکن مضمون اور موضوع کی وحدت کے لحاظ سے ہم اس کا تذکرہ اسی موقع پر مناسب سمجھتے ہیں۔

انیسویں صدی کے سب سے مشہور باؤل شاعر لالن شاہ ہیں۔ ان کی

زندگی کے تفصیلی حالات اگرچہ پردۂ خفا میں ہیں لیکن اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی وفات سنہ ۱۸۹۲ع میں ہوئی - انھوں نے ایک سو سولہ سال کی عمر پائی - بنگال کے مایۂ ناز شاعر ڈاکٹر رو بندرو ناتھ ٹھاکور بھی کافی حد تک اُن سے متاثر ہوئے ہیں - لالن شاہ کے بہت سے باؤل گانے بھی انھوں نے جمع کئے تھے - یہاں ہم لالن فقیر کے دو گانے بطور نمونہ کے پیش کرتے ہیں :—

"کھا نچار بھیترے آچین پاکھی کیمن آشے جائے
دھرتے پارلے منو بیڑی دیتم پاکھیر پائے
چیرو دن پوشی لم پاکھی بوجھلم نا تار بھا نکی جھونکی
دودھ کولا دے ئی بھائے رے پاکھی تبو دھولے نا تائے"

ترجمہ

"ایک ناواقف چڑیا پنجرے میں آتی جاتی ہے
کاش اگر میں اسے پکڑ سکتا تو اس کے پیروں میں بیڑی ڈال دیتا
ہمیشہ کی پروردہ چڑیا کی فریب دہی کو میں نہ جان سکا
دودھ اور کیلا کھا کر بھی یہ چڑیا اپنے وطن کو نہ بھول سکی" -

لالن شاہ کے ایک دوسرے باؤل گانے کا نمونہ ملاحظہ ہو :—

"آمار آپن کھبر اپنار ہوئے نا
ایک بار اپنارے چینیلے پرے جائے اچینارے چینا

شائیں نیکت تیے کے دورے دیکھائیے
جینو کیشیر آڑے پہاڑ دیکھونا لُوکائیے
آمی ڈھاکا دلی ھاتھرے پھری
آمار چوکھیر گھورنو جائیے نا
آتّا روپے کرتا ھری
مرے بیشتا ھولے مل بے تاری تھیکانا
بید بیدانتو پڑبے جتو بارٗبے تتو لکھّونا
آمی آمی کے بولے من
جے جانے تار چرن شرن کونا
شائیں لالن بولے منیر گھورے
ھولم چوکھ تھاکیتے کانا۔"

ترجمہ

مجھے خود اپنی ہی خبر نہیں ملتی
ایک بار اپنے آپ کو پہچان لینے سے نامعلوم کو بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔
سائیں قریب ہوکر بھی دور نظر آتا ہے
جس طرح بالوں کے اوٹ میں پہاڑ چھپ جاتا ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے؟

میں تھا کہ او دلی اپنے ہاتھوں کے پاس دیکھتا ہوں

لیکن میری نگاہوں کا حلقہ تو نہیں جاتا

روح کی صورت میں فاعل حقیقی خود خدا ہے

اپنے کو فنا کرنے سے اس کا تھکانا ملے گا

تم جس قدر وید ویدانت پڑھوگے اس قدر نظر وسیع نہ ہوسکے گی -

دل تو خود پرستی میں مشغول ہے

جو صاحب حال ہے اس کی قدمبوسی کیوں نہیں کرتے

سائیں لالن کہتا ہے کہ دل کے گھر میں

میں آنکھ رہتے بھی اندھا ہی ہوں -

لالن شاہ کے علاوہ اور بھی بہت سارے لوگوں نے باؤل گانے لکھے لیکن وہ اس لائق نہیں کہ ان کا شمار مشاہیر میں کیا جا سکے - باؤل کے شعرا اکثر و بیشتر مسلمان ہی تھے - بعض ہندو شعرانے بھی باؤل گانے لکھے - ان میں گنگارام باؤل، پدو لوچن، جگا کوئی برتو، سراج سائیں، منیرالدین فقیر وغیرہ قابل ذکر ہیں -

انیسویں صدی کے آخر میں بعض تعلیم یافتہ شعرا نے بھی باول گانوں کے تتبع میں گانے لکھے تھے ان میں ہری ناتھ مجمدار شہرت رکھتے ہیں ۔ انہیں کنگال ھری ناتھ بھی کہتے ہیں -

---

حصۂ سویم

تیسرا و چوتھا باب

بنگلا نثر کا آغاز

اس کی

تدریجی ارتقا اور ترقی

فورٹ ولیم کالج، راجا رام موھن رائے، تتو بودھنی کا دور،
اکیہ کمار دت، بہاری چاند متر، کالی پرسنو،
خند کار شمس الدین محمد صدیقی - بنکم چندر
میر مشرف حسین، ارجمند علی
غلام کبریا و مزمل حق وغیرہ

محمد عبد الحی ——— مترجم — مولانا عبد الرحمن سیفود

تیسرا باب

بنگلا نثر کا آغاز
اور
تدریجی ارتقا

انیسویں صدی سے پہلے ادب کی دنیا میں بنگلا نثر کا کوئی وجود نہ تھا - اگر کچھ تھا بھی تو دستاویزات، تمسکات، خطوط، رسیدات، سیاھے، وشنومت والوں کے منظوم ومنثور رسالوں اور بعض بعض اخلاقی تحریرات ھی میں تھا - اس کے علاوہ سترھویں صدی میں پرتگالی پادریوں نے وسطی اور مشرقی بنگال میں اپنی مذھبی تبلیغوں کے سلسلے میں جو کوششیں کی تھیں ان میں بھی بنگلا نثر کیلئے کسی قدر راستے ھموار ھوئے تھے - پرتگالی پادریوں کی منثور تحریرات کا طرز اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر تک قائم تھا - اس دھارے کی سب سے اھم کتاب دوم انتانیو کی تصنیف " براھمن رومن کیتھلک شنگباد " ھے - یہ کتاب ۱۲۰ صفحات پر پھیلی ھوئی تھی - اس کتاب کے ذریعہ سے ترک مذھب کر کے دوم انتھونیو نے عیسائیت پر اچھی طرح عبور

حاصل کرنے کے بعد ھندو مت کے مقابلے میں عیسائیت کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ھے - " براھمن رومن کیتھلک شنگباد" سترھویں صدی کے ساتویں عشرے کے لگ بھگ لکھی گئی تھی - پرتگالی پادریوں کی دوسری کتاب "کرپیار شاستر رارتھو بھید" تھی - یہ ۳۹۱ صفحات میں لکھی گئی تھی - پادری مانو ایلدا اسّمپ شام ضلع ڈھاکا کی ریاست بھاول کے دوران قیام سنہ ۱۷۴۳ع میں بھاول کی بول چال والی زبان میں یہ کتاب تحریر کی تھی - اسی سال میں مذکورہ کتاب لسبن سے رومن حروف میں طبع ھوکر شائع ھوئی - جہاں تک تحقیقات سے ثابت ھوسکا ھے بنگلا نثر میں سب سے قدیم مطبوعہ کتاب یہی تھی -

اگرچہ سنہ ۱۷۵۷ع میں انگریزوں نے پلاسی کی جنگ کے بعد بنگال کو فتح کرلیا تھا تاھم ان کی حکومت سنہ ۱۷۶۵ع سے پہلے استحکام پذیر نہیں ھوئی تھی - کمپنی کے عمال نے یہاں کے انتظامات کی سہولت اور یہاں کے رھنے والوں سے تعلقات استوار کرنے کی خاطر بنگلا زبان سیکھنے کی ضرورت محسوس کی - ان کے اس مقصد کی تکمیل کیلئے ھی نیتھا نیئل بیاسی ھل ھیڈ صاحب نے سنہ ۱۷۷۸ع میں انگریزی میں ایک کتاب بنام A Grammer of The Bengali Language تحریر دی - اسی سال کے اندر ھوگلی کے

مطبع سے یہہ کتاب شائع ہوئی - انگریزی میں لکھی ہوئی اس قواعد کی کتاب میں نمونے کے طورپر کریتی باس کی رامائن' کاشی داسی کی مہا بھارت اور بھارت چندرکی بدیا سندر سے اقتباسات بنگالی حروف میں لئے گئے تھے - بنگالی زبان کی تاریخ میں یہہ سال ایک یادگار سال کی حیثیت رکھتا ھے کیونکہ اسی سال سے بنگالی حروف میں بنگلا زبان اور ادب کے موضوعات کی سب سے پہلی طباعت ثابت ہوتی ھے -

پلاسی کی جنگ میں بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد مذہب اور تہذیب و تمدن کے میدان میں بھی اس ملک کے باشندوں کے تخیلات و نظریات پر فتح پانے کیلئے بہت سی تدبیریں انگریزوں کی طرف سے وقوع میں آئیں - اس تہذیبی فتح کی مساعی کا آغاز سری رام پور مشن کے قیام ھی سے ہوا - اٹھارھویں صدی کے خاتمے پر بنگال میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی غرض سے سری رام پور میں بپتسٹ مشن کا قیام عمل میں آیا - اس مشن کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ بائبل اور دوسری عیسائی مذہب کی تبلیغی کتابوں کا بنگلا زبان میں ترجمہ شائع کیا جائے - ولیم کیری اور جان تھامس اس مشن کے قائدین میں سے تھے - جوسف مارش میین اور ولیم ورڈ ان کے معاون کارکن تھے - بنگالیوں کو عیسائیت کا معتقد بنا کے ان کی روحانی

رہنمائی کرنے میں مذکورہ مشن والوں کا سیاسی مقصد جو بھی رہا ہو بنگلا زبان اور ادب کی تاریخ میں ان کے در پردہ ثمرات بہت خوش آیند ثابت ہوئے - ان مشن والوں ھی نے بنگال میں بنگالی ٹائپ اور مطبع کے لانے اور اس کی توسیع کیلئے کوششیں کیں - اسی کا ثمرہ تھا کہ بنگالی نثر کی ابتدائی کتابیں یہاں سے طبع ہو کر عام طور پر شائع ہونے لگیں -

اب تک جس بنگلا نثر کا تذکرہ کیا گیا ھے بنگالی نثر کی راہ ترقی میں ان کی تاریخی قدر و قیمت خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو ان کی ادبی کوئی حیثیت نہیں ھے - لیکن ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ انیسویں صدی سے پہلے ہی. یہاں تک کہ سری رام پور کے مشینری یا پرتگالی پادریوں کے منثور بنگالی تصنیفات میں مشغول ہونے سے پہلے ھی بنگال کی کلاسکل اور شستہ زبان میں نثر کا ایک ڈھانچہ تیار ہو چکا تھا -

---

فورت ولیم کالج

سنہ ۱۸۸۶ء میں نیتھانیل بیاسی ہیل ھیڈ صاحب نے اپنی تنہا کوشش سے بنگلا قواعد تحریر کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنوں کی جس طرح بنگلا سکھانے کے کام میں رہنمائی کی تھی اس کا یہ نتیجہ تھا کہ مئی سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ فورت ولیم کالج کا افتتاح ہوا - کمپنی کے عمال نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس ملک میں نظم و نسق کی بحالی کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس ملک کی زبان سے حتی الامکان واقفیت حاصل کی جائے - اسی مقصد کے پیش نظر انگریز سویلین ملازمین کو بنگلا کی تعلیم دینے کیلئے فورت ولیم کالج نے سنہ ۱۸۰۱ء میں بنگلا کا شعبہ قائم کیا - سری رام پور مشن کے جواں حوصلہ اور باہمت کارکن ولیم کیری کو شعبہ بنگلا کا پروفیسر مقرر کیا گیا - پروفیسر ولیم کیری کی ماتحتی میں مرتّن جے بدّیا النکار اور رام ناتھ باچش پتی نامی دو پنڈت نیز سری پتی مکھو پادھائے، انندو چندرو، راجب لوچن مکھو پادھائے کاشی ناتھ، پدّو لوچن چرامنی اور رام رام بوشو نامی چھ آدمیوں کو بطور معاون پنڈت کے مقرر کیا گیا -

ولیم کیری

شعبۂ بنگالی کی ذمہ داریاں قبول کرتے ہی مسٹر کیری کو اس زبان میں مناسب کتابوں کی کمی کا سخت احساس ہوا - اس کمی کو پورا کرنے کیلئے انھوں نے

جس طرح خود درسی کتابیں لکھیں اسی طرح اپنے ماتحت کام کرنے والے پنڈتوں کو بھی اس پر آکسایا - اس سلسلے میں ہمیں کیری کی دو مصنفہ درسی کتابیں ملتی ہیں - ایک کا نام "کتھوپو کتھن" ہے جو سنہ ۱۸۰۱ع میں سری رام پور مشن سے شائع ہوئی اور دوسری کتاب کا نام "اینتیہاش مالا" ہے - یہ کتاب سنہ ۱۸۱۲ع میں سری رام پور سے طبع ہو کر شائع ہوئی - کتھوپو کتھن کا انگریزی نام "Dialogues intended to facilitate the acquiring of the Bengali Language". تھا - اس کتاب کے نام ہی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کو بول چال کی زبان میں بنگلا سکھانا ہی اس کا مقصد تھا - اینتیہاش مالا میں بنگال کی مروجہ کہانیاں درج تھیں - ان قصوں کے چند ہیرو پروتا پادیتو، روپ و سناتن اور اکبر و بیربل وغیرہ تاریخی اشخاص تھے - بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مذکورہ دونوں کتابیں مسٹر کیری کی ذاتی تصنیفات نہیں ہیں - یہ فورٹ ولیم کالج کے پنڈتوں کی تصنیف ہیں جو مسٹر کیری کے نام سے شہرت رکھتی ہیں - لیکن اس زمانے کے دریافت کردہ دلائل سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ مسٹر کیری بنگلا زبان میں خاصا دخل رکھتے تھے اور مذکورہ کتابیں دراصل انھی کے زور قلم کا نتیجہ تھیں - فورٹ ولیم کالج کے معلمین کی مصنفہ درسی کتابوں سو مسٹر کیری کی اینتیہاش مالا کی

طرز تحریر کے ساتھ بھی امتیازی خصوصیت حاصل ہے - مصنف کی حیثیت سے مسٹر کیری کے یہ کارنامے اہم نہیں ہیں مگر اس زمانے میں بنگلا نثر کی تخلیق میں قیادت ہی ان کا سب سے اہم کارنامہ ہے - درسی کتابوں کی تصنیف کے پس پردہ بنگالی زبان کی بے مثال طاقت بیان اور اہم امکانات کے اسباب کی ایجاد و تحقیق کا سہرا انھی کے سر ہے - سب سے پہلے انھی نے بنگلا زبان کو شرفا اور صاحبان علم کی تحقیقات و تنقیدات کی حیثیت بخشی تھی - لیکن یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ انیسویں صدی میں بنگلا زبان سے عربی و فارسی الفاظ خارج کر کے اس زبان کو آہستہ آہستہ سنسکرت کا متبع بنانے میں ولیم کیری ہی کی قیادت کو سب سے نمایاں دخل بھی حاصل ہے - اس کا ثمرہ خواہ جو کچھ بھی ہوا ہو بنگلا زبان کے ابتدائی دور ارتقا میں اور اسی کی بنا پر بنگلا ادب میں کیری کا نام فراموش کئے جانے کے قابل نہیں ہے -

کیری نے جن پنڈتوں کی اعانت سے انگریز سویلین افسروں کیلئے بنگلا زبان میں درسی کتابیں لکھی تھی ان پنڈتوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت رام رام بوسو کو حاصل ہے -

فورٹ ولیم کالج کے پنڈت رام رام بوسو کی بنگالی تحریرات

سنہ ۱۸۱۳ع میں رام رام بوسو نے وفات پائی - ان کی دو کتابیں سری رام پور مشن سے شائع ہوئیں - ایک کا نام " راجا پرو تا پادیتو چریترو " ہے -

یہ کتاب سنہ ۱۸۰۱ع میں طبع ہوئی - دوسری کتاب کا نام " نیتی مالا " ہے - یہ کتاب سنہ ۱۹۰۴ع میں طبع ہوئی -

رام رام بوسو فارسی میں مہارت رکھتے تھے - جیسور کے راجا پروتا پاد تیو کے متعلق فارسی میں جو کچھ لکھا گیا تھا اسی کی اعانت سے انھوں نے اپنی کتاب " پروتا پاد تیو چریترو " تصنیف کی - فارسی سے مواد حاصل کرنے کے باوجود بنگلا نثر میں ایک تحقیقی مکمل تاریخی تصنیف کی یہ پہلی کوشش تھی اور اس کا سہرا رام رام بوسو کے سر ہے -

رام رام بوسو کی طرز تحریر شستہ اور خالص ہونے کے باوجود سنسکرت کی ہم رنگ یا مدبع نہ تھی - انھوں نے حسب ضرورت فارسی اور عربی کے بے شمار الفاظ استعمال کئے ہیں -

فورٹ ولیم کالج کے پنڈتوں میں گولک ناتھ شرما کی مترجمہ کتاب " ہیتوا پدیش " (اچھی نصیحتیں) سنہ ۱۷۰۴ع میں شائع

کالج کے دوسرے پنڈتوں کی بنگلا تصانیف

ہوئی - راجب لوچن مکھوپادھیا کی کتاب "مہاراجا کرشنو چندر و رایشّو چرترنگ " سنہ ۱۸۰۵ع میں طبع ہوئی - چنڈی چرن منشی کی "طوطا اینیہاش" سنہ ۱۸۰۵ع میں مطبوع ہوئی اور ہرپرشاد رائے کی " پورش پورِکّھا " سنہ ۱۸۱۵ع میں طباعت پذیر ہوئی - طوطا اینیہاش فارسی کی "طوطی نامہ " اور پورش پورِکّھا میتھل کے شاعر

بدّیا پتی کی مصنفہ ایک سنسکرت کتاب "پورش پورکھا" کے بنگالی تراجم ہیں -

فورٹ ولیم کالج کے پنڈتوں میں مرتّن جے بدّیا اولنکار ہی سب سے زیادہ مشہور و معروف تھے - یہ مدنی پور کے رہنے والے تھے - اُس زمانے میں ضلع مدنی پور کا شمار صوبہ اڑیسہ میں ہوتا تھا اور یہی سبب ہے کہ بہت سے لوگ مرتن جے کو اڑیسہ کا باشندہ سمجھتے ہیں - ان کی تعلیم و تربیت بالخصوص سنسکرت کی تعلیم ناتور میں ہوئی - مسٹر کیری کے ماتحتوں میں مرتن جے ہی بنگلا زبان کے ممتاز معلم تھے - سنہ ۱۸۰۱ع سے سنہ ۱۸۱۶ع تک وہ کالج میں اس عہدے پر بحال رہے - اس کے بعد انھوں نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سر فرانسس میکناٹن کی ماتحتی میں بحیثیت جج پنڈت کے کام کرکے شہرت پائی - سنہ ۱۸۱۹ع کے وسط میں انھوں نے مرشدآباد میں وفات پائی - ۱۹ - جون سنہ ۱۸۱۹ع کے "شماچار درپن" اخبار میں ان کی وفات کی خبر شائع ہوئی تھی - فورٹ ولیم کالج کی پروفیسری کے زمانے ہی میں انھوں نے پانچ کتابیں بنگلا زبان میں لکھی تھیں - یہ کتابیں بہ ترتیب : (۱) بتّرِیش شنگھاشن (بتیس تخت) مطبوعہ سنہ ۱۸۰۲ع - صفحات ۲۱۰ - (۲) ہیتواُپودیش (اچھی نصیحتیں) مطبوعہ سنہ ۱۸۰۸ع صفحات ۲۴۳ - (۳) راجا بولی (راجگان

مرتّن جے بدّیا اولنکار

مطبوعہ سنہ ۱۸۰۸ع - صفحات ۲۹۵ - (۴) بیدانتو چندریکا - مطبوعہ سنہ ۱۸۱۷ع - صفحات ۲۱۳ سے زاید - (۵) پرو بودھ چندریکا - تصنیف سنہ ۱۸۱۳ع - طباعت سنہ ۱۸۳۳ع - صفحات تقریباً تین سو -

بتیس شنگھاشن اور بے تال پچیسی کا رواج بنگال میں بطور قومی افسانوں کے بہت دنوں سے ہے - سنسکرت کی نظم و نثر میں ایک سے زاید " بتیس سنگھاسن " اج بھی موجود ہے - بلند مرتبت شاعر کالی داس کی طرف بھی ایک مروجہ بتیس سنگھاسن منسوب ہے - مرتُن جے نے بھی انھیں مروجہ کتابوں ھی سے کسی ایک کو نمونہ بنا کر ایک بتیس سنگھاسن خود ترتیب دیا یا ترجمہ کیا تھا - اپنی بتیس سنگھاسن میں انھوں نے سنکرت کی متابعت کے ساتھ ساتھ مروجہ طریقے کو باقی رکھنے کی کوشش کی ہے - یہاں ان کی پُر زور طرز ادا اور آسان زبان قابل غور اور داد طلب ہے - ھیتواُپدیش کی زبان بہت زیادہ سنسکرت آمیز ہے - اس کا سبب یہ بھی ھوسکتا ھے کہ انھوں نے سنسکرت کی کتاب " پنچوتنترو " سے اسے بنگلا کے قالب میں ڈھالا تھا - راجا بولی میں چندر بنسی راجاؤں کے کھتری خاندانوں کے دور سے بنگال میں کمپنی کی حکومت کے آغاز تک پاک بھارت برصغیر کی ایک مسلسل تاریخ ہے جو بنگلا زبان میں لکھی گئی ھے ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ مسلم دور کی کوئی تاریخ فارسی سے سنسکرت میں منتقل کی گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس حصے میں عربی اور فارسی کے الفاظ نسبتاً زیادہ ہیں۔ بہرحال راجا بولی کی زبان شستہ اور سہل ہے اور اسی وجہ سے مرتن جے کی تصنیفات میں اسے شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ لیکن مختلف کالج کے درس میں داخل ہونے کی وجہ سے ان کی کتاب "پربودھ چندریکا" نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ مرتن جے کی دوسری قابل ذکر تصنیف "بیدانت چندریکا" ہے۔ راجا رام موہن رائے کی کتاب "بیدانت گرنتھ اور بیدانت سار" کے جواب میں مرتن جے نے یہہ کتاب تصنیف کی تھی بیدانت چندریکا سے مرتن جے کی حاضر جواب طبیعت کا پتہ ملتا ہے۔ ناقابل فہم بیدانت درشن کے متعلق بنگلا زبان میں فیصلہ کن تنقیدات کے امکانات کے دروازے راجا رام موہن رائے اور مرتن جے ہی نے کھولے تھے۔

بنگلا نثر کے تین اسالیب یعنی قدیم سنسکرت کی تبعیت کے اصول کی پیروی، سنسکرت سے تبدیل شدہ آسان مشتق الفاظ کا استعمال اور سنسکرت سے غیر مبدل مشتقات اور تبدیل شدہ مشتقات کے مخلوط الفاظ کے استعمال کا جو رواج بنگلا ادب میں پایا جاتا ہے ان تینوں اسالیب کے استعمال کا تجربہ

مرتن جے کی تصنیفات میں دیکھا جاتـا ھے - خالص سنسکـرت کے طرز ادا میں مختلف نقائص کے باوجود انھیں کے ھاتھوں بنـگلا ادب نے مضامین اور طرز تحریر دونوں حیثیتوں سے عام طور پر ایک خوشنما روپ حاصل کیا تھا - وہ اگرچـہ بنـگالی منثور ادب کے کامیاب اور مکمل کرنے والے صناع نـہ تھے لیکن تقدم کا شرف اور ابتدائی دور کی کامیابی کا سہـرا ان کے سر ضرور ھے -

فورٹ ولیم کالج کے پنڈتوں نے اگرچہ خصوصیت کے ساتھ درسی کتابیں مرتب کرنے کے سلسلے ھی میں بنـگلا نثر استعمال کی تھی لیکن بعض اھم اور مشکل مضامین پر مشتمل بنـگالی نثر میں بھی انھوں نے اظہار خیال کیا تھا - ان کے تنوع مضامین اور کثرت استعمال ھی کا یـہ نتیجہ تھـا کـہ بنـگلا نثر کی راھـوں کا تعین ھونے کے ساتھ ساتھ تـوسیع کے میدان میں بھی اس کـی راھیں ھموار ھوتی گئیں -

———:•*•:———

راجا رام موهن رائے

بنگلا نثر میں تنوع پیدا کرنے اور اس کی اشاعت میں راجا رام موهن رائے کی خدمات بهی کم نهیں هیں - انهی نے انیسویں صدی کی ابتدا میں درسی کتابوں سے هٹ کر بنگالی نثر کو رواج دینے کی سب سے پہلے کوشش کی تهی - انگریزوں کی فتحیابی کا یہ نتیجه هوا که اس دور کا هندوستان سیاسی، مذهبی اور تمدنی وغیرہ مختلف قسم کے مسائل سے دو چار هوا - پلاسی کے میدان میں فوجی ذرائع سے کامیابی کے بعد اس ملک پر پائدار اقتدار کی خاطر انگریزوں نے مشینری عیسائیوں کے ذریعه هندؤں کے چهوت چهات سے فائدہ اٹها کر ان میں عیسائیت کی تبلیغ شروع کردی - عاقبت میں تو نجات ملے یا نه ملے لیکن دنیا میں اقتصادی اور سیاسی دلکش طمع کے پهندے میں پهنس کر انیسویں صدی کی ابتداء میں بہت سے هندؤں نے عیسائیت قبول کرلی تهی - اس وقت یہاں کے مسلمانوں پر انگریزوں کا یهه دل فریب جادو موثر نه هو سکا تها - بنگالی هی نهیں بلکه تمام هندی هندؤں کی زندگی میں اس تبدیلی مذهب کی تحریک نے ایک طوفان برپا کر دیا تها - اس طوفانی مصیبت سے اس وقت کے

ہندؤں کو بچانے کیلئے رام موہن رائے نے ہندو دھرم، تہذیب اور قومی زندگی میں مختلف الانواع اصلاحات کی تلقین و ترویج کیلئے جس آزاد خیالی اور دور اندیشی کا ثبوت دیا تھا اس سے مجموعی طور پر سارے ہندو سماج نے تمام انیسویں صدی میں فائدے حاصل کئے - راجا رام موہن کے وقت بھارت میں ہندو مت نے اسلام اور عیسائیت دونوں مذاہب اور انکی تہذیب کے باہمی تقابل کی وجہ سے فوائد اور اثرات حاصل کئے - یہہ ایک فطری امر تھا کہ ذات پات اور چھوت چھات کی لعنت سے پامال شدہ ہندو قوم عیسائیت کی ظاہری رواداری اور مساوات کی دلکشی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی - رام موہن رائے نے ہندؤں کی قومی زندگی کے اس مرض کی اچھی طرح تشخیص کی اور ہندو مت، اسلام اور عیسائیت سے اپنے خیال کے مطابق بہتر اجزا اور دل پسند تعلیمات لے کر برھمو سماج طریقے کی ابتدا کی - نیز وہ ستی اور دوسرے مذموم مراسم سے ہندو قوم کو بچانے کیلئے بھی جان و دل سے ساعی ہوئے - ان کے تمام اعمال میں آزاد خیالی اور حریت پسندی کا جذبہ نمایاں پایا جاتا ہے - مصلح راجا رام موہن رائے کو بھارت کے قدامت پسند ہندو پسند کریں یا نہ کریں لیکن انیسویں صدی کی ابتدا میں انھوں نے اس طرح غور و فکر کرکے جس عام پسند آزاد

خیالی کی تخلیق کی تھی اُس کے خوشگوار ثمرات ھندو سماج کی زندگی پر آج بھی منعکس نظر آتے ہیں -

اپنے تخیلات کو واقعیت کا جامہ پنہانے کیلئے رام موھن رائے کو قلم ہاتھ میں لینا پڑا تھا - رام موھن کی سب سے پہلی تصنیف " بیدانت گرنتھہ " ہے - پھر انھوں نے " بیدانت شار " لکھی - یہہ دونوں کتابیں مع ترجمہ کے سنہ ۱۸۱۵ع میں طبع ہوئی تھیں - ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے قدامت پسند ھندو رام موھن رائے کے خلاف تیغ بکف ہو گئے - رام موھن کی مصنفہ بیدانت چرچا اور " برھمو اُپاشنا " کے جواب میں مرتن جے بدّیا او لنکار نے "بیدانت چندریکا" تصنیف دی - رام موھن نے اس کے جواب میں " بھتاچارجیر شہیت بچار" نامی کتاب لکھی - پھر انھوں نے سنہ ۱۸۱۸ع میں شوہر کے ساتھ مر جانے یا ستی کی مخالفت میں اس کا بے دلیل اور خلاف مذھب ہونا اپنی دو کتابوں میں ثابت کیا - ان کتابوں میں سے ایک کا نام " پرو برتک و بی بر تکیر شنگباد " (تعمیر و تخریب کا پیغام) ہے اور دوسری کا نام " گوشو امیر شہیت بچار " (گوشوامی کے ساتھ فیصلہ) ہے - ان تحریرات کی وجہ سے رام موھن رائے پر کاشی ناتھ ترکو پنچانن نے اپنی کتاب " پاشنڈو پیڑن " میں سخت حملے کئے - رام موھن رائے نے سنہ ۱۸۲۳ع میں اپنی کتاب " پتّھو پردان " شائع کر کے ان کا دندان شکن جواب دیا -

رام موھن رائے نے سنہ ۱۸۲۲ع میں ایک فارسی اخبار " مرأت الاخبار" کے نام سے جاری کیا تھا - اس کے علاوہ رام موھن رائے نے بنگلا زبان میں ایک " گوڑیو بیا کرن " (گوڑی زبان کا قواعد) بھی لکھا تھا -

اس میں شک نہیں کہ رام موھن کی بنگلا نثر میں کسی قدر قدامت اور عالمانہ طرز کا انعکاس پا یا جاتا ھے - یہ بھی سچ ھے کہ بنگلا نثر کی مروجہ صورت یا روانی میں جو فطری توازن ھے اس کی ایجاد میں رام موھن رائے بے شمار وقفات ، سکتات وغیرہ علامات استعمال کرنے کے باوجود اچھی طرح کامیابی سے ہم کنار نہ ہوئے تھے - لیکن ان کی تمام تر باغیانہ زندگی کے پر معز اور عمیق پیغامات نے ان کے سارے دلائل اور مباحث کو نیز مذھبی تحقیقات کے پردے میں انھی کی کتابوں کے نادرات کی حیثیت سے ان کی تحریرات کو ایک ناقابل تصور عظمت عطا کی ھے - رام موہن کی نثارانہ طرز تحریر سے ان کی طاقت نفس اور خود اعتمادی کے علاوہ راسخ ، وسیع اور سنجیدہ شخصیت کا انعکاس واضح طور پر ہوتا ھے - رام موہن رائے تک پہنچ کر ھمیں یہی نظر آتا ھے کہ بنگلا نثر ایک قوی تخیل اور دلائل و مباحث کی حامل طرز تحریر بننے کی صلاحیت حاصل کر چکی ھے -

—•:)*(:•—

تتّو بودھینی کا دور

بنگلا نثر کی توسیع میں بہت سارے لوگوں کا ہاتھ ھے - ان میں سے بعض کا اس سے پہلے تذکرہ ہوچکا ھے - اشخاص کی مساعی کے ماسوا بنگلا نثر کی تدریجی توسیع میں انیسویں صدی کے دوسرے عشرے سے مختلف وقتی اخبارات و رسائل نے بھی اپنا اپنا پارٹ ادا کیا - اس وقت سے آج تک خصوصی طور پر اخبارات و رسائل ہی کی تبعیت میں بنگالی ادب نے ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں -

سنہ ۱۸۴۳ع میں تتّو بودھینی نامی اخبار برھمو سماج کے نقیب کی حیثیت سے جاری ہوا - اس وقت کے ممتاز اھل قلم میں اکھے کمار ودّیا ساگر، مہارشی دیبندرو ناتھ ٹھاکور، راج نراین بوشو، دیجندرو ناتھ ٹھاکور وغیرہ کا شمار ھے - ان لوگوں نے مسلسل اور با قاعدہ طور پر تتو بودھینی اخبار میں مضامین لکھ کر اپنا ایک مستقل عہد قائم کیا - اکھے کمار دت نے تقریباً بارہ سال تک اس اخبار کی ادارت کے فرائض انجام دئے - اس اخبار میں علم و حکمت اور فلسفہ وغیرہ مختلف موضوعات پر تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے - قومی اصلاح کے حامی ہی اس اخبار کے قلمی اور مالی معاون تھے اور انھی کے تخیل و اعمال کا نقیب یہ اخبار تھا - اسی اخبار کو مرکز بنا کر ان لوگوں نے اپنے دور کے ادب کی خدمت کی

اور اپنے ملک و قوم کے ساتھ ساتھ بنگال کے ہندؤں کی غیر معمولی ترقی کیلئے جد و جہد کی اور فی الحقیقت وہ اس مقصدمیں کامیاب رہے - تتو بودھینی اخبار کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جو مضامین شائع ہوئےتھے ان کے بعض اجزاء فی الحقیقت ادبی حیثیت کے حامل تھے - ان کے کچھ حصے آج بھی ادبی خصوصیات کے حامل ہیں اور یہ متوقع ہے کہ مستقبل میں بھی ان کی یہ حیثیت باقی رہے گی -

---

اکھے کمار دت

سنہ ۱۸۲۰—۱۸۸۶ع

اُس دور کے اہل قلم میں اکھے کمار دت ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں - یہ تتّو بودھینی اخبار کے عرصے تک ایڈیٹر رہے - ان کا دور حیات سنہ ۱۸۲۰ع سے ۱۸۸۶ع تک ہے - ان کی تحریر میں حقیقت طلبی کی جد و جہد اور غیر معمولی دقت پسندی کا رنگ پایا جاتا ہے - ہندو کالج (موجودہ پریسی ڈنسی کالج کلکتہ) قائم شدہ سنہ ۱۸۱۷ع میں ایک طبقہ جو تعلیم پاکر اور جدید مغربی تعلیم کی روشنی سے متاثر، مفتوح اور متبع ہوکر اُسی رنگ میں رنگ گیا نیز قدیم اصول اور ہندو سرمایہ ادب و تہذیب کو ختم کرنے کی دھن میں دیوانہ وار آگے بڑھا اُس کی نظیر بنگال کی تاریخ میں بہت کمیاب ہے - اکھے کمار نے اس جماعت کے معتقدات اور تصورات کی بنیادوں کو اپنی مساعی سے جس طرح استوار کیا اُس کا ثبوت ان کی تحریروں سے بخوبی ملتا ہے -

اکھے کمار کی پہلی کتاب جو جاج کمّب کی کتاب Constitution of man کی تقلید میں لکھی گئی تھی وہ " باہّو بستو ر شہیت مانب پر وکر یتیر شمبندھو بیچار'' ہے - یہ کتاب سنہ ۱۸۵۲ع میں طبع-

ہوئی تھی - انھوں نے اس کے دوسرے اور تیسرے حصے میں حسب مقام تشکیل جسم ظاہری، خوش اخلاقی (کیریکٹر)، طریقۂ زندگی کے اصول کا فیصلہ اور مذہبی و سماجی زندگی کے اصول کی پابندی کے ساتھ ساتھ میخواری کے معائب وغیرہ پر بحث کی ہے - یہ کتاب بالخصوص اینگلو بنگالی جماعت کو مخاطب کر کے لکھی گئی تھی اور اُس دور کے اینگلو بنگالی افراد کی دنیاوی زندگی سدھارنے میں یہ کتاب بہت معین ثابت ہوئی تھی -

اکھے کمار کی دوسری کتاب " دھرمو نیتی " سابق الذکر کتاب کیلئے ایک تکملہ یا ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہے - اس میں انھوں نے اصول صحت، شادی، گرہستی، تربیت اولاد اور حقوق والدین وغیرہ مختلف معاشی امور پر بحث کی ہے -

اکھے کمار کی سب سے اہم کتاب " بھارت دھرمیو اُپاشک " ہے - اس کا پہلا حصہ سنہ ۱۸۷۰ع میں اور دوسرا حصہ سنہ ۱۸۸۳ع میں طبع ہوا - ان دونوں حصوں کے مقدمات کافی طویل اور قیمتی مضامین کے حامل ہیں - انھوں نے حصہ اول کے دیباچے میں اصلی آریہ قوم (انڈو یوروپی)، آریہ (انڈو یوروپی) اور بھارتی آریہ (ویدی اور سنسکرتی) زبانوں پر لسانی حیثیت سے تحقیقاتی Philological بحث کی ہے - دوسرے حصے کے مقدمے میں قدیم بھارت کے ویدی اور پورانی مذہب اور فلاسفی ادب کے مختلف اسرار کی

تفنیش کی ہے - ہم اُسے اکیے کمار کی فلسفۂ معاشرت پر تصنیف کہہ سکتے ہیں - اکیے کمار کے تحقیق طلب دماغ پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ کسی قوم کی تمدنی تاریخ پر بحث کرنے میں اس قوم کی معاشرتی اور قومی مفاهمت کی اصل یعنی زبان اور مذهب ہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے - اسی حقیقت کے پیش نظر اکیے کمار نے غیر معمولی کاوش اور جانفشانی سے اپنی مذکورہ کتاب " بھارت دھرمیو اُپاشک " مرتب کی تھی - اکیے کمار کی اس کتاب کی اساس بھی " هورسن هیمن ولسن " کی انگریزی کتاب "Essays and Lectures on the Religion of the Hindoos" پر رکھی گئی تھی -

درسی کتابوں کی حیثیت سے اکیے کمار کی " چارو پاٹھ " کا پہلا حصہ سنہ ۱۸۵۲ع میں دوسرا حصہ ۱۸۵۴ع میں اور تیسرا حصہ ۱۸۵۹ع میں شائع ہوا تھا - ان کتابوں نے بنگلا زبان کے ذریعہ علم و حکمت کی نشر و اشاعت میں بہت کام انجام دیا -

اکیے کمار کے ہاتھوں ہی بنگلا نثر علم و حکمت، سائینس اور تاریخ وغیرہ مضامین کی حامل ہو چکی تھی - ان کی تحریرات میں خیالات کی صفائی نمایاں ہے - جملوں میں زور ہے اور انکے مدلل ہونے کی خوبی موجود ہے - بنگلا نثر کا اغلاق انھی کے هاتھوں ختم ہو کر اس میں اظہار خیال کی صلاحیت اور وسعت پیدا ہوئی - اگرچہ ان کی نثر میں سنسکرت الفاظ کی کثرت ہے تاہم اس مین ایک فطری روانی نظر آتی ہے -

ایشور چندر ودّیا ساگر

سنہ ۱۸۲۰ع تا سنہ ۱۸۹۱ع

بنکم چندر سے سابق دور میں ایشور چندرودّیا ساگر جیسی سماجی بیداری اور قومی مفاد کیلئے دور اندیشی کا ثبوت کسی اور ادیب میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ عہد جدید کے بنگالی ھندؤں کی سماجی تشکیل میں ان کی خدمات بے حد و بے حساب ھیں۔ غیر منظم بنگالی نوجوان جماعت Young Bengali Dal اور رجعت پسند بوڑھوں کے درمیان دیس اور قوم کی بہبودی کیلئے تعمیری پروگرام کے ساتھ ودّیا ساگر نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا تھا۔

ودیا ساگر ضلع مدنی پور کے ایک معزز برھمن گھرانے میں پیدا ھوئے تھے۔ بچپن ھی سے ھر کام میں ان کا انہماک غیر معمولی تھا۔ لائق والدین کے ھاتھوں پروان چڑھ کر ودّیا ساگر ایک طرف تو کارکردگی کی بے نظیر صلاحیتوں اور عملی کیرکٹر کے مالک ھوئے اور دوسری جانب سمندر کی طرح رحم و فیاضی کی عظمت کے حامل بنے۔ اس دور میں ھندو قوم کے مختلف امراض ملی کے اسباب کو جس طرح انھوں نے سمجھا اور محسوس کیا تھا اس طرح کسی اور نے

نہیں کیا ۔ انھوں نے اپنی قوم کی طرف نظر غائر سے دیکھا کہ ستی کی رسم، ذات پات کی حیثیت سے تعدد ازدواج کا رواج اور نکاح بیوگان کو مذموم سمجھنے کا تصور وغیرہ بہت قدیم زمانے سے داخل شدہ ظالمانہ رسموں نے ہندؤں کی سماجی زندگی کو مفلوج کر دیا ہے اور تمام تر سماجی بد نظمی کی اصل بنیاد یہی مذموم رسمیں ہیں ۔

ستی کا بے بنیاد ہونا رام موہن رائے نے بھی اچھی طرح سمجھا تھا ۔ انھوں نے بھی اسے اٹھا دینے کیلئے آخری وقت تک جدوجہد کی تھی ۔ لیکن اس رسم کا خاتمہ ودّیا ساگر کے زمانے میں دراصل انھی کی کوششوں سے ہوا ۔ ودّیا ساگر کے اہم کارناموں میں سے تعدد ازدواج کی روک تھام اور بیوہ عورتوں کو نکاح ثانی کا حق ملنا ہے ۔ ملک اور قوم کی تعمیر کے سلسلے میں جن خواتین پر قومی تعمیر کی ذمہ داری کا بوجھ آتا ہے ان کی فلاح و بہبود اور ان کے حقوق کی نگہداشت، نیز ان کی خود اعتمادی کو واپس دلانے کیلئے جو جدوجہد ودیا ساگر نے اپنے عہد میں کی اُسی کی بنگال جدید کی تاریخ میں دوسری کوئی نظیر موجود نہیں ہے ۔ یہ تصور اُس دور میں صرف انھی کے دماغ میں سب سے پہلے جاگزیں ہوا تھا کہ بنگالی عورتوں میں ان کی اپنی قدر

و قیمت کا صحیح اندازہ اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے کا احساس پیدا کرنے کیلئے جس طرح ان تمام قبیح رسموں کو دور کرنا ضروری ہے اسی طرح انھیں مغربی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا بھی لابدی ہے۔ اسی وقت سے کلکتے میں عورتوں کی تعلیم کے مرکز بیتھون کالج کا قیام ودیاساگر ھی کی مساعی کا مرھون منت ہے۔

ودّیاساگر کی قومی خدمات اور اصلاحی کاوشوں میں ان کا رھنما صرف جذبہ انسانیت اور خدمت خلق تھا۔ اُس عہد کے تعریف شدہ ظالمانہ اصول مذھبی سے انھیں عناد تھا۔ برھمن خاندان سے منسلک ھوکر بھی وہ اس طرح کے مراسم کے شکار مذھب سے متنفر تھے۔ رام کرشن پرم ھنگش یا بی بیکانند کی طرح مخلوق کو خالق کا مظہر سمجھ کر انھوں نے خدمت خلق نہیں کی بلکہ ایک صحت مند سماج کی تشکیل کیلئے قابل مل زندگی کے وسائل کو ترقی دینے کے واسطے وہ مغربی فلسفہ دمیت (Humanism) کے پجاری بنے۔ اس سلسلے میں سورپ کے "آگست کونتے" اور "استیورٹ مل" غیرہ فلسفی ھی اغلباً ان کے رھنما بنے۔ پونتے" کی Positivism (ثبوتیت) نے بھی ان کے ماغ کی نشو ونما کی۔

نامعلوم زمانے سے جاری رہنے والے مراسم کی اصلاحی تحریک میں ودّیاساگر نے جس جوش و خروش، ناقابل شکست عزم و ہمت اور غیر معمولی طاقت و حوصلہ، فہم و ذکا، بے مثال کردار اور بے حساب قوت عمل کا ثبوت دیا اُس کا جواب دور حاضر کی تاریخ میں مشکل ھی سے مل سکتا ھے۔ ان تمام اصلاحی تحریکات میں ودیاساگر لوگوں کی تیغ زبان اورشمشیر قلم سے بھی محفوظ نہ رہے۔ قدامت پسند ھندوؤں نے ان کی تذلیل و تضحیک میں کمی نہیں کی۔ ساتھ ھی ساتھ انھوں نے ودیا ساگر کی مخالفت بھی کی۔ مروجہ سماجی مراسم کے قائدین اور مذھبی پنڈتوں کے ساتھ ودیاساگر کو بارھا نبرد آزما ھونا پڑا۔ ان کے تصنیف کردہ بنگالی ادب میں ان کی مجاھدانہ زندگی کا نقش بہت نمایاں اور روشن نظر آتا ھے۔

ودیاساگر کی مصنفہ بنگالی منثور ادب کو ھم مجموعی طور پر چار حصوں میں تقسیم کرسکتے ھیں۔

۱۔ سماج کے متعلق مضامین :- اس حصے میں ھم ان کی کتاب "بیدھوا بیباھو پروچلیتو ھوا اُچت کی نا اتودی شویک پرستاب" (شادی بیوگان کا رواج مناسب ھے یا نہیں اس بارے میں تجویز) (پہلی اور دوسری تجویز)۔

ان دونوں تجاویز کے دونوں حصے سنہ ۱۸۵۵ع میں تصنیف اور طبع ہوئے - ان کی دوسری کتاب " بہو بیبا ہو رہیتو ہوا اُچت کی نا اتیت بشویک بچار (تعدد ازدواج کے مناسب یا نامناسب ہونے کا فیصلہ) ہے جسکی طباعت سنہ ۱۸۷۱ع میں ہوئی -

۲ - گمنام مطبوعہ متعدد طنزیہ مضامین اور خود اپنے نام سے لکھی ہوئی " آتو جیبنی (آپ بیتی) اور مزید براں متعدد سنجیدہ مضامین -

شادی بیوگان کے قیام اور تعدد ازدواج کے خاتمے کے متعلق تارا ناتھ ترکو باچس پتی نے ودیا ساگر پر طنزیہ مضامین لکھے تھے - ان کے جواب میں ودیا ساگر نے گمنام طریقے پر منجانب کشّو چیت اُپوجگتو بھائی پوشّو پرونیتو" " اتی الپو ہوئیلو" (بہت کم ہوا) مطبوعہ سنہ ۱۸۷۳ع اور " ابار اتی الپو ہوئیلو" (ابھی بہت کم ہوا) مطبوعہ سنہ ۱۸۷۳ع یہ دونوں اور دوسرے طنزیہ مضامین کا مجموعہ بنام " جت کنچیت اپور بو مہا کابو بروجو بیلاس" مطبوعہ سنہ ۱۸۸۵ع اسی زمرے میں داخل ہوسکتا ہے - ودّیا ساگر کے عزیز راج کرشن بندو پادّھیا کی بچی پرو بھاوتی کی نا وقت موت پر مرتبہ کتاب " پرو بھاوتی سنبھاشن" سنہ ۱۸۶۴ع میں طبع ہوئی - ودیا

ساگر کی کتاب " آتو جیبن چریتو " (اپنی آپ بیتی) مطبوعہ سنہ ۱۸۴۹ع بھی اسی حصے میں داخل کی جاسکتی ہے -

۳ - درسی اور ادبی تصنیفات - اسی حصے میں " بنگلار ایتیہاش " مطبوعہ سنہ ۱۸۴۷ع، برنو پوری چے (تعارف حروف)، بودھودئے، نیتی بودھہ، کتھا مالا، چریتا بولی، اتّھان منجری، وغیرہ اسکول کی درسی کتابیں نیز " شنسکریتو بھاشا " اور " شنسکریتو شاسترو بشویک پرستاب " بھی اسی سلسلے کی کتابیں ھیں -

۴ - ان کے ادبی کارنامے - سنہ ۱۸۴۷ع میں شائع شدہ ان کی سب سے پہلی ادبی کتاب بیتال پنچو بنگشتی (بیتال پچیسی) ہے - کالی داس کے " ابھگیان شکنتل " ڈرامے کا ترجمہ شکنتلا مطبوعہ سنہ ۱۸۵۴ع - بھبو بوتی کے " اُتّر رام چریت " ڈرامے کے ابتدائی دو مناظر کا ترجمہ اور بال میکی کی رامائن کی تبعیت میں مصنفہ " سیتار بنو باش " مطبوعہ سنہ ۱۸۶۰ع شکسپیر کی " کمیڈی آف ایررس " کی تقلید میں مرتبہ " بھرانتی بیلاش " مطبوعہ سنہ ۱۸۶۹ع اور اسی طرح مہا بھارت کے دیباچے کے بعض حصوں کا ترجمہ بھی اسی عنوان میں داخل ہو سکتا ہے -

ودّیا ساگر کا ایک بڑا اہم کارنامہ خود بنگالی زبان ہے - انھی کے

ہاتھوں بنگلا زبان ادبی محاسن سے معمور ہوئی ۔ اس معاملے میں ودیا ساگر کی تنہا کوششوں ہی نے بنگالی نثر کو آسان طرز بیان اور سہل اسلوب ترکیب بخشا ہے ۔ ودیا ساگر کے آبا واجداد کی مساعی سے بنگالی نثر نے جو حیثیت بھی حاصل کی تھی اس کے مقابلے میں انھوں نے اس زبان کو بہت زیادہ موقر، معزز اور دولت مند بنا دیا ۔ زبان کے معاملے میں ان کی ہمہ بیدار اور ہمہ صناع طبیعت اور ساتھ ہی ساتھ غیر معمولی جد و جہد نے زبان کی قدر و قیمت کے اضافے کے لئے ان کے راستوں کو ہموار بنا دیا تھا ۔ بنگالی نثر کی رسیلی صورت کو منظر عام پر لانے میں ودیا ساگر کے دو فیوض خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ پہلی چیز یہ ہے کہ انھوں نے بنگالی نثر کے اندرونی توازن کی ایجاد میں کمال دکھایا اور دوسری چیز یہ ہے بنگالی محاورات اور ضرب الامثال کا سب سے پہلا کامیاب استعمال انھیں نے کیا ۔ تخیلات کی مناسبت کے مطابق الفاظ کے تجسس سے کسی زبان کی نثر میں جو تقویت اور فطری روانی پیدا ہوتی ہے اسے وڈیا ساگر نے اچھی طرح محسوس کیا تھا ۔ ایسے معاملے میں وہ بڑے ہوشیار اور صناع واقع ہوئے تھے ۔ ہمیں اس چیز کا پتہ ان کے وقفات، سکنات (Breath Pause) اور تخیلی مواقف (Sense Pause) نیز دوسرے رموز اوقاف کے برمحل اور بہ کثرت استعمال سے ملتا ہے ۔ ودیا ساگر سے پہلے رام موھن بھی بنگالی

جملوں کے اس توازن کی ایجاد میں پیش رو واقع ہوئے تھے لیکن وہ پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے - ودیا ساگر ھی نے جملوں میں رموز اوقاف وغیرہ کے ذریعہ ارکان Syllablel پر اساس سخن رکھہ کر انھیں ایک ماترے کے تحت قائم کیا - اس طرح کے دو ارکان کے اکٹھا ہونے سے شمار میں ان کے اندر حواہ کتنے ہی حروف کیوں نہ ہوں پڑھتے وقت ان کی تقسیم ھموزن (Equal measure) معلوم ھوتی ھے - اس وجہ سے جملوں کی اندرونی آوازیں بھی مختلف و متناسب طور پر گونجتی ھوئی معلوم ھوتی ھیں - جملوں کے درمیان کی آواز سے کس طرح اور کس صنعت کے ذریعہ سے قاری کے دل میں معانی اور مطالب اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ پاش ہو سکیں گے اس صنعت میں بھی ودیا ساگر نے حیرتناک مہارت اور خوبی کے باعث بنگلا الفاظ کی آواز اور سُر میں (Speach Sound) بے نظیر عظمت کی تخلیق کی ھے -

ھر زبان کے محاورات اور ضرب الامثال اس زبان کا قیمتی سرمایہ ہیں - ھر زبان ہی میں چند ایسے ماھر اور صناع اشخاص نے جنم لیا ھے جنھوں نے بہ کثرت محاورات اور کہاوتوں کا استعمال کرکے زبان اور ادب کے راستوں کو ہموار کیا ھے - ودیا ساگر کی گمنام طنزیہ تحریرات میں اس طرح کے بعض بنگالی محاورات تخلیقی طور پر بھی استعمال کئے گئے ھیں - چونکہ ودیا ساگر کے

ہاتھوں یہ محاورات برمحل مستعمل ہوئے ہیں اس لئے ان کا طنز بھی نہایت وقیع ہو گیا ہے -

سماجی تحریرات میں ودیا ساگر کے جوش بیان اور طاقتور حوصلہ مندی کے نشانات جس طرح نمایاں ہیں اسی طرح " پروبھاوتی شنبھاشن " اور " آتمو چریت " میں ان کی دلی کمزوری اور دلچسپ ظرافت کا بھی پتا ملتا ہے - ان کے غیر مفتوح بلند حوصلوں کے پردے میں رحم و کرم کی ایک موج رواں تھی - اسی جذبے کو انھوں نے اپنی سماجی زندگی میں بروےکار لاکر اپنی ہم وطن عورتوں کی بد نصیبی کو دور کرنے کی بھی کوشش کی تھی - اپنی ادبی زندگی میں تراجم کے ذریعہ سے بھی انھوں نے ہمیشہ کی دکھیاری ماں' اور شکنتلا کی دردبھری تصویر میں رنگ بھرتے وقت رحم و کرم کا ایسا ہی مینھ برسایا تھا - ان کا سب سے بڑا ادبی شاھکار " شکنتلا اور سیتا کا بن باس ترجمہ ہونے کے باوجود ایک ممتاز تخلیقی (اور یجنل) کارنامہ معلوم ہوتا ہے - اس میں ان کی زبان اور شخصیت نے ایک خاص طرز (Style) پیدا کر دیا ہے - اسے ودیا ساگر کا سنسکرت آمیز اسٹائل کہا جاتا ہے - آسان اور متوازن طرز تحریر نیز دلکش ترنم کے اعتبار سے شکنتلا اور سیتا کے بن باس کی بنگالی نثر نے جس حد تک کلاسیکل عظمت اور تقدس پذیر سنجیدگی حاصل کی ہے اس سے آج بھی اِنکار نہیں کیا جا سکتا -

پیاری چاند متر

۱۸۱۴ء—۱۸۸۳ء

الالی بنگلا

بنگالی منثور ادب کی تدریجی ارتقا کی تاریخ میں ابتک ہم نے جن لوگوں کا تذکرہ کیا ہے ان سب لوگوں نے شستہ سنسکرت آمیز بنگالی زبان کیلئے سنسکرت کی تبعیت ہی میں جد و جہد کی تھی - ودّیا ساگر کے زمانے میں اس طرز نے غیر معمولی توسیع، تنوع اور استحکام حاصل کیا - ودیا ساگر کے طرز سے پیاری چاند متر نے اختلاف کیا - ان کا دورحیات سنہ ۱۸۲۴ء سے سنہ ۱۸۸۲ء تک ہے - یہہ ہندو کالج کے متعلم تھے - وہ اگرچہ "ڈی روزیو" کے بلاواسطہ شاگرد نہ تھے تاہم ڈی روزیو کے نقش قدم پر چل کر پیاری چاند ایک آزاد اور حریت پسند تخییل اور طبیعت کے مالک بنے - بنگالی زبان کے تجربے (Experiment) کے دور میں ودیا ساگر کے ہاتھوں بنگالی نثر جس درجے تک پہنچی اس سے ادب کے متعلمین اور ادب کے خادموں کو مسرت حاصل ہو سکتی ہے لیکن عوام کیلئے اس کی تقلید آسان نہیں کیوں کہ سب کے لئے یہ راہ ہموار اور سہل گذارنہ تھی - اس بات کو پیاری چاند مترنے اچھی طرح سمجھا تھا اور اسی لئے انھوں نے عوام کے لائق ادب

کی تخلیق کرنے میں کلکتہ اور اس کے مضافات کی مروجہ اور مستعمل زبان ھی کو ادبی زبان تسلیم کیا - خدمت زبان کی تاریخ میں ہم اسے ایک گونہ باغیانہ حرکت کہہ سکتے ہیں - لیکن رادھا ناتھ سکدار کے زیر ادرات " ماشک پتریکا (ماہوار رسالہ) ' کی اشاعتوں میں وہ اپنے خیالات اور زبان کے متعلق معتقدات کی تبلیغ کرتے رہے - بول چال کی زبان میں شاعری' بہ کثرت سنسکرت الفاظ کے مشتقات اور مروج فارسی الفاظ کا استعمال نیز افعال میں شستہ اور بول چال کی زبان کا اختلاط ھی اس اخبار " ماشک پتریکا " کی طرز تحریر کی بڑی خصوصیت تھی - اسی اخبار میں ان کی بے حد مشہور کتاب " الا لر گھر ردولال " کا کچھ حصہ شائع ہوا تھا - پھر سنہ ۱۸۵۷ع میں یہ ایک کتابی صورت میں طبع ہوئی - اس مشہور ناول " الا لر گھر ردولال " کے ذریعہ ان کی زبان کا مثالی مطمح نظر منظر عام پر آیا اور اسی لئے ہم ان کی بنگلا کو " الا لی بنگلا " بھی کہہ سکتے ہیں - پیاری چاند کی تحریر نے بول چال کی زبان کا شستہ طرز قبول نہیں کیا - اس میں شستہ اور بازاری زبان کا کافی اختلاط موجود ھے - تاہم عوامی زبان کی شکل میں انھوں نے جس غیر وقیع طرز کی ایجاد کی تھی اسے اُس دور کی تاریخ زبان میں ایک تعجب خیز سانحہ کہا جا سکتا ھے - زبان کی تخلیق اور استعمال میں

جس طرح ان کی نظر واضح تھی اسی طرح موضوعات ادب کے متعلق بھی ان کے تخیلات بنیادی حیثیت رکھتے تھے - فارسی، سنسکرت، هندی یا انگریزی کا کوئی ترجمہ نہ کر کے ادبی تحریرات کے اسباب اور موضوعات متعین کرنے کیلئے انھوں نے بنگال کی سماجی اور گھریلو زندگی هی کی طرف اپنی توجہ منعطف کی تھی - ایک سو سال کے دور حکومت انگریزی میں جن لوگوں نے یکایک دولتمند بن کر کلکتے میں رھائش اختیار کی ان کی دولت میں زیادتی کی وجہ سے خود ان کی اور ان کے اهل وعیال کی معاشرتی زندگی میں کسی حد تک خلا رونما هو گیا تھا اس کے متعلق اس غیر منظم ناول میں خاموش تبصرے هیں - پیاری چاند نے خود گمنام رہ کر ٹیک چاند ٹھاکور کے نام سے ایک کتاب میں اس عہد کے کلکتے کی ناکام زندگی پر سخت تنقید کی هے - اس کتاب سے ان کی حیرتناک قومی بیداری اور سماجی زندگی کیلئے قابل اعتماد ادب کی تخلیق کی بے نظیر صلاحیت کا پتہ ملتا هے -

سنہ ۱۸۳۵ع میں اگرچہ انگریزی نے فارسی کی جگہہ لے کر سرکاری زبان کی حیثیت حاصل کر لی تھی تاهم هندو اور مسلمان کی تفریق نہ کر کے هر بنگالی اس دور میں بہ کثرت فارسی الفاظ استعمال کرتا تھا - اس بات کا اس سے بھی ثبوت

ملتا ہے کہ " الالرگھور ردولال " کتاب اگرچہ مروجہ زبان میں منضبط ہوئسی تھی لیکن اس میں عربی اور فارسی الفاظ بڑی کثرت کے ساتھ استعمال کئے گئے تھے - بول چال کی زبان میں بنگالی ہمیشہ سے محاورات استعمال کرنے میں چابکدست رہے ہیں - ہمیں اس حقیقت کا ثبوت بھی اسی کتاب میں مستعمل محاورات سے ملتا ہے -

پیاری چاند متر کی اور سب کتابیں یہہ ہیں :—

" مدکھاوا بڑو دائے ذات تھا کار لی اُپائے " - (شراب پینا سخت مشکل اسلئے عزت بچانے کی کیا صورت ہے) - یہہ کتاب سنہ ۱۸۵۹ع میں شائع ہوئی تھی - " راما رنجیکا " مطبوعہ سنہ ۱۸۶۰ع - " کریشی پاٹھ " (درس مزراعت) ' " گیتا انکور " اس کا تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۸۷۰ع میں شائع ہوا - " جت کنچت (قدرے قلیل) مطبوعہ سنہ ۱۸۶۵ع - " آبھیدی " مطبوعہ سنہ ۱۸۷۱ع - " اینودیشیو استری لوک دیر پور با ابستھا " مطبوعہ سنہ ۱۸۷۸ع - " نیوڈ هیرر جیبن چریت (سوانح) - اڈّھا تیکا " مطبوعہ سنہ ۱۸۸۰ع اور " باماتوشینی " مطبوعہ سنہ ۱۸۸۱ع -

کالی پرسنو سنگھ

استعمال زبان اور نظریات کی رو سے ودیا ساگر کے خلاف جو مخالفانہ تحریک اٹھی تھی اس کا تذکرہ پہلے ھی ھو چکا ھے - اس مخالفت کے بڑے نقیب " ماشک پتریکا " اخبار کے مدیر رادھا ناتھ سکدار اور ان کے ھمنو اوھم کار دوست پیاری چاند متر تھے - مذکورہ بالا اخبار میں گاہ بگاہ ودیا ساگر کی طرز تحریر پر طنزیہ مضامین شائع ھوا کرتے تھے - ایک مضمون میں " xenophon " مقطوع الآخر لفظ مرقوم تھا - ودیا ساگر ان تمام اعتراضات کے باوجود انپر مربیانہ شفقت ھی کی نظر رکھتے تھے - استعمال زبان میں انقلاب پیدا کرنے کے دوران پیاری چاند نے اگرچہ شستہ اور عامی دونوں طرز زبان کے اختلاط کا نمونہ پیش کیا ھے لیکن ان کے متبع کالی پرسنو سنگھ نے اس حیثیت سے بنگالی زبان کو زیادہ ترقی یافتہ اور خوش آئند بنایا - کلکتہ اور اس کے مضافات کی مروجہ زبان کا صحیح استعمال سب سے پہلے کالی پروسنو سنگھ ھی نے کیا - ان کے مستعمل طرز میں عامی اور شستہ افعال کا اختلاط نہیں ھے - اس حیثیت سے کالی پروسنو کی زبان پیاری چاند سے زیادہ وقیع ھوگئی ھے - کالی پروسنو نے اپنی کتاب " ھوتم پینچار نقشہ " میں اپنی اس خاص زبان کا استعمال کیا ھے -

ان کا فرضی نام "هوتم" هے اور اسی مناسبت سے ان کی مستعملہ زبان کو "هوتومی بنگلا" کہا جاتا هے۔

"هوتم پینچار نقشہ" مطبوعہ سنہ ۱۸۶۲ع کے نام هی سے سنجیدہ ظرافت اور طنز کا اظہار هوتا هے۔ واقعتاً ایسا هی هوا بهی هے کلکتے کے انقلاب انگریز سماج کا تذکرہ کرتے هوئے انهوں نے ایسے نوجوانوں کا مذاق اُڑایا هے جو خوش نصیبی سے قلیل عرصے میں دولت مند بن گئے تهے۔ ایسے دولتمند بابو زادگان کی غیر منظم اور سرپهری زندگی کی عیاشی کی تصویر کشی هی اس کتاب "هوتم پینچار نقشہ" کا بنیادی مقصد هے۔ اس زمانے میں کلکتے کے نوخیز بابو زادگان اور هندو سماج کی زندگی کا ایک غیر استقرار پذیر نقشہ اس کتاب کے پڑهنے سے آنکهوں کے سامنے آ جاتا هے۔ علاوہ بریں اس کتاب کے ذریعہ عام جہالت پر کافی حد تک تمسخر اور طنز کا بهی اظہار کیا گیا هے۔ بہت سے مقامات پر اُس دور کے ممتاز لوگوں کا طنزاً مذاق بهی اڑایا گیا هے۔

———:•*•:———

خندکار شمس الدین محمد صدیقی

خندکار شمس الدین محمد بردوان کے باشندے تھے - سنہ ۱۸۵۲ع میں ان کا ایک مجموعہ نظم بنام " بھاب لا بھہ " شائع ہوا - اس وقت انیسویں صدی کے ممتاز ترین بنگالی مسلمان ادیب میر مشرف حسین کا سن صرف پانچ سال کا تھا - سنہ ۱۲۷۱ ب ماہ ماگھ مطابق سنہ ۱۸۶۵ع میں ڈاکٹر محمد شہید اللہ کے آبا و اجداد میں سے ایک اہل علم منشی بشارت اللہ نے خندکار شمس الدین محمد صدیقی کی مصنفہ ایک کتاب " اُچت شربن" کی نظم و نثر کو نقل کیا تھا - اغلب ہے کہ اسے کسی مطبوعہ کتاب ہی سے نقل کیا گیا تھا - " اُچت شربن" یعنی روحانی تخیل ایک مذہبی کتاب ہے - میر مشرف حسین کی پہلی کتاب "رتنابلی" سنہ ۱۸۶۹ع میں شائع ہوئی - اُس سے بہت پہلے ہی " اُچت شربن " تصنیف ہو چکی تھی - اس تصنیف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خندکار شمس الدین محمد ہی سب سے پہلے بنگالی مسلمان نثر نگار تھے - بنگالی نثر کی توسیع کے میدان میں ہم انیسویں صدی کے وسط تک جہاں آکر پہنچتے ہیں وہاں بلا شک خندکار شمس الدین محمد کا کارنامہ قابل ذکر نظر نہیں آتا لیکن سب سے پہلے بنگالی مسلمان نثر نگار کی حیثیت سے ادب کی تاریخ میں ان کا مقام بھی غیر متزلزل ہے -

بنگالی نثر میں پختگی اور ترقی

بنکم چندر

سنہ ۱۸۳۸ع – سنہ ۱۸۹۴ع

مغربی بنگال میں نئی ہٹی کے قریب کنتھل پاڑا ایک دیہات میں بنکم چندر پیدا ہوئے - ہوگلی محسن کالج اور پھر پریسیڈنسی کالج سے تعلیم حاصل کی اور سنہ ۱۸۵۷ع میں امتیازی شان کے ساتھ کلکتہ یونیورسٹی سے بی - اے - کی ڈگری لی - بنکم اپنے دور کے ان خوش نصیبوں میں سے تھے جنھوں نے نو قائم شدہ کلکتہ یونیورسٹی سے ابتدائی دور میں گریجویٹ ہونے کا فخر حاصل کیا تھا - سنہ ۱۸۵۸ع میں بی - اے - پاس کرنے کے بعد ہی وہ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز ہوگئے اور پنشن حاصل کرنے تک بڑی نیکنامی کے ساتھ اس عہدے پر بحال رہے -

شاعر ایشور گپت کے شاگرد کی حیثیت سے بنکم چندر نے بنگلا ادب کی خدمت شروع کی - سنہ ۱۸۵۳ع میں انکے دو منظوم مجموعے بنام " للیتا " اور " مانش " شائع ہوئے - اس کے بعد ہی سے انھوں نے ترتیب نظم کے بجائے ناول نگاری کی طرف توجہ کی - انگریزی ادب کی خدمت کا نشہ ان کے متعدد ہم

عصروں کی طرح خود ان کے دماغ پر بھی مستولی تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کا پہلا ناول Rajmohan's wife سنہ ۱۸۶۴ع میں شائع ہوا - لیکن یہ محسوس کرتے ہی کہ انگریزی کے ذریعہ حصول شہرت ممکن نہیں وہ بنگالی ادب کی خدمت میں لگ گئے -

بنکم کے پہلے بنگالی ناول " درگیش نندنی " کی اشاعت سنہ ۱۸۶۵ع میں ہوئی اور اس نے بنگالی ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا - سبب یہ تھا کہ اس وقت تک بنگالی ادب مذکور میں جس قدر کتابیں شائع ہو چکی تھیں انھوں نے نوسیع زبان میں جس قدر مدد کی تھی اس کی مناسبت سے قابل قدر ادب کی تخلیق نہیں کی - انگریزی داں بنگالی سماج کے افراد نے انگریزی کی تعلیم سے بہرہ مند اور مغربی تخیلات سے متاثر ہوکر جب بنگالی ادب میں گرانپایہ، ترقی یافتہ اور ذوق کی پیاس بجھانے والا ادب مفقود پایا تو فطرۃ ان کے ذہن میں اپنی زبان کے متعلق تحقیر اور افلاس کا جذبہ پیدا ہوا - انگریزی کے رومان پرور اور آفاق گیر تخیلات سے معمور ادب سے واقف ہوکر بنگال کے انگریزی داں ہندو سماج کی نظر میں وسعت اور خیالات میں آزادی اور قوت پیدا ہو گئی - جس قدر یہ صفتیں بڑھتی گئیں اسی قدر بنگالی زبان اور ادب کے متعلق ان کی طبیعت میں بے اعتمادی پیدا ہوتی گئی - اگرچہ پیاری چاند کی

مشہور کتاب " الالر گھریر دلال" بنگالی زندگی کی معلوم حیثیتوں اور کیفیتوں کو سامنے رکھ کر ہی مرتب کی گئی تھی لیکن اسمیں بھی بےروک تخیل کی کمی اور گہرائی کا فقدان تھا ۔ بنکم نے انگریزی طرز پر درگیش نندینی لکھ کر بنگالیوں کی اس پیاس کو بجھایا تھا ۔ مدھو شودن نے اپنی " میگھناد بودھ " نظم میں جس طرح مغربی ادب کے تخیل کو اجاگر کر کے بنگالی ادب کے میدان کو وسیع اور منظوم ادب کے پیاسوں کو سیراب کیا تھا اسی طرح بنکم نے نثر کے میدان میں مغربی تخیل کے نغموں سے اپنے موسیقار کو ہم آہنگ کر کے درگیش نندینی کے ذریعہ دلدادگان ادب کو مسحور بنا یا تھا ۔ مدھو شودن دی میگھناد بودھ اس دور کے عوام میں مقبول نہ ہو سکی لیکن درگیش نندنی کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی ۔ عوام نے درگیش نندنی کو ایک مشہور ناول ہونے کی وجہ سے بڑی رغبت کے ساتھ قبول کیا تھا ۔ اس کتاب کے ذریعہ اُس دور کے بنگلا ادب کا افلاس دور کیا گیا تھا اور زبان میں سلاست و روانی پیدا ہوئی تھی ۔ اس کے ذریعے سے ادیبوں کے تخیل میں غیر معمولی وسعت کے امکانات روشن ہوئے تھے ۔ آج کے تنقید نگاروں کی کسوٹی پر پرکھنے سے درگیش نندنی میں بحیثیت ایک ناول کے بہت سارے نقائص نکالے جا سکتے ہیں لیکن یہ بات تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ

درگیش نندنی کے ذریعہ ہی درجہ بدرجہ ترقی پاکر بنگالی نثر نے آج کے دولتمند ادب کا روپ حاصل کیا ہے -

ودیا ساگر کی سنسکرت آمیز بنگالی ' پیاری چاند کی الالی زگلا اور کالی پرسنو کی ہوتومی بنگلا کو توڑ مروڑکر بنکم نے نگالی نثر میں جان ڈالی - ودیا ساگر کے پیروؤں نے بنکم کی اس یم مشکل اور نیم آسان بنگالی کو پسند نہیں کیا - انھوں نے نکمی بنگلا کو (شب پوڑا و موڑا داہو) سنسکرت و بنگالی مخلوط زبان کے نام سے موسوم کر کے اس پر طنز دھی کیا ' لیکن درگیش نندنی اور اس کے کچھ دنوں بعد ہی " کپال کنڈلا " مطبوعہ سنہ ۱۸۶۶ع کے ذریعہ بنگلا نثر نے جو روپ اختیار کیا تھا اس نے مختلف حیثیتوں سے بنگالی ادب کے حسن و جمال میں چار چاند لگا دئیے -

بنکم نے جس زمانے میں ادب کی خدمت کی تھی اُس زمانے کی حیثیت سے اس زبان اور اس کے آزاد تخیلات تاریخ ادب بنگالہ میں حیرت ناک طور پر نتیجہ خیز ثابت ہوئے - درگیش نندنی کے بعد ہی بنکم کا گرانمایہ رومانی ناول "کپال کنڈولا" سنہ ۱۸۶۶ع میں شائع ہوا - اس کے بعد بارہویں صدی کی بنگلا کے پس منظر پر سنہ ۱۸۶۹ع میں " مرینالینی " کتاب تصنیف ہوئی - سنہ ۱۸۷۴ع میں بنکم نے " بنگو درشن "

اخبار جاری کیا - ما بعد کے ناول اسی اخبار میں مسلسل شائع ہوتے رہے - سنہ ۱۸۷۵ع کے خاتمے سے پہلے ہی " بـیش بـرکھو " سنہ ۱۸۷۳ع میں " اِنـدرا " سنہ ۱۸۷۳ع میں " جوگول انگوریو " سنہ ۱۸۷۴ع میں " چندرو شیکھر " اور " رادھـا رانی سنہ ۱۸۸۵ع میں شائـع ہوئی - سنہ ۱۸۷۵ع سے سنہ ۱۸۸۲ع کے درمیـان انکی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں - " رجنی " سنہ ۱۸۷۷ع میں ، " کرشنو کانتیر ویل " سنہ ۱۸۷۸ع میں ، "راج شدـگھو " سنہ ۱۸۸۰ع میں ، " آنندو مٹھ " سنہ ۱۸۸۲ع میں اور " دیوی چودھرانی " بھی سنہ ۱۸۸۲ع ھی میں شائع ہوئی - سنہ ۱۸۸۸ع میں ان کا آخری ناول " سیتا رام شائع ھوا -

اس کے علاوہ انھوں نے " لوک رہشو " سنہ ۱۸۷۴ع میں ، "بگیان رہشو " ۱۸۷۵ع میں " املا کانتیر دفتر " سنہ ۱۸۷۵ع میں " بی بیدھ پرو بندھو " سنہ ۱۸۷۹ع میں ، " شامو " سنہ ۱۸۷۹ع میں ، " موچی رام گورتیر جیبن چریت " سنہ ۱۸۸۴ع میں ، " ارشنو درترو ، سنہ ۱۸۸۶ع میں " بی بیدھ پرو بندھو " (مختلف مضامین حصہ اول و دوم) سنہ ۱۸۸۷ع و سنہ ۱۷۹۲ع میں ، " دھرمو تتّو و انو شیلن " (معارف مذهب اور مشق) سنہ ۱۸۸۸ع میں اور " شری مد بھگوت گیتا " مطبوعہ سنہ ۱۹۰۲ع و مصنفہ سنہ ۱۸۸۶ع تا سنہ ۱۸۸۸ع وغیرہ مختلف مضامین کی کتابیں تصنیف کیں -

اس قدر کثیر التعداد ناول اور مقالات کی کتابوں کی فہرست ھی سے بنکم چندر کے شغف ادبی اور خدمت ادب کا بےنظیر پتہ ملتا ھے - بنکم نے ایک ادیب ھی کے روپ میں جنم لیا تھا اسلئے سرکاری ملازمت میں مشغول رھنے کے باوجود ان کا اصلی کارنامہ ادبی میدان ھی میں نمایاں ھوا -

گذشتہ نصف صدی میں بنکم کی کتابیں بنگال میں اور بنگال سے باھر جس قدر پڑھی گئیں ان کے لحاظ سے بنکم پر غیر جانب دارانہ تنقید ابتک نہیں کی گئی - قدامت پسند ھندؤں کے جذبات کے ترجمان کی حیثیت سے بنکم بنگال کے آسمان ادب پر نمودار ھوئے تھے - اکثر ھندو تنقید نگاروں نے اپنے خیالات، افکار، آرزو اور تمناؤں ھی کے روپ میں بنکم کو دیکھا یا بنکم کی تصنیفات میں اپنی آرزؤں کا درشن پایا ھے اور یہی سبب ھے کہ غیر جانب دارانہ حیثیت سے وہ بنکم کا تنقیدی مطالعہ نہ کر سکے - بنکم اسی وجہ سے انکے ھاتھوں بجائے ادیب ھونے کے ایک رشی بنکم کے روپ میں جاوہ گر ھو گئے ھیں - یہہ بھی تنگ نظری ھی کا ایک سبب ھے -

بنکم نے مذکورہ آٹھوں ناولوں میں تاریخ کا پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کی ھے مگر کسی میں بھی وہ کامیاب نہ ھو سکے - بنکم صرف اپنی ایک کتاب راج شنگھ ھی کو تاریخی

40—

ناول سمجھتے تھے - لیکن یہ کتاب بھی ایک مثالی تاریخی ناول کی حیثیت نہیں رکھتی - کیرکٹر اور واقعات میں تاریخی طور پر تحریف کرکے بنکم نے اپنے مختلف تاریخی ناولوں میں ان کی صورتیں بگاڑ دی ہیں - ناول کے ابتدائی دور میں اس سے درگذر کیا جا سکتا ہے - اس سلسلے میں " انندو متھ " کے تیسرے ایڈیشن کے مقدمے میں وہ خود ہی فرماتے ہیں - اس عدم توازن کو میں مہلک نہیں سمجھتا - کیونکہ ناول بہرحال ناول ہے - " اس کی حیثیت تاریخ کی نہیں ہے "- اس طرح خود ہی اقبال نقص کرنا ان کے منھ سے اچھا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ پڑھنے والے ناول پڑھتے وقت ایک سنجیدہ ناول کے ذریعہ انسان کی پیدائش اور موت کے نشیب و فراز اور اس کے دکھ سکھ کے مختلف دلچسپ حالات ہی میں کھو جانا چاہتے ہیں - وہ تاریخ کے سنجیدہ اور تلخ واقعات سے لطف اندوز ہونا پسند نہیں کرتے - تاریخ کے مشہور اور غیر مشہور کیرکٹروں کی اندرونی زندگی کی کشمکش، مکالمے اور دلکش انداز میں سجائے ہوئے وہ واقعات جو اپنے اندر تڑپ اور بے قراری کی تصویریں نہیں رکھتے انھیں کے خاموش اور دلکش نقوش ایک ناول نگار کیلئے زیادہ جاذب توجہ ہوتے ہیں - اسی لئے اسکاٹ وغیرہ ممتاز مورخین نے تاریخ کی

طرف اسباب تاریخ کے حصول کی خاطر ھاتھ بڑھایا ھے۔ لیکن
بنکم کے ناولوں میں تاریخ اور ناول کے حصوں کا کامیابی کے
ساتھ ہم آھنگ امتزاج Harmonions blending نہ ھوسکا - ان کے
تصنیف کردہ ناولوں میں تاریخی پہلو غیر واقعی اور بے جان
نظر آتا ھے - یہاں تک کہ جس کتاب کو انھوں نے اپنے خیال میں
تاریخی ناول کی حیثیت دی ھے اس " راج شنگھو " کے تاریخی
پہلو کے کیرکٹروں میں بھی جان نہیں پڑ سکی - تاریخ کے جو چند
کیرکٹر انھوں نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ھے وہ بھی ان کے
آدرش اور مقاصد کا کھلونا بن کر رہ گئے ھیں - تاریخ میں ان کا
اس حیثیت سے کوئی پتہ نہیں ملتا - جن واقعات اور پس منظر کی
بنیاد پر انھوں نے اپنے تخیل کی عمارت کھڑی کی ھے ان میں مذکورہ
واقعات کے علاوہ دوسرے واقعات کو بھی لیا جا سکتا تھا - ان کے
چندر و شیکھر ناول میں بھی میر قاسم اور دولنی بیگم کے تذکرے
ناول کے حصے سے بالکل غیر متعلق ہو کر رہ گئے ہیں -

بیش برکھ و ، کرشنو کا نتیر ول اور رجنی وغیرہ سماجی
ناولوں ھی میں ان کا اصلی روپ سامنے آتا ھے - وہ خود
اونچے متوسط طبقے کے ایک فرد تھے اسلئے اپنے ان ناولوں
میں انھوں نے اسی طبقے کی نمائندگی کی ھے - گھر کے ملازمین
کے علاوہ متوسط طبقے یا تحتانی طبقے کے افراد کی کوئی

تصویر ہمیں ان کے سب سے بہترین ناولوں میں بھی نظر نہیں آتی - اپنے مقالاتی ادب میں ہاشم شیخ اور راما کوئی برت کے متعلق انھوں نے صرف دور ہی دور سے ہمدردی کے چھینٹے دئے ہیں ورنہ ان کی زندگی کے متعلق اُن کی تحریریں مصنف کی بیدار مغزی کا کوئی ثبوت نہیں دیتیں - انھوں نے اپنے ناولوں سے اپنے آپ کو صرف خوشحال اور اونچی ذات والے قدامت پسند ہندوؤں ہی کے تصورات کا پجاری ثابت کیا ہے - خصوصیت کے ساتھ انھوں نے موقع شناس چالاک، اعلیٰ وسطانی اور زمیندار طبقے کے امیر زادگان ہی کی نیابت کرنے اور انھیں کے کیرکٹر کو سامنے لانے میں پورا پورا زور قلم صرف کیا ہے - ان کے ان نظریات کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اپنے تصورات کی ایک مثالی ہیروئن کو بھی انھوں نے اسی روپ میں پیش کیا ہے - شوئبولینی، روھینی، کندو اور سورج مکھی وغیرہ کے کیرکٹر انھی تصورات کے آئینہ دار ہیں - ان کے طبقہ پرست ذہن میں یہی عورتیں مثالی حیثیت رکھتی ہیں - عورتوں کا طبقہ محبت کا اقرار نہیں کرتا اور یہ بات کہ انمیں بھی انسانی کمزوریاں موجود ہیں انھیں بنکم کسی طرح قبول نہیں کرتے - بوڑھے چندر شیکھر کی جوان بیوی شوئبرالینی اپنے

بچپن کے عاشق پرتاپ سے محبت کرنے کی بنا پر پاگل بنائی گئی اور مختلف طور پر گولیوں کا نشانہ بنی ہے۔ نگیندر ناتھ سے شادی کرنے کے جرم میں بیوہ کندو نندنی کو ناوقت موت قبول کرنی پڑی ہے۔ دیوی چودھرانی ناول میں وہ ایک ناکام مبلغ مذہب کے روپ میں اپنا ناقص کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سماجی اور گھریلو زندگی سے باہر مصائب کی شکار دیوی چودھرانی ہی ان کے خیال میں ایک مثالی ہندو خاتون بننے کے لائق ہے۔ "رجنی" میں لونگ لتا ہی بنکم کے تصورات کی ایک ممتاز اور مثالی عورت ہے۔ ان سارے ناولوں میں بنکم کی نگاہ صرف ایک ملک کے حالات تک محدود نظر آتی ہے۔ زندگی کی بہت ساری کٹھن منزلوں اور انسان سے متعلق بہت سارے رخ اور ان کی باریکیوں کا اظہار بنکم نے غیر ضروری یا غیر واقعی سمجھا ہے۔ ودیا ساگر عورت کی بہبودی اور مفاد کی خاطر جس وقت شادی بیوگان کی ترویج اور تعدد ازدواج کے خاتمے کی جدوجہد میں مشغول تھے اس وقت بنکم نے اپنے محبوب قدیم سماج کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے ودیا ساگر کے جواب میں قدیم رسم و رواج کو محفوظ رکھنے ہی کی جان توڑ کوشش کی ہے۔ دیوی چودھرانی اور سیتا رام

میں اونچی ذات والوں کے تعداد ازدواج کی حمایت کی گئی ہے۔

آنند مٹھ، مرینالینی اور سیتارام ناول بنکم کے سیاسی نقطۂ نگاہ کو پیش کرتے ہیں۔ اِن میں اِن کا جذبۂ حب الوطنی اور قوم پرستی بہت ہی تنگ نظری کا حامل نظر آتا ہے۔ ان کے اس نظرئے سے بنکم کے بہترین مداح بھی انکار نہیں کرسکتے۔ بنکم نے جس طرح مسلمانوں سے نفرت اور عداوت کا پرچار کیا تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ پاک بھارت برصغیر میں ان دونوں قوموں میں حد سے زیادہ تلخیاں پیدا ہوکر ناخوشگوار تعلقات کی بنیاد پڑی۔ بنکم نے ہندؤں پر آفتوں اور بھارت پر تمام تر مصائب کا واحد سبب مسلم حکومت کو قرار دے کر اپنے عناد کا بھرا پُرا ترکش موجودہ دور کے مسلمانوں پر تیراندازی کرکے خالی کر دیا ہے۔ آنند مٹھ کے گانے "بندے ماترم" میں انھوں نے جس جذبۂ قومیت کا خواب دیکھا ہے وہی در اصل ہندو فلسفہ، تمدن اور قومیت کا مایۂ ناز سرمایہ ہے۔ بنکم کا خواب اسی دن شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے جس دن اس برصغیر پر صرف ہندؤں کا راج قائم ہوجائے اور انھیں کا مذہب اور تہذیب سارے ملک پر مستولی ہوسکے۔ بھارت کے ہندؤں اور مسلمانوں کے اختلاط سے ایک قوم کی تشکیل کا تصور تو دور کی بات ہے مسلمانوں کے قومی

جود ھی کا بنکم کو اعتراف نہیں ھے ۔ مسلمانوں کی حکومت
کے زوال پر انگریزوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی ۔
س پر بنکم نے حد سے زیادہ مسرت اور خوشی کا اظہار
یا ھے ۔ اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ان کا سیاسی شعور کس
درجہ مفلس اور ان کا نظریہ کس حد تک تعصب آمیز تھا ۔
ھمیں تو مجبوراً ان کے اس اظہار مسرت پر یہی کہنا پڑتا
ھے کہ وہ دوسروں کی بدشگونی کیلئے اپنی ناک کٹوانا پسند
کرتے ھیں ۔

تاریخی، سماجی یا سیاسی ھر قسم کے ناولوں میں بنکم
کا نظریہ اور آدرش غیر واقعی تصورات سے بھرپور ھے ۔ زندگی
کے ساتھ عورت کے خوش آئند تعلق سے ان کی تحریرات خالی
نظر آتی ھیں ۔ ھندو بھارت کے دھرم، اور تہذیب کی
بربادی کیلئے مسلم حکمرانوں کو ذمہ دار ٹھہرا کر انھوں نے اپنے
ناولوں میں اپنے دلی جذبات غم اور رومانوی خیالات کا بڑے
متعصبانہ انداز میں اظہار کیا ھے ۔

ان کی تمام تر تصنیفات میں صرف ایک کتاب ”کملا
کانتردفتر“ ھی ان نقائص سے پاک نظر آتی ھے اور اس لئے
یہی کتاب ان کا شاھکار بننے کے لائق ھے ۔ اس میں انسانی
کیرکٹر کے متعلق ان کی قدامت پرست نظر نے بھی گہرے

نظریات اور عمیق اور واضح تخیلات کا نقشہ پیش کیا ہے۔ انسانی زندگی کی مختلف کمزوریوں کو انھوں نے بڑی ہمدردی، شفقت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھا اور بڑی دلکشی اور خندہ دلی سے پیش کیا ہے۔ اس تحریر میں بنکم کو رحم وکرم کا مجسمہ اور زندگی کو ہنستے کھیلتے گذارنے والا ایک مثالی انسان دیکھا جاسکتا ہے۔

بنکم جس طرح ایک بڑے ادیب تھے اس طرح تخلیق ادب میں بہت ساری خوبیوں کے حامل بھی تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار بنگو درشن کو مرکز بنا کر ادیبوں کی ایک جماعت تیار کرلی تھی۔ شنجیب چندر چٹو پادھیا (۱۸۳۱ تا ۹۳ع) اور رمیش چندر دت (۱۸۴۸ تا ۱۹۰۹ع) اس جماعت کے ممتاز ترین لکھنے والوں میں سے تھے۔ شنجیب چندر چٹو پادھیا بنکم کے بڑے بھائی تھے۔ انہوں نے "مادھبی لتا" اور "کنٹھو مالا" نام کے دو ناول، ایک "ایتیہاش کاھینی" اور ایک "بھرمن کاہینی" (سفرنامہ) تصنیف کی تھی۔ "پالاموٗ" نامی سفرنامہ سنجیب چندر کے زور قلم کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ ایک سفرنامے کو بھی ناول کا روپ دے کر افسانے کی صفائی کے ساتھ ایک منظوم ناول کی طرح باعظمت ادب کے درجے تک پہنچایا جا سکتا ہے اس کا بہترین اور بہت شیریں نمونہ شنجیب چندر کے اس بنگلا سفرنامے میں موجود ہے۔

میش چندر نے چھ ناول لکھے تھے - ان کے نام یہ ہیں - بنگوبی جیتا ،
مادھبی کنکن ، راجپوت جیبن شندھا ، مہا راشٹر و جیبن پرو بھات اور
شنکشار و شماج - قدیم ہندو بھارت کے آدرش کے غم میں بنکم کے
ساتھ رمیش چندر بھی برے دکھی ہیں اور ہر طرح ان کے
ہم ساز نظر آتے ہیں -

—— •:)*:• ——

میر مشرف حسین

(سنہ ۱۸۴۸—۱۹۱۲ع)

انیسویں صدی کے وسط میں جب بنگلا ادب پختگی کے مدارج طے کر رہا تھا اس ادب کے نہایت ممتاز مصنف اور ادیب میر مشرف حسین نے افق بنگال پر جلوہ پاشی کی - ان کی پیدائش گوری ندی کے ساحل پر آباد موضع لاہنی پاڑا ضلع ندیا کے ایک سید گھرانے میں ہوئی تھی - میر مشرف حسین کی "آمار جیبنی' " ہماری زندگی " پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے ادب کے میدان میں قدم رکھا تھا - موجودہ ضلع کشتیا کے موضع کمارکھالی میں " گرام بارتا " اخبار کے مدیر ہری ناتھ مجمدار عرف کنگال ہری ناتھ مشرف حسین کے ادبی گرو تھے - ہری ناتھ مجمدار کے گرام بارتا اور ایشور گپت کے " پرو بھا کر " میں میر مشرف حسین نے لکھتے لکھتے مشق بہم پہنچائی -

میر مشرف حسین سے سابق العہد بنگلا نثر کا کوئی قابل ذکر مسلمان ادیب ہمیں نظر نہیں آتا - انیسویں صدی میں ملک کی سیاسی اور سماجی حالت بدل چکی تھی - مغربی تعلیم اپنے قدم جما چکی تھی اور مغربی علم و ادب کی روشنی میں ہندو

ادیبوں نے بلند پایہ، دلکش اور رسیلا بنگالی ادب تیار کرنا شروع
کر دیا تھا - بنگال کے مسلمانوں نے اُس وقت تک اس حقیقت کا
اعتراف نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس وقت بھی دوبھاشی پوتھی ہی کی
تیاری میں منہمک تھے - ایسے وقت میں سماج اور سیاست کے
تبدیل شدہ حالات کا اعتراف کر کے میر مشرف حسین نے بنگلا ادب کے
میدان میں قدم رکھا - ان کے ہم عصروں کے درمیان ذہنی فراست
میں اگر ان کا کوئی مد مقابل تھا تو صرف بنکم ہی تھے - بنکم نے
نظم ناول اور مضامین لکھے تھے - لیکن مشرف حسین کے فہم و
ذکا نے ان کے علاوہ اور بھی مضامین کو اپنا یا تھا - انھوں نے بیک
وقت نظم، ناول، مضامین، ظرافت، ڈرامے، طنز وغیرہ پر
۳۵ کتابیں تصنیف کیں - بنگالی ہندو سماج کے دو صاحبانِ کردار ممتاز
ادیب بنکم اور ودیا ساگر کے ساتھ ان کا حیرت ناک تقابل ہے -
قدرت نے انھیں بنکم کا آرٹ اور ذہن عطا کیا تھا اور ودیا ساگر کا
ادبی امتیاز - اگرچہ انھوں نے اپنے ما بعد کے مسلمان ادیبوں کے لئے
کوئی شاہ راہ متعین نہیں کی اور نہ ان کے لئے کوئی ہدایت کا
سامان جمع کیا تا ہم ان کی تصنیفات کی واضح روشنی نے ان
نئے ادیبوں کے لئے نئے جوش اور حوصلے کا رنگا رنگ چراغ روشن
کر دیا - انھیں ہم اس دور کے مسلمان ادیبوں کے مورث اعلیٰ یا
جد اکبر کی حیثیت دے سکتے ہیں کیوں کہ انھوں نے خود اعتمادی

اور خدمت ادب کی میراث اُنھیں سے حاصل کی ھے - بنگالی مسلمانوں کی ادبی جد و جہد میں مشرف حسین کی خدمات اولیت کا تاج اپنے سر پر اور فیوض کا ساگر مابعد والوں کیلئے موجزن رکھتی ھیں -

مشرف حسین کی ادبی زندگی میں ایک عجیب و غریب بے تعلقی ارر بے ہمگی نظر آتی ھے - لیکن اس بے ہمگی یا عدم تعلق کا یہ مطلب نہیں ھے کہ وہ آرٹ سے بےگانہ یا سماج سے بے تعلق تھے - ان کے کلام میں ہمیں قنوطیت بھی کہیں نظر نہیں آتی - سماج کے ہمہ گیر احوال سے پوری پوری باخبری اور ان کی باریک بین نگاہ کی حقیقت شناسی ہمیں ان کے " زمیندار درپن" "غازی میا نربستانی" اور " بازی مات وغیرہ کتابوں سے اچھی طرح معلوم ھوتی ھے -

هم وثوق کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی سیاسی یا سماجی تحریک کیساتھ بالواسطہ یا بلا واسطہ انکا کوئی تعلق نہ تھا - لیکن کسی ادارے کیساتھ خاص طورپر تعلق نہ رکھنے کیوجہ سے وہ اپنے ہم عصروں کی خوبیوں اور ادب کی انفرادی خصوصیات سے ناواقف بھی نہ رھے - انھوں نے سارے ادبی محاسن کو صرف قبول ھی نہیں کیا بلکہ اپنے ادبی شاھکاروں میں استعمال بھی کیا - انھیں اپنے ادبی استاد کنگال ھری ناتھ سے غیر معمولی عقیدت تھی -

اسی کیساتھ مسلمان ادیب اور قومی رھنما نواب عبد اللطیف کے
ساتھ بھی عقیدتمندی کی بنا پر انھوں نے اپنے ڈراما " بشنو کماری "
کو ان کی طرف منسوب کیا تھا ۔ نواب عبد اللطیف کی حوصلہ
افزائی اور سید امیر علی وغیرہ ممتاز لوگوں کی اعانت سے
سنہ ۱۸۶۳ع میں کلکتہ میں Muhammadan Literary society
کی اس غرض سے بنیاد رکھی گئی کہ مسلمانوں کی تہذیب اور
ثقافت کو ممتاز اور نمایاں کیا جا سکے ۔ اسی کے پیش نظر یہ مقاصد
بھی تھے کہ مسلمانوں میں ادبی بیداری پیدا کی جائے ۔
اسی کے قریب قریب زمانے میں اور اسی کے اغراض و مقاصد کو
سامنے رکھ کر ایک " بنگیو مسلمان شاھتو شمیتی " کا قیام بھی
عمل میں آیا ۔ لیکن ان ادبی اداروں سے بھی میر مشرف حسین
کی ساری ادبی زندگی غیر متعلق رھی ۔ ایک زمینداری کچہری
کی منیجری کے باعث تنگائل کے مقام " دل دوار نیز فرید پور کے
مقام پدم دی اور کلکتہ یا اپنے وطن کشتیا میں انھوں نے اپنی ساری
زندگی گذار دی ۔ مسائل زندگی کی گوناگوں کشمکش اور اکتا
دینے والے کاموں کے سلسلے میں انھیں جہاں کہیں بھی جانا پڑا
وھاں کاموں کے درمیانی فرصت کے لمحات کو انھوں نے اپنی ادیبانہ
زندگی کے باغ میں ایک کامیاب مالی کیطرح آبیاری کرتے ھی گذارا
ھے ۔ زندگی کی عام ھلچل یا لوگوں کی ھنگامہ پرور ری سے

انھیں کوئی لگاؤ نہ تھا - انھیں اپنی بیوی کلثوم کے ساتھ غیر معمولی محبت تھی اور اس وجہ سے بھی وہ احباب پسند سے زیادہ خویش پسند تھے - کلثوم بی بی نے بھی ان کی ادبی زندگی کو مختلف زاویوں سے ترقی پسند بنانے میں ھمنوائی اور معاونت کی تھی - میر صاحب کی ابتدائی ادبی زندگی میں جس طرح کنگال ھری ناتھ کے اثرات بہت نمایاں نظر آتے ہیں اسی طرح ما بعد کی زندگی میں ان کی رفیقۂ حیات اور محبوبۂ دلنواز کے رنگین اثرات بھی بہت خوش آئند طور پر دخیل دکھائی دیتے ہیں - ان کی بیرونی زندگی اور اندرونی زندگی کی ھم آھنگیوں نے حیرتناک طریقوں پر ان کی کامیابی میں معاونت کی ھے - ھمیں ان کی تصنیفات میں سے " غازی میان ر بستانی' بی بی کلثوم " وغیرہ کتابوں میں اس ھم آھنگی کا پورا نمونہ نظر آتا ھے -

انگریزی حکومت کیساتھ بنگالی مسلمانوں کا عدم تعاون اور وھابی تحریک کے اثرات جب منزل فنا سے قریب ترھو رھے تھے اُسوقت میر مشرف حسین کی پیدائش ھوئی - اسی زمانے یعنی انیسویں صدی کے چھٹیں اور ساتویں عشرے میں تحریک آزادی ھند کے علمبردار مسلمان جب انگریزوں کے ھاتھوں فنا کے گھاٹ اتارے جا رھے تھے اسی زمانے میں میر مشرف حسین میدان

ادب میں گامزن ہوئے - ان کی وفات سنہ ۱۹۱۱ع میں اسوقت
ہوئی جب تقسیم بنگالہ کے خاتمے کا اعلان انگریزوں کی
طرف سے ہوا - تقسیم بنگال کا اعلان اور اسکا تردیدی بیان
دونوں ہی ان کی زندگی میں ہوا - وہابی تحریک کے اثرات
انیسویں صدی کے آخری دو عشروں اور بیسویں صدی کی ابتداء
میں جس حدتک منشی مہر اللہ اور شیخ عبد الرحیم وغیرہ
مسلمان ادیبوں پر پڑے تھے اور بنگال میں اسلامی ادب کے احیاء کا جو
جذبہ ان میں پایا گیا تھا اُس سے ہم میر مشرف حسین کے ادب کو یکسر
خالی پاتے ہیں - اس زمانے کے بنگالی مسلمانوں کے خاص طبقے
میں ردّ تقسیم بنگال کے خلاف جو بیداری پیدا ہوئی تھی اسکا
ظاہر نمونہ ہمیں اسماعیل حسین شیرازی اور منیر الزمان اسلام
آبادی وغیرہ ادیبوں کی تحریرات میں بہت واضح ملتا ہے -
لیکن وہابی تحریک یا رد تقسیم بنگالہ کیطرف میر مشرف
حسین کے ادب میں ہمیں کوئی نشان نہیں ملتا - اس کا سبب
صرف یہ ہے کہ میر مشرف حسین میں خالص ادب کی خدمت
کا جذبہ تھا اور وہ بین الاقوامی ادب اور آرٹ کے دلدادہ تھے - اس
خالص ادبی خدمت کے نظریہ ہی نے انھیں اشخاص اور اداروں سے
غیر متعلق رکھا - یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے بالقصد مسلمانوں
کی خاص تحریکات اور قومی مشاغل سے اپنے آپ کو الگ تھلگ

رکھا ہو اور انھوں نے اسمیں داخل ہوکر حصہ دار بننا قبول نہ کیا ہو۔ اس معاملے میں انکا مسلک اس صدی کے مشہور بنگالی شاعر نذرالاسلام سے بہت زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ اسلامی تواریخ کے جواہر پارے اور حضرت محمد صلعم کے احوالِ زندگی سے مختصر واقعات کو بنگالی مسلمان سماج میں قاضی نذرالاسلام نے جس قدر ھردل عزیز بنا یا اس قدر سارے بنگالی ادب میں کسی اور کے دریعہ یہ ممکن نہ ہوسکا۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ میدان ادب میں اسلامی اصول اور آدرش کی اشاعت کیلئے نہ اُنکا کوئی شاہکار ہمارے سامنے ہے اور نہ وہ خود اس میدان کے شہسوار مانے جاتے ہیں۔ اسلام اور اسلامی تاریخ کے جس رخ نے اُن کے راہوار تخیل کو تیز بنایا ہے انھیں وقائع پر انھوں نے اپنے ادب کی بنیاد رکھی۔ مشرف حسین نے بھی اس مقاصد کے پیش نظر کہ بنگال میں اسلامی عظمت قائم رہے کسی قدر ادبی خدمت کی ہے لیکن اپنے ہمعصر مگر کم سن ساتھی منشی مہر اللہ اور شیخ عبد الرحیم کیطرح تبلیغ اسلام کی سطح پر آکر نمایاں نہ ہوسکے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے مؤخر الذکر منشی مہر اللہ اور شیخ عبد الرحیم کی طرح اسلامی ادب کی تخلیق بھی نہیں کی۔ مذہب اسلام کے محاسن نے ان کی صنعت پسند اور ادب نواز طبیعت کو جسطرح

بہارا تھا اسکا نمونہ ھمیں ان کی " اسلامر چے" (فتم اسلام)
اور " مولود شریف" میں نظر آتا ھے - ان کے عقیدتمند دل
کے جذبات اور نرم و نازک احساسات اگرچہ اسلامی آدرش
سے متاثر ھو کر کہیں کہیں ان کی تحریرات میں پھوٹ پڑے
ھیں تاھم ان کے یہاں اسلامی ادب کی تخلیق کیلئے کسی
عملی اور ارادی جدو جہد کا پتہ نہیں ملتا -

عہد جدید کے مسلمان بنگالی ادیبوں کے آغاز کار سے ھی
مذھبی ادب اور خالص ادب (آزاد ادب) دونوں اقسام کے نمونے
ھمیں ان کی تصنیفات میں نظر آتے ھیں - خالص مذھبی ادب ابتداءً
" شودھاکر" جماعت کے ھاتھوں وجود میں آیا تھا - لیکن اس
جماعت کے وجود سے بہت پہلے مشرف حسین نے اپنی الگ
راہ گذار بنائی تھی - انھوں نے جس ترقی پسند مذھبی ادب
کی ابتدا کی تھی وھی ادب کیقباد، مزمل حق، قاضی نذر
الاسلام، قاضی عبد الودود، سید ابو الحسین، قاضی مطہر
حسین، ایس واجد علی اور ھمایوں کبیر وغیرہ آنجہانی اور
این جہانی ادیبوں اور ان کے متبعین میں آج بھی جاری
و ساری ھے -

میر مشرف حسین کی کم و بیش ۳۵ چھوٹی بڑی کتابیں
دستیاب ھوئی ھیں :—

۱ ـ ناول :—

(۱) رتنو بتی (۲ ـ ستمبر تعداد صفحات ۶۱ ـ سنه ۱۸۶۹ع

(۲) بشاد شندھو (بحر غم ' محرم کے متعلق ـ سنه ۱۸۸۵ع) ـ
صفحات ۲۰۴) یه کتاب تین ابواب میں منقسم ہے ـ
الف ـ "محرم پربـو' سنـه ۱۸۸۴ع ـ ' اُدّھار پرو"
سنه ۱۸۸۷ع ـ ج ـ " یزید بَدھ پربـو" سنه ۱۸۹۰ع ـ

(۳) " اُداشین پتھیکر منیر کتھا " (غمگین مسافر کے دل کی بات) ـ
سنه ۱۸۹۱ع صفحات ۱۹۸ ـ

(۴) " غازی میانر بستانی " (ظریفانه تصنیف) سده ۱۸۹۹ع
تعداد صفحات حصۂ اول ۴۰۰ ـ

(۵) " اِسلامِر چے " (ناول نامضامین) سنه ۱۹۰۸ع ـ تعـداد
صفحات ۳۰۲ ـ

(۶) " رضیه خاتون "

(۷) ' تہمینه '

(۸) " باندھا کھا تا "

(۹) " نیتی کی ابونتی " (ترقی یا تنزل)

۲ ـ ڈرامے :—

(۱) " بشنتو کماری ناٹک " سنه ۱۸۷۳ع تعداد صفحات ۱۲۷ ـ

(۲) " زمیندار درپن " ـ سنه ۱۸۷۳ع تعداد صفحات ۷۲ ـ

(۳) " بےھولا گیتابھی نوے " (جا ترا) سنہ ۱۸۸۹ع - تعداد صفحات ۱۳۸ -

(۴) " تا لا ابھی نوے " - (جاترا) ۱۸۹۹ع -

- طنز :—

(۱) " ایر اوپائے کی " (اس کی تدبیر کیا ہے) ۱۸۷۶ع -

(۲) " بھائی بھائی ایئی تو چائی " - سنہ ۱۸۹۹ع -

(۳) " فاس کاغذ " - سنہ ۱۸۹۹ع -

(۴) " اےکی " - سنہ ۱۸۹۹ع -

نوٹ :—

غازی میانر بستانی کے آخری صفحے پر جلد ثانی میں کئی اشتہارات سنہ ۱۳۰۶ بنگلہ مطابق سنہ ۱۸۹۹ع چھپے ہوئے موجود ہیں - بد قسمتی سے میں ذاتی طور پر ان کتابوں کو نہ دیکھ سکا - غالباً یہ بھی بعض طنزیہ کتاب ہی کے متعلق ہیں -

۴ - نظمیں :—

(۱) " گورائی برج اتھوبا گوری شیتو " - سنہ ۱۸۷۳ع تعداد صفحات ۱۸ -

(۲) " شنگیت لہری " - حصہ اول سنہ ۱۸۸۷ع -

(۳) " اونچو ناری پدّو " - سنہ ۱۸۹۹ع -

(۴) " پریم پاری جات " -

(۵) " بی بی خدیجه ایر بیـباهو" - سنه ۱۹۰۵ع - تعـداد صفحات ۱۲۷ -

(۶) "حضرت عمر یر (رض) دهرمو جیبن لابه" - (حضرت عمر رض کا قبول اسلام) - صفحات ۴۲ - سنه ۱۹۰۵ع -

(۷) "حضرت حمزار دهرمو جیبن لابه" - سنه ۱۹۰۵ع - صفحات ۲۲-

(۸) "حضرت بلالیر جیبنی" (سوانح حضرت بلال رض) - سنه۱۹۰۵ع صفحات ۴۲ -

(۹) " مدینه گوَرب " - سنه ۱۹۰۶ع - صفحات ۱۲۰ -

(۱۰) " مسلم بیرتّو " - (مسلمانوں کی بہادری - سنه ۱۹۰۷ع صفحات ۱۹۶) -

(۱۱) " بازی مات " - (سنه ۱۹۰۸ع صفحات ۱۳۱) -

(۱۲) " مولود شریف " - (نظم و نثر) صفحات ۲۰۸ -

۱ - مقالات :—

(۱) " گو جیبن " - سنه ۱۸۸۹ع -

(۲) " خطبـه " -

(۳) " مسلما نیر بنـگلا شیکها " - حصهٔ اول سنهٔ ۱۹۰۳ع - حصه دوم سنه ۱۹۰۸ع -

۲ - درسی کتب :—

(۱) " اسـار جیـبو نی " (آپ بیتی - سنـه ۱۹۰۸ع—۱۹۱۰ع صفحات ۳۳۹) -

(۲) " حضرت یوسف " - سنہ ۱۹۰۸ ع -

(۳) " بی بی کلثـوم " یا " اسار جیبو نر جیبونی " (ہماری زندگی کی آپ بیتی سنہ ۱۹۱۰ع) -

کے عـلاوہ انھوں نے ایک اخبار عزیـز الفہار کی ادارت بھی

---:•*•:---

بشاد شندھو (بحرِ غم)

محرم پربو سنه ۱۸۸۵ع — اُدّھار پربو سنه ۱۸۸۷ع

یزید بدھ پربو سنه ۱۸۹۰ع

محرم کے روح فرسا تاریخی حالات کی تبعیت منظوم و منثور ایک قومی ناول کا نہایت اعلیٰ نمونہ ھے "بشاد شندھو" میں ملتا ھے - اسے پڑھنے کے بعد یہ سوال پیدا ھوتا ھے کہ آیا یہ کتاب تاریخی حیثیت کی ھے یا اس کی حیثیت محض ایک ادبی ناول کی ھے -

بشاد شندھو خالص تاریخی ناول نہیں ھے - ھم اسے سوانح کا درجہ بھی نہیں دے سکتے - اسی طرح ھم اسے ایک (Organic Plot) بھی نہیں کہہ سکتے - یہ تاریخ، ناول، مذھبی تصنیف، اور ڈرامے وغیرہ کا ایک معجون مرکب مجموعہ ھے - اس میں افسانوی، تخئیلی، رومانوی اور ڈرامائی ادب کا ایک نادر اختلاط ھے - اس کی تنقید اس لئے بھی دشوار تر ھے کہ اس پر کسی ایک صنف سخن کا اطلاق نہیں ھو سکتا -

اندازہ یہ ھوتا ھے کہ میر مشرف حسین نے دانستہ طور پر اسے ایک ناول کی حیثیت دینے کا ارادہ کیا تھا - یہ بات نہیں

کہی جاسکتی کہ میر مشرف حسین کربلا کے تاریخی واقعات سے لا علم تھے تاہم لکھتے وقت انھوں نے تاریخی واقعات کی تبعیت کا التزام نہیں کیا۔ اس سلسلے میں حنیفہ اور زاهده کے کردار بھی قابل ذکر هیں۔ بعض کتابوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی (رض) کے ایک فرزند کا نام حنیفہ بھی تھا لیکن میر صاحب نے حنیفہ کی جو خیالی تصویر کھڑی کی ہے اسکا تاریخ میں کہیں بھی نام و نشان نہیں ہے۔ زاهده کے متعلق بھی انھوں نے جس طریقے پر اپنے بحر تخیل کی روانی دکھائی ہے۔ اس کا تاریخ میں کوئی پتہ نہیں ملتا۔ هم تاریخ میں جس امام حسین (رض) کا کردار مذکور پاتے هیں اس کا بشاد شند هو میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔ اس طرح تجزیہ کرنے سے یہ بات ثابت هو جاتی ہے کہ میر مشرف حسین کی یہ تصنیف کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتی۔

اگر هم بشاد شند هو کو ناول کی حیثیت دیں تو یہ امر تحقیق طلب ہے کہ اسے تاریخی ناول کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کتاب کی تصنیف میں میر صاحب نے جس طرح تاریخ کی تبعیت سے احتراز کیا ہے اُس سے زیادہ انھوں نے پوتھی ادب کے افسانوں اور ان کی گوناگوں خصوصیات کی پیروی کی ہے۔ سانحۂ کربلا کے متعلق میر صاحب نے مقتل حسین''

جنگ نامہ اور شہید کربلا وغیرہ پوتھیوں کا طرز اختیار کیا ہے - ان پوتھیوں میں خصوصیت کے ساتھ کربلا کے روح فرسا واقعات کو زیادہ غم انگیز بنانے کی کوشش کی گئی ہے - انہوں نے بھی کربلا کے متعلق پوتھیوں ھی پر زیادہ نظر رکھی ہے - انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے کربلا کے غم افزا واقعات سے اپنے نرم و نازک دل میں جو ٹیس محسوس کی تھی اسے زیادہ مؤثر انداز میں اس کتاب کے ذریعہ مسلمانوں کے دلوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے - انھوں نے رنج و غم کے ساگر سے آبدار موتی نکال کر غمگین دلوں کے سامنے ایک ایسی مالا پیش کی ہے جسکی آب تاب سے ہر زخمی دل منور ھوجاتا ہے - یہی سبب ہے کہ انھوں نے کربلا کے جزوی واقعات کو بھی تفصیلی رنگ میں پیش کرکے اسے ایک رومانوی المیہ کی صورت میں ظاہر کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو ایک تاریخی ناول کی حیثیت حاصل نہ ہوسکی -

بشاد شندھو کے اہم کردار تاریخ ھی سے لئے گئے ھیں - غیر اہم کردار کے اکثر اجزاء کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ یا تو پوتھی ادب سے ماخوذ ھیں یا مصنف کے اپنے ذہن کی تخلیق ھیں - تاریخی ناولوں کا یہ ایک مسلم اصول

ے کہ تاریخ سے باہر کے کردار کا تذکرہ کرتے وقت ان کے طرز
انداز کی ہم آہنگی پر نظر رکھتے ہوئے تخئیلی کردار کی
تخلیق کی جاتی ہے - اگر ایسانہ کیا جائے تو اس کی تاریخی
صداقت مشکوک ہو جائے گی - اہم کرداروں میں جہاں تک
تاریخ واقعات کی ترتیب میں رہنمائی کرتی ہے وہاں تک
تاریخی ناول کے مصنف کو صرف رنگ آمیزی کی ضرورت
پیش آتی ہے مگر جہاں خلا پیدا ہوجاتا ہے وہاں ناول کا
انداز جگہ لے کر خلا کو پُر کر دیتا ہے - جنگ، سیاسی جوڑ
توڑ اور حکومت کے سکون بخش تاریخی احوال اہم کردار کی
جگہ لیتے ہیں اور انہیں کے بیچ بیچ میں انسانی زندگی
کی دلچسپ کہانیاں رنگ آمیزی کر کے انہیں ناول کا روپ
دے دیتی ہیں - مصنف کا زور قلم تاریخی ناول کو تاریخ
سے متعلق رکھ کر بھی تخئیل اور رومانس کا جامہ پہنا کر
ہمارے سامنے اس طرح کھڑا کرتا ہے کہ واقعات کا تسلسل پورے
ناول کو ایک واقعی حقیقت کا درجہ دے دیتا ہے - مصنف
کی باریک بینی اور واقعات میں رنگینی پیدا کرنا ہی اس
کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے ۔

حسین (رض) اور یزید کا کردار سامنے رکھ کر تاریخ سے باہر
کے تخئیلی معتقدات کی تخلیق سے بشاد شندھو معمور ہے ۔

43

مذہب اسلام کی تاریخ جس طرح متعین ہے، اسلام کی مذہبی کتاب قرآن کے تمام حروف و ارکان جس طرح غیر معروف ہیں، یہاں تک کہ حضرت نبی کریم صلعم کے اقوال و افعال تک دلائل کی روشنی میں مابعد کی ترتیب ہوتے ہوئے بھی حرف بحرف حقیقت پر مبنی اور مسلمانوں کے نزدیک ہمیشہ کے واسطے واجب الاطاعت ہیں اور ان میں جس طرح عقل و تخیل کو مداخلت کی اجازت نہیں ہے اسی طرح مسلمانوں کے مذہب اور تاریخ کو یا خلفائے راشدین کے زمانے کے حیرتناک اور شجاعت سے بھرے ہوئے کارناموں کو تخیل کی رنگ آمیزی سے آلودہ کرکے نظم کے روپ میں جلوہ گر کرنا عالم اسلام کے نزدیک قابل حوصلہ افزائی کام نہیں ہے۔ کربلا کے اس غم افزا تاریخی واقعات کو مرکز بناکر مسلمانوں کے دلوں میں غم کی ایک ایسی دنیا پیدا ہوچکی ہے کہ اس پر ایک ذراسی زخمہ زنی بڑے سے بڑے مصنف کی دلکش تحریر کو خاک میں بھی ملا سکتی ہے اور اسی طرح اس کی عظیم عکاسی چار چاند لگا دینے کیلئے بھی کافی ہے۔

یزید کے ساتھ حضرت امام حسین رضؓ کی تاریخی مخالفت عقید تمندی کے علاوہ سیاسی رنگ بھی رکھتی ہے۔ خاندان نبوت کے

واجب الاحترام فرزند حضرت امام حسین رضہ کسی حیثیت سے بھی حضرت معاویہ رضہ کے نا خلف اور بد کردار بیٹے یزید کو خلیفہ ماننے کیلئے تیار نہ ہوئے - حضرت علی رضہ کے دونوں فرزند حضرت امام حسن رضہ اور امام حسین رضہ اگر یزید کی خلافت تسلیم نہ کرتے تو نہ اسکی حکومت محفوظ رہ سکتی تھی اور نہ وہ خلافت کا جائز حقدار قرار دیا جا سکتا تھا - یہیں سے مخالفت کی ابتدا ہوئی اور اسی وجہ سے یزید کا غم و غصہ خاندان رسالت پر دن بدن بڑھتا گیا اور آخر کار کربلا کے میدان میں حضرت امام حسین رضہ کو اسی کے نتائج کا شکار ہونا پڑا -

لیکن میر صاحب نے تمام سوانح کربلا کے پس منظر میں بنیادی سبب عشق و محبت کو قرار دیا ہے - حضرت زینب رضہ (خواہر امام حسین رضہ) کے شہرۂ آفاق حسن سے مسحور ہوکر یزید نے حضرت امام حسین رضہ کے خاندان کو ختم کرنے پر کمر باندھ لی اور اس کے پس منظر میں صرف حریفانہ اور رقیبانہ جذبہ کارفرما رہا - میدان کربلا میں جو آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی اور جس کے نتیجے میں بےشمار بہادروں کا خون بہایا گیا اُس کے تذکرے کو بشاد شندھو میں زینب کے حسن کے ذریعہ زیادہ رنگین بنایا گیا ہے - ایک خود ساختہ تخیل اور ذاتی جذبات کی رو میں بار بار میر مشرف حسین کو تذکرۂ واقعات نے تاریخی حقائق سے

بہت دور پھینک دیا ہے - ایک نوخیز تصور حیات کی تموج خیزیوں کے دھارے میں بہہ کر سوکھے اور غیر دلچسپ واقعات کی خشکیوں کو بھی میر صاحب نے زور تخیل سے بڑی حد تک دلکشی بخش دی ہے - اس عظیم جنگ کے اسباب کی تلاش کرتے ہوئے رومانوی ناول کے کردار کی تخلیق کرنے کے سلسلے میں ہر ہر قدم پر میر صاحب نے جیتے جاگتے انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے - کندو بھوانند، پرتاب شیبولینی، شری سیتارام وغیرہ کے ساتھ معاصرانہ تعلقات کی بنا پر انھوں نے سب سے زیادہ زور کلام کی روانی اور عشق و محبت کی جنوں خیزیوں میں دکھایا ہے - میر صاحب نے اپنی کتاب میں یزید کا بھی ایک شاعرانہ تخئیلی نقشہ پیش کیا ہے - زندگی کی حقیقت سے پوری طرح واقفیت نے اس تاریخی واقعہ میں تخییل کی رنگ آمیزی سے ایک عجیب دلکشی پیدا کر دی ہے - میر صاحب کا تخیل رومانس کے شاعرانہ جذبات میں اسطرح بہہ گیا ہے کہ انھوں نے حقیقت پر مجاز کا رنگ غالب کر دیا ہے - زندگی کے غیر معمولی واقعات اور جذبات نگاری کی طرف ان کی نظر بنکم کی طرح بہت عمیق ہے - اسی لئے ان کا فرضی یزید اپنے کردار میں مائکل کا راون اور ملٹن کے شیطان (Satan) جیسا طاقتور ہے - اُن کی مفروضہ زینب رض واقعی ہوں یا غیر واقعی

مہر تخییل کی نقاشی نے انہیں تعجب خیز طریقے پر نمایاں اور
ان کے حسن کو اثر اندازی میں بنکم کی مفروضہ ملکہائے حسن
سے لیجا کر ملا دیا ہے - ان حالات میں بشاد شندھو کو ایک ایسا
کامیاب رومانوی ناول تسلیم کرنا پڑتا ہے جس نے برائے نام
تاریخ کے سائے میں پناہ لی ہے -

بشاد شندھو ایک مخلوط قومی ناول ہے - حضرت امام حسن رض
کی وفات تک جس انسانیت ، واقعیت اور صنائع کی نشانیاں
اس میں نظر آتی ہیں ان کا ما بعد کے حالات میں پتہ نہیں ملتا -
اس کے بعد اس کتاب میں ناول کی خصوصیات زیادہ نمایاں نہیں ہیں -
واقعات کا تسلسل، کردار کی تخلیق اور جذبات کی روانی مذھبیت
سے متأثر ہوکر رہ گئی ہے - اسی لئے اس کتاب کی ناولیت
حضرت امام حسن رض کی وفات کے حالات تک ہی پہنچ کر ختم
ہو گئی ہے - اسی کے ساتھ ساتھ یزید اور حضرت معاویہ رض وغیرہ
کے ایسے کردار جو واقعات کی تکمیل اور اغراض تصنیف کو پورا
کرنے کیلئے بڑھائے گئے ہیں ختم ہو جاتے ہیں - ما بعد کے حصے
میں قصہ نسبتاً بےجان اور صرف تطویل لا طائل ہی معلوم ہوتا ہے -

دوسرے اور تیسرے حصے یعنی "اُدّھار' اور "یزید بدھ پربو" کے
ابتدائی حصے میں بہت زیادہ تسلسل نہیں ہے - مہر صاحب کی
فطری کمزوری یہ ہے کہ وہ غیر ضروری تطویل میں تسلسل پر

قابو نہیں رکھتے - ان دونوں حصوں میں ان کا یہ نقص بہت نمایاں ہے - ان دونوں حصوں میں کردار اور واقعات کی تبعیت میں اُنھوں نے اس ناول کے واقعاتی پہلو کو حسب دستور بہت زیادہ مربوط رکھنے کی پوری طرح کوشش نہیں کی ہے - ان کی اس طرح کی کمزوریوں کی مثالیں اس کتاب میں بہت وافر پائی جاتی ہیں -

ادب اور آرٹ کی حیثیت سے بشاد شندھو نے بنگالی ادب میں ایک جدید اور بے مثل تخلیق کی حیثیت حاصل کی ہے - مصنف نے ذاتی تأثرات (Personal reflection) کے اظہار کی وجہ سے جس طرح بشاد شندھو کی عظمت بڑھا دی ہے اسی طرح اس ناول میں بہت ساری اور خوبیاں بھی پیدا کی ہیں - بعض بعض جگہ میر صاحب اپنی ان کوششوں میں حد اعتدال سے تجاوز بھی کر گئے ہیں - مذکورۂ بالا خصوصیات کی بناہی پر ہم بشاد شندھو کو بنگلا ادب میں غیر معمولی حیثیت دیتے ہیں -

میر صاحب کی بشاد شندھو میں بنگلا نثر ایسی مرصع ' مقفیٰ اور ساتھ ہی ساتھ اس درجہ رواں اور سلیس ہے کہ پڑھنے والا اس میں محو ہوکر رہ جاتا ہے - اگر اس کتاب کا توضیحی طور پر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کتاب صرف ایک غم کا سمندر ہی نہیں ہے بلکہ نافع خلائق اصول پر مظلوم صداقت اور مجبور انسانیت کی حقیقتیں بیان کر کے ایک ایسی عظمت کی حامل

اور اس درجہ کشش کا باعث بن گئی ہے کہ بنگلا ادب میں اُسے ایک کلاسک ادب کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے - اس کی جاندار زبان اور بے پایاں روانی نے میر صاحب کے ادب کو ایک خصوصی طرز کا مالک بنا دیا ہے -

زمیندار درپن

میر مشرف حسین کے تمام ڈراموں میں " زمیندار درپن " ہی ان کا شاہکار ہے - انھوں نے اس ڈرامے میں اپنے دور کے منظوم سماج پر زمینداروں کے مظالم کی داستان کی بڑے ہی موثرانداز میں نقشہ کشی کی ہے - دولت کی محبت اور رشوت کی حرص میں ہمارے ملک کا ایک معتد بہ طبقہ کس طرح بد اخلاقیوں کا شکار ہوا ہے اس کا ایک کامیاب نقشہ انھوں نے اپنے اس درپن (آئینہ) میں کھینچا ہے - جج ، مجسٹریٹ ، پولیس انسپکٹر ، وکیل مختار ، بیرسٹر ، ڈاکٹر اور ڈیتو مُلّا نیز ہری داس کے کیریکٹر کو انھوں نے بڑے واضح طور پر پیش کیا ہے - انسانی کیریکٹر کے متعلق ان کی نگاہ بہت دوررس اور ان کا تخیل بہت واضح ہے - اس ڈرامے کے نام سے یہ منشرح ہوتا ہے کہ "دین بندھو متر" کے ڈراما "نیل درپن" کا اس پر کچھ اثر پڑا ہے - ان دونوں ڈراموں کا بنیادی موضوع ایک ہی ہے - تا ہم ان دونوں میں نیل کے مالکوں اور زمینداروں کے

مظالم ہی کو بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس دور کے کسانوں اور عوام الناس کی عام بیداری اور مظالم کے خلاف عام بیزاری کی نقاشی میں انہیں ایک نمایاں ادبی حیثیت حاصل ہے ۔

اُداشین پتھیکیدر منِر کتھا

(مطبوعہ ۲۹ - اگست سنہ ۱۸۹۰ع تعداد صفحات ۱۹۸ - سائز آٹھ صفحہ والا)

میر مشرف حسین کی اس کتاب کے متعلق اخبار "بھارتی" نے اپنی اشاعت ماہ بیساکھ سنہ ۱۲۹۸ب کے شمارے میں لکھا ہے :—

"کتاب زیر تبصرہ واقعی طور پر ایک ناول نہیں ہے ۔ یہ ناول کے روپ میں نیل والوں کے مظالم سے معمور ایک داستان ہے اگرچہ مظالم کی تشریح بڑی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے تاہم قصوں کی تقسیم سے اس قدر مہارت کا اظہار نہیں ہوتا" ۔

معلوم ہوا ہے کہ کلکتہ کے محلہ باغ بازار کی "ریڈنگ لائبریری" میں اس کتاب کی ایک نقل اب بھی موجود ہے ۔

بسنتو کماری ناٹک

(طبع اول سنہ ۱۸۷۳ع، طبع ثانی سنہ ۱۲۹۴ب (سنہ ۱۸۸۷ع) قیمت آٹھ آنہ)

میر مشرف حسین نے اس کتاب کا نواب عبد الطیف خان بہادر کے نام انتساب کیا تھا ۔ اس ڈرامے میں سنسکرت کے ڈراموں کے کافی

اثرات پائے جاتے ھیں - مناظر اور تخیلات میں اس کے اثرات نمایاں ہیں - اِندر پور کے بوڑھے راجا بریندر سنگھ اور ان کی نوجوان رفیقۂ حیات کے واقعات نے اس قصے کو اور زیادہ رنگین بنا دیا ھے -

غازی میانر بستانی

میر مشرف حسین کی مصنفہ " غازی میانر بستانی " دو حصوں میں مکمل ہوئی ھے - مضمون متعلق کا دس آنہ پہلے حصے میں اور چھ آنہ دوسرے حصے میں پایا جاتا ھے - ان دو حصوں کے مجموعہ ابواب چوبیس ھیں - جن میں بیس ابواب پہلے حصے میں ہیں اور باقی دوسرے حصے میں - حصۂ اول چارسو صفحات پر پھیلا ھوا ھے - دوسرے حصے میں چار ابواب کے علاوہ غازی میاں کا تعارف اور بستانی حاصل کرنے کا تذکرہ نیز سلام وغیرہ مذکور ھے - سب سے آخر میں غازی میاں کی رخصت کا حال لکھا ھوا ھے -

" غازی میانر بستانی " کے جملہ حقوق طباعت کی ملکیت " آداسین پتھیک " ساکن نمبر ۴ - ولیمس لین کلکتہ کو حاصل تھے اور یہ کتاب شری امرت لال گھوش کے مطبع سے سنہ ۱۳۰۶ ب مطابق سنہ ۱۸۹۹ء میں طبع ہوئی تھی - کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپیہ اور خرچہ ڈاک تین آنہ مرقوم ھے - ناشر ایم - یو - احمد ساکن کشٹیا تھے -

اگرچہ غازی میاںر بستانی کی طباعت سنہ ۱۳۰۶ ب مطابق سنہ ۱۸۹۹ع میں ہوئی تھی لیکن، اس کی تصنیف ۲- اگھن سنہ ۱۳۰۳ ب کے پہلے ھی مکمل ھوچکی تھی۔

ناشر جناب معین الدین احمد اپنے اشتہار میں اس طرح رقم طراز ھیں :— یہ دن نہیں رہے گا - اس قدیم "مہا کابیو" (منظوم داستان) کے نتائج کسی وقت ظاھر ھوں گے - لوگ آزادی کے ساتھ یہ کہیں گے کہ غازی میاں نے زمانۂ ماسبق میں ایک بہت بڑا آئینہ ھمارے لئے باقی چھوڑا ھے - ایک عجیب و غریب بات یہ بھی ھے کہ اس بستانی کی باتوں کو سننے والے کوئی نہ کوئی بات خود اپنی حالت کے مطابق ضرور ھی پائیں گے اور یہ اعتراف کرنے پر مجبور ھوں گے کہ شاید ھمارے ھی حالات کو غازی میاں نے اپنے نام سے مرتب کیا ھے"۔

اس مطبوعہ اشتہار میں ھمیں یہ بھی نظر آتا ھے کہ:— "موجودہ زمانے میں سماج کا ایک بہت بڑا نقش ناقدری کی وجہ سے نہ چھپ سکے یہ بات میرے لئے بڑی تکلیف دہ تھی اس لئے عوام کی نگاہ کرم اور قدر دانی پر بھروسہ کرکے میں نے یہ بوجھ اپنے سرلیا اور ولی اللہ کے مطبوعہ حصوں کو خود حلیہ طبع سے آراستہ کیا"۔ (میر پور- پندرہ ماہ آسن

سنہ ۱۳۰۶ ب E. B. S. R. سری مومن الدین احمد) -

انیسویں صدی کے نصف آخر میں بنگال کے ممتاز زمیندار گھرانوں کے محلوں میں جو مظالم اور نامناسب حرکات اُس زمانے کی خاندانی خواتین "سہاگن اور بیوہ" میں رہا اور نمائش کے ذریعہ "سوسائٹی گرل" بننے کی چاٹ میں حدود سے تجاوز کرتی رہی ہیں اسے بیگم پیرزار النساء کی صورت میں، اور زمینداری کے کام میں بیوہ زمیندار خواتین کے کار پرداز جس قسم کی جعل سازی اور بد معاملگی کرتے ہیں اسے "سب لوٹ علی" کی شکل میں پیش کیا گیا ہے - اس کتاب میں ساز باز، عدالتی معاملات، اور حاکموں اور وکیلوں کی بڑوں کے معاملے میں جنبہ داری اور چھوٹوں کے معاملے میں بے انصافی کا نمونہ پیش کیا گیا ہے - عیش و آرام میں رہنے والے دوست کی بیوہ بھوی پر وقت پڑنے کے بعد بے وفائی اور ظلم نیز دوست کی نیک طبعی کی بنا پر اس کے منافع پر ڈاکہ زنی کرنا (بھیڑا کاند کے ساتھ اُس کے ہندو دوستوں کا برتاؤ صفحہ ۳۶۸) - پولیس، جیل کا عملہ، جیل کے ڈاکٹر اور داروغہ وغیرہ کے درمیان حصول دولت اور لوگوں کی آپس میں بے اعتمادی اور ان کی باھمی چال بازی جس کا نمونہ صفحہ ۳۸۶، میں بھیڑا کاند نے ان الفاظ میں دیا ہے "میں نہیں لکھوں گا -

میں کسی کا اعتبار نہیں کرتا"۔ یہی سب باتیں "غازی میانر بستانی" میں مذکور ہیں - میر مشرف حسین کے سامنے ایک غیر اصلاح پذیر قوم کا نقشہ ہے جس کی دنیا میں بسنے والے بے اعتمادی، جھوٹ اور فریب وغیرہ کا شکار ہیں۔ انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب پر قنوطیت (Pessimism) کا غلبہ ہے - محبت، شفقت، ملاطفت احترام وغیرہ محاسن جو انسان کی زندگی کو محاسن اخلاق سے معمور کرکے خوشگوار بنا دیتے ہیں اور دوسروں کی توجہ کو اس کی جانب مبذول کراتے ہیں ان کی غازی میانر بستانی کی مفروضہ دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے -

بستانی کی بیان کی ہوئی زندگی مشرف حسین کے نزدیک مکر و فریب اور دھوکے سے معمور اور خوف و خطرے سے بھرپور ہے اُس زمانے کے بنگال کی معموم سماجی زندگی بڑی ہی اندوہ ناک اور پریشانیوں سے بھری ہوئی تھی جسے میر صاحب نے اپنے ہنر اور صنعت سے بڑی کامیابی کے ساتھ بیان کیا ہے - بستانی میں سماجی اور انفرادی زندگی کا ایک حیرت ناک اور عظیم الشان نقشہ ہی ان کے تخیل کا آئینہ دار ہے - " اراجب پور" ، "نچھّر پور" ، "اَلّادگنج" "خام خیالی گنج" ، "جمت دار گرام" ، "پا تال گرام" ،

ھنگٹی چورا گرام "، اور "گل کُھ نگر" وغیرہ ان کی بیان
کی ہوئی دنیا میں ایک ایک خصوصیت کی حامل جگہیں
ہیں - وہاں کے بسنے والے اعزہ واقارب باھمی فسادات میں مبتلا
ہیں - خود غرضیوں کے امراض نے وہاں کے رہنے والے انسانوں
کو اندھا اور حریص بنا رکھا ہے - بھائی بھائی میں نفاق ہے -
بہن ' بہن میں ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے جنگ و جدل کا
بازار گرم ہے - وہاں کے باشندے اعلیٰ متوسط طبقے سے تعلق
رکھتے ہیں - جو غریبوں کا خون چوس کر اپنی دولت مندی کا
نشان اونچا رکھنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں -
عورتوں کے حسن اور جوانی سے وہاں کے عیش پسند اپنی
تعیش گاھوں کو آباد اور اپنی رنگ رلیوں بھری محفلوں کو
سجائے رہتے ہیں - ہر ایک دوسرے کو اس کی ملکیت سے
محروم کرنے اور خود اس کی جائداد پر قابض ہونے کے لئے
جعل ' فریب اور مقدمہ بازیوں میں منہمک ہے - عملۂ
عدالت ' وکلاء ' حکام ' ملعون پولیس اور برقندازوں کی
جماعت موقعہ کی تاک میں لگی ہوئی رہتی ہے اور
دام پر اپنے پنجے تیز کیا کرتی ہے - ان اغراض پسند ' کور
باطن اور انسان نما حیوانوں کو مشرف حسین نے اپنے قلم کی
جنبش سے جو نام عطا کئے ہیں ان ناموں ہی سے پڑھنے والوں

کو ان کے کیرکٹر اور چال چلن کا حال اچھی طرح معلوم هوجاتا ہے -

ان کیرکٹروں میں سے بعض کے نمونے ملاحظه هوں :—"شونام دهنو" (اپنے منھ میاں مٹھو) "سب لوٹ چودهری" سب لوٹ کے چودهری بنا هوا) - "اراجک پوریر زمیندار" (باغی پور کا زمیندار) - اس کا مصاحب "کالو رائے"، "کتا لاهری" : "الکترا سنیال" (الکترے جیسا سرپنچ) - "کتا پیشکار"، "گهر بهانگا سنیال" (خانه برباد سرپنچ) - "اراجک پور" کے قریب ہی "جمات دار" گاؤں کی رهنے والی دولت مند بیوہ زمیندار "مونی بی بی" اور "سونا بی بی" وغیرہ موتی اور سونے کی وجه سے جس طرح دنیا میں عزت کی جنگ هوتی رهی ہے اس طرح وہاں کی دونوں بہنیں بھی اپنی زمینداری زعم میں ایک دوسرے کی دائمی بربادی کے لئے موت و حیات کی جنگ میں مشغول هیں - سونا بی بی کے فرزند کا نام "چے دهاک" ہے اور مونی بی بی کی لڑکی کا نام "سیڑیا خاتون" - مونی بی بی اپنی لڑکی کی "چے دهاک" سے شادی کرکے سونا بی بی کی ساری زمینداری مع اس کے فرزند کے اپنے قبضے میں لانا چاہتی هیں - ان دونوں کا وطن جمات دار گاؤں میں ہے - یه گاؤں بھی اپنے نام کی طرح عجیب و غریب خصوصیت رکھتا ہے - سونا بی بی

اعزہ و اقارب دغا باز، احمق، فریبی اور مکار ہیں - جس گاؤں
میں تھانا ہے اس کا نام "ہات پاتا" (دست دراز) ہے - اس
تھانے کے پولیس انسپکٹر کا نام "تیس مار خاں" ہے - سونی بی بی کے
طرفدار "گھر بھانگا سنیال"، "ما تھا پا گلا رائے" "مختار"،
"دھین تا دھینا بابو"، "دھا ما دھرا سرکار"، "دھڑی باز ٹھاکر"
ور "اونو پانجو رے گھوش" ہیں -

ان سب نے ملکر حس ظلم، عیاری، چال بازی اور جعل
سازی کا جال تیار کیا ہے - ان میں سے ہر ایک کی تفصیل ایک
راز داں اور واقف حال تماشہ بیں کی حیثیت سے مشرف حسین نے
پنی اس کتاب میں بیان ہے کی اس کتاب میں ہم میر صاحب کی
س حیرت ناک قوت تحریر کا نمونہ دیکھتے ہیں جس کے ذریعہ سے
ان کے خصائل کو سمجھنے اور اس کی نقاشی کرنے کا اظہار ہوتا ہے -
ان کی باریک بیں نگاہ نے ہر کردار کو ظرافت اور طنز کے روپ میں
اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ ان کی تحریر کا ہر ہر نقطہ مبینہ
اشخاص کے کیرکٹر اور سماجی زندگی کی گونا گوں حیثیتوں پر
پوری پوری روشنی ڈالتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سماج کے
داغدار جسم کا کوئی خال و خط اور اسے بد صورت بنانے والا کوئی
نقش بھی میر مشرف حسین کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے -

بنکم نے اپنی عمر کے آخر دور میں "کملا کانتر دفتر" لکھا تھا -

تمام عمرکی کوشش اور زندگی بھرکے تجربے کے بعد انھوں نے انسانی کمزوریوں اور سماجی بد حالیوں کے جو حالات معلوم کئے تو انھی کو دور کرنے کیلئے انھوں نے تیز و تند لہجوں میں "ڈی کوئنس" کی The confession of An English کی متابعت میں پاگل کی طرح opium-eater افیونی بن کر ظاھر کیا ھے - مروت اور آنکھوں کی شرم کے باعث جو باتیں ھوشیاری میں نہیں کہی جاسکتیں انھیں تلخ و ناخوشگوار باتوں کو ھم بذکم کی زبان سے محض اس لئے پاگل کے روپ اور ظرافت و طنز کے انداز میں سنتے ھیں کہ لوگوں کی اصلاح ھو سکے - ایسا معلوم ھوتا ھے کہ وہ بڑی ہی خوش دلی اور لطف اندوزی کے پیرائے میں سماجی زندگی کے ھر ھر زخم کو کریدتے اور چھیڑتے چلے جا رھے ہیں - ھم غازی میانر بستانی میں میر مشرف حسین کو بھی اسی دریا میں غوطے لگاتے اور اسی رنگ میں سماج کا مصلح دیکھتے ھیں -

غازی میانر بستانی اپنے دور میں سماجی زندگی کے محاسن و معائب پر مشتمل ایک کامیاب طنزکی حیثیت رکھتی ھے - اگر زندگی کی تنقید ہی کو ھم ادب کا درجہ دیسکیں تو میر مشرف حسین کی یہ کتاب ایک کامیاب ادبی تخلیق کا درجہ پا سکتی ھے -

——•:)*(:•——

اسلامیر جے

میر مشرف حسین کی مصنفہ " اسلا میر جے " نہ تو تاریخ کا رجہ پا سکتی اور نہ ناول کا - اسمیں اسلامی تاریخ سے متعدد بوش پیدا کرنے والے اور نیکیوں کی جانب شوق دلا نے والے اقعات بڑے دلچسپ انداز میں جمع کر دئے گئے ہیں - اس اتاب کے مام بنیادی قصے اگرچہ تاریخی حیثیت رکھتے ھیں لیکن طرز گارش ادبیت اور باریک بینی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی ر مائل ھے - اسلوب تحریرنے اس میں ناول کا رنگ پیدا کردیا ھے - اس تاب کے مباحث زوردار اور حقائق بہت ٹھوس ہیں - اجزائے حریر اگرچہ متعین اور واقعی ھیں لیکن انداز نگارش نے اسمیں بےپناہ تعجب خیزی اور تخئیل کا رنگ پیدا کر کے اس کتاب کو اول کی صف میں لا کھڑا کیا ھے - اور پڑھنے والا اسے ایک بار روع کرنے کے بعد پھر ختم کئے بغیر تسکین نہیں پاتا - اس کتاب ی حقیقت پسندی اور اجزائے تحریر کی انفرادیت بھی شروع سے خر تک یک ساں طور سے اس کتاب پر چھائی ہوئی ھے -

اس کے ماسوا واقعات کے ھر ھر جزسے کردار کی صناعانہ قشہ کشی، ایک ناول نگار جیسی باریک بیں بصیرت اور یک حقیقت نگار جیسی طاقت تشریح نمایاں ھے - اسلا میر جے " سے

میر مشرف حسین کی بے پناہ قوت تخئیل کا اندازہ ہوتا ہے - تخیل کی سحرکاری آغاز کتاب سے آخر ورق تک یکسار طور پر نمایاں ہے - ان کے تخیل نے حضرت محمد صلعم کی مجاہدانہ زندگی اور آپ کے اصحاب کے تصفیہ باطن کی کوششوں میں بڑی دلچسپ رنگینی پیدا کردی ہے - انھوں نے اس عمارت تعمیر میں ہر ہر اینٹ کو صناعانہ نگاہ سے دیکھ اور اسے محاسن سے معمور کرکے استوار کرنے کی کوشش کی ہے - اس کتاب کے جملہ ابواب کو انھوں نے " مُوکول " (شگوفہ کا نام بھی اسی مناسبت ھی سے دیا ہے کہ ایک ایک غنچے سے انھوں نے اپنے گلشن کتاب کو رنگین کرکے " اسلامیر چے یعنی اسلام کی فتح کا ایک بھرا پرا گلشن تعمیر کیا ہے -

" اسلامیر چے " سنہ ۱۹۰۸ع میں شائع ہوئی - اس زمانے میں بنگال منقسم ہوچکا تھا اور ہندؤں کی جانب سے بنگال کو دوبارہ متحد کرنے کیلئے تحریک بھی اپنے شباب پر تھی لیکن میر مشرف حسین سیاسی جھگڑوں سے دور رہ کر اپنے گوشۂ عافیت میں "اسلامیر چے" یعنی اسلام کی فتح کے نقوش ابھار رہے تھے اور ایک فلسفیانہ اور محققانہ تصنیف میں اپنی زندگی کے آخری ایام گذار رہے تھے - انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس دور میں اسلام اور بنگالی مسلمانوں کی خدمت اسی طرح ہوسکتی

کہ اسلام کی صحیح قدروں اور اس کے آدرش کو زیادہ سے زیادہ روشن کیا جائے - دلائل، رموز، حقائق، وقائع، ترغیب اور زور بیان کے محاسن سے معمور " اسلامیر جے" ۳۰۲ صفحات پر پھیلی ہوئی اپنی صفات میں ایک انمول اور بے بہا کتاب ہے - مقاصد مصنف کے اعتبار سے یہ کتاب ایک کامیاب تصنیف کا درجہ رکھتی ہے - یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ میر مشرف حسین کی تمام تر ادبی تصنیفات میں یہی کتاب ن کا شاہکار ہے -

بی بی کلثوم

یہ کتاب میر صاحب کی مصنفہ ان کی رفیقۂ زندگی بی بی کلثوم کی سوانح عمری ہے - بی بی کلثوم کی تصنیف سنہ ۱۳۱۶ ب مطابق سنہ ۱۹۰۹ع کی ۱۱- جیٹھ سے پہلے ختم ہوئی - بی بی کلثوم کی وفات ۲۶- اگھن سنہ ۱۳۱۶ ب میں واقع ہوئی اور انھوں نے اس میں بھادوں سنہ ۱۳۱۶ ب کی پہلی تاریخ سے ۳۰- ماگھ تک کے واقعات لکھے ہیں یعنی میر صاحب نے پدم دی اسٹیٹ کی منیجری پر بی بی کلثوم کو ساتھ لئے جس دن قدم رکھا اس دن سے موصوفہ کی وفات کے بعد تک کے حالات اس کتاب میں قلمبند کئے - میر مشرف حسین نے

" امار جیبنی " (میری سوانح حیات) میں بھی اپنی دوسری بیوی بی بی کلثوم کے متعلق جابجا بہت کچھ لکھا ہے لیکن " بی بی کلثوم " خاص طور ان کی مذکورہ بیوی کے متعلق ھی ایک تصنیف ہے ۔

Biography یا سوانح کا جو مفہوم سمجھا جاتا ہے وہ "بی بی کلثوم" میں موجود نہیں ہے ۔ بی بی کلثوم کی دائمی جدائی کے بعد دو ایک مہینے کے اندر ھی اندر " بی بی کلثوم" میں شاعر کے دلی جذبات اور دکھ بھرے خیالات ظاھر ہوئے ھیں ۔ میر صاحب اول تو ایک بلند پایہ ادیب اور پر زور طرز تحریر کے مالک تھے پھر ان کی مرکز محبت بیوی کی وفات کا غم ایسا نہ تھا جس نے ان کے قلم سے غم کے دریا نہ بہا دئیے ھوں ۔ ضعیف العمری میں بیوی کی جدائی نے ان کے نزدیک اس دنیا کو ایک نقش فانی کی حیثیت سے پیش کیا تھا اس لئے اس کتاب میں ایک غم زدہ شوھر کے دل کی محبت اور شفقت کا نچوڑ موجود ہے ۔ میر صاحب نے بیوی کو اپنی متاع حیات یا روح اور جان کے روپ میں دیکھا ہے اور یہی سبب ہے کہ اپنی بیوی کی سوانح حیات لکھتے وقت انھوں نے اس کا نام " امار جیبنیر جیبنی — بی بی کلثوم " یعنی میری زندگی کی آپ بیتی — بی بی

کلثوم' نام دیا ھے - اس وجہ سے اسی کتاب کو ایک مکمل سوانح کی حیثیت نہیں دی جا سکتی - انگریزی میں جو حیثیت Personal Essay کو حاصل ہوتی ہے وہی حیثیت اس کتاب کو بھی حاصل ھے جا بجا مثلاً تمہید اور " بی بی کلثوم کی وفات کے پہلے اور بعد " وغیرہ ابواب میں طرز تحریر کچھ اس درجہ و الہانہ اور عاشقانہ ہو گیا ہے کہ مذکورہ مضامین "چندر شیکھر مودھو پادھیا' کی " اُدھرا نتو پربم " کی طرح ایک ادبی نظم یا اکھے نو ژال کی "آے شا" جیسی نظم کے درجے پر پہنچ گئے ہیں - مشرف حسین کا بیان حقیقت اور تذکرۂ واردات کا انداز بے اختیارانہ ہونے کی وجہ سے بہت اندوہ ناک ہو گیا ہے - اپنی بیوی کی وفات کے وقت دل کو گرما دینے والے روز مرہ کے واقعات کے تذکرے نے بھی میر صاحب کے ہاتھوں اس قدر غمناک اور اندوہناک عظمت کا درجہ حاصل کر لیا ہے کہ خالص نجی اور ذاتی حالات بھی عوامی دکھ درد اور سارے انسانوں کے اپنے غم و رنج جیسے معلوم ہونے لگے ہیں - اس فراق کی راگنی نے ان کے دل کے ہر ہر تار پر ایسے انداز سے زخمہ زنی کی ہے کہ بیک وقت ان کا مکمل ساز حیات اس سے متأثر بلکہ شکستہ ہوتا معلوم ہوتا ہے - میر صاحب کی زندگی کا جہاز جب ساحل سے قریب ہو رہا تھا اس وقت اس خونچکاں واقعے نے جو ہوشربا موجیں اور قیامت خیز طوفان پیدا کیا اس کا تذکرہ

جس قدر حقیقت افروز، جتنا غم انگیز، جس درجہ صبر آزما اور جس حد تک رقت خیز ہے اسی قدر واضح اور مشرح بھی ہے - انسان کی قسمت کا ایسا المناک انقلاب، پیارے عزیز کی دائمی جدائی، غم و الم کی شدت، دل کی بے قراری اور موت کے نا معلوم پنجوں کے سامنے انسان کی بے بسی نے مشرف حسین کی اس المیہ تحریر میں بلا کی غم انگیزی اور قیامت کی تاثیر پیدا کر دی ہے -

مشرف حسین کی اس کتاب کو ان کی والہانہ اور بے اختیارانہ طرز تحریر نے ایک عجیب انداز بخشدیا ہے - ایسا طرز نگارش جس میں آمد ہی آمد اور روانی ہی روانی ہے - کہیں بھی تصنع اور صنعت لفظی کی آورد موجود نہیں ہے اور یہی سبب ہے کہ اس میں واقعات کی سنجیدگی اور خیالات کی پاکیزگی اپنی پوری تابانی سے جلوہ گر ہے - اس کتاب کو پڑھ لینے کے بعد رنج و غم کی ایک گھنگھور گھٹا آہستہ آہستہ پڑھنے والے کے دل پر چھا جاتی ہے اور خود بخود دل کے پردوں پر اس دائمی دکھ کی صدا گونجنے لگتی ہے - اس میں شبہہ نہیں کہ یہ تصنیف ذاتی اور نجی حالات پر مشتمل ایک تصنیف ہے لیکن حقائق زندگی اور اسرار موت کا تذکرہ میر صاحب نے کچھ ایسے انداز سے کیا ہے کہ یہ آپ بیتی ایک جگ بیتی بن گئی ہے - میر صاحب نے

اس اسلوب نگارش کو بڑی چابکدستی کے ساتھ شروع سے آخر تک باقی رکھا ہے -

ادبی حیثیت سے اس کتاب کی افادیت کو نظر انداز کرنے کے باوجود اس کتاب میں میر صاحب کی اپنی ذاتی زندگی کے حالات بھی ضمن تحریر میں اس طرح باھمدگر پیوست ہو گئے ہیں کہ ہمیں اس کتاب کے ذریعہ خود مصنف سے بھی روشناس ہونے کا موقع ملتا ھے اور اس لحاظ سے یہ کتاب ایک خاصی اھمیت کی حامل ھے -

میر مشرف حسین کی پہلی شادی عزیزن بی بی سے ہوئی تھی لیکن ان سے انہیں اس لئے موانست نہ ہو سکی کہ دونوں کے مزاج مختلف تھے - گھریلو زندگی کے معاملے میں وہ بہت متوحش اور پریشان تھے اسلئے اعزہ و اقارب کی ناراضی سے بے نیاز ہوکر انھوں نے دوسری شادی کا تجربہ کیا - بی بی کلثوم سے شادی کے بعد میر صاحب نے اپنی زندگی کی بہت کچھ اصلاحی منزلیں کلثوم بی بی ھی کی سعی اور معاونت سے طے کیں -

ضلع ندیا، کشتیا، تھانہ نوپاڑا کے موضع بارکھادا میں ایک غریب کسان کے گھر سنہ ۱۲۶۸ ب کے ماگھ مہینے میں کلثوم بی بی کی پیدائش ھوئی - ان کے والد کا نام شیخ صدرالدین

اور والدہ کا نام لالن تھا۔ ضلع ندیا کے بہت سارے مسلمان مردوں اور عورتوں کے نام آج بھی ھندؤں جیسے ھیں۔ لالن ایک مسلم خاتون کا نام تھا۔ لالن کی ایک سَوت بھی تھی۔ شیخ صدر الدین ایک تو یونہی غریب تھے اور پھر دو بیویوں کی وجہ سے خانگی تنازعات کے برابر شکار رھا کرتے تھے۔ گھر بلو بد حالی سے اکتا کر لالن بی بی نے اپنے شوھر کے ساتھ رھنا چھوڑ دیا اور اپنی بیٹی کلثوم اور ایک لڑکے کو ساتھ لے کر قریب ھی کے موضع "سَوتا" کے ھندو پاڑا میں رھنے لگیں۔ انھوں نے بڑی مصیبتوں میں اپنی زندگی گذاری۔ بچپن میں کلثوم بی بی کا نام "کالی" تھا اور میر صاحب کے ساتھ شادی کے موقع پر ان کا ھندوانہ نام بدل کر اسلامی نام کلثوم بی بی رکھا گیا۔

میر صاحب کلثوم کے گھر کے پاس ھی سے مختلف اوقات میں مختلف ضرورتوں سے سفید گھوڑے پر سوار ھو کر گذرا کرتے تھے۔ اور بچوں کی طرح کلثوم بھی انھیں بچپن کی معصومانہ نگاھوں سے دیکھا کرتی۔ اس کی معصومیت اور سادگی نے میر صاحب کا من موہ لیا۔

اس واقعہ کے کئی سال بعد کا واقعہ ھے کہ کلثوم کے گاؤں میں ایک دن دو پہر کے وقت خوفناک طور پر آگ لگ

ئی اور بہت سے باشندے خانماں برباد ہوگئے۔ عوام کے ساتھ
ساتھ میر صاحب بھی آگ کا تماشا دیکھنے گھر سے باہر نکلے۔
دیکھا کہ بہت سارے لوگ شور مچاتے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر
، اِدھر دوڑ رہے ہیں۔ آگ پھیلتی جا رہی ہے۔ اس حالت
یں دو گھوڑے بھی جان بچانے کیلئے دوڑنے لگے اور ان سے
ان بچانے کے کیلئے ایک جوان لڑکی بے تحاشا دوڑتی ہوئی
ن کے پاس آ کھڑی ہوئی اور چیخ کر کہنے لگی "خدا کیلئے
میری جان بچائیے" یہ کہتے کہتے وہ شدت خوف کی وجہ
ے میر صاحب سے لپٹ کر تھر تھر کانپنے لگی۔

"یہی جو میں نے دیکھا تو پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ پہلے بھی دیکھا
تھا اور آج بھی اتفاقاً دیکھا۔ یہ خانماں برباد کرنے والی آگ
اگر نہ لگی ہوتی تو میں اسے نہ دیکھ سکتا۔ اگر گھوڑے نہ
دوڑے ہوتے تو وہ آکر میرے سینے سے نہ لگتی اور نہ میری
گود میں اپنا منہ چھپاتی، میں نے اسے اطمینان دلایا۔ دل سے دل ملا
اور ایسا سکھ ملا جسنے ساز دل کے ہر ہر تار کو بجا دیا"۔

* * * * *

میں نے کہا— اس بد نصیب واقعے نے تمہیں مجھ سے قریب
کیا ہے۔ اسی کے طفیل تم نے میری آغوش میں اپنا سر چھپایا ہے۔

46—

میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تم نے جس آغوش میں پناہ لی ہے اور جس سینے سے سینہ ملایا ہے اُسے خدا ہمیشہ اسی طرح ملائے رکھے - ایسی آفت اور ایسے خوف کی حالت میں بھی کلثوم مسکراتی ہوئی سر جھکا کر میرے داہنے ہاتھ کو جو اس کے ہاتھ میں نہا دیکھنے لگی (صفحہ ۴۷ - ۴۹ -)'

اس واقعے کے بعد ھی میر صاحب کلثوم کو گھر لے گئے اور اعزہ واقارب نیز عزیزن بی بی کی شدید مخالفتوں کے باوجود انھوں نے کلثوم بی بی سے شادی کرلی - اس معاملے میں میر صاحب کو صرف اپنے بزرگ شیخ اور مرشد جناب عبد اللہ صاحب ھی سے موافقت اور اعانت حاصل ہوئی تھی - شادی کے بعد بھی عزیزن بی بی نے مختلف طور پر کلثوم بی بی سے عداوتیں ظاہر کیں یہاں تک کہ انھوں نے کلثوم بی بی کی زندگی کا خاتمہ کرانے کیلئے ڈاکؤں سے بھی مددلی - آخر میر صاحب نے عاجز آکر اپنی رفیقۂ حیات کلثوم بی بی کو ساتھ لیا اور ملازمت کے سلسلے میں کلکتہ ، دل دوار اور پدم دی وغیرہ مقامات پر زندگی گذاری - کلثوم بی بی ھی سے خدا نے انھیں پانچ بیٹے اور چھہ بیٹیاں عنایت کیں اور ان کی زندگیاں بڑے آرام سے بسر ہوئیں -

میر صاحب اپنی اس بیوی کے بےحد مطیع تھے - غازی میاں داستان میں میر صاحب نے غازی میاں کی زبان سے اپنی بیوی

ی دی طرف اشارہ کرکے خود کو "بھیڑا کانت" (زن مرید) کے
ام سے یاد کیا ہے -

بی بی کلثوم ہی کی کوششوں سے میر صاحب کو اس قدر عروج
حاصل، ہوا - اس شادی سے پہلے میر صاحب اپنی بربادی کی
خری منزل تک پہنچ گئے تھے - ان کے جذبات بدترین راستوں
ی طرف بھٹکتے جا رہے تھے - خدا کے فضل اور کلثوم بی بی
ی نیک دعاؤں کی بدولت وہ آہستہ آہستہ غلط راہ سے ہٹ
ر سچے اور پاکبازانہ راستے کی طرف واپس آ گئے - اس طرح
ہ کہنا بھی صحیح ہے کہ ان کی اصلاح اور ترقی کا اصلی سبب
کلثوم بی بی ہی تھیں -

" — " آپ اس معاملے میں کچھ لکھنے والے تھے؟ کیا ہوا؟
پ نے ابتک نہ لکھا؟ دیکھئے فلاں مضمون کا ایک ہی صفحہ
کھ کر آپ نے اسے نا تمام چھوڑ دیا ہے — اشتہار دیدیا اور
کتاب کا پتہ ہی نہیں " — " یہ نظم تو ابتک نا تمام ہی ہے ".
س طرح کی باتیں کرکے کلثوم بی بی میر صاحب کو
بی مشاغل میں مشغول رکھتی تھیں - وہ یہ
اتیں کہہ کر صرف ہمت ہی نہیں بڑھاتی تھیں بلکہ کام کی
کمیل تک پیچھے لگی رہتی تھیں - کاغذ، قلم، دوات، تیل،
وشنی سب پر خود نظر رکھتیں اور اپنے ہاتھوں سے وہ سب

درست کرتیں پھر خود پاس بیٹھ کر دل بہلاتیں اور کام لینیں
انھیں ھاتھ پاؤں تک ھلانانہ پڑتا - جب کسی قدر لکھ چکے
تو بڑی محبت اور دلسوزی سے کہتیں " اگر زحمت نہ ہو
تو ذرا مجھے بھی سنائیے "۔ میر صاحب انھیں پڑھ کر سناتے
اور سننے ھی بیوی جان نثارانہ انداز میں خوش ہوتیں
کہتیں — " اچھا، پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ مجھے زبانی ھی
سنا دیجئے "۔

میر صاحب کہتے - " میں نے تمہاری چالاکی سمجھی
تم مجھ سے قصہ کہلوانا نہیں چاھتی ہو بلکہ پورے قصے کی
تکمیل کرانا چاھتی ہو - بھلا قصہ کہیں زبانی کہا جاتا ہے
معلوم نہیں قلم کی روانی اس قصے کا رخ کدھر پھیر دیتی
اور تخئیل کی دیوی کون کون سے نقشے سامنے لاکر کھڑے کرے گی
ایسے قصے کہیں زبانی کہے جاتے ہیں؟ اچھا اگر تمہیں اس
کا اتنا ھی شوق ھے تو میں جلد اسے مکمل کر دیتا ہوں
اس طرح وہ اپنا شوق ظاھر کرکے انھیں کام میں لگائے رکھتیں -

بھیڑا کانت کے راھوار قلم کو اسی طرح ان کی اھلیہ
اپنی محبت آمیز مساعی سے قدم قدم پر اکسا کر آگے بڑھایا ھے
اسی وجہ سے بھیڑا کانت نے بھی کبھی ان کی باتوں
ناراضی ظاھر نہیں کی - (بی بی کلثوم صفحہ ۱۱۱-۱۱۲)

میر مشرف حسین کی خوشگوار متاہل زندگی اور باہمی محبت آمیز سلوک کی بے شمار نشانیاں اس کتاب میں موجود ہیں - یہ باتیں جہاں ایک طرف دلی جذبات محبت اور تریم کے رس سے معمور ہیں اسی طرح شاعرانہ تخیلات کی بو باس بھی رکھتی ہیں

ایسی محبوبہ اور رفیقۂ حیات کی جدائی نے میر صاحب کے جذبات میں کیسی ہلچل پیدا کی ہوگی اسے ہر شخص نہیں سمجھ سکتا - دونوں ہی آپس میں ایک جان و ایک قالب تھے اور اسی سبب سے ان کی مفارقت سخت غم آفریں تھی -

میر صاحب فرماتے ہیں :—

بی بی کلثوم میری جان جاں ہیں - وہ میری متاع حیات اور بصیرت چشم ہیں - دل ربا اور دلکش ہیں - ان کی آوازیں میرے کانوں کے لئے شہد کے جرعہ خوشگوار یا ساز دل کی رنگین جھنکار اور خوش آیند راگنیاں ہیں - ان کی ہنسی جاذب قلب و نظر ہے - وہ میری ساری متاع محبت کی تنہا مالک ہیں - وہ میرے سکھ اور دکھ کی برابر کی شریک ہیں - شرمیلی آنکھوں، نازک طبیعت، حسین اور جاذب نگاہ چہرے والی، سادہ مزاج، باوفا، ہوشمند، فہیم، فیاض، ہر کام میں بہتر سوجھ بوجھ والی، شفقت

کرنے والی، صداقت پسند، راست گفتار، خادمہ، کنیز، منتظم پکانے والی، تیماردار، گھر کی مالکہ، شوہر پرست، رازدار محبوبہ، شوہر کی محبت میں سرشار و از خود رفتہ رہنے والی، شوہر کی عزت پر جان قربان کرنے والی، بے بتائے اور بے جتائے خدمت کر کے مسرور ہونے والی، محبت کی دیوی، شوہر کی ہر چیز کو جان و دل سے عزیز رکھنے والی اور اس کے سامانوں کی حفاظت کرنے والی، رفیقۂ حیات، مقدس نصف آخر، گیارہ بچوں کی ماں اور میری عقل کل بی بی کلثوم - ان سے بھی حسین تر عورتیں دنیا میں موجود ہوں گی - لیکن میری نگاہوں نے انہیں جیسا دیکھا ہے ویسا ہی میں نے بیان کیا - (ص ۷) -

محبت کا قانون یہی ہے - یہ ناقص کو بھی کامل دکھاتی ہے - وہ اپنے دل کا شہد ملا کر اسے بھی شیریں تر بنا دیتی ہے - کیا مذکورہ کلثوم واقعی ایسی ہی تھی یا میر صاحب نے اپنے تخیل کو الفاظ کے روپ میں کھڑا کر کے ایک شاعرانہ کلثوم کی تخلیق کی ہے ؟

' پدم دی میں بی بی کلثوم کے پختہ مزار پر میر صاحب کے مندرجہ ذیل تخیلات کندہ ہیں :—

" میں زندگی کے متعینہ کاموں کو سمیٹ رہا ہوں
شوق، محبت اور شفقت سب کو رخصت کر رہا ہوں

گھر، لباس، دولت اور اعزہ و اقارب
حرص، سکونت، غذا سب کو قربان کر رہا ہوں
شوہر پرست بی بی کلثوم اس جگہ
فرش لحد پر دائمی نیند کے مزے لے رہی ہے
پانچ لڑکوں اور ایک لڑکی اور اپنی جان (شوہر) کو
چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی اور جنت میں ٹھکانا بنایا
اگھن کی چھبیسویں تاریخ تھی اور سنہ ۱۳۱٦ بنگلا
سال تھا

اتوار کی صبح تھی جب اس نے جان جاں آفریں کے سپرد کی
یہ دولت مند خاتون شوہر کو ساتھ لئے یہاں آئی تھی
لیکن "پدم دی" کے گورستان میں تنہا ہی خاک سے
ہمکنار ہوئی
بھائی یا بہن جو بھی یہاں آئیں وہ کچھ دیر ضرور
ٹھہر جائیں
اور اس کی روح کی تسکین کیلئے دعائیں دیتے جائیں

---*---

مولود شریف

صفحات ۲۰۸ ـ نظم و نثر مخلوط

مولود دل پذیر و غیرہ بہت ساری میلاد سید البشر صلعم کے احوال پر مشتمل کتابیں بنگال میں مروج ھیں۔ ان سب کتابوں میں حضرت محمد صلعم کی ولادت سے پلے کے حالات، ان کے والدین کی جسمانی اور روحانی زندگی کے عجیب و غریب سوانح اور ان کی ولادت نیز بچپن کی زندگی کے حالات درج ھیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ معجزات کے تذکرے بھی جابجا ملتے ھیں۔ میر صاحب کو یہ احساس ھوا کہ بنگلا زبان میں ایسی کتابوں کی کمی اور سخت ضرورت محسوس کی جاتی ھے۔ اس لئے انھوں نے بعنسہ اردو کی تقلید کرکے بنگلا زبان میں ایک کتاب بنام مولود شریف مرتب کی۔ انھوں نے اکثر عربی کی حمد و نعت کا بھی سلیس بنگلا میں ترجمہ کر دیا ھے۔ وہ فرماتے ھیں :—

—" اس عظیم المرتبت انسان کے احوال زندگی سے ہر مسلمان کو با خبر ھونا ضروری ھے۔ بوقت فرصت پاک محفل میلاد کا انعقاد اور سیرت رسول کا بیان ایک بڑا ھی مبارک فعل ھے — تذکرِ میلاد سے مذھب کی جڑیں استوار ھوتی ھیں اور عقیدت مندی

کے ساتھ مذهبی بنیاد دین همیشه مستحکم اور جذبهٔ اتباع برابر
تر و تازہ رهتا ہے -

اب هم میر مشرف حسین کی زبان اور اس کی ادبیت کے متعلق کچھ عرض کریں گے - بنگالی نثر کی توسیع ' تخلیق اور توصیع میں ان کا بھی ایک مستقل کارنامہ ہے - سنہ ۱۸٦٩ع میں ان کا پہلا ناول "رتنو بتی" شائع هوا - میر صاحب کی کتاب "گورائی برج" یا "گوری شیتو" پر تبصرہ کرتے هوئے بنکم چندر نے سنه ۱۸۷۳ع میں اپنے اخبار "بنگو درشن" میں میر صاحب کے متعلق فرمایا ہے -

"میر صاحب کی تحریر جیسی خالص بنگلا بہت سارے هندو بھی نہیں لکھ سکتے - اس کی مثال قابل تقلید ہے" -

مشرف حسین کی بنگلا نثر متموج اور رواں ہے - سنسکرت کے اصول کی مستحکم بندش اس میں موجود نہیں ہے - جیسے ان کے موضوعات سخن دلکش هیں ویسے هی ان کی زبان تموج خیز ہے - جب وہ جنگ کا تذکرہ کرتے هیں تو ان کی زبان کی دھار زیادہ تیز نظر آتی ہے - ایسے تذکروں میں ان کی زبان کی چنچل رو قابل دید هوتی ہے - ایسا معلوم هوتا ہے کہ ان کی نثر بار بار پڑھنے کا ذوق بڑھاتی رهتی ہے اور پڑھتے وقت هر هر لفظ جھنکاروں کے ساتھ

47—

ایک رولی اور متوازن آواز کی تخلیق کرتا جاتا ہے - تمام بنگالی منثور ادب میں مشرف حسین جیسی رواں، دواں، تابلی اور درخشاں نثر بہت کم لوگوں نے لکھی ہے -

---

ارجمند علی چودھری

موضع بھدیشر ضلع سلہٹ میں ارجمند علی چودھری کی پیدائش سنہ ۱۸۷۰ع میں ہوئی - پینتیس سال ہی کی عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی - ہم انہیں شاعر اور سنگیت کے مرتب کی حیثیت سے جانتے ہیں - انیسویں صدی کے آخری عشرے میں انھوں نے " پریم درپن " نامی ایک ناول لکھ یہ ناول ۱۰- اپریل سنہ ۱۸۹۱ع کو طبع ہو کر شائع ہوا - یہ ۷۸ صفحات پر مشتمل تھا - ایک بنگالی مسلمان کے قلم سے یہہ سب سے پہلا سماجی ناول قلمبند ہوا تھا - اس میں ایک ہندو لڑکی کے ساتھ ایک مسلمان نوجوان کی محبت کی داستان ہے - پریم درپن میں انھوں نے اپنی زندگی کے دکھ درد اور غم و الم کی بھی تصویر کشی کی ہے - اس ناول کی ادبی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو لیکن تاریخی حیثیت سے اسے بنگال

سلمان اهل قلـم حضرات کی تصنیفـات میں ایک بلند مقـام
اصل ھے - اس کے علاوہ ہمیں ارجمند علی نے علمی اور قلمی
سی اور کارنامے کا پتہ نہ مل سکا -

منشی غـلام کبریا

منشی غلام کبریا شیخ عبـد الـرحیم کے ماموں اور ان سے عمر میں سولـہ سال بڑے تھے - ان کی نظـم و نثـر کی ایک تصنیف بنـام " اُچت کتھا " (مناسب بـات) ھمیں دستیـاب ہوئی ھے - یہـہ کتاب سنـہ ۱۸۹۰ع میں شائـع ھـوئی تھی - یہ ایک طنزیہ تصنیف ھے اور ڈھائی سو صفحات پر پھیلی ہوئی ھے - کتـاب چـار ابـواب میں منقسـم ھے - اس میں بھدّاری فقیروں کا قصہ ھے - باب اول میں پیچ اور فـریب کے احوال ھیں - باب دوم میں فقیروں کے کرتـوت درج ھیں - تیسرے باب میں فقیری کے متعلق تذکرہ ھے اور چـوتھے باب میں عیسائیت پـر تبصرہ کیا گیا ھے -

اس کتاب سے مصنف کی عجیب و غریب ناصفـائی طبع کا پتہ ملتا ھے - انھیں یہہ نظر آیا ھے کـہ دنیـا میں عـورتیں ... کاریوں میں مبتلا اور مرد ان کے فریب میں گرفتار ھیں -

وہ عورتوں کو مکار نفس پرست ، بدکردار اور فاحشہ اور مردوں کو ان کے دام فریب میں گرفتار ہوکر عقل و خرد سے بے بہرہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔ کس طرح مرد ان ذلیل عورتوں کی جھوٹی محبت میں گرفتار ہوکر دنیادار اور دین فروش بنتے اور آخر کار برباد ہوتے ہیں ان کا تفصیلی تذکرہ مصنف نے اپنی مذکورہ کتاب " اُچت کتھا " میں کیا ہے ۔ ہم اس کتاب کو پڑھ کر کوئی مسرت حاصل نہیں کرسکتے بلکہ بدذوقی کا شکار ہوسکتے ہیں ۔ نہ اس کتاب کو کوئی تاریخی حیثیت حاصل ہے اور نہ ادبی اہمیت ۔

مزمل حق

(سنہ ۱۸۶۰ع — ۱۹۳۳ع)

بنگالی نثر کے ارتقائی دور کے ایک بڑے ممتاز مسلمان مصنف مزمل حق تھے ۔ وہ ضلع ندیا کے مقام شانتی پور میں سنہ ۱۸۶۰ع میں پیدا ہوئے تھے ۔ اور کافی عرصے تک ادبی خدمات کے بعد سنہ ۱۹۳۳ع میں راھی ملک عدم ہوئے ۔ وہ بہ یک وقت شاعر اور نثار دونوں ھی تھے ۔ عمر میں را بندرو ناتھ سے ایک سال بڑے تھے ۔ را بندرو ناتھ کے شباب شاعری کے

زمانے میں انھوں نے بھی میدان نظم میں اپنا علم بلند کیا تھا۔ رابندرو ناتھ کی شندھا شنکیت اور مزمل حق کی "کثم انجلی" تقریباً ایک ھی زمانے میں شائع ھوئی تھی۔ مزمل حق نے اگرچہ میدان نظم و نثر دونوں ھی میں اپنے کمالات ادبی کا اظہار کیا اور "جانیبو پھوارا" میں حضرت محمد صلعم کے متعلق مضمون لکھا۔ تاھم ان کا آفتاب ادب فلک نثر ھی پر زیادہ تاباں درخشاں نظر آتا ھے۔ یہی سبب ھے کہ ان کی شہرت جس قدر بطور ایک نثر نگار کے ھوئی اس حد تک انھوں نے بحیثیت شاعر کے شہرت نہ پائی۔

مزمل حق کی نثر نگاری کی راھیں مختلف الانواع ھیں۔ انھوں نے سوانح اور ناول کے ساتھ ساتھ فارسی ادب کے تراجم بھی کئے تھے۔ غالباً مسلمانوں میں سب سے پہلے انھیں نے درسی کتابیں لکھی تھیں۔ ان کی درسی کتابیں آج بھی بنگال کے بعض اسکولوں میں زیر درس ھیں۔ مزمل حق کی مصنفہ مندرجہ ذیل کتابیں ھم تک پہنچی ھیں۔

۱۔ جیبن چریت (سوانح)۔

الف ۔ مہارشی منصور۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۹۸ع تعداد صفحات ۹۰۔

ب۔ فروسی چریت۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۹۸ع صفحات ۸۸

دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۱ع - تعداد صفحات ۱۲۲ -

ج - تاپش کا ہینی - دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۴ع - تعداد صفحات - ۱۱۰ -

د - بڑو پیر چریت -

ہ - ٹیپو سلطان -

و - حاتم طائی -

۲ - تراجم :-

الف - شاہ نامہ - (حصۂ اول) سنہ ۱۹۰۹ع - صفحات ۳۳۵

۳ - ناول :-

الف - درّاف خان غازی - (مذہبی تاریخی ناول) اس کتاب میں بنگال کے ہندو مرد و زن کی محبوب کتاب "درّاف خاں کی گنگا ستوتر" میں تری بینی کے فاتح بزرگ جعفر خاں غازی کی سوانح حیات اس وقت کے تاریخی حوادث کی تبعیت میں لکھی گئی تھی -

ب - زہرہ - سنہ۱۹۱۷ع صفحات ۲۷۲ - یہ ایک سماجی رومانوی ناول ہے -

ج - رنگیلا باڈی - (نا مکمل اور غیر مطبوع) ناول زہرہ کے مقدمے میں اس کتاب کا تذکرہ ملتا ہے - مزمل حق ! ؟

دوست دامودر موکھو پادھیا کے مشورے سے اس ناول کی کتابت میں مشغول ہوئے تھے - لیکن مختلف خانگی پریشانیوں کی وجہ سے وہ اسے مکمل نہ کر سکے - اس کے علاوہ انھوں نے سنہ ۱۳۰۷ب مطابق سنہ ۱۹۰۰ع میں "لوھوری" نام کا ایک منظوم ماھوار رسالہ اور سنہ ۱۳۲۷ب مطابق سنہ ۱۹۲۰ع کے بیساکھ سے مسلم بھارت نامی ایک ممتاز ادبی پرچہ جاری کیا تھا - ان کے سابق الذکر رسالہ "لوھوری" کے ممتاز ترین قلمی معاون بابو ڈی - ایل - رائے تھے اور ان کے موخر الذکر رسالے کے اھم قلمی معاون قاضی نذر الاسلام - نذر الاسلام نے سب سے پہلے اپنی خود نمائی اسی مسلم بھارت کے ذریعہ کی تھی - مسلم بھارت بیساکھ سنہ ۱۳۲۷ب سے اگھن سنہ ۱۳۲۸ب تک جاری رھا -

مزمل حق کی مہارشی منصور اور تاپش کا ہینی کا ھم نے اور جگہ بھی ذکر کیا ھے - بزرگ پیر چریت کے متعلق اگرچہ کچھ نہیں کہا گیا لیکن یہ اسی سلسلے کی ایک تصنیف ھے - مزمل حق کا مقصد ان کتابوں کی تصنیف سے یہ تھا کہ مسلمان صوفیوں اور درویشوں کی روحانی زندگی کی عظمت آشکار ھو - ان کی دنیاوی زندگی کی سوانح کا ذکر مصنف نے ضمنی طور پر کیا ھے - فلسفۂ تصوف کی تکمیل میں کس طرح انسان کی اندرونی زندگی کی

پوشیدہ خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں انہیں محاسن کو مزمل حق نے اپنی تصنیفات میں بیان کیا ہے -

فردوسی چریت اور شاہ نامہ اگرچہ دو مختلف کتابیں ہیں لیکن ایک ساتھ ہی منسلک ہیں - ہندوستان کی مہا بھارت اور رامائن نیز یونانی کی " الیڈ و تلیس" کی طرح فارسی زبان میں شاہنامہ ایک عظیم الشان مہا کابیہ (رزمیہ مثنوی) ہے - اس کے مصنف فردوسی طوسی ہیں - اس لئے فردوسی کو ہومر آف دی ایسٹ (مشرق کا ہومر) کہا جاتا ہے - اس کتاب میں زمانۂ قبل اسلام کے ایرانی بادشاہوں کے مکمل احوال و سوانح ہیں اور منظوم صورت میں جمع کئے گئے ہیں - عہد قدیم کے ایران کی قومی زندگی کے مختلف رخ اس مثنوی میں فردوسی نے بڑے ہی پرشکوہ انداز اور بےمثل شاعرانہ تخییل کے ساتھ پیش کئے ہیں -

مزمل حق کا شاہنامہ فردوسی کے اصلی شاہنامے کے حصۂ اول کا ترجمہ ہے - بنگالی ادب میں مزمل حق کا یہ کارنامہ ایک لازوال حیثیت رکھتا ہے - مزمل حق نے فردوسی چریت میں شاہنامے کے مصنف فردوسی طوسی ہی کے مختلف پر لطف واقعات و سوانح مجتمع کئے ہیں -

" ٹیپو سلطان :— ریاست میسور کا آخری آزاد اور مجاہد تاجدار جسنے اٹھارھویں صدی عیسوی کی ظلمت میں آزادی کا

چراغ روشن کیا تھا اُس مرد مجاھد کی داستان اس کتاب میں درج کی گئی ھے - اس کتاب سے مزمل حق کی کوئی محققانہ کاوش یا ادیبانہ عظمت ظاھر نہیں ھوتی تاھم انھوں نے خلوص اور سلاست کے ساتھ صداقت کے اظہار کی کوشش کی ھے - اس کتاب میں مزمل حق نے آفتاب حریت کی آخری کرن اور غیر معمولی بہادر ٹیپو کی ناکامیابی کے احوال بڑے غمناک انداز میں بیان کئے ھیں -

زھرہ ناول میں مسلمان سماج کے ایک دردناک پہلو کی طرف انھوں نے لوگوں کی توجہ ملتفت کرائی ھے - دیہاتوں میں لڑکی والوں کے رشتےدار آج بھی لڑکی کے والدین کو نا مناسب رشتہ قبول کرنے پر مجبور کرتے اور تدابیر سے لڑکی کو کسی نالائق نوجوان تک پہنچانے کی سعی کرتے ھیں - اس طرح بہ جبر و اکراہ بسا اوقات وہ ازدواجی تعلقات کو منقطع کرانے میں بھی اپنے اثرات کو کام میں لاتے ھیں - اس بےجا مداخلت کا ثمرہ یہ ہوتا ھے کہ لڑکے اور لڑکی دونوں ھی کی زندگی بڑی تلخ گذرتی ھے - ایسے امور میں ان لوگوں کی توجہ شادی شدہ جوڑے کی بہبودکی طرف نہ ہوکر صرف اپنی ضد اور اپنے منشا کی تکمیل کی طرف رھتی ھے - سماج کی اس گندی ذھنیت اور گھناؤنے ماحول کا تذکرہ درد ناک انداز میں مصنف نے زہرہ جیسی کم سن لڑکی کی غم ناک زندگی کے پردے میں کیا ھے - دائمی غم کی کشاکش میں غم کی

ناکامی اور مسرت کی کامیابی کا نقشہ کھینچنے میں بھی مزمل حق نے اپنے زور قلم کا پورا پورا حق ادا کیا ہے ۔ اس ناول میں صحرا و بیابان، ڈاکوؤں کی پناہ گاھیں، ان کے اعمال و حرکات اور زہرہ کا پے درپے مصائب میں گرفتار ہونا دیکھ کر بنکم کے "کپال کنڈولا" کے بہت سارے واقعات ہماری نظروں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں ۔ زہرہ ناول میں اس قسم کی بہت ساری رومانوی نشانیاں موجود ھیں ۔

مزمل حق کی تمام ترمنثور تصنیفات میں صفائی بیان اور وضاحت قابل دید ہے ۔ چونکہ وہ اسلامی سرمائے اور مسلم قوم سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے ان محاسن کے اظہار پر انھیں قدرت حاصل ہو سکی تھی ۔ ان کی سوانح، ترجمہ شاہ نامہ اور ناول میں اپنی تہذیب سے واقفیت کا واضح طور پر اظہار ہوتا ہے ۔ اسلامی ادب کے ممتاز مصنفین اور مبلغ اسلام "شودھا کر دل" سے انھیں گہرا لگاؤ تھا ۔ وہ ان سے ملتے بھی رہتے تھے لیکن اُس جماعت میں داخل ہو کر انھوں نے تبلیغ اسلام کی ذمہ داریاں قبول نہیں کیں ۔ مزمل حق کی توجہ صرف اس جانب تھی کہ مسلم تہذیب اور سرمائے پر ایک بلند پایہ ادب کی بنیادیں استوار کی جائیں اور اس کے ذریعہ سے مسلم سماج کی زندگی کو صالح بنایا جائے ۔ اس معاملے میں ہمیں ان کا مطمع

نظر ان کے پیش رو میر مشرف حسین سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے۔
موضوعات اور مضامین کے انتخاب میں انھوں نے جس طرح اسلامی روایات اور اساطیر قدیم وغیرہ سے رغبت کا اظہار کیا ہے اسی طرح استعمال الفاظ میں بھی انھوں نے فہم و فراست کا ثبوت دیا ہے۔ سنسکرت کی تبعیت میں مغلق اور ٹکسالی الفاظ کی صورت نیز آواز کی سنجیدگی نے ان کے دل پر قبضہ جما یا تھا۔ ان کی فردوسی چریت اور شاہ نامہ کی زبان میں جس طرح صنائع لفظی اور زور بیان کا حیرتناک طور پر اجتماع ہے اسی طرح توازن صوت بھی قابل ستائش ہے۔ ان کی نثر نگاری میں کہیں بھی روانی میں فرق نہیں پیدا ہوتا۔ وہ ہر جگہہ رواں اور دواں نظر آتے ہیں۔ یہہ بات حیرت انگیز ہے کہ بیک وقت ان کی نثر میں ودیا ساگر اور بنکم کے مختلف طرز کا اجتماع ہو گیا ہے۔ مشرف حسین کی نثر میں وافر جوش کے ساتھ تموج بھی ہے لیکن مزمل حق کی زبان مغلق ہوتے ہوئے بھی رواں ہے۔ انتخاب الفاظ میں انھیں مشرف حسین سے بھی زیادہ دسترس اور تمیز حاصل ہے۔ استعمال زبان میں وہ بیدار مفکر اور ماہر صناع تھے۔ اسی لئے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ان کی تصنیفات میں انھیں کے ہاتھوں یہ زبان رفتہ رفتہ سہل تر ہوتی

گئی ہے - ان کی ادبی زندگی کی آخری تصنیف ٹیپو سلطان میں مستعمل زبان نے ہمارے دعوے کی تصدیق کی ہے -

---*---

منشی محمد ریاض الدین احمد

(سنہ ۱۸۶۲ع - ۱۹۳۳ع)

اس دور کے اور دو صاحبان قلم کے متعلق بہت سارے لوگوں کے خیالات واضح اور درست نہیں معلوم ہوتے - ان میں سے ایک منشی محمد ریاض الدین احمد اور دوسرے پنڈت ریاض الدین مشہدی ہیں - یہہ دونوں ہی شودھا کر دل کے قائد شیخ عبد الرحیم کے معاون کار تھے - اسی لئے ان دونوں حضرات کی ادبی زندگی کے احوال اور ان پر مناسب تبصرے علٰحدہ طور پر نہیں کئے گئے - ان میں سے ایک کی طرز تحریر دوسرے سے بہت مشابہ ہے اور یہہ امکان ہے کہ ایک کی صفت دوسرے پر بہ آسانی منطبق ہوسکتی ہے - حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوا ہے - نظیر الاسلام کی مصنفہ " بنگلا شاھتیر نوتن اتیہاش " کا صفحہ ۴۴۰ اس سلسلے میں قابل دید ہے انھوں نے ریاض الدین مشہدی کی " سماج شنگسکارک " اور " اگنی کُکُٹ " نامی دونوں کتابوں کو محمد ریاض الدین کی

طرف منسوب کر دیا ھے - اسی لئے میں نے پہلے ھی یہ عرض کیا ھے - کہ ایک کی صفت دوسرے پر بہ آسانی منطبق ھو سکتی ھے -

منشی محمد ریاض الدین احمد سنہ ۱۸۶۲ء میں باریسال کے قریب واقع ایک دیہات میں پیدا ھوئے تھے - وہ ضلع تپرہ میں موضع روپ شا کے ایک فیاض زمیندار چودھری محمد غازی کی نظر عاطفت اور سرپرستی حاصل کرنے میں کامیاب ھوئے تھے - سنہ ۱۸۷۶ء میں انھوں نے انٹر میڈیٹ میں کامیابی حاصل کی - اس کے بعد وہ حصول تعلیم کے مواقع حاصل نہ کر سکے - مذھب اسلام کی خدمت کے پیش نظر وہ سنہ ۱۸۸۳ء میں کلکتے آئے اور اپنے ھی ھمنوا و ھم مقصد مولوی معراج الدین اور شیخ عبد الرحیم سے ملاقی ھوئے - کچھ دنوں کیلئے انھوں نے " مسلمان " " نبو شودھا کر اور " سلطان " کی ادارت کے فرائض بھی انجام دئے تھے - انھوں نے شیخ عبد الرحیم کے ساتھ مل کر " اسلام تتو " کی اشاعت میں حصہ لیا تھا - منشی محمد ریاض الدین احمد مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف ھیں :—

۱ - گریش تورشکو جودّھو (جنگ یونان و ترک) اس کے حصۂ اول کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۹۸ء میں شائع ھوا - تعداد صفحات ۳۸۵ تھی - یہ کسی خاص کتاب کا ترجمہ نہیں ھے

بلکہ بہت ساری انگریزی، اردو اور بنگلا کتابوں اور رسائل و اخبارات وغیرہ کی مدد سے تصنیف ہوئی ہے۔ اس میں ترکی سلطان غازی عبد الحمید خاں کی بہادری کے کارنامے اور ترکوں کے ہاتھوں یونانیوں کی شکست کے احوال درج کئے گئے ہیں۔

۲۔ تحفۃ المسلمین۔ یہ کتاب سینٹ زیویرس کالج کلکتہ کے پروفیسر عربی و فارسی مولوی معراج الدین احمد صاحب کی معاونت قلمی سے مرتب ہوئی تھی۔ مولوی معراج الدین احمد صاحب اس زمانے میں سینٹ زیویرس کالج کلکتہ میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔

۳۔ کریشک بندھو (رفیق مزارعین) منظوم۔

۴۔ حضرت محمد (ص) پر جیبن چریت (سوانح)۔

۵ مسلم پاک پرونالی (حصہ اول و دوم۔ مسلمانوں کا اصول طہارت)۔

۶۔ آمار شنگشار جیبن (ہماری گھریلو زندگی) وغیرہ۔

مذکورہ کتابوں کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی ریاض الدین ایک سماجی مصلح اور مسلمانوں کے ہمدرد اہل قلم تھے۔ بنگال کے مسلمان عالم اسلام ہی کا ایک حصہ ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا یہ اعتقاد واضح معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم اسلام کی ترقی ہی سے

گال کے مسلمانوں کی ترقی کو وابستہ سمجھتے ھیں - سنہ ۱۹۳۳ع
یں انھوں نے کلکتہ میں وفات پائی -

پنڈت ریاض الدین مشہدی

(سنہ ۱۸۵۹ع—۱۹۱۹ع)

یہ ضلع مومن شاھی موضع تنگائل مدک سارکے باشندے تھے - انھوں نے "سیریا بجے" (فتح الشام) کے نام سے ایک تاریخ لکھی تھی - اس کے علاوہ ان کی دو اور کتابیں معلوم ھوئی ھیں - ایک سماجی اصلاح کے متعلق "سماج شنگشکارک (مصلح قوم) اور دوسری "اگنی کُکُّٹ" (مرغ آتش) - سماج شنگشکارک میں عالم اسلام کے مشہور مرد مجاھد جمال الدین افغانی کی سوانح اور ان کے مقاصد کے جد و جہد کی توضیح ھے - اس کتاب کو اس دور کی حکومت نے ضبط کر لیا تھا - ان کی دوسری کتاب اگنی ککت ایک ظریفانہ کتاب ھے - انیسویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کے ذبیحہ گاؤ کے خلاف سارے بنگال میں ایک زبردست تحریک رونما ھوئی تھی - کلکتہ ٹاؤن ھال میں بھی ایک مخالفانہ جلسہ منعقد ھوا تھا - ھندؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کی توقع اور ہندؤں کا دل جیتنے کی آرزو میں میر مشرف حسین نے اپنا

ایک مقالہ بنام "گؤ جیبن" اس جلسے میں پڑھ کر سنا یا تھا
ریاض الدین مشہدی نے اسی کے جواب میں اپنی کتاب
"اگنی ککت" لکھ کر شائع کی - قدیم عہد یعنی ویدک
دور میں ہندو گائے کا گوشت کھایا کرتے تھے - وہ مہمانوں کی
ضیافت اور احباب اور رشتوں کی خاطر تواضع کرنے کیلئے
ایک گڑھا کھودتے اور اسمیں آگ جلا کے بہت سی گایوں کو
ایک ساتھ ذبح کر کے بڑی خوشی کے ساتھ اس کا گوشت پکاتے، کھاتے اور
کھلاتے - لہذا اِس دور میں ہندؤں کو اس کا کیا حق ہے کہ وہ
صرف مسلمانوں ہی کو اس جائز حق سے محروم رکھیں - علاوہ
ازیں میرمشرف حسین صاحب میر (سید) ہو کر بھی مسلمانوں کو اس
قسم کی ہدایت نوازی کا کیا حق رکھتے ہیں - وغیرہ وغیرہ - یہی
سارے امور ریاض الدین مشہدی کی اس کتاب میں مشرح درج ہیں
اپنے دوسرے معاصرین اور ہم کار احباب کی طرح ریاض الدین بھی
اسلامی تہذیب کے دلدادہ تھے - ان کی اسلامی محبت پر ان کی
تحریریں شاہد ہیں -

ہم اس موقع پر اس جماعت کے سربراہ شیخ عبد الرحیم کی
کتاب "پروَنے جاتری" پر کچھ تبصرہ کر کے اس باب کی تکمیل
کریں گے - اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۳۶۷ب مطابق سنہ
۱۹۲۰ع میں ۹۰ صفحات پر شائع ہوا تھا - پروَنے جاتری دراصل

واشنگٹن ارونگ کی مشہور کتاب " پیلس آف الحمرا اور پلگرمس آف لو" کا ترجمہ ہے ۔ اس کے متعلق شیخ عبد الرحیم نے خود ہی فرمایا ہے " مجھے شک ہے کہ یہ کتاب اس دور کے اہل نظر کو پسند نہیں آئے گی - لیکن خوف ہے کہ کہیں قومی ادب کی ترقی کے وقت اس قسم کی تحریرات کا نمونہ ضائع نہ ہو جائے اس لئے میں یہ کتاب دوبارہ شائع کر رہا ہوں " - مصنف کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی تصنیفات کے متعلق جو رائے چاہے پیش کرے لیکن اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ " پرونے جاتری" ایک نہایت ذوق آفریں اور دل چسپ کتاب ہے -

o

حصۂ سویم

پانچواں باب

اسلامی ادب

محمد عبد الحی ——— مترجم— مولانا عبد الرحمٰن بیخود

پانچواں باب

اسلامی ادب

(الف)

اسلامی تاریخ و تمدن پر تصنیفات

س سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ انیسویں صدی کے چھٹیں اور ساتویں عشرے میں فرائضی ' وھابی اور دوسری مذھبی و سیاسی تحریکات حکومت کے ظالمانہ قوانین اور حکمرانوں کی سخت گیریوں کی وجہ سے ختم ہوگئی تھیں - اس کے بعد بیس پچیس سال تک بنگال کے مسلمانوں میں اصلاحی اور سیاسی تحریکات بالکل بےجان رھیں اور بنگال میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد انیسویں صدی کی ابتداء سے تقریباً نصف اول تک ہندو سماج میں آہستہ آہستہ جو زہر پیدا ہوتا اور پھیلتا گیا اسی کے شکار اس صدی کے آخر کے مسلمان اور ہندو ہوئے - اسوقت بنگال کے بعض اضلاع میں چند مسلمان بھی دنیاوی حرص اور ترقی کے شوق میں اپنے مذھب سے بیگانہ ہوکر عیسائی مذھب میں داخل ھوگئے تھے - اس دور کی حکومت کا

مذہب قبول کر لینے کا مطلب یہ تھا کہ تبدیلی مذہب کرنے والوں کا اعتقاد خود اپنے مذہب کے بارے میں نہایت کمزور تھا - ناقص تعلیم نے ان کے دل سے سچے اور باطل مذہب کی تمیز مٹا دی تھی - اسی کے ساتھ ساتھ اس غیر مذہب کو قبول کرنے کے پردے میں اقتصادی اور معاشرتی خوش حالی کی دلکش امید بھی کارفرما تھی -

اُنیسویں صدی کی ابتداء میں عیسائیت کی جانب میلان سے هندؤں کو راجا رام موهن رائے نے بچایا تھا - اور اسی صدی کے آخر میں مسلمانوں کے اندر مذہبی تحریک پیدا کرنے والے بزرگ ضلع جیسور کے پرجوش مقرر منشی مہر الله اور شیخ ضمیر الدین تھے - شیخ ضمیر الدین منشی مہر الله کے هاتھ پر عیسائیت سے تائب هو کر اسلام قبول کرچکے تھے - ان کا سب سے بڑا ذریعۂ تبلیغ وعظ تھا - اضلاع اور دیہاتوں میں اپنے مواعظ کی بنا پر منشی مہر الله نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل کی تھیں -

بنگال کے مسلم سماج کو بچانے اور انھیں اسلام پر قائم رکھنے میں منشی مہر الله کی خدمات بلا شک و شبہه غیر معمولی هیں - لیکن وہ یا ان کے پیرو شیخ ضمیر الدین اجتماعی طور پر مسلم سماج میں روح احساس کو بیدار نہ کر سکے - انھیں کے مقاصد سے متأثر هو کر اجتماعی طور پر اس دور کے بنگالی مسلمانوں کا رخ اسلام کی

طرف پھیرنے والی ایک خاص جماعت تھی جسے "شودھا کر دل" سا ہلالی جماعت کا نام دیا گیا تھا -

اس جماعت میں سب سے نمایاں حضرات مندرجہ ذیل تھے :-

(۱) ضلع کھلنا محکمہ سات کھیرا ' موضع بانچ دھا کے رہنے والے مولوی معراج الدین صاحب - یہ کلکتہ کے ڈوٹن اور سینٹ زیویرس کالج میں عربی کے پروفیسر تھے -

(۲) ضلع مومن شاھی محکمہ ٹنگا ئل' موضع چاران کے رہنےوالے جناب پنڈت ریاض الدین مشہدی صاحب - یہ اس زمانے میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بنگلا اور سنسکرت کے پروفیسر تھے -

(۳) بشیرھاٹ ' موضع محمد پور کے رہنے والے منشی شیخ عبد الرحیم -

(۴) ضلع ٹپرا موضع روپ شا کے باشندے مولوی محمد ریاض الدین احمد وغیرہ -

اقتصادی بد حالی اور دنیاوی لالچ کی وجہ سے چونکہ اس زمانے میں چند بنگالی مسلمانوں نے بھی مذھب عیسائیت کے چرنوں میں اپنا سرنیاز جھکا دیا تھا اس لئے عام مسلمانوں کو عیسائیت کی جانب عام میلان سے بچانے کیلئے یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ان کے مذھبی سرمائے ' قومی روایات اور تہذیب و تمدن سے واقف کرا کے حساس بنایا جائے - اس کی واحد صورت یہی تھی کہ ان کی مادری زبان ھی میں ان کے

قومی ادب کا سرمایہ مرتب کرکے عوام تک زیادہ سے زیادہ تعداد میں پہنچایا جاتا رہے تاکہ مادری زبان میں مذہبی ادب کی کتابیں اور اخبارات پڑھ کر مسلم عوام میں بیداری اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو سکے - مذکورہ بالا حضرات نے ان اہم مقاصد کی اہمیت کو سمجھا اور پریشان ہوکر کلکتہ میں ایک مذہبی انجمن کی بنیاد رکھی - ضروری سرمایہ اور وسائل کی کمی کی بنا پر اُنھوں نے اِبتدا مسلمانوں کیلئے دیدی ضروریات پر مشتمل چند کتابیں اور تراجم بہ اقساط چھوٹے چھوٹے رسائل کی صورت میں شائع کرنے شروع کئے - مذہب اسلام کے متعلق علامۂ جلیل اور مجاهد عظیم جناب سید جمال الدین افغانی کی فارسی میں تصنیف کردہ کتاب " نیچر اور نیچریہ " کا بنگالی ترجمہ بنام " اسلامی تتو " مرتب هوکر اس کا پہلا حصہ شائع هوا - اس کی اشاعت سے تھوڑے دنوں کے بعد هی مولانا عبد الحق دهلوی کی تفسیر حقانی کے مقدمۂ تفسیر سے عظمت اسلامی کے ابواب کا ترجمہ بھی بنام " اسلام تتو دیتیو کھنڈو " (حصۂ دوم) یا مذہب اِسلام کے مختصر مجموعے کے نام سے شائع هوا - اِس کا پہلا حصہ سنہ ۱۲۹۴ بنگلہ مطابق سنہ ۱۸۸۷ع کے آسن مہینے میں اور دوسرا حصہ سنہ ۱۲۹۵ب مطابق سنہ ۱۸۸۸ع میں طبع هوا تھا -

" اسلام تتو " کے اجزاء چونکہ مسلسل شائع ہونے لگے تھے -

اس لئے کچھ لوگوں نے انھیں ایک ماہوار رسالے کی حیثیت دے رکھی تھی - لیکن یہ سلسلہ بہت دنوں تک قائم نہ رہ سکا - تاہم اس کے زرمنافع اور کروتیہ ضلع مومن شاهی کے زمیندار حافظ محمد علی خاں ' نیز ضلع بردوان کے موضع کُشم گرام کے زمیندار منشی محمد ابراھیم کی مالی اعانت سے شیخ عبد الرحیم اور منشی محمد ریاض الدین نے ایک هفته وار اخبار بنام " شودھا کر " (مصلح) جاری کیا اس اخبار کا پہلا شمارہ سنه ۱۲۹۶ب مطابق سنه ۱۸۸۹ع کے آسِن مہینے میں شائع ھوا تھا -

مختلف رکاوٹوں اور بدحالیوں کے باوجود " شودھا کر " کافی دنوں تک چلتا رھا - اسی اخبار کے ذریعه مادری زبان کی وساطت سے بنگالی مسلمانوں نے اپنے مذھب کی عظمت ' اصول ' حقائق ' قومی سرمائے اور مفاخر کے بارے میں کسی قدر احساس اور بیداری حاصل کی تھی - اس زمانے میں بنکم وغیرہ معاندین نے مسلمانوں کے خلاف جس قدر زہر افشانیوں کا طوفان کھڑا کر رکھا تھا ان کے جوابات " شودھا کر " ھی میں شائع ھوا کرتے تھے -

یه کہنا درست نه ھوگا که شدھا کر" کے قومی ادب کی حیثیت اختیار کرنے سے پہلے جس وقت بنگالی ادب تعمیر جدید کے راستے پر گامزن تھا اسوقت بنگال کے مسلمانوں میں بیداری پیدا نہیں ہوئی تھی - کیونکه اس جماعت کے قیام سے بہت پہلے ھی یعنی

انیسویں صدی کے نصف ثانی کی ابتدا ھی میں ھمیں یہ نظر آتا ھے کہ میر مشرف حسین نے بنگلا زبان و ادب کی خدمت کیلئے جان و دل سے کوشش شروع کر دی تھی - ان سے بھی پہلے شمس الدین محمد صدیقی ھمیں میدان ادب میں رہ نوردی کرتے دکھائی دیتے ھیں ان کی " بھاب لاب " اور "اوچت شرو بن" سنہ ۱۸۶۵ع سے پہلے ھی تصنیف ھوکر شائع ھو چکی تھی - تا ھم بنگلا زبان میں اسلامی ادب پیدا کرنے کی دھن میں " شودھا کر دل " کے افراد اس حد تک دیوانہ وار آگے بڑھ رہے تھے اور اُنھوں نے اس طرح کی خدمات کے نمونے پیش کئے کہ اس میدان میں ھم ان کا پیش رو کسی اور کو نہیں پاتے - علاوہ بریں اس حد تک احساس آفریں اور قومیت پرور تخئیل اور تحریر بھی ھم اِن سے پہلے کسی اور مسلمان مصنف کی موجود نہیں پاتے - ان لوگوں نے عربی اور فارسی ادب سے تراجم پیش کئے ہیں - حضرت رسول کریم (ص)، دوسرے مشائخ، انبیاء، خلفاء، صحابہ اور اولیاء کرام کی سوانح حیات پیش کی ھے - انھوں نے مذھب اسلام کے قابل فخر کارنامے مرتب کئے ہیں اور اس کی عظمت کے ترانے گائے ہیں - ایک قومیت کے احساس اور اس کے داخلی اور خارجی طور پر اظہار نیز اپنے قومی خصائص کی تبلیغ پر ان کا پختہ اعتقاد تھا - بنگالی مسلمانوں کی سخت

بدحالی کے زمانے میں انھیں نے اس پستی کی طرف مائل ہونے والی قوم کو سربلندی کی طرف آگے بڑھا یا تھا ۔ انھیں نے اس قوم کو خود شناسی اور معرفت نفس کا سبق دیا تھا ۔ مختصر یہ کہ اس شدھا کر جماعت ھی نے اُس وقت جس طرح بھی ھو سکا مسلمانوں کے قومی اور اسلامی ادب کی بنیادیں استوار کیں اور تقریباً نصف صدی کی کاوشوں اور کوششوں سے مسلمانوں کا قومی سرمایہ ادب تعمیر کیا ۔ مختصراً ھم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی قوم اور اس کی قومی تہذیب کا صحیح رخ انھیں چند نفوس کے ہاتھوں متعین ہوا اور پروان چڑھا ۔ اسی حیثیت اور نظریئے سے بنگالی مسلمانوں کے ادب میں شودھا کر جماعت کے ابتدائی کارناموں کو مقام دینا پڑے گا ۔ مابعد کے مسلم ادیبوں کیلئے انھیں پیش رو حضرات نے راستے متعین کئے اور ان پر خود چل کر ان کی رھنمائی کی ۔ اسی کے دریعہ سے ھماری قومی زندگی میں بھی انھوں نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور بنگال کے مسلمانوں میں خود اعتمادی کی طاقت کو بیدار کر کے نئے مفاخر کا احساس پیدا کیا ۔ بہر حال ان کا مرتب کیا ہوا ادب جسکی قدر و قیمت چاھے جو کچھ بھی ہو مقام اور زمانے کے فیصلے کے مطابق بنگلا ادب میں ایک تاریخی حیثیت اور انمول منزلت کا حامل ہے ۔

ان کے کارناموں کا فیصلہ کرنے کے بعد اُس زمانے سے اِس دور تک ان کی دکھائی ہوئی راہ پر جو ادب بنگلا زبان میں مرتب ہوا اُس کا ہم مفصل تذکرہ کریں گے - ظاہری طور پر ہم اسے اسلامی مذہبی شاخ کا نام دے سکتے ہیں - اس شاخ میں تخلیقی کتابوں، تراجم، سوانح، ادب، فلسفہ، اصول، اور حدیث و قرآن کے تراجم، تشریحات اور مباحث اور موازنہ و تنقید وغیرہ نے ساتھ ساتھ جگہ پائی ہے - چونکہ ان سب انواع علوم کے مقاصد ایک ہی تھے اس لئے ان پر علٰحدہ علٰحدہ بحث نہ کرکے اگر انھیں "اِسلامی ادب" کا نام دیا جائے تو ایک ہی باب میں ان کا مجموعی تذکرہ مجتمع ہو سکے گا -

منشی محمد مہر اللہ

(سنہ ۱۸۶۱ع—۱۹۰۷ع)

اس شاخ کی ابتدا میں ہمیں منشی محمد مہر اللہ ملتے ہیں جن کا دور حیات سنہ ۱۸۶۱ع سے سنہ ۱۹۰۷ع تک ہے - یہ ضلع جیسور کے باشندے تھے - حریفانہ مقابلے انسان کی صلاحیتوں کو زیادہ اُجاگر کرتے ہیں - منشی مہر اللہ ایک معمولی قسم کے مولوی تھے لیکن عیسائیت سے زوردار مقابلوں کی وجہ سے ان کی پوشیدہ

صلاحیتیں زیادہ تابندہ ہوگئی تھیں - پادری ضمیر الدین کے ساتھ ان کے مناظرے ہوئے - سنہ ۱۹۹۲ع میں جان ضمیر الدین نے " کرشتیو بندھب " اخبار میں ایک مضمون بہ عنوان " اصلی قرآن کہاں ھے " شائع کیا - مذکورہ سال کی بیسویں اور ستائیسویں تاریخ ماہ چیت اور پھر دوسرے سال کی دوسری بیساکھ اور ستائیسویں جیٹھ سنہ ۱۳۰۰ ب کی تاریخوں کے اخبار " شودھاکر " میں منشی مہر اللہ نے " عیسائی باکرشتانی دھوکا بھنگن " (عیسائیوں کا فریب پارہ پارہ) کے عنوان سے ایک تحقیقی طویل مقالہ شائع کیا - یہ مضمون پھر کتابی صورت میں بھی شائع ہوا تھا - اس مضمون میں منشی مہر اللہ نے جان ضمیر الدین کے چھ سوالوں کا نہایت تشفی بخش اور فاضلانہ جواب دیا تھا - منھبی مباحث میں ناکامیاب ہوکر جان ضمیر الدین نے منشی مہر اللہ کے پاس آکر اسلام قبول کیا اور روحانی بصیرت حاصل کی - ازاں بعد ان کا نام منشی ضمیر الدین ہوا اور انھوں نے تبلیغ اسلام اور صیانت دین کے کاموں میں منشی مہر اللہ کے دست راست کی حیثیت حاصل کرلی -

منشی مہر اللہ کی دوسری تصانیف مندرجہ دیل ھیں -

۱- اُپدیش مالا - مرتبہ سنہ ۱۹۰۹ع صفحات ۲۸ -

۲- " نبورتنو مالا " (نورتن مالا) یا بنگلا غزل - طباعت

ثانی سنہ ۱۹۱۱ع - صفحات ۳۶ -

۳- اسلامی بکتریتا مالا (وعظ) سنہ ۱۹۰۸ع صفحات ۶۳ -

۴- ردِّ کرسٹان (عیسائی) و دلیل الاسلام سنہ ۱۸۹۵ع -

۵- کرسٹان دھرمیر اُشارتا (مذھب عیسائیت کی بے حقیقتی)

۶- بابو ایشان چندر منڈل ابنگ چارلس فرینچیر اسلام گرھن (قبول اسلام)

۷- مہر الاسلام -

۸- پند نامه -

مصنف نے مذھب اسلام کی اندرونی تجدید و اصلاح کی غرض سے کتاب مہر الاسلام بنگلا پوتھی کی صورت میں مرتب کی تھی - اس کتاب کی ابتدا میں حضرت رسول کریم کے محامد اوصاف یا نعتیں ھیں - آج بھی بہت سے مقرر اور واعظ ان بندوں کو درود شریف کی طرح باربار پڑھا کرتے ھیں - بعض اردو نظموں کی ابتدا و انتہا میں بھی اس طرح کے دعائیہ بند پائے جاتے ھیں -

" گاؤ رے مسلم گن نبی رگن گاؤ رے
پران بھریا شبے صل علٰی گاؤ رے "
(گاؤ اے مسلمانو نبی کے محامد اوصاف گاؤ -
جی بھرکے سب لوگ صل علٰی گاؤ)

کتاب مہر الاسلام میں ایک غیر معمولی خصوصیت بھی تھی - اس کی زبان اگرچہ بہت ھی آسان اور عام فہم تھی لیکن شاعرانہ محاسن اور اس کی صوری و معنوی دلکشیوں میں کمی نہ تھی -

انکی مشہور کتاب " ردّ کرستان و دلیل الاسلام " عیسائی پادریوں کے مذھبی حملوں کے جواب میں لکھی گئی تھی - جس میں مذھب عیسائیت پر اعتراضات کئے گئے تھے - اس کتاب سے مصنف کی قابل حیرت وسعت معلومات مذھبی اور حقیقت فہمی کا پتہ ملتا ھے -

منشی محمد ضمیر الدین

شیخ ضمیر الدین مذھب اسلام کی تبلیغ میں منشی مہر اللہ کے متبع اور معاون تھے - اُنیسویں صدی کے چھٹیں یا ساتویں عشرے میں وہ موضع گازادوب محکمہ مہرپور ضلع ندیا میں پیدا ھوئے تھے - وہ پیدائشی مسلمان تھے لیکن اُسوقت کے عیسائی مشنریوں کی صحبت میں آکر اُنھوں نے عیسائی مذھب قبول کر لیا تھا - منشی مہر اللہ سے مذھبی مباحثوں اور مناظروں میں مغلوب ھو کر وہ پھر مذھب اسلام کی آغوش میں پناہ گزیں ھوئے اور پھر اُن کے

معتمد مبلغ کی حیثیت سے اُنہوں نے آخری لمحات حیات تک مذہب اِسلام کی خدمت اور تبلیغ کیلئے اپنی زندگی وقف کردی - اِن کی پہلی تصنیف صداقت اسلام کے بارے میں غیر مذہب والوں کی شہادت (اِسلامیر شتّو شمبندھے پرو دھر مابو لمبو دیگر منتبّو) یہ کتاب سنہ ۱۳۰۸ب مطابق سنہ ۱۹۰۰ع میں شائع ہوئی تھی - ہندؤں اور عیسائیوں نے مذہب اِسلام کی عظمت کے متعلق جہاں کہیں کچھ لکھا ھے اُسے مجتمع کرکے مولف نے غیر مسلمانوں کو اِسلام کی جانب مائل کرنے کیلئے یہ کتاب شائع کی تھی - اِس کتاب کا چوتھا اِیڈیشن سنہ۱۳۱۲ب میں شائع ہوا تھا - شیخ ضمیر الدین کی دوسری کتاب " اِسلامی بکتریتا " دراصل ایک ترجمہ ھے یہ ۵۸ صفحات پر مشتمل ھے - اِس کا تیسرا اِیڈیشن سنہ ۱۳۲۲ب میں اشاعت پذیر ہوا تھا - اِن کی تیسری کتاب "شِرشتّھو نبی" (نبی اعظم) حضرت محمد (ص) و پادریر دھوکا بھنگن (حضرت محمد ص اور پادری کا فریب پارہ پارہ - شمار صفحات ۱۲ + ۹۸) سنہ۱۳۲۳ب میں شائع ہوئی تھی - یہی کتاب شیخ ضمیر الدین کا شاہ کار ھے اِس کتاب میں ایک طرف تو اُنہوں نے حضرت محمد ص کی مقدس زندگی اور اِس کی عظمت کا تذکرہ کیا ھے اور دوسری جانب پادریوں کی ان فریب بازیوں کا پردہ چاک کیا ھے جنہیں وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کیلئے کام میں لاتے تھے - اِن کی اور ایک کتاب " شوکا نل "

تعداد صفحات ۲۴ کا تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۳۲۳ب میں شائع ہوا۔ علاوہ بریں " اصل بنگلا غزل' کے نام سے درود شریف اور مناجات کا مجموعہ (تعداد صفحات ۴۸) اُنھوں نے سنہ ۱۳۱۴ب میں مرتب کیا تھا - اِن کی اور کتاب موسوم بہ " بشودّھو خط نا ما " ۳٦ صفحات پر مشتمل تھی۔

شیخ عبد الرحیم

(سنہ ۱۸۵۹ــــ۱۴ جولائی ۱۹۳۱ع)

شیخ عبد الرحیم اُنیسویں صدی میں مسلم بنگلا ادب کی ظلمت کے لئے ایک چراغ اور شودھاکر جماعت کے ایک عظیم رکن تھے - قومی ادب کے احیاء کیلئے غیرمعمولی جوش' عقیدت اور عشق جو آپ کو ودیعت ہوا تھا اور اس کے لئے جس قدر جد و جہد اور خدمت اُنھوں نے کی وہ اپنا آپ ہی جواب تھی - اِن کی زندگی کا مقصد عظیم صرف ادب کی خدمت تھا - صرف یہی بات نہ تھی کہ اُنھیں مسلمانوں کے قومی ادب کی خدمت کے شوق اور اِس کے نشے نے سرشار بنا رکھا تھا بلکہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بنگالی مسلمان ایک عظیم تہذیب و آدب کے وارث ہیں نیز یہ کہ اِنسانی تہذیب کی سر بلندی کیلئے اِسلام نے جو عظیم الشان ترکہ چھوڑا ہے اِس سے

بنگال کے مسلمانوں کو باخبر کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اُنھیں ان کی میراث ان کی مادری زبان ہی کے ذریعہ سونپی جائے - اِس حقیقت کو اُنھوں نے پوری دیانتداری کے ساتھ باور کیا تھا اور اِس لئے اُنھوں نے اپنی زندگی اِس کام کیلئے وقف کر دی تھی -

"Literature, in a word, was with him not so much an end in itself, but as a means for a farther end, which was national, not individual."

مذکورہ مقولہ شیخ عبد الرحیم پر کس حد تک صادق آتا ہے اسے پوری طرح وہی سمجھ سکتا ہے جو اس دور کے بنگالی مسلمان اور اس عہد کی تاریخ بنگالہ سے واقفیت رکھتا ہے - شیخ عبد الرحیم کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :—

(۱) حضرت محمد (ص) ایر جیبن چریت و دھرمو نیتی (حضرت محمد (ص) کی سوانح حیات اور اصول مذہب) مصنفہ ماہ پھاگن سنہ ۱۲۹۴ب مطابق سنہ ۱۸۸۷ع - شمارۂ صفحات ۹۵۸ -

شیخ عبد الرحیم کی یہ پہلی کتاب تھی جو اُنھوں نے اٹھائیس سال کی عمر میں مرتب کی تھی - اس کا چھٹا ایڈیشن سنہ۱۹۲۳ع میں شائع ہوا تھا -

اس عظیم کتاب کے نام سے جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے - اس کتاب کا موضوع اور مصنف کا نیز نظریہ ظاہ

ہوتا ہے - حضرت کی سوانح حیات اور اسلام کے اصول اس کتاب میں تفصیل اور تشریح کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں - علاوہ بریں مصنف نے اس کتاب میں یہ بحث بھی کی ہے کہ زمان اور مکان کے لحاظ سے اسلام نے کس طرح ہمہ گیر حیثیت حاصل کی تھی - شیخ عبد الرحیم کی تمام تر تصنیفات میں یہی انکا سب سے اہم کارنامہ ہے -

(۲) اسلام ایتی برتّو (تاریخ اسلام) History of the Muslim world اسلام ایتی برتو (یعنی خلفائے راشدین کے زمانے سے مسلمانوں کے مذہب اور حکومت کی مسلسل تاریخ) کا پہلا اور دوسرا حصہ سنہ ۱۹۱۰ع میں شائع ہوا - ''حضرت محمد (ص) یر جیبن چریت و دھرمو نیتی'' اور '' اسلامیر ایتی برتو'' کو ایک ساتھ ملا کر شیخ عبد الرحیم نے اسلام کی مکمل تاریخ مرتب کرنے کا تہیہ کیا تھا - خود ان کے قول کے مطابق '' حضرت محمد (ص) یر جیبن چریت و دھرمو نیتی '' کو اسلام ایتی برتو کا پہلا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے - اس کے بعد خلفاء کی سوانح اس کا دوسرا حصہ کہا جا سکتا ہے - اس تاریخ میں خلفائے راشدین سے شروع کر کے بنی اُمیہ، بنی عباسیہ، بنی فاطمہ اور اسپین کے بنی امیہ وغیرہ کے قدیم خاندانوں کی تاریخ اور ہر خاندان کے دور حکومت میں ان کی سیاست، معاشرت، تعلیم، لباس و پوشاک، صنعت

او ر توسیع مذهب وغیرہ امور پر بحث کر نے کا منصوبہ تھا
علاوہ بریں ہندوستان ' چین او ر جزائر بحر الہند و افریقہ کے دوسرے
مقامات پر اسلام کی ترویج و اشاعت نیز مسلم حکومتوں کی
تاریخ بھی مسلسل طور پر قلمبند ہوتی ۔ اتنے عظیم الشان مقصد
او ر منصوبے کو حقیقت کا جامہ پہنانے کیلئے ماہوار اقساط میں
اسلامی تاریخ شائع کرنے کا انتظام کیا گیا تھا ۔ سنہ ۱۳۱۷ب یعنی سنہ
۱۹۱۰ع میں پہلے او ر دوسرے حصوں کی اشاعت کے بعد ہماری
بد نصیبی سے اس کی اشاعت بند ہو گئی ۔

(۳) " اسلام نیتی " پہلا او ر دوسرا حصہ ۔ سنہ ۱۹۲۵ سے سنہ ۱۹۲۷ع تک ۔

(۴) قرآن و حدیث ایر اُپدیشابلی (قرآن و حدیث کے نصائح) سنہ ۱۹۲۶ع ۔

(۵) نماز تتو با نماز بشیک جُکتی مالا (حقیقت الصلٰوۃ یا دلائل الصلٰوۃ) سنہ ۱۳۰۳ب مطابق سنہ ۱۸۹۸ع ۔

(۶) حج بیدھی (قواعد حج) پہلا حصہ تعداد صفحات ۱۹۰ ۔ سنہ ۱۳۱۰ب مطابق سنہ ۱۹۰۳ع ۔

(۷) رو زار تتو (حقیقۃ الصوم) ۱۳۰ صفحات ۔ سنہ ۱۳۳۴ب مطابق سنہ ۱۹۲۸ع ۔ اس میں ضرورت رو زہ' اس کی عظمت' محاسن' فوائد و غیرہ امور کا قرآن و احادیث سے مکمل

طور پر تذکرہ کیا گیا ھے اور روزہ کے مخالفین کے اعتراضات وغیرہ کو دلائل و مباحث سے باطل ثابت کیا گیا ھے ۔

(۸) خطبہ (یعنی جمعہ، عید الفطر، عید الاضحیٰ اور نکاح کے خطبے ۔ اس کی ترتیب سنہ ۱۳۳۴ب سے قبل ہوئی تھی اور اشاعت سنہ ۱۳۳۹ب مطابق سنہ ۱۹۳۲ع میں ہوئی ۔ تعداد صفحات ۶۴ ۔

(۹) اسلام تتّو ۔ (حقیقت اسلام) اس کے علاوہ انھوں نے پنڈت ریاض الدین مشہدی کی مرتبہ " سیریا بجے " (فتح الشام) بھی شائع کی تھی ۔ سیریا بجے میں حضرت ابوبکر صدیق (رض) کے زمانے میں فتح شام کے واقعات درج ھیں ۔

شیخ عبد الرحیم نے مذھب اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ " واشنگٹن ارون " کی " ٹیلس آف الحمراء پلگرمس آف لو " کا ترجمہ کیا اور اسے " پرانوئے جاتری " کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا افسانوں کے تذکرے میں اس کتاب کا تفصیلی ذکر آئے گا ۔

ھم ان سارے اخبارات سے بھی شیخ عبد الرحیم کی ادبی عظمت کا اندازہ کر سکتے ھیں جنکی ادارت کے فرائض انھوں نے انجام دئے ۔

۱۔ شودھا کر —(ھفتہ وار)

۲۔ مہر —(ماہنامہ)

۳۔ مہر و شودھا کر —(ہفتہ وار)

۴۔ حافظ —(ماھنامہ)

۵۔ مسلم پرو تیبھا —(ماھنامہ)

۶۔ مسلم ھی توئشی —(ہفتہ وار)

۷۔ اسلام درپن —(ماھوار)

شیخ عبدالرحیم نے سنہ ۱۳۳۶ ب مطابق سنہ ۱۹۲۹ع میں ماہنامہ جریدۂ محمدی میں بھادوں سے پوس تک یعنی متواتر پانچ ماہ تک اس کے پانچ شماروں میں بنگلا زبان اور مسلمان سماج کے متعلق ایک بڑاھی محققانہ مسلسل مضمون لکھا تھا - اس مضمون میں اُس دور کے بنگالی مسلم ادب اور ادیبوں کے متعلق انھوں نے ایک واضح مبحث کا دروازہ کھول دیا تھا -

شیخ عبدالرحیم کے ھزاروں ادبی کا رناموں کا جائزہ لینے سے ھمیں پتہ چلتا ھے کہ قوم کے لئے ان کے دل میں قومی درد اور بنگالی ادب سے مسلمانوں کی عام غفلت کی بنا پر ان کے قلب میں ایک احساس تکلیف موجود تھا - ایسا قوم پرور، مذھب پرست، اپنے ادب کا دلدادہ اور خادم ادب بنگالی، مسلمانوں میں بہت کم نظر آتا ھے - ان کے خیالات میں صفائی تھی اسلئے اُس زمانے

میں ان کا طرز ادا بہت صاف اور زوردار تھا۔ بندش میں جولانی، گہرائی اور سجع بندی ہے۔ طریقۂ بیان سہل، رواں اور تیز ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنگلا زبان پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

مولانا منیر الزماں اسلام آبادی

(۱۸۷۴ــــ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۰ع)

مولانا منیر الزماں اسلام آبادی موضع آزالیا تھانہ پٹیا ضلع چاٹگام میں سنہ ۱۸۷۴ع میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ رنگ پور ضلع میں ایک سینیر مدرسے کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ یہاں قیام کے زمانے ھی میں وہ تبلیغ اسلام اور توسیع تعلیم کیلئے کوشاں ہوئے اور تمام عمر انہیں کوششوں میں صرف کرنے کے بعد ۲۴ اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ع سفرآخرت اختیار کیا۔ نواب اسلام خاں نے چاٹگام فتح کرنے کے بعد اُسے اپنے نام پر اسلام آباد کے نام سے موسوم کیا تھا اور اسی مناسبت سے مولانا منیر الزماں بھی اسلام آبادی کے لقب سے ملقب ہوئے۔

مولانا اسلام آبادی بیک وقت سیاسی مدبر، سماجی کارکن،

ثقافتی، ادبی اور مذہبی خادم تھے۔ وعظ کی مجلس بھی ان کی شعلہ فشانیوں سے گرم رہا کرتی تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے تحریک خلافت میں بھی شرکت کی تھی۔ کانگریس کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے تحریک ترک موالات اور سول نافرمانی میں بھی شرکت کی تھی اور اس کے نتیجے کے طور پر کچھ دنوں قید و بند کے مصائب بھی سہے تھے۔ "اکری شک پرجا" تحریک کے ساتھ بھی ان کا تعلق تھا اور غیر منقسم ہندوستان میں "جمعیت العلماء ہند" کی بنگالی شاخ کے بانی اور روح رواں وہی تھے۔

سماجی کارکن منیر الزماں اسلام آبادی کا ایک اہم کارنامہ "قدم مبارک" مسجد اور اس کے متصل ایک یتیم خانہ ہے جو چاٹگام میں اب تک ان کی یاد دلاتا ہے۔

مولانا اسلام آبادی خصوصیت کیساتھ تاریخی تصنیفات کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ لیکن اس باب میں انھیں جگہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ساری ادبی زندگی، اسلام اور بالخصوص اُس دور کے ہندی مسلمانوں کی خدمت میں گذاری تھی۔ ان کی تصنیف کی ہوئی کتابوں سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اسلامی ادب کے احیاء کے لئے کیا کوششیں کی تھیں۔

ان کی مصنفہ کتابوں کے نام :—

۱ـ تورشکیر سلطان (سلطان ترکی)

۲ـ بھارتے مسلمان شبھوّتا (ھندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب) -

۳ـ نظام الدین اولیاء (رح) -

۴ـ بھارتے اسلام پروچار (ھندوستان میں تبلیغ اسلام)

۵ـ مسلمانیر ابھوتّھان (مسلمانوں کا عروج)

۶ـ سماج شنگسکار (سماج کی اصلاح)

۷ـ کھوگول شاسترے مسلمان (علم نجوم میں مسلمان) -

۸ـ بھوگول شاسترے مسلمان (علوم جغرافیہ میں مسلمان) -

۹ـ کانستـینـتینـوپل (قسطنطنیہ) -

۱۰ـ اورنـگ زیب -

۱۱ـ مسلم بـرنـگونا (مسلمانوں کی شجاعت) -

۱۲ـ قرآنے شادھی نوتار دانی (قرآن میں احکام آزادی) -

۱۳ـ اِسلامیر اُوپودیش (اِسلامی نصائح)

۱۴ـ اسلامیر پونـو کوتھا پرو بھریتی (اسلام کی اچھی باتیں وغیـرہ) -

ان کتابوں میں سے متعدد کتابیں مختلف رسائل میں مسلسل شائـع ھوئی تھیں - وہ کتابیں اب تـک علٰحدہ صورت میں شائع نہ ھو سکیں -

"بہارِ مسلمان شبھوتا" ان کی سب سے اہم ادبی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں دس ابواب ہیں۔ مسلمانوں کے دور حکومت ہند میں رفاہ عام کے کون کون سے ادارے قائم ہوئے تھے ان کا تفصیلی تذکرہ جناب اسلام آبادی صاحب نے اس کتاب میں کیا ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اسلامی تہذیب نے ہندوستان کو مختلف حیثیتوں سے ترقیاں دی تھیں۔ علوم تعمیرات، تدبیر مملکت، مختلف علوم و فنون میں توسیع اور ادبی خدمات کی راہیں مسلمان حکمرانوں نے اس طرح ہموار کی تھیں کہ اقوام عالم میں ہندوستان کی عزت بہت نمایاں تھی۔ ان کی کوششوں سے تحقیقات علمی کے دروازے کھل گئے تھے۔ ان امور کی چھان بین اور واقعات کی تحقیق میں مولانا منیر الزماں نے بڑی کوششوں کا ثبوت دیا ہے۔

"بہارِ مسلمان شبھوتا" کتاب کے دوسرے حصے کی اشاعت سے انھوں نے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن ان کی یہ اُمیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ شاعر غلام مصطفےٰ کے ماہنامہ "نو بہار" میں اس کتاب کے کئی ابواب شائع ہوئے تھے منیر الزماں کی زبان بڑی جاندار اور انداز تحریر بہت پرزور ہے۔

اردو زبان میں واقعی طور پر فلسفۂ تاریخ کی رعایت کرتے

ہوئے مولانا شبلی نعمانی ھی نے اسلام کی تاریخ تصنیف کی ھے -
بنگالی زبان میں تاریخ اسلام کی تصنیف میں مولانا منیر الزماں نے
علامہ شبلی ھی کو اپنا امام تسلیم کیا تھا -

T. W. Arnold کی Preaching of Islam کتاب کے نمونے پر
اور اسی کی تبعیت میں مولانا منیر الزماں نے اپنی کتاب "بھارتے
اسلام پرچار" تصنیف کی تھی - بھارت میں تبلیغ اسلام کے متعلق
ھندؤں نے جس طرح خلاف اسلام زھر افشانیاں کی ھیں اور
مخالفت میں ایک بے بنیاد فتنہ کھڑا کیا ھے ان کا دنداں شکن
جواب مولانا اسلام آبادی نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا -

ھندو مت اور مذھب اسلام کے درمیان جو اختلاف ھے اس کا
زندہ نمونہ ھم اورنگ زیب اور شیواجی کی صورت میں دیکھ
سکتے ھیں - منیر الزماں نے اپنی کتاب " اورنگ زیب " میں اسی
نظریئے کے ماتحت ھندو اور مسلمان کے مختلف روپ کا
اورنگ زیب کے کردار میں معائنہ اور تصفیہ کیا ھے -

حضرت محمد (ص) کے زمانے میں اور ان کے مابعد کے دور میں
بہادر مسلمانوں نے میدان جنگ میں کس قدر حیرتناک شجاعت کے
مظاھرے کئے اور انھوں نے اسلامی فتوحات کی توسیع میں
کس حد تک حصہ لیا تھا انھیں مولانا منیر الزماں اسلام آبادی نے
اپنی کتاب " مسلم بیرنگونا " میں اچھی طرح بیان کیا ھے -

انہوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ دور اول کی مسلم خواتین نے مردوں کے دوش بدوش کس طرح شجاعت کے کارنامے دکھائے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی ہم وطن خواتین کو باہمت اور شجاع بننے کیلئے اُبھارا ہے ۔ مسلمانوں کی ہمہ گیر ترقی ہی ان کا مقصودِ تحریر تھا۔ ان کی ادبی زندگی کا یہی خواب تھا اور اسی کی تعبیر کو دیکھنے کیلئے وہ تمام عمر جد و جہد کرتے رہے ۔ یہ ظاہر ہے کہ حصول تعبیر ان کی دسترس سے باہر تھا ۔

مولانا منیر الزماں " شودھا کر دل " کے قائدین مولوی معراج الدین اور پنڈت ریاض الدین کے تیار کئے ہوئے تھے ۔ ان کی ادبی اور سیاسی زندگی پر ان حضرات کے گہرے نقوش دکھائی دیتے ہیں ۔ سنہ ۱۹۰۶ع " میں بنگیو مسلمان شاھتو شمیتی " (انجمن ادب مسلمانان بنگالہ) کی تشکیل میں سب سے اہم ہاتھ انہیں کا تھا ۔ بنگالی مسلمانوں کو حساس اور بیدار کرنے میں انہوں نے جسم و جان کی بازی لگا دی تھی ۔

انہوں نے ابتداءً ہفتہ وار " سلطان " اور پھر روزانہ " سلطان " اخبار نکالا ۔ اس سے پہلے " مہر " اور " شدھاکر " میں اپنے مضامین شائع کرا کے انہوں نے ادبی شہرت حاصل کی تھی ۔ پھر "الاسلام" وغیرہ اس زمانے کے مختلف اخبارات اور رسائل میں مذہب اسلام اور مسلم سماج کے متعلق بہت سے قیمتی مقالے شائع

الے - سنہ ۱۹۲۹ع میں انھوں نے روزانہ " امیر " اخبار کی ادارت اور اشاعت کی - منیر الزماں " پین اسلامزم " کے بڑے حامی تھے - ان کا تخیل ، ان کا تصور اور ان کی جد و جہد صرف اسی کام کے دیلئے وقف تھی کہ مسلمان قوم کس طرح پھر اپنے کھوئے ہوئے وقار کو حاصل کرسکے - ان کے تمام ادبی کارناموں میں ان کا یہ قومی تخیل نمایاں نظر آتا ہے -

جن لوگوں نے بنگالی زبان میں اسلامی تاریخ اور اسلامی ادب کے احیاء کی کوشش کی ہے ان میں قاضی اکرم حسین کا نام بھی عزت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے - سنہ ۱۹۲۴ع میں ان کی شائع کردہ " اسلام ایتیہاش " (تاریخ اسلام) طرز تحریر کے اعتبار سے ایک کلاسکل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے - ملک عرب میں آغاز اسلام سے دنیا کے مختلف ممالک میں ، بالخصوص اسپین اور ہندوستان میں توسیع اسلام ، اس کے اسباب اور اسکی تشریحات قاضی اکرم حسین نے مؤرخانہ طور پر اور ادیبانہ انداز سے اس کتاب میں مکمل کی ہے - یہ کتاب ہمارے خزینۂ ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے -

اس کے علاوہ انھوں نے ایک منظوم کتاب " جیبن بانی " (پیغام حیات) میں اقبال کی نظموں کے تراجم اور مولانا جلال الدین رومی (رح) کی مشہور مثنوی کے تقریباً نصف اول

حصے کا ترجمہ پیش کیا ھے - ان کی یہ تصنیف سنہ ۱۹۴۶ع میں پایہ تکمیل کو پہنچی - اسی سال انھوں نے شیخ سعدی کی "کریما یا پند نامہ" کا منظوم ترجمہ پیش کیا - بنگلا ادب میں قاضی اکرم حسین کی خدمات قابل ذکر اور لائق ستائش ھیں -

-----*o*-----

اسلامی حقائق — تصوف

(اسلامی اصول اور سماجی زندگی کے متعلق تصنیفات)

گریش چندر سین

(سنہ ۱۸۳۴ — ۱۹۱۰ع)

(ب)

برھمو سماج فرقے میں نئے قوانین کے بانی اور مجدد برمانند کیشب چندر سین نے اپنے بہت سے متبعین کو مختلف مذاکروں کے ذریعہ نئی زندگی اور نئے جذبات سے آشنا کیا تھا - ان میں سے گریش چندر سین اور گرو گوبند رائے کے نام قابل ذکر ھیں - گریش چندر نے اسلام کی خدمت اور اسلامی تہذیب و تمدن کی نشریحات کیلئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی - ڈھاکا ضلع کے موضع پانچ دونا میں گریش چندر سین کی پیدائش سنہ ۱۸۳۴ع میں ھوئی اور بڑھاپے کی عمر تک زندہ رہ کر سنہ ۱۹۱۰ع میں انھوں نے دنیا کو خیرباد کہا - گریش چندر ھی نے سب سے پہلے بنگلا زبان میں قرآن پاک کا مکمل ترجمہ پیش کیا اور اس کے بعد حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کا نصف سے زائد ترجمہ پیش کیا -

گریش چندر نے اسلامی موضوعات کو اپنے گرو کیشب چندر سین کے اشارے اور حوصلہ افزائی سے اپنایا تھا - غالباً کیشب چندر

سین خود بھی اس معاملے میں برھمو سماج کے بانئ اول راجا رام موہن رائے کے نمونے پر گامزن ہوئے تھے - برھمو سماج مت نے عیسائیت ھندوئیت اور اسلام سے بہت ساری چیزیں لیکر اپنا وجود قائم کیا تھا - بھارت میں اس مت کے اختلاط کی غرض سے انیسویں صدی کے شروع میں راجا رام موہن رائے نے جان توڑ کوشش کی تھی - انھوں نے ھندو، عیسائی اور مسلمانوں کی مذھبی کتابوں کے متعلقات پر کافی تحقیقات کی تھی -

ہندو اور عیسائی مت کی کتابوں پر راجا رام موہن رائے نے جو تحقیقی کوششیں کی تھیں ان کا ایک معتدبہ حصہ اب بھی موجود ھے - لیکن انھوں نے جو کچھ مسلمانوں کی مذھبی کتابوں پر تبصرے کئے ان کا کوئی جزو ھمارے ھاتھ نہیں لگا - پھر بھی ان کی کتاب " تحفۃ الموحدین " اور ان کی دوسری تحریرات میں مختلف مقامات پر اسلامی موضوعات کے متعلق انھوں نے جو کچھ منشتر طور پر لکھا اور اشارات اور کنایات سے ظاھر کیا ھے ان سے یہ بات اچھی طرح واضح ھوجاتی ھے کہ رام موھن رائے کے دل پر ان کی اسلامی خدمات کا عکس اچھی طرح پڑا تھا - ان کے ھم قوموں کی بت پرستی اور عیسائیوں کی تثلیث سے ان کی بیزاری کا سبب درحقیقت قرآنی تعلیمات تھیں -

برھمو سماج کے پیرو ایک غیر متشکل برھما کے پجاری اور

ایک خالق کے معتقد ہیں - مذہبی حیثیت سے ان کی مماثلت مسلمانوں کے ساتھ بہت زیادہ ہے - مسلمان بزرگوں کے حسن اخلاق سے اپنی قلبی عقیدت مندی کے اظہار میں برھمو سماج کے معتقد ایک زمانے میں مطلقاً پس و پیش نہیں کرتے تھے - مسلمان اولیائے کرام کی ریاضت ، ایثار ، زھد ، عبادت ، عشق اور روحانی مکاشفات کی نظیر کہیں اور نہیں پائی جاتی - یہ اگرچہ مسلمانوں کیلئے مابۂ افتخار چیزیں ہیں لیکن ساتھ ھی عام انسانوں کا سر عقیدت بھی جھکا دیتی ہیں - عقیدت مند گریش سین ان کے محاسن حیات سے بے حد متاثر ہوئے ہیں - انہوں نے اپنی قلمی خدمات کو حسن عمل کا درجہ دے کر مسلمان بزرگوں کی سوانح قلمبند کرنے میں روحانی زندگی کا مزہ پایا ہے -

"شرح القلب" ، "فلک الاسرار" اور "معرفت نفس و الرب" ان تین کتابوں میں اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے احوال زندگی بیان کئے گئے ہیں - ان تینوں کتابوں کا خلاصہ مولانا فرید الدین عطار (رح) نے اپنی فارسی کتاب تذکرۃ الاولیاء میں مجتمع کیا ہے - گریش سین نے تذکرۃ الاولیا کے تتبع میں ایک کتاب بنام " تاپش مالا " تصنیف کی - گریش سین کی تاپش مالا اگرچہ تذکرۃ الاولیا کا لفظی ترجمہ نہیں ہے لیکن ہم اسے معنوی

ترجمہ کہہ سکتے ہیں - کہیں کہیں خیالات کی ترجمانی ہے اور جابجا لفظی ترجمہ بھی ہے لیکن بعض اوقات انہوں نے اسے فضول سمجھ کر ترک بھی کردیا ہے - تاپش مالا کی ترتیب مکمل ہوگئی تھی - ہر حصے کے اڈیشن پانچ سے زیادہ شائع ہوچکے ہیں - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاپش مالا کو مقبولیت حاصل ہوئی تھی - بنگلا زبان میں تاپش مالا کی تصنیف گریش سین کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے - انہوں نے بنگلا زبان میں صوفیائے کرام اور درویشوں کی سوانح حیات لکھ کر اِس شاخ ادب کی بنیاد رکھی - اِن کے بعد بہت سے مسلمان مصنفین نے مسلمان بزرگوں اور درویشوں کے ساتھ مرتاضوں اور عابدوں کے حالات قلمبند کئے ہیں -

اس کے علاوہ گریش چندر سین نے دیوان حافظ، گلستاں، مکتوبات مخدوم شرف الدین منیری، مثنوی رومی، منطق الطیر، کیمیائے سعادت، گلشن اسرار وغیرہ کتابوں کے جستہ جستہ تراجم کئے اور مندرجہ ذیل کتابیں اُنہوں نے خود اسلام کے متعلق تصنیف کیں :-
" مہا پرش محمد (ص) وتت پرو ترتیتو اِسلام دھرمو (حضرت محمد ص او اِن کا قائم کردہ مذہب اِسلام) - "چاری جن دھرمو نیتا" (چار مذہبی رہنما) شمار صفحات ۸۸ " امام حسن و حسین ایر جیبنی" " مہا پُرش چریت " حصۂ اول و مہا پُرش چریت حصۂ دوم

حضـرت محمد ص کی سوانـح حیات) اور " چـاری تـی مادھبی مسلمان ناری" (چار مقدس مسلم خواتین) - بھائی گریش سین کی اسلامی تالیفات اور تصنیفات و تراجم کی مجموعی تعداد اکیس ھے -

"تـتّو رتنو مالا" (یعنی تصوف کے متعلق تحریرات) اس کتاب میں بھائی گریش سین نے منطق الطیر اور مثنوی مولانا روم وغیرہ فارسی کتابوں سے اقتباسات جمع کئے ھیں - یہ مکمل ترجمہ نہیں ھے بلکہ بسا اوقات انھوں نے صرف مضامین اور خیـالات اخذ کئے ھیں - سنہ ۱۹۱۴ع میں اس کتاب کا تیسرا اڈیشن شائع ھوا تھا - مختصر قصوں کی صورت میں اس کتاب میں بہت سـاری اصولی باتیں اور فاضـل اخذ مضامین قائمند ھوئے ھیں - اس میں صرف خشک تصوف ھی نہیں ھے بلکہ بہت سی دلچسپ باتیں بھی ھیں -

" شودھا کر دل " کے اراکین نے جس عظیم مقصد کیلئے اسلامی ادب کی ترتیب اور تدوین شروع کی تھی اس کا نمایاں اثر بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ظاھر ھو گیا - کلکتہ میں قیام کرکے ان با عظمت لوگوں نے جب بنگلا زبان کے ذریعے سے اسلام کی تبلیغ کرنے اور بنگال کے عام مسلمانوں کی ھدایت کرنے کا بیـڑا اُٹھایا اور اس طرح ان کے قومی ادب کی تشکیل میں منہمک ھوئے اُس وقت حضرت مخدوم شاہ کے وطن راجشاھی میں " نور الایمان سماج " کے نام سے ایک ادارہ قائم ھو رہا تھا - "اِسلام

تستو"کے نام سے چند کتابیں سنہ ۸۸-۱۸۸۷ع میں شائع ہوئی تھیں - اِس کے چند سال بعد ہی سنہ ۱۸۹۵ع میں "نور الایمان سماج" کی تشکیل ہوئی - مرزا محمد یوسف علی کے فرزند مرزا محمد یعقوب غالباً " نور الایمان سماج " کے مدیر تھے - موجودہ " پلّی بندھب" (دیہات کا دوست) اخبار اسی سماج کا ایک زمانے میں نمائندہ یا نقیب اخبار تھا - مشہور ادارہ " اِخوان الصفا " اور مشہور اہل قلم انگریزوں کے قائم کردہ ادارہ "ایشیاٹک سوسائٹی" کی تبعیت میں نور الایمان سماج کی تشکیل ہوئی تھی - اس سماج کا سب سے مشہور کارنامہ عالم اسلام کے مایۂ ناز فلسفی اور عالِم حضرت اِمام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق کتاب کیمیائے سعادت کا ترجمہ تھا - اِس کتاب کے ترجمہ اور ادارت کے فرائض کو مرزا محمد یوسف علی نے شروع کیا - حضرت اِمام غزالی کی کیمیائے سعادت پانچ جلدوں میں ہے - بنگلا میں ابتداءً اِن پانچ حصوں کا ترجمہ سات جلدوں میں شائع ہوا - پھر بعد میں ان سات جلدوں کو اصل کے مطابق پانچ جلدوں میں جمع کیا گیا - سنہ ۱۹۱۵ع سے پہلے ہی اِس ترجمہ کا کام ختم ہوگیا تھا - مترجم مولوی یوسف علی نے اِس ترجمہ کا ایک نہایت مناسب اور موزوں نام " شئو دھا گُو اسپرشو مونی " رکھا ہے - اِن پانچ جلدوں کے ترجمے نے پندرہ سو صفحات لئے ہیں - اِن مجلدات کے علٰحدہ علٰحدہ نام ہیں -

مثلاً " درشن پُشتک " (حصۂ فلسفہ)، عبادت پُشتک ، " بیوہار پُشتک " (حصۂ معاملات) ، " بِذاشن پُشتک " (حصہ بربادی) ، " پریتران پشتک " (حصۂ نجات) -

اسلام صرف ایک مذھب ھی نہیں ھے بلکہ کامل انسانیت حاصل کرنے اور خدا سے تعلق پیدا کرنے کا راستہ یا دستور ھے - حضرت محمد صلعم کی ذات اس بات کا عملی نمونہ ھے جسے سامنے رکھ کر انسان تکمیل انسانیت کر سکتا ھے - " شدُو بھاگو اسپر شو مونی" میں اس بات کی نہایت دلکش انداز میں تشریح کی گئی ھے کہ ایک مسلمان مذھبی اعمال کی پیروی اور احکام الہی کی پابندی سے کسی طرح معراج انسانیت کی راہ پر گامزن ھوسکتا ھے - عام فطری قاعدے کے مطابق ھی انسان چھوٹے سے بڑا ضرور ھوتا ھے - لیکن اسی قاعدے کے مطابق تکمیل انسانیت نہیں کرتا - اس کے لئے جدو جہد کی ضرورت ھے - حضرت امام غزالی (رح) نے اپنی کتاب کیمیاے سعادت میں ان مباحث کی بے مثال تشریحات بیان کی ھیں کہ انسان کس طرح اسلام کے بتائے ھوئے راستوں اور اصولوں پر چلکر ضبط نفس، طاقت اور اعلی اخلاقی محاسن حاصل کرتا ھوا اپنے مقصود حیات یعنی خدا تک پہنچنے کی کوشش میں کامیاب ھوتا ھے - مرزا یوسف نے نہایت پیاری اور آسان نثر میں

کیمیائے سعادت کا ترجمہ کر کے اور اسے " شلو بھاگّو اسپر شو مونی" نام عطا کر کے بڑی کمال فہم و فراست اور صلاحیت کا ثبوت دیا ھے - یہ کتاب فی الحقیقت بنگلا زبان میں ایک بڑا کارنامہ کہی جاسکتی ھے -

اسی وقت یعنی تقریباً سنہ ۱۹۰۰ع میں جیسور کے مقام گھڑ کی کے رھنے والے مولوی محمد عبد الکریم نے تصوف کے متعلق " ارشاد خالقیہ" یا "خدا پرا پتی تتّو " (تعداد صفحات ۲۹۸) کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی - مولوی عبد الکریم نقشبندیہ طریقہ کے ایک کامل بزرگ اور صوفی انسان تھے - چونکہ انھوں نے خود اپنی عملی زندگی تصوف کے رنگ میں گذاری تھی اس لئے اس طریقے کے نشیب و فراز سے وہ اچھی طرح باخبر تھے - پہلے باب سے چوتھے باب تک انھوں نے تصوف کے مشکل مسائل اور فلسفیانہ اصول Metaphysical کی تشریح بہت دلکش طور پر کی ھے - پانچویں سے نویں باب تک صوفیانہ ریاضتوں کے نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ طریقے بہ تفصیل بتائے ھیں - دسویں یعنی آخری باب میں انھوں نے وید اور پوران وغیرہ مذھبی کتابوں کے مروجہ فلسفیانہ مسائل کی حقیقت پر سیر حاصل بحث کرکے ان کے اسرار کو فاش کیا ھے اور پھر ان کا اسلامی تصوف سے مقابلہ کرکے اُنپر تنقیدی بحث کی ھے -

مولوی عبد الکریم کی مذکورہ کتاب جیسی کوئی دوسری کتاب تصوف پر بنگلا زبان میں ہمیں نظر نہیں آتی - ہم اس کتاب کا موازنہ صرف " شٹو بھاگو اسپر شو مونی " کے ساتھ کر سکتے ہیں - مولوی عبد الکریم نے سنہ ۱۹۱۵ع میں وفات پائی - ان کی وفات کے بہت بعد سنہ ۱۹۴۹ع میں مذکورہ کتاب کا چوتھا ایڈیشن شائع ہوا -

اسی سلسلے میں ندیا شانتی پور کے رہنے والے مزمل حق کی تاپش کاھنی (افسانۂ ریاضت) کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۰ع میں' دوسرا سنہ ۱۹۱۴ع میں شائع ہوا - مزمل حق کا دور حیات سنہ ۱۸۶۸ع سے سنہ ۱۹۳۳ع تک کا ہے - ان کی دوسری کتاب " مہی رشی منصور " (منصور مرد بزرگ) کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۸۹۴ع میں (شمارہ صفحات ۹۰) قابل ذکر ہے - مزمل حق نے اپنی مذکور الصدر کتاب " تاپش کاھنی " میں حضرت عبد القادر جیلانی (رح)' حضرت نظام الدین اولیاء (رح)' امام جعفر صادق' حضرت ابراھیم ادھم بلخی' شیخ فضیل ابن عیاض' حضرت بشر حافی اور صوفی ابو حفص وغیرہ سات مشاھیر بزرگان دین کے حالات زندگی' ان کی عبادات و ریاضات' روحانی مراقبات اور عشق الٰہی کے متعلق تذکرے کئے ہیں - صوفی منصور نے انا الحق کہا تھا - ان کے احوال زندگی اس کتاب میں مندرج ہیں - روحانی مجاھدات سے انسان کس درجہ

عظیم الشان صفائے باطن حاصل کر سکتا ہے اُسے ہم صوفی منصور کے احوال زندگی کے آئینے میں مشاہدہ کر سکتے ہیں' - منصور کے متعلق جو حکایات مشہور ہیں اُنھیں بنیاد بنا کر اور ان کے بارےمیں اردو کی ایک کتاب کا تتبع کر کے مزمل حق نے یہ تخلیقی کتاب تصنیف کی ہے - یہ کتاب بہت دلچسپ ہے - اس کتاب میں مزمل حق نے منصور کو مذہب کا متبع اور اس سے کمال عشق کی بنا پر اپنی جان کی قربانی پیش کرنے کو لائق توصیف وستائش ثابت کیا ہے -

کیدار ناتھ کی کتاب " مسلمان بھکتو چریت " (مسلمان فقرائے اخلاق و احوال) مطبوعہ ماگھ سنہ۱۳۳۵ب مطابق سنہ ۱۹۲۸ع بھی اس سلسلے میں لائق ذکر ہے - مشہور بزرگ حضرت اویس قرنی' حضرت فضیل بن عیاض' حضرت ابو عثمان خیری' حضرت ابو حافظ' حضرت ابراھیم ادھم' حضرت حسن بصری' حضرت مالک دینار' حضرت جنید بغدادی' حضرت سری سقطی حضرت یوسف حسین اور حضرت رابعہ بصریہ وغیرہ گیارہ اولیائے کرام کے سوانح حیات مذکورہ بالا کتاب میں مذکور ہیں - کیدار ناتھ متر نے ان کی ریاضات اور اخلاقی کاموں سے متاثر ہو کر ایک عقیدت مند کی طرح ان کے حالات لکھے ہیں -

مولانا منیر الزماں اِسلام آبادی کی تصنیف "نظام الدین اولیاء" بھی

اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے - حضرت نظام الدین اولیاء کی زندگی اور ان کے احوال ریاضت مولانا منیر الزماں نے اس کتاب میں قلمبند کئے ھیں -

اس کے علاوہ بنگلا زبان میں بہت سے تراجم اور اوریجینل (تخلیقی) تصنیفات نے اس شاخ ادب کو تقویت پہنچائی ھے - شیخ فضل الکریم نے "سماء تتو" کے نام سے " اثبات السماء" کا بنگلا ترجمہ ۲۷ صفحات میں پیش دیا - شیخ فضل الکریم نے اپنے ھم عصر بنگالی لوگوں کی دنیاوی زندگی کی خوشحالی اور خیالات کی اصلاح کیلئے بنگلا زبان میں مسلمان بزرگوں اور صوفیوں کی زندگی کے حالات تصنیف کئے تھے - "راج رشی (سلطان المشائخ) ابراھیم" ، "بی بی رحیمہ" اور " پوتھ و پاتھیو" (راہ و سامان) وغیرہ بہت ساری کتابیں انھیں مقاصد کے پیش نظر تدوین کی تھیں - مخلصانہ جذبات اور پرجوش خیالات ان کی ادبی تصنیفات میں اس قدر ھیں کہ مذھب کی طرف کھینچ لے جاتے ھیں - اُس زمانے کے اعلٰی ترین نثر نگاروں میں ان کا ایک خاص مقام تھا اور ان کے متعلق دوسرے اصناف سخن میں بھی تذکرے آتے رہیں گے -

نواب بہادر سید نواب علی چودھری نے سنہ ۱۹۰۰ع میں ایک کتاب "عید الاضحیٰ" کے نام سے ایک سو چوھتر ۱۷۴ صفحات میں لکھی تھی - انھوں نے اس کتاب میں عید الاضحی کے اثرات او

اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے - انھوں نے سنہ ۱۳۲۲ھ مطابق سنہ ۱۹۰۳ع میں ایک کتاب " مولود شریف بھی " ایک سو اُناسی صفحات پر شائع کی تھی - اس میں اُنھوں نے آنحضرت صلعم کی پیدائش سے شیرخوارگی کے زمانے تک کے بچپن کے حالات درج کئے ہیں -

سید امداد علی کی کتاب '' تاپوشی رابعہ '' (عابدہ رابعہ) (تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۳۱ع تعداد صفحات ۱۰۲) بھی اسی صنف سخن میں داخل کرنے کے قابل ایک اچھی کتاب ہے - امداد علی نے اس کتاب میں صرف حضرت رابعہ کی ظاہری زندگی ہی کے حالات بیان نہیں کئے ہیں بلکہ ان کی پیدائش، وفات اور دنیاوی زندگی کے مختصر حالات بیان کر کے حقیقت میں ان کی عبادت و ریاضت کے واقعات تفصیل سے بیان کئے ہیں - خدا کی محبت اور اطاعت میں مشغول ہونے سے انسان کس طرح اپنے تن، من، دھن، جوانی اور زندگی کو خدا کے راستے میں مٹا سکتا ہے - اس کا تفصیلی تذکرہ ہمیں امداد علی کی مذکورہ کتاب میں ملتا ہے - اس کتاب کی زبان بڑی شستہ اور انداز بیان بہت رواں ہے - ہم اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں - ابتدائی ۶۴ صفحات میں حضرت رابعہ کی زندگی کے حالات اور ریاضتوں کی حقیقت بیان کی گئی ہے - اس کے بعد کے صفحات میں صوفیوں کے اصول عبادت

اور ان کے طریقۂ ریاضت پر روشنی ڈالی گئی ھے - انداز بیان بےحد دلچسپ ھے . خیالات چونکہ واضح ھیں اس لئے مضمون بلندپایہ ھونے کے باوجود زبان کی سلاست میں فرق آنے نہیں پایا -

اس سلسلے میں مولوی اظہر علی کی تصنیف کردہ ''خواجہ معین الدین چشتی (رح)'' بھی قابل ذکر کتاب ھے - اس کتاب کی ادارت محمد قربان علی نے کی تھی - یہ کتاب سنہ ۱۹۲۲ءمیں شائع ہوئی تھی- اور اس کی مقبولیت کا اسی سے اندازہ ھوسکتا ھے کہ ۲۴ سال یعنی سنہ ۱۹۴۷ء تک کے درمیان میں یہ آٹھ مرتبہ چھپی اور ھاتھوں ھاتھ بکی -

شیخ حبیب الرحمٰن (شاھتو رتنو) کی کتاب '' اسلام دھر موتتّو '' جو سنہ ۱۹۰۷ء میں ۹۲ صفحات پر مشتمل شائع ھوئی تھی اور ''گلستاں'' (سنہ ۱۹۳۳ء) '' بوستاں'' اور اورنگ زیب کے حالات زندگی پر ایک تاریخی کتاب ''عالمگیر'' یہ سب قابل ذکر کتابیں ھیں جن سے شیخ حبیب الرحمٰن کی ادبی صلاحیت نمایاں ھوتی ھے - انھوں نے اسلامی صنف ادب کے علاوہ اور بھی متعدد کتابیں لکھی ھیں جن میں '' کرمو بیر منشی مہر اللہ '' (صفحات ۱۵۲ سنہ ۱۹۳۴ء) اور '' امار شاھتّیک جیبن '' (ھماری ادبی زندگی) قابل ذکر ھیں -

سنہ ۱۹۱۳ء میں غلام علی خندکار نے ایک کتاب '' ماجّوت ''

(معجزات) ۵۹ صفحات میں قلمبند کی - هر نبی سے کچھ نہ کچھ معجزات ظاهر هوئے هیں - یہ کتاب انھیں معجزات پر مشتمل ہے -

اس صنف سخن میں بعض قابل ذکر کتابیں یہ هیں :—

غلام محمد کی مصنفہ " اسلام شار شنگر هو " (ترجمہ ' صفحات ۷۶ اِشاعت سنہ ۱۹۱۳ع) دیوان شاہ عبد الرشید چشتی بنام " گیان شندهو یا گنج توحید ' صفحات ۱۷۸ - سنہ ۱۹۱۹ع صدر الدین احمد کی کتاب - " علم تصوف "- صفحات ۲۴ - دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۴ع اس کتاب پر مصنف کا نام نہیں ہے - صدر الدین اس کے ناشر هیں - " حضرتیر بچنا بولی " (اقوال حضرت) - صفحات ۳۲ - دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۴ع یہ کتاب اغلباً خان بہادر احسن اللہ صاحب کی مرتب کی هوئی ہے -

" اسلامیر شکّھا و شُندرجو "- حصۂ اول - دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۴۴ع - اس پر مصنف کا نام نہیں ہے - اس کا ناشر " محمدی بک ایجنسی المکتبہ " ہے - بنگال کے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی اصلاح کے پیش نظر یہ کتاب قلمبند کی گئی تھی -

شاعر غلام مصطفےٰ کی مصنفہ " جے پراجے "- یہ کتاب " اخوان الصفاء ' کا ترجمہ ہے - انھوں نے مسدس حالی کا منظوم ترجمہ بھی شائع کیا ہے -

" مصطفٰی چریت" کے مصنف مولانا محمد اکرم خاں کی کتاب " شمشّا و شمادھاں " (مشکلات اور اس کا حل) بھی اسی ضمن میں قابل ذکر کتاب ہے - اس کتاب میں اگرچہ اسلامی حقائق کا تذکرہ نہیں ہے لیکن اسلامی سماج اور اس کی معاشرت کے بارے میں احکام اسلام کے مطابق سود ' بدکاری اور موسیقی و غیرہ مختلف امور پر محققانہ تبصرے اور اس کے مناسب حل بڑی کاوش سے لکھے گئے ہیں - دور حاضر کی بنگلا زبان اور بنگالی ادب میں مولانا اکرم خاں کا حصہ نہایت عظیم اور یادگار رھنے کے قابل ہے -

ڈاکٹر محمد انعام الحق (سال پیدائش سنہ ۱۹۰۲ع) کی کتاب " بنگے صوفی پر بھاب " (بنگال پر صوفیوں کے اثرات) ایک محققانہ کتاب ہے - اس میں صوفیانہ حقائق پر قابل اعتماد مباحث اور تفصیلات ہیں ڈاکٹر انعام الحق نے اپنی اس کتاب میں بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ شریعت اسلام اور صوفی مت میں کہاں کہاں مطابقت اور کن کن مقامات پر مخالفت ہے - نیز یہ کہ تصوف نے بنگال کے مسلمانوں کی زندگی پر کیا اثرات ڈالے ہیں اور آج بھی اس کے کیا کیا اثرات نمایاں ہیں - اس کے ساتھ ہم ڈاکٹر انعام الحق کی کتاب "پوربو پاکستانے اسلام" کا بھی تذکرہ کر سکتے ہیں - انھوں نے اس

کتاب میں تفصیلی طور پر مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کی آمد کے آغاز سے مسلمانوں کی اس خطے میں حکومت کے قیام اور اس کے اہم تاریخی واقعات کا تذکرہ کیا ہے ۔ انھوں نے اس کا بھی منصفانہ طور پر انکشاف کیا ہے کہ اس خطے میں مسلمانوں کی اکثریت کے کیا اسباب ہیں ۔

سید عبد المنان نے علامہ اقبال کی کتاب " اسرار خودی" کا بنگلا ترجمہ کیا ہے ۔ انساب کے بنگلا ایڈیشن کی اشاعت سے قرآن کی بنیاد پر اسلامی فلسفہ اور خودی کے اسرار سے بنگالیوں کو واقفیت حاصل ہوئی ۔ اسلامی امور کے متعلق اور بہت ساری کتابوں میں سے مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں :-

عبد اللہ سہروردی کی کتاب "Sayings of Mohammad" کی مطابقت میں ، محمد یسین کی تصنیف " اسلامیر بشے شتّو" (اسلام کی خصوصیات) ۔ صفحات ۵٦ سنہ ۱۹۳۰ع ۔

اے ۔ اے ۔ رحمانی کی مصنفہ " سوغات مسلم " صفحات ۳۴ ۔ سنہ ۱۹۳۵ع اس کتاب میں ایک معلم اور ایک متعلم کے درمیان سوال و جواب کی صورت قائم کی گئی ہے ۔ معلم نے شاگرد کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم اسلامی خصوصیات کو "کہاں کہاں" سے حاصل کر سکتے ہیں ۔ اے اے رحمانی نے اپنی کتاب سوغات مسلم کے ذریعہ احمدیہ جماعت کی تردید کی ہے ۔

اے - زیڈ نور احمد نے اپنی کتاب "محدث" کے ساتھ ساتھ "خلفائے راشدین" کے نام سے ۳۲ صفحات پر مشتمل ایک کتاب سنہ ۱۹۳۷ع میں لکھی جس میں بخاری، نسائی، ابو داؤد، ابن ماجہ، مسلم اور ترمذی وغیرہ حدیث کی کتابوں سے مختصر طور پر خلفاء کی سوانح جمع کی ہے - یہ مقالہ سنہ ۱۳۳۴ب میں ڈھاکہ سے مسلمان سماج کے نقیب "شیکھا" میں شائع ہوا تھا اور پھر کتابی صورت میں علحدہ شائع ہوا - اس کے علاوہ اے - زیڈ نور احمد کی دوسری کتابیں یہ ہیں -

(۱) "حضرتیر نتھا مریتو" (نبی اکرم ص کے خطبات کا ترجمہ) -

(۲) "قرآنیر کتھا" -

(۳) "نیا زمانہ" -

(۴) "راشٹرو گرو" (بطل سیاست) جمال الدین افغانی وغیرہ وغیرہ - مولانا رومی کی مثنوی کا منثور ترجمہ مولوی اظہر علی بختیاری نے کیا - یہ کتاب ۱۹۶ صفحات میں ہے اور اب تک اس کے گیارہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں -

خندکار امین الدین احمد کی کتاب "دعوت اسلام" سنہ ۱۹۴۱ع میں شائع ہوئی - اس کا پہلا ایڈیشن ۲۳۵ صفحات پر مشتمل تھا - سنہ ۱۹۰۹ع میں کلکتہ کے ٹاون ہال میں ہندوستانی مذاہب کا ایک

مشترک جلسہ (Parliament of Religions) منعقد ہوا تھا - اس جلسے میں مذھب اسلام کے متعلق مقالات پڑھنے کی ذمہ داری خواجہ کمال الدین، صلاح الدین خدا بخش، مرزا ابو الفضل اور خندکار امین الدین احمد پر ڈالی گئی تھی - خندکار امین الدین احمد نے اسلام کے متعلق جو مقالہ اس اجتماع میں پڑھا تھا اسی کو بعد میں زیادہ مفصل اور مبسوط صورت میں بنام "دعوت اسلام" شائع کیا گیا -

دور قدیم سے دنیا میں جتنے مذاھب منصۂ شہود پر آئے تھے - انھیں کی تدریجی اور فطری ترقی یافتہ صورت کو اسلام کے نام سے حضرت محمد صلعم نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا - جس دور میں قدیم مذاھب دنیا میں ظاھر ھوئے تھے اس دور کے تمام تقاضوں کو اُن مذھبوں نے پورا کیا لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے ان مذاھب میں تبدیلیاں پیدا کردیں اور انھیں محرف کر ڈالا - اسلام کوئی آنی یا زمانی مذھب نہیں ھے بلکہ انسانی عقل و فہم سے بالا تر ھوکر عالم انسانیت کے تمام ادوار کیلئے اسلام نے اپنے آپ کو پیش کیا ھے - خندکار امین الدین احمد نے اپنی اس کتاب میں اسلام کے احکام و ھدایات کا دیگر مذاھب عالم سے مقابلہ کرکے اسلامی ھدایات کی برتری، عام تقاضوں سے زیادہ تناسب اور اس کا ضروریات انسانی پر زیادہ حاوی ھونا

بدلائل ثابت کیا ھے ۔

امین آباد ضلع ڈھاکہ کے باشندے محمد مظفر حسین ایک مقالہ نگار ھیں ۔ ان کی تصنیفات میں " اسلامے پارتھب اُونّوتی" (اسلام میں دنیاوی ترقی) جنوری سنہ ۱۹۴۲ع میں ' " پردا تتّو " (حقیقت پردہ) کا دوسرا ایڈیشن اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ع میں اور " پریدار نا ھے کاراگار " (تاھّل یا تقیّد) قابل ذکر ھیں ۔ یہ آخری کتاب حقیقت میں ایک معاشرتی کتاب ھے ۔ مگر اسے اس شاخ ادب میں جگہ دینے کی وجہ یہ ھے کہ مظفر حسین کا معاشرتی تخیل بھی اسلام سے متاثر ھے ۔

الحاج قاضی مولانا محمد غلام رحمٰن کی کتاب " مقصودالمؤمنین " یا " بہشت ایر کنجی " کے پہلے اور دوسرے حصوں کے اب تک چودہ ایڈیشن شائع ھو چکے ھیں ۔ یہ کتاب چار سو تئیس صفحات پر طبع ھوئی ھے ۔ اسمیں انھوں نے آیات قرآنی ' احادیث رسول اور دوسرے مختلف دلائل کی مدد سے اسلامی احکام کی تشریح کرنے کی کوشش کی ھے ۔

اظہر علی کی تصنیف " خواجہ معین الدین چشتی (رح) " کے طابع و ناشر محمد قربان علی کی کتاب " عمدۃ الاسلام " ۳۴۳ صفحات پر تصنیف ھوئی ۔ اس کا چوتھا ایڈیشن سنہ ۱۹۵۱ع میں شائع ھوا ۔ اسلام کے عملی ارکان نماز ' روزہ '

حج و زکوٰۃ اور اسلامی احکام و ھدایت پر یہ کتاب مشتمل ھے -

محمد اظہر الدین نے سنہ ۱۹۳۲ع میں " قرآنیر آلو" (نور قرآن) کی تصنیف کے کچھ دنوں بعد ہی تین سو چار صفحات پر ایک کتاب بنام " حدیث یر آلو " (انوار حدیث) شائع کی - اسے ھم احادیث رسول کا ترجمہ بھی کہہ سکتے ھیں - اس کتاب میں صحاح ستّہ، مشکوٰۃ اور جامع صغیر وغیرہ مستند کتب احادیث سے ایک ہزار پچیس صحیح حدیثوں کے تراجم شستہ اور دلفریب بنگلا زبان میں جمع کئے گئے ھیں - حضور اکرم صلعم کے وسیع المطالب اقوال انسانیت کا عام سرمایہ ھیں - ان پر تمام دنیا کے انسانوں کا یکساں طور پر حق ھے - اس نظرئیے کو پیش نظر رکھ کر اظہر علی نے اقوال رسول سے یہ حقیقت ثابت کرنے کیلئے ایک ھزار سے زیادہ حدیثوں کو بنگلا زبان میں منتقل کر کے بنگلا ادب کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ھے - اس کے علاوہ " عرب یر آلو " نام سے بھی ان کی ایک تصنیف پائی جاتی ھے - یہ کتاب حقیقت میں حضرت محمد صلعم کی سوانح حیات پر مشتمل ھے - یہ بات بالکل ظاھر ھے کہ اظہر الدین نے اپنے ان انوار ثلاثہ کے ذریعہ مذھب اسلام اور مسلم تہذیب و ثقافت کو پوری طرح اُجاگر کرنے کی کوشش کی تھی -

---*o*---

قرآن پاک کے تراجم اور ہدایات ربانی کی تشریح

سنہ ۱۸۷۶ء تک کسی شخص کی توجہ اس بات کی طرف مبذول نہ ہو سکی کہ بنگلا زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ پیش کیا جائے - اس اہم فرض کی ادائیگی کیلئے سب سے پہلے پختہ عزم و ہمت کے ساتھ ایک ہندو بنگالی گریش چندر سین نے کمر ہمت باندھی - مولانا محمد اکرم خاں صاحب اس ترجمہ کے چوتھے ایڈیشن کے شروع میں گریش چندر کے حضور میں نظر عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں — " گریش سین کی اس غیر معمولی خدمت اور بےمثل کامیابی کو آٹھواں عجوبہ کہا جاسکتا ہے " - کیشب چندر نے گریش چندر سین کو ترجمۂ قرآن اور اسلامی موضوعات پر دوسری کتابیں لکھنے کی ہدایت کرتے وقت یہ دعا دی تھی کہ تمہاری زندگی اس مرد عظیم الشان یعنی حضرت محمد صلعم کی برگزیدہ زندگی سے حیات حاصل کر سکے - ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ گریش چندر سین کی تمام تر خدمات اور تصنیفات میں اس دعا نے اپنی قبولیت کا اثر دکھایا ہے -

سنہ ۱۸۸۱ء سے سنہ ۱۸۸۶ء کے اندر گریش چندر سین کا یہ کامیاب بنگالی ترجمۂ قرآن طبع ہوا اور سنہ ۱۸۸۶ء میں مکمل ترجمہ شائع ہوا - اس ترجمہ کو اصلی متنِ قرآن سے الگ کرکے شائع

کیا گیا تھا - اس کے پہلے ایڈیشن کی طباعت میں خود گریش چندر سین نے ذاتی طور پر دیکھ بھال کی ذمہ‌داری اپنے سر لی تھی - ان کے اس ترجمے کا چوتھا ایڈیشن ان کی وفات کے بہت دنوں بعد سنہ ۱۹۳۶ع میں شائع ہوا -

گریش چندر سین نے ترجمۂ قرآن پاک کے ذریعہ بنگال کے چار کروڑ مسلمانوں کو اللہ، رسول اور قرآن سے واقف ہونے کا موقع دیا - اس عظیم الشان نیک کام کے قائد (Pioneer) کی حیثیت بنگلا زبان میں انھیں کو حاصل ہے -

گریش چندر سین کے ترجمے سے اکتساب فیض کرکے زمانۂ مابعد میں قرآن پاک کے ایک حصے کا ترجمہ مولوی نعیم الدین ساکن کراتیہ نے پیش کیا - انھوں نے تقریباً نصف قرآن کا ترجمہ کیا تھا - بنگال کے مسلمانوں میں سب سے پہلے یہ کام انھیں نے کیا - اس کے علاوہ ان کی کتاب "زبدۃ المسائل" بھی قابل ذکر کتاب ہے - مختلف کتابوں سے ضروری مسائل بنگلا زبان میں جمع کر کے انھوں نے ایک کتاب میں پیش کئے ہیں - یہ کسی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے - اس کتاب کو انھوں نے دو حصوں میں مکمل کیا تھا - اس کے علاوہ انھوں نے عربی فقہ کی مشہور کتاب "فتاوائے عالمگیری" کا بنگلا ترجمہ بھی چار جلدوں میں پیش کیا تھا - اس کے بعد ۲۴ پرگنہ کے باشندے مولوی عباس علی نے قرآن پاک کا مکمل بنگالی ترجمہ پیش

کیا - مولوی عباس علی کا ترجمہ شائع ہونے سے کچھ دنوں بعدھی " پریو پیغمبریر پریو نتھا " اور " صحابیہ " کے مصنف خان بہادر تسلیم الدین احمد صاحب سا ئن رنگ پور نے تین مساوی جلدوں میں قرآن پاک کا مکمل بنگالی ترجمہ پیش کیا - ان کے ترجمے میں بھی اصلی عربی عبارت نہیں ھے - لیکن ھر صفحے کی جدول پر سورہ، رکوع اور آیات کا اشارہ مذکور ھے - خان بہادر مذکور کے ترجمۂ قرآن پاک کا پہلا حصہ جو دس پاروں پر مشتمل تھا سنہ ۱۹۲۲ع میں اور دوسرے دس پارے کا ترجمہ سنہ ۱۹۲۳ع میں اور پھر آخری دس پاروں کا ترجمہ سنہ ۱۹۲۵ع میں شائع ھوا -

ٹنگائل ضلع مومن شاہی کے باشندے مولوی ابو الفضل عبد الکریم نے بھی مکمل قرآن مجید کا بنگالی زبان میں ترجمہ کیا تھا - اس ترجمے میں اصلی متن کی عبارت بھی محفوظ رکھی گئی ھے - مولوی عبد الکریم ابتداءً کسی ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کے عہدے پر فائز تھے - بعد میں کلکتہ یونیورسٹی کی ملازمت میں داخل ھوگئے اور یونیورسٹی کی عربی و فارسی مطبوعات کے پروف ریڈر کی حیثیت سے کام کرتے رھے -

سنہ ۱۹۳۸ع میں مولوی محمد عبد الحکیم اور مولوی علی حسن نے مشترکہ طور پر قرآن پاک کے متن کو باقی رکھ کر خالص اور

ادیبانہ بنگلا زبان میں ترجمہ اور تفسیر مرتب کیا ۔ تمام مطبوعہ تراجم میں یہی ترجمہ سب سے زیادہ وقیع اور بلند پایہ ہے ۔ اس ترجمے میں اس بات کی خاص طور پر رعایت کی گئی ہے کہ زبان ادیبانہ رہے اور متن کے محاسن تا بحد امکان باقی رکھے جائیں ۔ تفسیر میں بھی تحقیق اور تفصیل کی شان پائی جاتی ہے ۔ انھیں محاسن نے اس ترجمے کو ترفع اور تفوق بخشا ہے ۔ حاشیہ پر آیات کا شمارہ دے کر قارئین کے لئے سہولت پیدا کی گئی ہے ۔ اس طرح اصل صفحہ میں متن اور ترجمہ ہے اور نیچے تفسیر ۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ " سیل "، " ریڈول "، " پامر "، سر سید احمد اور محمد علی وغیرہ جدید مفسرین پر سیر حاصل تنقیدات اور مدلل جرح و تعدیل بھی ہے ۔

سنہ ۱۹۵۲ع میں خان بہادر عبد الرحمان خاں نے اصل متن کو باقی رکھ کر مکمل قرآن پاک کا بنگالی ترجمہ شائع کیا ۔ عبد الرحمان خاں کے ترجمے کی زبان آسان اور رواں ہے ۔

اس ترجمے میں جابجا حاشیہ پر تشریحات بھی ہیں ۔ چونکہ فہم قرآن کیلئے مبلّغ اول حضرت محمد صلعم کی زندگی کے احوال سے واقف ہونا اور اسلام کے بنیادی مسائل اور اہم معلومات سے باخبر ہونا بھی ضروری ہے اس لئے خان بہادر صاحب نے " اسلام پُوری چیتی " (تعارف اسلام) کے نام سے ایک

مفید رسالہ بھی آغاز ترجمہ میں شامل کردیا ہے۔ اس رسالے میں باب الایمان سے شروع کرکے اسلامی معتقدات اور ہدایات کے مطابق معاشرتی امور اور گھریلو زندگی پر بھی مفید تبصرے ہیں۔ انھوں نے انفرادی اور سماجی زندگی سے انسانی تعلقات کی استواری اور اس کی متعینہ قدروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ہم اس رسالے کو ان کے ترجمۂ قرآن کا مقدمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے بھی ترجمۂ قرآن پاک کی تکمیل کی ہے۔ ان کے ترجمے میں ایک طویل مدت کی مساعی پوشیدہ ہیں۔ یہ ترجمہ شائع ہوجانے سے بنگلا زبان میں یہ صنف ادب اور بھی ترقی یافتہ اور بالیدہ ہوگی۔

مذکورۂ بالا مکمل یا نا تمام تراجم قرآن کے علاوہ اور بھی بہت سارے لوگوں نے جزوی تراجم کئے ہیں۔ بعض اہل قلم حضرات نے قرآن پاک کی بعض آیات یا سورتوں یا اجزائے سور کا بنگلا مجموعہ شائع کیا ہے۔ یہ مسلسل ترجمہ نہیں ہے بلکہ مختلف مقامات سے احکام و ہدایات کا مختصر مجموعہ ہے۔

مولانا روح الامین نے بھی "پارۂ عمّ" اور ابتدائی تین پاروں کے ترجمے کئے ہیں۔ مولانا اکرم خاں نے بھی پارۂ عمّ اور ابتدائی دو سورتوں کے ترجمے کئے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۲ع میں

جب مولانا اکرم خاں علی پور سنٹرل جیل میں حکومت برطانیہ کے مہمان تھے اسی زمانے میں پارۂ عمّ کا ترجمہ مکمل ہوا تھا۔ " أنمول قرآن " (انمول) کے نام سے مولانا موصوف نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ اور تفسیر بھی علحدہ ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کی تھی۔ سردست مولانا صاحب قرآن پاک کے مکمل ترجمہ و تفسیر کے کام میں مشغول ہیں۔ ان کا ترجمہ اور تفسیر ۲۵ پاروں تک پہنچ چکی ہے۔

مولوی یار احمد نے بھی عمّ پارہ کا ترجمہ کیا تھا۔

ڈاکٹر محمد قدرت خدا نے " پوبتر و قرآن یر پوتو لو تھا " (پاک قرآن کی مدفون باتیں) کے نام سے احکام قرآنی کا بنگلا زبان میں ترجمہ کیا۔ اس کا پہلا اور دوسرا حصہ بترتیب سنہ ۱۹۴۵ع اور سنہ ۱۹۴۷ع میں شائع ہوا۔ ان دونوں حصوں میں پانچویں پارے تک سے قرآن کی عظیم ہدایات اور ان کے معارف کو وقت کے ساتھ موازنہ کرکے حکیمانہ طور پر سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

قاضی نذر الاسلام نے بھی عمّ پارہ کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ باریسال کے باشندے میر فضل علی نے بھی قرآن پاک کے مختلف اجزاء کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور اسے " قرآن کونیکا " (قرانی جواہر پارے) کے نام سے موسوم کرکے شائع کیا ہے۔

ان کا ترجمہ محاسن ظاہری سے مالا مال ہے ۔

اس سلسلے میں محمد اظہر الدین کی کتاب " قرآن یر آلو " (نور قرآن) بھی قابل ذکر ہے ۔ اس کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے ۔ یہ کتاب چار سو چون صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کی طباعت سنہ ۱۹۳۰ع میں ہوئی تھی ۔

" پیغمبر کاھنی " اور " اسرائیل بنگشیو نو بی گون " (انبیائے بنی اسرائیل) کے مصنف فضل الرحیم چودھری کی کتاب قرآن یر شو بورنو کنجیکا " (قرآن کی اچھی کنجیاں) بھی خاص طور پر قابل ذکر کتاب ہے ۔ اس کتاب میں قرآن پاک کی اعلیٰ تعلیمات جمع کی گئی ہیں ۔

مشہور و معروف صاحب قلم ابو الفضل کی کتاب " قرآن یر بانی " بھی اس صنف سخن کی ایک ادیبانہ تصنیف ہے ۔

ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے بھی سورۂ فاتحہ اور قرآن پاک کی آخری دس سورتوں کا ترجمہ اور تفسیر " مہا بانی " کے نام سے سنہ ۱۹۴۰ع میں شائع کی تھی ۔

علاوہ بریں سراج الاسلام کی " حضرت یر امرت بانی " اور مولوی نقیب الدین کی " قرآن تتو " (پانچ حصے) بھی اس شاخ ادب میں ذکر کرنے کے قابل کتاب ہے ۔

مولوی محمد تیمور کا بھی ایک مختصر مجموعہ جس میں

قرآن پاک سے منتخب اجزاء جمع کئے گئے ھیں ھمیں دستیاب ھوا ھے -

(د)

حضرت محمد (ص)، صحابہ اور انبیا و اولیا کی سوانح حیات

اُنیسویں صدی کے نویں عشرے میں " شودھاکر دل" کے کارکنوں نے بنگلا ادب میں اسلامی موضوعات پر تصنیفات کی بنیاد رکھی - ان کا اور ان کے متبعین کا سب بڑا مقصد یہ تھا کہ مذھب اسلام، اسرار تصوف، فلسفۂ مذھب اور اسلامی تاریخ کے قصے وغیرہ کو موضوع کلام بنا کر کتابیں لکھی جائیں - اس موضوع پر حضرت محمد (ص) کی سوانح عمری اور ان کی ھدایات (مجموعۂ احادیث)، حضرت محمد (ص) کے سابق العہد انبیا کی سوانح حیات، ان کے ضبط نفس، صبر و استقلال، تبلیغ مذھب کے اغراض، خلفائے راشدین اور دوسرے صحابۂ کرام کی سوانح حیات نے کافی اہمیت حاصل کی - ان سوانح کے ذکر سے در پردہ یہ مقصد تھا کہ ان عظیم المرتبت انسانوں کے عملی نمونہ ہائے حیات کو قارئین

اپنی نجی زندگی کا جز و بنا سکیں - ان موضوعات کے مصنفین نے اس سلسلے میں مفید تشریحات بھی فرمائی ھیں - اس صنف سخن میں حضرت محمد (ص) کے احوال زندگی پر سب سے زیادہ کتابیں تصنیف ہوئیں -

بنگلا ادب میں حضرت محمد (ص) کی سوانح حیات پر سب سے پہلے گریش چندر سین نے قلم اُٹھایا - ان کے بعد ہی "شودھا کر ل" کے قائد شیخ عبد الرحیم کا نام ہمیں دستیاب ھوتا ھے - پھر س جماعت کے ایک ممتاز رکن منشی ریاض الدین احمد کو ھم س میدان میں گامزن دیکھتے ھیں - اس موقع پر یہ مناسب معلوم ھوتا ھے کہ ھم محمد ریاض الدین احمد کی مصنفہ " حضرت محمد مصطفےٰ ر جیبن چریت " کے مقدمے سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کریں :-

" آنحضرت (ص) کی سوانح عمری عربی فارسی اور اردو زبانوں میں بہت ھے لیکن تقریباً ساڑھے تین کروڑ بنگالی مسلمانوں میں ے اب سے پچاس سال پہلے تک کسی مسلمان مصنف نے بھی ان کی مبارک سوانح حیات نہیں لکھی - سب سے پہلے نو تخلیق شدہ برھمو سماج مت کے متبع اچاریہ کیشب چندر سین کے باہمت شاگرد بابو گریش چندر سین نے آنحضرت (ص) کی ایک سوانح عمری بنگلا زبان میں لکھ کر شائع کی - اس سے پہلے وہ

قرآن پاک کا بنگلا زبان میں ترجمہ کر چکے تھے - ان کی مصنفہ سوانح عمری میں ان کے اپنے مذہبی معتقدات کے نقوش بھی نمایاں تھے - اِس کے بعد سنہ ۹۲—۱۲۹۱ب (واقعی طور پر سنہ ۱۲۹۴ب مطابق سنہ ۱۸۸۷ع) میں کلکتے کے باشندے تاؤتن اور سین زیویرس کالج کے فاضل پروفیسر عربی و فارسی جن کے عزم و حوصلے، همت و لیاقت اور بیداری و دل سوزی نے هم سب کا دل موہ لیا ھے یعنی مولوی معراج الدین احمد مرحوم نے "منصور"، "مہر"، "شودھاکر" اور "مسلم هیتو ایشی" وغیرہ کے مدیر منشی شیخ عبد الرحیم صاحب کے ذریعہ آنحضرت (ص) کی ایک سوانح عمری لکھا کر طبع کرائی - مذکور الصدر مولوی معراج الدین احمد صاحب مرحوم نے عربی اور فارسی زبانوں کی مستند تاریخوں سے اس کتاب کا مواد فراهم کیا تھا اور یہی سبب ھے کہ یہ کتاب مبسوط اور مسلمانوں کے پڑھنے کے قابل تیار ہوئی - اس سوانح عمری میں مذهب اِسلام کے اصول سے متعلق تفصیلی تذکرے هیں -

مذکورہ اقتباس سے یہ بات اچھی طرح واضح هوتی ھے کہ رام پران گپت غالباً آنحضرت کی سوانح حیات کے چوتھے مصنف هیں -

رام پران گپت نے "حضرت محمد" نامی ایک کتاب جو ۵۵ صفحات پر مشتمل تھی سنہ ۱۹۰۴ع میں تصنیف کی - اس

کتابچہ میں رام پران گپت نے سچے مذہب اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں حضرت محمد صلعم کی جد و جہد کا تذکرہ کیا ہے۔ حضرت کی زندگی میں قوت عمل اور مجاهدۂ مذهبی کا یکساں روشن نمونہ دیکھ کر رام پران گپت مسحور ہوگئے ہیں۔ انہوں نے اپنے دلی تاثرات سے اس رسالے کو مرصع کیا ہے۔ اسی مصنف نے سنہ ۱۹۱۱ع میں ایک ضخیم کتاب بنام "اسلام کاهنی" مرتب کی۔ اِس کتاب میں تاریخ اسلام کے جستہ جستہ واقعات اور مذہب اسلام پر اصولی بحث پائی جاتی ہے۔

"شنجیبونی" کے مدیر بابو کرشنا کمار مترا نے بھی حضرت محمد صلعم کی سوانح حیات لکھی تھی۔ ان کی مصنفہ "محمد چریت (سیرت محمد صلعم) خصوصیت کے ساتھ هندؤں اور برهمو سماج کے متبعین میں مقبول هوئی تھی۔ سنہ ۱۹۰۸ع میں ابو الحسین نے حضرت محمد صلعم کی سیرت لکھی اور اُسے "حضرت محمدیر جیبونی" نام دیا۔ یہ کتاب دو سو اٹھارہ صفحات پر پھیلی هوئی تھی۔

اس کے کچھ بعد کی تحریرات میں سے خان بہادر تسلیم الدین احمد ساکن ضلع رنگ پور کی مصنفہ سیرت رسول صلعم بنام "شمرات پیغمبر" (شہنشاہ پیغمبران) تھی۔ یہ کتاب حضرت محمد صلعم کی سوانح کے اعتبار سے کافی مبسوط ہے اور بڑی

خوبیوں کے ساتھ لکھی گئی ہے ۔ حضرت محمد صلعم کی زندگی کے اہم واقعات کو یکجا کرکے تسلیم الدین احمد صاحب نے مورخانہ انداز سے اس کتاب کی تکمیل کی ہے ۔ تسلیم الدین صاحب نے اسی مقدس مقصد کے تحت قلم ہاتھ میں لیا تھا کہ مبلغ اسلام حضرت محمد صلعم کی پاک زندگی کا نمونہ بنگالی سماج میں پیدا ہو اور اس حیثیت سے بنگالی مسلمانوں کے اخلاق مضبوط ہوں ۔ تسلیم الدین کی مذکورہ کتاب " ثمرات پیغمر " میں یہ مقصد برابر پیش نظر رہا ہے ۔

مذکورہ مصنف کی اور بھی دو کتابیں اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں :—

۱۔ " پریو پیغمبر پر پریوکوتھا " ۔ (پیارے نبی کی پیاری باتیں) اس کتاب کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۵ع میں شائع ہوا ۔

۲۔ "صحابیہ"۔ یہ کتاب دسمبر سنہ ۱۹۲۶ع میں شائع ہوئی ۔

" پریو پیغمبر یر پریوکوتھا " درحقیقت مشکوۃ شریف کی پانچ سو احادیث کے تراجم کا مجموعہ ہے ۔ تعلیم صداقت ' شرافت ' حسن سلوک ' سچی زندگی وغیرہ موضوعات پر آنحضرت صلعم کی احادیث کا اقتباس کرکے تسلیم الدین نے اپنی مذکورہ کتاب تصنیف کی تھی ۔

" صحابیہ " (رض) میں ۲۷ مسلمان صحابی عورتوں کے احوال

زندگی درج هیں - ان میں ازواج رسول، دختران پیغمبر اور ان کی دیگر قرابت مند خواتین شامل هیں - اِس کتاب کی زبان بڑی آسان اور جاندار هے - اِسلام کے اِبتدائی دور میں قابل اِحترام خواتین عرب نے کس طرح حضرت محمد صلعم کی خدمت کے لئے ایثار اور قربانیاں پیش کی تھیں ان کا پورا پورا اندازہ اس کتاب سے هو سکتا هے - آنحضرت صلعم کی ازواج مطہرات، بنات اور دوسری صحابیات مسلم خواتین عالم کی سرگروہ اور سرتاج هیں - خانگی خدمات، تیمارداری، میدان جہاد میں آنحضرت اور مسلمانوں کی خدمت اور علمی میدانوں میں تفحص اور تحقیق کے جو نمونے ان خواتین نے همارے لئے باقی چھوڑے هیں وہ هر ملک اور هر زمانے کی عورتوں کے لئے لائق تقلید هیں -

علاوہ بریں تسلیم الدین نے " مواود نفیسه " اور " سوریا بجے، فتح الشام) نامی کتابیں بھی لکھی تھیں -

مولانا محمد اکرم خاں صاحب کی "مصطفے چریت" (سیرۃ مصطفےٰ) سنه ۱۹۲۴ع میں لکھی گئی - یهه ضخیم تصنیف ۷۷۵ صفحات میں حضرت رسول کریم صلعم کی زندگی پر ایک تحقیقی کتاب هے - مولانا اکرم خاں کی مذکورہ کتاب صرف رسمی طور پر لکھی هوئی کتاب نهیں هے - حضرت کی سیرت پر بحث کے سلسلے میں دوسرے مصنفین نے جو راسته اختیار کیا هے - اسے

مولانا اکرم خاں نے قصداً اختیار نہیں کیا - دوسرے سیرت نگاروں نے واقعات کے تذکرے میں تاریخ طبری، طبقات، ابن ھشام اور واقدی پر اپنے بیانات کی بنیاد رکھی ہے - انھوں نے آیات واحادیث کے میزان اعتدال پر واقعات کو پرکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی - مولانا اکرم خاں نے صرف مورخین کے بیانات پر بھروسہ نہ کرکے آیات واحادیث کے معیار پر واقعات اور حالات کو پرکھا ہے - مصطفیٰ چریت میں کورانہ تقلید کا وجود نہیں ہے - ھر واقعہ کو مولانا اکرم خاں نے اصول تاریخ کے مطابق کسوٹی پر جانچ پرکھ کر قبول یا عدم قبول کی سند دی ہے - ان کی زبان زوردار اور مدلل ہے - بانی اسلام حضرت محمد صلعم کے متعلق عالم اسلام میں جو عظیم الشان کتابیں لکھی گئی ھیں ان میں مصطفےٰ چریت کا بھی ایک خاص مقام ہے - بنگلا زبان میں حضرت کی سیرت اور مذھبی تحقیقات پر تمام شائع شدہ کتابوں میں مصطفےٰ چریت بلا شک و شبہہ سب سے اعلیٰ اور افضل تصنیف ہے -

غلام مصطفےٰ کی "بِشّونبی" سنہ ۱۹۴۵ع میں شائع ھوئی - حضرت نبی کریم کی سیرت، تبلیغ اسلام واشاعت دین کے متعلق اس صدی کی تصنیفات میں یہہ کتاب بھی قابل ذکر حیثیت رکھتی ہے - اس کتاب کا طرز بیان نہایت عمدہ اور دل چسپ ہے - غلام

مصطفی ایک شاعر ھیں اور بشونبی میں ان کے شاعرانہ محاسن کا بہت کچھ نمونہ نمایاں ھے - یہ کتاب ان کی طبعی آمد اور صحیح وجد ان کا بھی پتہ دیتی ھے -

خان بہادر احسن اللہ کی مرتبہ "اسلام وآدرشو مہاپُرش" بھی اس سلسلے میں ایک یادگار تصنیف ھے - یہ کتاب سنہ ۱۹۲۴ع میں لکھی گئی تھی - احسن اللہ عقیدت مند ھیں اور اسی وجہ سے یہ بات لازمی ھے کہ ان کی مذکورہ بالا تصنیف میں رسول کریم ص سے کمال عقیدت مندی کا اظہار فطری طور پر ھوگا اور واقعۃً ایساھی ھوا ھے -

مولانا عبد الخالق ایم اے کی مصنفہ "سید المرسلین" (حصہ اول - صفحات ۸۷۱ - اور مقدمۂ کتاب - صفحات ۱۱۰ -) نمبر ۲۴ - بخشی بازار ڈھاکا سے شائع کردہ مودود الرحمن و ابو احمد مبشر سنہ ۱۳۵۷ب مطابق سنہ ۱۹۵۰ع ایک بلند پایہ کتاب ھے - یہ اس صنف ادب میں ایک قابل ذکر تصنیف ھے - اس ضخیم کتاب میں مصنف کی والہانہ عقیدت مندی اور جوش محبت قابل دید ھے - لیکن اس کی زبان نقائص سے خالی نہیں ھے -

مقالہ نگار محمد واجد علی کی سیرت رسول بنام "مورو بھاشکر" پہلی بار سنہ ۱۹۴۱ع میں اور دوسری بار سنہ

۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی - اس کے صفحات کی تعداد ۲۰۵ ہے -
یہ بھی ایک قابل ذکر کتاب ہے - رسالہ " بلبل " کے مدیر حبیب اللہ بہار " انّتو جیبن سیریز " کے نام سے ایک سلسلہ تصنیفات کی اشاعت کے متمنی تھے - مذکورہ کتاب " مورو بھاشکر " اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی - اعتدال مزاج ، علمیت اور فکر و تحقیق میں واجد علی ایک خاص مقام کے مالک ہیں - انھوں نے اپنی اس تصنیف میں اپنی شہرت اور اپنے مقام کو بے داغ طور پر باقی رکھا ہے -

علاوہ بریں حضرت محمد صلعم کے متفرق واقعات کو یکجا کرکے واجد علی نے بچوں کیلئے ایک سیرت رسول بنام " چھوتو دیر حضرت محمد " سنہ ۱۹۴۸ء میں لکھی - اس میں ایمان و فکر کی تفریق ، نور و ظلمت کا فرق اور اسی قسم کے عنوانات پر سیر حاصل مضامین لکھے ہیں - مضامین اگرچہ وقیع اور بلند پایہ ہیں لیکن زبان کی سلاست نے اسے بچوں کیلئے لائق فہم بنادیا ہے - انھوں نے حضرت کو اس کتاب میں " اندھوکار جوگیر آلو " (دور ظلمت کا نور) کہا ہے - اس کتاب کا نام " آلوک شیشو " (منور بچہ) ہے -

یعقوب علی چودھری
(۱۸۸۷—۱۹۳۸ء)

موضع پنگسا ضلع فرید پور کے باشندے یعقوب علی چودھری نے مذہب اسلام، اسلامی فلسفہ، تصوف اور تمدن کی بنیادوں پر چار طویل مقالات قلمبند کئے تھے - ان کی مشہور اور قابل ذکر کتابوں کے نام "مانب موکوٹ" (تاج انسانیت) "نورنبی"، "شانتی دھارا" (موج امن)، اور "دھرم ایر کاھینی" (افسانۂ مذہب) ھے - یہ کتابیں اگرچہ مذہبی موضوعات پر لکھی گئی ھیں لیکن ان کا انداز بیان اس درجہ دلکش اور اسلوب تحریر اس قدر دل چسپ ھے کہ اس خطے کے ھندو اور مسلمان سب نے ھی اسے یکساں طور پر پسند کیا اور اس کے متعلق اعلی خیالات کا اظہار کیا - اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کتاب کے مختلف ایڈیشن شائع ھوئے - ان کی وفات کے بہت دنوں بعد سنہ ۱۹۵۳ء میں ان کی کتاب "مانب موکوٹ" کا پانچواں ایڈیشن طبع ھوا - یہ کتاب اٹھتر صفحات پر شائع ھوئی ھے -

نور نبی (صفحات ۱۱۴) کا تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۵۰ء میں شائع ھوا - شانتی دھارا کا چھٹا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۸ء میں طباعت

پذیر ہوا - "دھرمر کا ھینی" (شمارہ صفحات ۵۶) اگرچہ سنہ ۱۹۱۴ع میں سب سے پہلے شائع ہوئی تھی لیکن سنہ ۱۹۵۲ع میں اس کا پانچواں ایڈیشن نکلا -

"مانب موکوتھ" (سرتاج انسانیت) مذھب اسلام کے بانی ' نبی اعظم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور احوال زندگی پر مشتمل ھے - اس کتاب میں مصنف نے مختلف نظریات سے سیرت رسول اور ان کے اقوال و ھدایات سے بحث کی ھے - حضرت نبی کریم کے احوال زندگی سے بحث کرنے میں مصنف نے اس کتاب میں اغیار کے اقوال و اعتراضات سے بھی تعرض کیا ھے اور اسی کے اندر سے انھوں نے حضرت رسول کریم کے سدا زندہ رھنے والے آدرش کی تلاش کی ھے -

شانتی دھارا میں مصنف کے دو مقالے ھیں - شانتی دھارا در اصل اسلام کی تصویر ھے اسمیں اسلام کے مختلف رخ رمضان ' اذان ' عبادت ' لفظ اسلام کی لغوی تحقیق وغیرہ ھے - اسلامی آدرشوں سے معمور مقالات کو مجتمع کرکے اُسے شانتی دھارا کے نام سے موسوم کیا گیا ھے - بہ ظاھر یہ مقالات مختلف النوع اور منتشر نظر آتے ھیں لیکن یہ درحقیقت باھم مربوط ھیں اور اسلامی ھدایات ' محاسن' عظمت' فضیلت اور حیات جاوید بخشنے والی اخوت پر مبنی ھیں -

مذہب کے نام پر دنیا کے انسانوں کو ہمیشہ اور ہر موقع پر لا مذہبیت کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھ کر ان کے دل میں جو درد اور دکھ پیدا ہوا تھا اُسی سے ان کی کتاب ''دھرمیرکا ہینی'' کا سرچشمہ پھوٹ نکلا - دھرمیر کاھینی میں ارکان اسلام نماز، صداقت، خودغرضی، فیاضی، دیانت و مہمانداری اور سود وغیرہ مسائل پر مضامین ہیں -

کم سنوں کیلئے بھی حضرت رسول کریم کی سیرت پر کم کتابیں نہیں لکھی گئیں - بچوں کیلئے اس موضوع پر جو متعدد کتابیں لکھی گئیں انمیں چودھری یعقوب علی کی نور نبی سب سے ممتاز ہے - انھوں نے حضرت کی زندگی کے شیریں اور محبوب حصوں کو بڑی ہی شیریں اور پیاری زبان میں مجتمع کر کے اپنی اس کتاب کی بنیاد رکھی ہے - اس کتاب کی زبان میں صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ یہ بچوں کیلئے بہت سہل ہے بلکہ نہایت شیریں اور دلکش بھی ہے - ڈاکٹر روبندرو ناتھ نے اس کتاب کے متعلق فرمایا تھا کہ اس کی زبان آسان اور پیاری ہے نیز طرز تحریر بچوں کے پڑھنے کیلئے بڑا دلکش ہے - ایسی زبان لکھنا بڑا مشکل کام ہے - پانچ سات سال کی عمر کے بچوں کیلئے صرف معین الدین کی کتاب '' آمادیر نبیر کتھا '' (ہمارے نبی کی باتیں) کے علاوہ اس صدی میں اور کوئی کتاب نور نبی کے ہم پلہ

نہیں لکھی گئی ۔ اس کتاب سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یعقوب علی چودھری ایک بلند پایہ ادیب اور قادر الکلام نثار تھے ۔

یعقوب علی کی طرح مشہور و معروف ادیب بنگالی مسلمانوں میں اس صدی کی ابتدا میں کم پیدا ہوئے ۔ وہ ایک اعلی درجے کے مفکر اور فلسفی تھے ۔ ان کے بلند پایہ افکار اور اعلی تخییل کا ان کی کتاب " مانب موکوتھ " میں اچھی طرح اظہار ہوا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ اس کتاب میں حضرت رسول کریم کی سیرت کے بیان میں ان کی زبان بلند پایہ ' پرشوکت ' رواں اور پر زور ہوگئی ہے ۔ مانب موکوتھہ اور شانتی دھارا ایک ہی موضوع کے دو رخ ہیں ۔ یعقوب علی بڑے جدباتی Highly emotional تھے ۔ لیکن ان کے جذبات کی رو نے انھیں دلائل و شواہد سے کہیں بھی ہٹنے نہیں دیا ہے ۔ ان کی تصنیفات نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ اسلامی موضوعات پر بھی اعلی ترین درجے کا ادب مرتب کیا جا سکتا ہے ۔ بنگال کے تمام تر سرمایہ ادب منثور کا موازنہ کرنے سے یہہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یعقوب علی کی بلند پایہ اور مسحور کن تحریرات نے اس میں مفید اضافے کئے ہیں ۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ بنگال کے ہندو اور مسلمان ادیبوں کی صف میں یعقوب علی بھی

ایک خاص اور امتیازی مقام کے مالک ہیں ۔

شاعر مزمل حق نے نظم میں حضرت محمد (ص) کی سوانح حیات مرتب کی ۔ اس کتاب کا نام " حضرت محمد " ہے ۔ نذر الاسلام نے اس سلسلے میں جو کتاب "مرو بھا شکر" لکھی وہ نا تمام تصنیف ہے ۔

قربان علی کی تصنیف " شانتی کرتا حضرت محمد " (مالک امن حضرت محمد) اور عبد الجبار صدیقی کی کتاب "مانوشیر نبی" (آدمیوں کے نبی) بھی اسی صنف کلام میں داخل کرنے کے قابل کتاب ہے ۔

انیسویں صدی کے آخری عشرے سے بیسویں صدی کے نصف اول تک حضرت محمد (ص) کی سیرت کے علاوہ دوسرے انبیاکے احوال زندگی بھی بنگلا ادب میں قلمبند ہوئے ۔ معروف اور غیر معروف بہت سے ادیبوں نے اپنے قلم کا رخ اس جانب بھی موڑا ہے ۔ اس باب میں مسلم سماج کی عکاسی کرنے والے اور ناول " عبد اللہ " کے مصنف خان بہادر قاضی امداد الحق کی کتاب " نبی ر کاهینی " ایک کامیاب تصنیف ہے ۔ "نبی ر کاهینی" سب سے پہلے اس صدی کے تیسرے عشرے میں شائع ہوئی ۔ یہ ایک سو باسٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ۔ سنہ ۱۹۵۳ع میں اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن شائع ہو چکا ہے ۔ اس کتاب میں حضرت آدم ؑ ، حضرت نوح ؑ ، بہشت شداد، عاد و ثمود، حضرت ابراہیم ؑ ، حضرت یوسف ؑ ، حضرت

موسیٰ ۴ ، حضرت ایوب ۴ ، حضرت داؤد ۴ ، حضرت سلیمان ۴ ، حضرت یونس ۴ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام بارہ انبیائے کرام کے احوال زندگی بڑے ہی مصورانہ انداز اور دلکش طرز سے قلمبند ہوئے ہیں - یہ کتاب دراصل بچوں کیلئے لکھی گئی تھی - لیکن بچے اور بوڑھے سبھی انبیا کی زندگی کے معارف ، انکے دکھ سکھ اور انکی عبادت و ریاضت سے مستفید ہو سکتے ہیں - خالص طور پر بچوں کی کتاب کے نظرئے سے بھی ہم اس کتاب کو یعقوب کی "نور نبی" کے پلے میں رکھ سکتے ھیں -

مشہور ادیب فضل الرحیم چودھری دی کتابیں " پیغمبر کاھنی" اور " اسرائیل بنگشیو نبی گن " (انبیائے بنی اسرائیل) اس صدی کے تیسرے عشرے میں شائع ھوئیں - " پیغمبر کاھنی " میں ابتدائے خلقت سے حضرت یوسف (علیہ) تک تمام انبیا کی مسلسل تاریخ ھے -

دور سابق کے ھفتہ وار محمدی کے مدیر نظیر احمد چودھری کی تصنیف " فاروق چریت ' (سیرت فاروق صفحات ۲۱۹) سنہ ۱۹۲۶ع میں شائع ھوئی تھی - اس کتاب میں حضرت عمر رضی اللہ کے قابل تقلید احوال زندگی کے حالات بیان کئے گئے ھیں - اسی کے ساتھ ھم سید عبد الرؤف کی تصنیف " حضرت عمر " کا ذکر بھی مناسب سمجھے ھیں -

ابو احمد عبد الواسع نے سنہ ۱۹۲۷ع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سوانح عمری قلمبند کی - یہ کتاب ۸۷ صفحات میں ہے -

ایک سو ساٹھ صفحات کی ایک کتاب '' حضرت ابراھیم '' نامی مرزا سلطان احمد نے بھی لکھی تھی جس کا تذکرہ اس سلسلے میں مناسب ہے - اس کتاب میں حضرت ابراھیم کی ولادت سے ان کی کبر سنی تک کے حالات و اعمال مورخانہ طور پر بیان کئے گئے ھیں - شہر مکہ کا مقدس گھر کعبہ حضرت ابراھیم ؑ کے دست مبارک ہی سے تعمیر ھوا تھا - اس کتاب میں اس کا بھی تفصیلی تذکرہ ھے کہ کس طرح اور کن ھدایات کے ماتحت انھوں نے اس مقدس گھر کی تعمیر کی - مرزا سلطان کی اور دوسری تصنیفات یہ ھیں - (۱)حضرت محمد ص - (۲)حضرت ابوبکر رض - (۳)حضرت عمر رض - (۴)حضرت عثمان رض - (۵) حضرت علی رض - (۶) حضرت فاطمہ رض - (۷) حضرت نوح ؑ - (۸) حضرت داؤد ؑ - (۹) حضرت سلیمان ؑ - (۱۰) 'نیرباشی تا'' (بے گھر) ھاجرہ رض -(۱۱) مسلم پنچوشتی- حضرت مریم ؑ - (۱۲) حوا ؑ و آدم ؑ - (۱۳) مسلم تاپش دیر کتھا (مسلمان درویشوں کی باتیں) نظام الدین اولیا رح اور خواجہ معین الدین چشتی رح -

ایس واجد علی (بی - اے - کنٹب) کی مصنفہ ''پیر پیغمبر دیر کتھا'' (پیر اور پیغمبروں کے احوال) ۷۷ صفحات پر مشتمل ھے -

اس میں متعدد انبیا و اولیا کے احوال جمع کئے گئے ہیں - نثر کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں نظم کی آمیزش بھی ہے - اس میں جس طرح حضرت ابوبکر رض و حضرت عمر رض کے احوال ہیں اس طرح حضرت ابو حنیفہ رح، حضرت ابراهیم ادهم رح اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم کے جستہ جستہ احوال و اقوال بھی درج ہیں - اس مختصر مگر دلکش کتاب میں اولو العزم بزرگوں کی بہت ساری مفید باتیں جمع کی گئی ہیں -

ابو الغنی نور احمد کی تصنیف " خلفائے راشدین " (صفحات ۶۷۶ - طباعت اول سنہ ۱۹۵۳ع) بھی اس سلسلے میں ایک قابل ذکر کتاب ہے - ان کی تمام تر تصنیفات میں خلفائے راشدین ہی ان کا شاہکار ہے -

عبد القادر کی "خلفائے راشدین" خاص طور پر بچوں کیلئے لکھی گئی ہے اور اس صنف ادب میں ایک مفید اضافہ کہی جا سکتی ہے - اس میں تاریخی واقعات قصے کے پیرائے میں بیان کئے گئے ہیں اور اس طرح ان کی تاریخی حیثیت بڑی ہی دلچسپ ہوگئی ہے -

اسی کے ساتھ " پیغمبر کاهینی" اور "اسرائیل بنگشیو نبی گن" (انبیائے بنی اسرائیل) کے مصنف فضل الرحیم چودھری کی کتاب "مشکوٰۃ شریف" بھی قابل تذکرہ ہے - اس میں "مشکوٰۃ المصابیح" کی منتخب احادیث کا بنگلا ترجمہ منضبط ہے - یہ کتاب ایک سو

صفحات پر مشتمل ھے - اور سنہ ۱۹۲۶ع میں شائع ھوئی - بلا شبہہ یہ ترجمہ ادبی حیثیت کا حامل ھے اور تراجم کے ادب میں ممتاز مقام رکھتا ھے - فضل الرحیم نے بخاری شریف کی منتخب احادیث کا ترجمہ بھی کیا تھا -

قرآن پاک کے مترجم اور " اسلامیر پریچیتی " کے مصنف خان بہادر عبد الرحمان خاں کی تصنیف " شیش نبی " (آخری نبی) سوانح رسول پر ایک لائق ذکر کتاب ھے - انھوں نے احکام قرآن اور سیرت رسول میں مطابقت دکھانے کی کوشش کی ھے - اس کے علاوہ اُن کا ترجمہ مشکوٰۃ بھی خاص طور پر قابل ذکر ھے - انھوں نے مکمل مشکوٰۃ کا ترجمہ تین جلدوں میں کیا ھے - تیسری جلد سنہ ۱۹۵۵ع میں شائع ھوئی - جلد اول میں انھوں نے ایک مفید اور قیمتی مقدمہ بھی شامل کیا ھے - بلاشبہہ ترجمۂ قرآن و احادیث کے سلسلے میں عبد الرحمن خاں کا نام بھی یادگار رھےگا -

باریسال کے باشندے مولانا فضل الکریم (بی - ایل) کا نام بھی بنگلا زبان میں اسلامی ادب کے سلسلے میں قابل ذکر ھے - ان کی مشہور تصنیف " آدرشو مانب ' (مرد کردار) ' " مانب دھرمو " (انسانیت کا مذھب) ' اور چار جلدوں میں شائع شدہ بنگلا ترجمۂ مشکوٰۃ اس سلسلے میں لائق تذکرہ کتابیں ہیں - "آدرشومانب' سیرت رسول پر ایک مفید کتاب ھے - " مانب دھرمو " میں انھوں نے

انسان کا فطری مذهب اسلام ثابت کیا هے - یه دو نـوں کتابیں کافی ضخیم اور ادیبانه طـرز ادا کی مالک هیں - ان دو نـوں سے فضـل الـکریم صاحب کی ادیبانه کاوش اور علمی تحقیق نمایاں ہوتی هے -

ان کتابوں کے علاوہ اس صنف ادب میں ابوالمنصور احمد کی کتاب " مسلمانی کتها " ، حبیب الله بهار کی مصنفه " عمر فاروق " بیگم شمس النهار کی کتاب "پنّو موئی" ، تراب علی کی تصنیف "چھوٹو دیر مصطفیٰ" ، "چھوٹو دیر فاروق چریت" اور صفی الدین احمد کی مصنفه "حضرت بڑو پیر صاحبر جیبنی" (حضرت بڑے پیر صاحب کی سوانح حیات) جسے محمدی بک ایجنسی نے شائع کیا اور ان کے علاوہ دوسری کتابیں شامل کی جاسکتی هیں *

کربلا سے متعلق ادبی تصنیفات

اسلامی سرمایۂ تاریخ پر ادب کی بنیادیں استوار کرکے بہت سے ادیبوں نے بنگلا زبان میں مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں - بالخصوص واقعات کربلا کو مرکزی نقطہ بنا کر بہت سارے شعرانے ادب منظوم میں اپنی تصنیفات سے اضافہ کیا - تاریخ اسلامی کے اس المناک سانحے نے ادب منثور کو بھی اپنا یا - میر مشرف حسین کی تصنیف "بشاد شندھو" محض مسلمانوں ہی کی منثور ادب میں ایک ممتاز درجہ نہیں رکھتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ سارے بنگالی ادب منثور میں اس جیسی تصنیفات بہت کم ملتی ہیں - فضل الکریم چودھری کی کتاب "محرم چِتّرو" (تصویر محرم) بھی اس موضوع پر ایک عمدہ کتاب ہے - یہ کتاب سنہ ۱۹۱۷ع میں شائع ہوئی تھی -

مولوی محمد عبد الرشید نے واقعات کربلا کو موضوع بنا کر "کربلا" نامی ایک کتاب لکھی - یہ کتاب دو سو تیس صفحات پر سب سے پہلے دسمبر سنہ ۱۹۳۶ع میں شائع ہوئی - بشاد شندھو، جدی نامہ وغیرہ کتابوں کے اثرات بنگال کے مسلم سماج پر کافی پڑے - اگرچہ یہ کتابیں واقعات کربلا پر مبنی ہیں لیکن ان میں تخیلات کی بلند پروازیاں اور افکار کی رنگینیاں بہت زیادہ ہیں - عبد الرشید کی

مذکورہ تصنیف ''کربلا'' میں تخییل کا زور نہیں ہے بلکہ واقعات اور بیان حقیقت پر اکتفا کی گئی ہے - انھوں نے تاریخ ابن خلدون ابن اثیر اور طبری وغیرہ اسلامی مستند تواریخ سے استنباط کرکے واقعات کربلا پر روشنی ڈالی ہے - ہم اسے تاریخ کی شاخ ادب میں بھی جگہ دیسکتے ہیں -

" بچوں کے حضرت محمد (ص) " بہت سارے لوگوں نے لکھے ہیں لیکن کربلا کے المیہ کو بچوں کیلئے دلکش بنا کر بہت کم ہی لوگوں نے پیش کیا ہے - بنگلا ادب میں اس کمی کو بنگلا کے بلند پایہ مسلم ادیب ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے پورا کیا اور اپنی کتاب کا نام " چھوٹودیر کربلا " یعنی بچوں کا کربلا رکھا - یہ کتاب ۶۴ صفحات پر طبع ہوئی ہے - یہ کتاب بڑے ہی دلکش انداز اور آسان زبان میں بچوں کیلئے لکھی گئی ہے - امداد الحق کی " نبی کاھینی " اور یعقوب علی چودھری کی نور نبی کے ساتھ اسلامی واقعات پر اساس رکھ کر بچوں کے ادب میں اس کتاب کو بھی ایک مستقل مقام حاصل ہے -

(اسی کے ساتھ بند علی میاں کی کتاب " چھوٹودیر بشاد شندھو" (بچوں کا بحر غم) بھی ایک قابل ذکر تصنیف ہے *

حصۂ سویم

چھٹاں باب

بنگلا ادب منثور کی ترقی

و

توسیع

(دور روبندرو ناتھ)

محمد عبد الحی ——— مترجم— مولانا عبد الرحمٰن بیھود

چھٹاں باب

بنگلا ادب منثور کی ترقی و توسیع

دور روبندرو ناتھ ۱۸۶۱—۱۹۴۱ء

روبندرو ناتھ بنگلا ادب میں اس قدر متعارف ھیں اور ان کی شخصیت اس درجہ عظیم الشان ھے کہ انھیں عام طورپر پیش کرنا غیر ضروری معلوم ھوتا ھے - انھوں نے تنہا نثر و نظم دونوں ھی کو ایک صدی آگے بڑھا دیا ھے - سارے بنگالی ادب میں روبندرو ناتھ جیسی فطری دھانت کی حامل شخصیت پیدا نہیں ھوئی - دنیائے ادب میں وہ بحیثیت ایک شاعر کے شہرت کے مالک ھیں -

انکی شاعرانہ صناعیوں نے میدان نثر میں انھیں اس قدر نمایاں ھونے نہ دیا - تاھم یہ امر حیرت ناک ھے کہ آج تک کے بنگالی نثر نگاروں کی امامت کا سہرا روبندرو ناتھ ھی کے سر ھے - جس طرح یہ حیثیت امامت دنیا کے کسی شاعر کیلئے لائق فخر و مباہات ھے اس طرح کسی ملک کے ادب کی ترقی کیلئے بھی یہ بات لائق افتخار ھے کہ ایسے ایسے اھل علم میسر آئے - بنگالی ادب میں روبندرو ناتھ

صرف عظیم ترین شاعر ھی نہیں بلکہ سب سے بڑے نثر نگار بھی ھیں اور ممکن ھے کہ ایک دن ان کے بارے میں یہ سوال بھی زیر بحث آئے کہ وہ ھر دو اصناف سخن میں سے کس صنف میں زیادہ عظمت کے حامل ھیں - اس سوال کا فیصلہ خواہ کچھ بھی ھو یہ بات متفق علیہ ھے کہ بنگلا نثر نے ان کے ساحرانہ تعلق اور معجزانہ افکار و تخییل کی بنا پر جو غیر معدود حلاوت، بے نہایت حسن اور بے مثال دلکشی کی دولت حاصل کی ھے اس سے انکار نہ آج ممکن ھے اور نہ دور آئندہ میں ممکن ھو سکے گا -

جس بنگالی نثر کی بنیادیں فورٹ ولیم کالج اور سری رام پور مشن میں استوار ھوئیں، جسے رام موھن رائے نے اپنی مادرانہ شفقت سے بار آور کیا، جس کی پرورش ودیا ساگر کے ھاتھوں ھوئی، جسے بنکم اور کالی پرو سنو سنگھ نے پروان چڑھایا اس ادب منثور نے روبندرناتھ کے ھاتھوں میں آکر جوانی اور حسن، ملاحت اور نکھار حاصل کیا - یہ حقیقت ھے کہ روبندرناتھ نے بھی اپنی تمام ترمساعی حیات کی قربانیاں دے کر بنگلا نثر کو ایک شاھد رعنا کے روپ میں جلوہ گر کرنے کیلئے وہ سب کچھ کیا جو انسانی بس میں ھو سکتا ھے - آج بنگالی ادب میں نظم کو جو درجہ حاصل ھو چکا ھے اُس کے ساتھ نثر کا تقابل اگرچہ موزوں نہیں لیکن ھم یہ کہہ سکتے ھیں کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کا

دامن کہیں بھی چھوڑا نہیں ہے اور تـوام نہ ہوکـر بھی متـوالی فرزندوں جیسی ترقی حاصل کی ہے -

بنگالی نظم کے میدان میں جس طرح انھوں نے بہاری لال کی تبعیت میں قدم رکھا تھا اسی طرح میدان نثر میں انھوں نے بنکم کی اقتدا کی تھی - اور یہی سبب ہے کہ روبندرو ناتھ کے ابتدائی ناولوں پر بنکم کا اثر غالب ہے - یہ سچ ہے کہ کـردار' طرز ادا اور تخلیق افسانہ میں تبعیت کا اثر نمایاں نہیں ہے لیکن زبان پر بنکم کے اثرات ہی غالب ہیں - بیان میں شستہ طرز ادا کے علاوہ مـکالمات میں بھی وہی رنـگ نمـایاں ہے - لیکن تھوڑے ہی زمانے میں روبندرو ناتھ نے بنکـم کے طـرز سے گذرکر خود اپنا طرز قائم کیا - انھوں نے اظہار خیالات میں شستہ زبان کو اپنایا اور مکالمات میں روز مرہ یا بـول چال کی زبان سے کام لیا - روبندرو ناتـھ نے " بھارتی " اور " شادھنـا " کے دور سے " سبز پتر " کے زمانے تک اپنے اسی طرز کو نبھایا اور بڑی خوش اسلوبی سے اپنائے رکھا - بنگـلا نثـر کا کون سا انداز بیان ان کے ادب پر مستولی ہو سکے گا اور نثر نگاری میں وہ کس طرز کو ترجیـح دیں گے یـہ کشمکش عـرصے تک انکے دماغ کـو متاثـر کرتی رہی - اگرچـہ روز مرہ کی طـرف ان کا رجحان غالب تھا لیکن وہ شستہ اور کلاسکل زبان کی طرف سے

یـک بیک اپنی عنان راهوارکو موڑ نه سکے ۔ اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے "یورپ پرو باشی پتر" (یورپ کے مسافر کے خطوط) میں روزمرہ کا آسان اور مدھ بھرا روپ پیش کیا ھے ۔ اس میں انداز بیان کی حلاوت اور حیـرتناک طور پـر سہل ممتنـع کے اختلاط نے ایک عجیب موثر گھلاوٹ پیدا کردی ھے ۔ تاھم نوبل پرائـز حاصل کرنے سے پہلے تک ان کی معرکـۃ آلارا تصانیف نثـر پر شستـه زبـان کا رنگ ھی غالـب رھا اور یـه ھمیں ان کے "گلپو گچھو" (گلدستہ افسانہ جات) کے افسانوں کی زبان میں نمایاں نظر آتا ھے ۔ ان کے "پوشٹھوماشٹر" (پـوسٹ ماسٹـر) "گھودھیتو پاشن"، "کابولی والا"، "ایک راتری"، نی‌شی‌تھے" وغیـرہ ان‌گنت افسانوں میں ھمیں شستہ زبـان (شادھو بھاشا) کا کوئی بھی روپ نظر نہیں آتـا ۔ کلاسیکل زبـان کی عظمت و شان اور عظیم المرتبت شاعرانہ تخییل کی بے پنـاہ روانی کے ساتھ ساتھ اتھاہ گہرائی نے ان کی عظیم شخصیت کا مظاہرہ کیا ھے ۔ اس زبان کی حلاوت اور ترنـم خیزی جـس طـرح جاذب دل ھے اس طرح حیرت انگیز اور ناقابل تقلید ھے ۔ مختصر افسانوں میں روبندروناتھ نے قدیم شستہ زبان کو اپنی پوری تابانی کے ساتھ اپنے آخری ناول "چترانگ" تک باقی رکھا ھے ۔

نثر کے طرز کو محفوظ رکھنے کیلئے ان کے زندہ دل نے اس کے

بعد ھی پختگی کے ساتھ اپنا انداز بدلا ۔ اسی تبدیلی ھی نے رو بندرو ناتھ کی ادبی زندگی کو حیات جاوداں عطا کی ورنہ رو بندرو ناتھ بھی آج ایک قابل فراموش ماضی بن کر رہ جاتے ۔ ان کے نوبل پرائز پانے کے بعد ھی پرمتھ چودھری نے اپنا ''سبز پتر' نکالا ۔ اسی سبز پتر کی راہ پر گام زن ھو کر رو بندرو ناتھ نے اپنی نثر و نظم کا انداز تحریر تبدیل کیا ۔ بول چال کی زبان کو ادب کا درجہ عطا کرنے کیلئے پرمتھ چودھری نے جو کوشش شروع کی تھی اس میں پیر مغان ادب رو بندرو ناتھ نے بھی اپنی شاگردانہ مساعی سے راہ ھموار کی ۔ پرمتھ چودھری کا نظریہ یہ تھا کہ زبان انسان کے منھ سے دھان قلم تک آتی ھے ۔ وہ قلم سے زبان تک نہیں جاتی اور اسی لئے خلاف اصول کوشش سرخروئی سے ھمکنار ھونے نہیں دیتی ۔ رو بندرو ناتھ نے بھی اس نظریئے سے اتفاق رائے کیا اور بنگالی ادب کی توسیع کیلئے جدید جاری شدہ '' سبز پتر '' کو اپنی تمام تر قلمی مساعی کا مرکز بنایا اور نئے سرے سے اپنے ادبی قافلے کا سفر شروع کیا ۔ اسی اخبار کے ذریعہ بنگلا جدید روزمرہ میں رو بندرو ناتھ کا پہلا ناول '' گھرے بائرے '' (گھر مین اور باھر) شائع ھوا ۔

اس کے بعد بھی طرز روزمرہ کے متعلق ان کے دل میں

وقتاً فوقتاً شکوک پیدا ہوئے اور انھوں نے قدیم شستہ زبان کو
بالکلیہ ترک نہیں کیا۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ روبندرو ناتھ نے
اپنی دوربینی کے ثبوت بھی فراہم کئے ہیں اور زندگی کے
آخری دس بارہ برسوں میں ان کی جس قدر تصانیف ناول،
افسانے، تنقیدات ادب، درسی کتب اور اعلی تعلیمی مقالات کے
سلسلے میں وجود پذیر ہوئیں وہ سب کی سب روزمرہ اور
بول چال کی زبان ہی میں منصۂ شہود پرآئیں۔ بنگالی ادب کی
تخلیق نو کی تاریخ میں روبندرو ناتھ ہی کے ذریعہ سے روزمر
ادب نے غیر فانی حیثیت کے ساتھ بلندی تخییل، عذوبت،
ملاحت، دلکشی، مٹھاس، روانی، پختگی، زوربیان،
گہرائی اور تیزی و تندی حاصل کی۔ قدیم شستہ اور روزمرہ
زبان کے ساتھ پرمتھ چودھری اور روبندرو ناتھ نے خیالات او
مواد مضامین کو بنیاد سے الگ اور مرکزی خیال سے غیر
مربوط نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے تنہا جس طرح اپنی مساعی
سے ادب منثور کی خدمت کی ہے اسی میں بنگلا نثر کے اد
مستقبل کی جانب بھی اشارات پائے جاتے ہیں۔ ار
روبندرو ناتھ نے روزمرہ کی زبان میں سیاست، فلسفہ
ادب، تنقید، قواعد، عروض و رموز، زبان
سائینس، تنقید مذہبی وغیرہ تحقیقی اور مشکل مضامین

زور طبع اور روانی قلم کا مظاہرہ کیا ہے - انھوں نے اپنی منظومات اور نثر کے ذریعہ یہ دکھا دیا ہے کہ روزمرہ کے ذریعہ بھی کس قدر دلکش انداز میں اظہار خیال کیا جاسکتا ہے - انکی آخری زمانے کی منظومات دراصل بول چال کی زبان میں نظم منثور کا مرتبہ رکھتی ہیں - ان کی زبان بےحد رواں ہے - یہ نظمیں نثر مسجع معلوم ہوتی ہیں اور نثر نظم معریٰ - ایسی زبان اور دلکش روانی نے بنگلا ادب میں ایک ناقابل بیان انداز کو جنم دیا ہے - جس طرح ان کی کتاب " گلپو گچھو " ایک ناقابل تتبع شاہکار ہے وہی کیفیت انکی ہر نثر و نظم میں نمایاں ہے - جس طرح گلپو گچھو کا کلاسیکل طرز، اس کی شیرینی، اس کی ترنم ریزی، گہرائی اور عذوبت ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے اسی طرح دور آخر کی نظمیں جو روزمرہ میں لکھی گئی ہیں اپنی دل فریبی میں روانی اور مسحورکن کیفیات کی وجہ سے سامع کے دل کو جنتی فضا میں جھولے جھلانے لگتی ہیں - دل بےقرار ہوکر سینے سے نکل پڑنا چاہتا ہے اور کسی حیثیت سے بھی دلکشی میں کمی محسوس نہیں ہوتی - روبندروناتھ کی بےمثال طبیعت نے بنگلا ادب پر ساحرانہ اثر ڈالا ہے اور اسی کے ثمرات ہمیں اس زبان میں نظر آتے ہیں - تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ روزمرہ کا طرز بعد ہی میں رونما ہوا ہے تاکہ وہ تاریخ ادب میں ایک مستقل اور لازوال

جگه حاصل کر سکے -

روبندرو ناتھ نے اگرچه تنها بنگالی ادب کو اس قدر ترقی یافته بنا یا تاهم مقابلةً بنگلا منثور ادب میں آج بھی بڑی خامیاں موجود هیں - سائنس، فلسفه، طبعیات، سائیکلوجی، سیاست اور معاشیات وغیره سائینسی مضامین و تنقیدات وغیره پر ابتک مناسب کتابیں لکھی نه جا سکیں . روبندرو ناتھ جیسی عظیم شخصیت بھی اس معاملے میں جو کچھ کر سکتی تھی وه ان کے ہاتھوں انجام نه پا سکا - کلاسیکل سنسکرت کے مجموعهٔ الفاظ سے بنگلا زبان نے بہت سارے الفاظ مستعار لئے هیں - سنسکرت سے مشتق الفاظ کے علاوه غیر سنسکرت زبان سے بنگلا میں مستعار لئے هوئے الفاظ بھی کم مستعمل نہیں ہیں- سائینس کے مضامین کی تحقیقات میں انگریزی زبان کے مشاهیر اهل قلم نے بھی جب لاطینی اور یونانی وغیره کلاسیکل زبانوں سے انگریزی میں الفاظ عاریةً لئے هیں اور نئے الفاظ خود بھی گھڑے هیں تو ایسے مضامین پر قلم اُٹھاتے وقت بنگالی زبان کے بلند پایه ادیب بھی اگر سنسکرت یا عربی و فارسی وغیره قدیم زبانوں کے اصلی الفاظ Root words کافی حد تک مستعار لیتے تو بنگلا زبان کی یه کمی پوری هو سکتی تھی - بنگلا ایک توسیع پسند زبان هے اور سنسکرت یا عربی کی طرح نحوی Analytical

ساخت Synthatic کی زبان نہیں ہے - نحوی ساخت کی زبان کے مصادر یا اصلی الفاظ کے ساتھ الحاقی یا اسباقی ٹکڑے لگا کر بہت سے الفاظ تیار کئے جا سکتے ہیں - اس قسم کے الفاظ سے حال کی زبانیں مملو ہیں - اس کی عمدہ مثال خود انگریزی زبان ہے - روبندرو ناتھ جیسے ذی الفطرت انسان ہی کیلئے یہ ممکن تھا کہ وہ بنگلا زبان کی اس خامی اور تنگ دامنی کو دور کرکے اس کی نثر کے دامن کو وسیع تر کرتے - لیکن ایسا نہ ہوا اور اس نہ ہونے ہی کی وجہ سے مقابلتہً بنگلا زبان میں توسیع نہ ہو سکی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جمال پرست روبندرو ناتھ نے بنگلا نثر کے اس جمالیاتی رنگ سے بے اعتنائی کا ثبوت بھی دیا ہے - تحقیق اور اسرار و غوامض کے مضامین میں بھی روبندرو ناتھ کے جمالیاتی ذوق نے ہمیشہ حسن و جمال ہی کی تلاش کی ہے اور یہی سبب ہے کہ اصل موضوع تشنہ رہگیا ہے - ان کی جمالیاتی تفصیلات نے اصل مضمون کو اس طرح چھپا لیا ہے کہ تلاش سے بھی ان مضامین تک دسترس نہیں ہوتی - الفاظ کی دلکشی اور معانی آفرینی ہی سارے مضامین پر غالب پائی جاتی ہے - روبندرو ناتھ کی تحریرات نثر میں جہاں یہ ایک کمی پائی جاتی ہے وہیں اس شاعر عظیم کی دستکاریوں نے انھیں دوسری بے مثال خوبیاں بھی بخشی ہیں -

سنسکرت زبان کے صناع ماہرون کا فیصلہ ہے کہ رس بھری

باتوں کو نظم کہا جا سکتا ہے - جس طرح خاص قسم کے لذیذ کھانوں سے زبان مزے حاصل کرتی ہے اسی طرح روبندرو ناتھ نے مخصوص الفاظ کے ذریعہ لطف اندوزیاں کی ہیں اور ان میں ان کے لذت آفریں مزاج اور کیف پرور طبیعت نے ناقابل بیان رس کا امتزاج کرکے جو مئے دو آتشہ تیار کی ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا - انہوں نے اس ذریعہ سے صرف نظم کی خصوصیات ہی نہیں پیدا کی ہیں بلکہ نثر میں بھی انہوں نے مناسب ترین الفاظ کے استعمال سے ناقابل انکار حد تک توسیع کے سامان فراہم کئے ہیں - انسان کے منھ سے نکلی ہوئی باتیں زبان کا روپ اختیار کرتی ہیں یا ترنم ریز نغموں کی جھنکار بن کر دل و دماغ کیلئے کیف اور راگنیاں بن جاتی ہیں اور ان کی باہمی نت نئی ترکیبوں سے لغوی معانی کے علاوہ ایک جدید اور اچھوتے معانی پیدا ہو کر سامع یا قاری کے دل و دماغ کو ناقابل بیان کیف و سرور میں غرق کر دیتے ہیں ان کا بےحد کامیاب نمونہ ہمیں روبندرو ناتھ کی تحریرات میں ملتا ہے - روبندرو ناتھ کی نثر پڑھکر یہ ہوش نہیں رہتا کہ کس عنوان پر مصنف نے خامہ فرسائی کی ہے بلکہ ذہن اس تصور میں ڈوب جاتا ہے کہ مصنف نے کس طرح اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہے - موضوع سخن خواہ کچھ بھی ہو ان کے اظہار میں روبندروناتھ نے شہد و شراب کا ممزوج کیف پیدا کیا ہے - ایسی عذوبت ،

ایسا نکھار، اس درجہ جذب اور اس حد تک صناعانہ دستکاری کا کوئی نمونہ ہمیں بنگالی نثر میں روبندرو ناتھ سے پہلے نظر نہیں آتا۔ روبندرو ناتھ کی بنگالی نثر کے ہر دو اصناف، خالص اور شستہ (شادھو) اور روزمرہ (کتّھو) میں خصوصیت کے ساتھ یہی بات مایۂ ناز اور طرۂ امتیاز دکھائی دیتی ہے۔ روبندرو ناتھ نے زبان کی دلاویز عظمت کو انسانی توقعات سے بالا تر کرکے ساحرانہ دلکشی بخشی ہے اور اسے انھوں نے انسانی آرزؤں سے بھی بڑی چیز اور غیر معمولی سرمایہ سمجھا ہے۔

روبندرو ناتھ کے ہاتھوں معمولی معمولی باتوں نے ادب کا روپ حاصل کر لیا ہے اور ان کا ہر لفظ دلیل راہ بن گیا ہے۔

روبندر وناتھ کی "چھنّو پترو"، "جیبن سریتی"، "پنچو بھوت"، "بی چتّرو پروبندھو"، "پراچین شاھتو"، "آدھنک شاھتو"، "شکھا"، "سماج"، "کال انتر"، "شبدھو تتو"، "چھندو" اور مذھبی موضوعات پر منثور کتابوں میں بنگالی نثر نے مختلف عنوان سے حق بیان ادا کیا ہے۔ روبندرو ناتھ نے جو مضمون جہاں سے شروع کیا ہے اور جس جگہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ ایسا معلوم ھوتا ہے کہ جیسے انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کے ساحرانہ اثرات سے اُسے سونے جیسا قیمتی بنا دیا ہے۔ مقالات میں دلائل اور مباحث کا انھوں نے ایسا انداز اختیار کیا ہے جس سے معلوم

ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی باتوں کے سرمائے سے خود اپنے دل کو مطمئن کرنےکی کوشش کی ہے - ان کی تحریر میں اس غضب کی روانی ہے کہ انھیں خود اپنے منتہائے کلام کا اندازہ نہیں ہوتا اور سب کچھ بھول کر وہ اپنی روانی میں خود کھو جاتے ہیں - مقالات میں طرز ادا کی عظمت اور باتوں کی دلکش ملاحت کی وجہ سے کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتاہے کہ موضوع کلام کا بنیادی تصور دب کررہ گیا ہے - دلائل اور مباحث کے الٹ پھیر میں بسا اوقات شعراء بھی کسی نتیجے تک پہنچنا بھول جاتے ہیں لیکن درمیان راہ میں جس طرح خلاق عالم اپنی مخلوقات کو گونا گوں کھیلوں میں مشغول رکھتا ہے اسی طرح روبندرو ناتھ نے بھی رنگینیوں میں کھو کر اپنی تخلیقی نثروں میں اپنا دلکش کھیل دکھایا ہے - روبندرو ناتھ کی نثر کے بارے میں "اتول گپت" نے بھی یہی باتیں دوسرے الفاظ میں کہی ہیں - ان کی تمام تر تصنیفات میں ہر جگہ اس شاعر اعظم کے دل کا نقش نمایاں ہوا ہے اور ہر مقام پر اس عظیم شاعرکا سرمایہ کلام موثر نظر آتا ہے - کسی دلیل کے دوران میں جب تشبیہات آ جاتی ہیں تو مشبہہ اور مشبہ بہہ میں ایک بےنظیر یکسانیت ان کے راستوں کو منور کرتی نظر آتی ہے - مقابل سمجھتا ہے کہ یہ بات نامناسب ہے کیونکہ یہاں جنگ میں لاٹھیاں استعمال ہورہی تھیں لیکن اس میں تلوار کی دھار اور اسکی چمک بیچ میں کیوں آ پہنچی -

پھر کہیں کہیں اختلاف موضوع کی وجہ سے اس تموج قلبی کو
ظاہری طور پر دل پسند بھی کرتا ہے اور کہیں کہیں یہی تموج
کلام غیر مرئی ہو جاتا ہے اور مسحور کن طرز کی وجہ سے روانی کلام
کیلئے جن لوازم کا اجتماع ضروری ہے اس کے لئے غیر شعوری
طور پر شاعرانہ تموج سد راہ ہو جاتا ہے - نثر اور پھر وہ بھی ایسے
عظیم شاعر کی معلوم ہوتا ہے کہ نثارانہ جذبہ اسے چھو بھی نہیں
گیا ہے - بھرپور طریقے پر نظم اور خصوصیات نظم کی بو باس
مہکتی نظر آتی ہے - بلکہ کہیں کہیں یہی چیز اس شاعر عظیم کی
نثارانہ تحریرات میں مزاحم نظر آتی ہے - ان کی نثر شاعرانہ تخییل
میں الجھ کر رہ جاتی ہے - صنائع لفظی کی بہتات بہت
نمایاں ہے لیکن انہیں ایسی زبان میں ظاہر کیا گیا ہے جو ایک
نثار کے قابو سے باہر نظر آتی ہے - ایسے مقالات صرف بنگلا ادب
ہی میں نہیں دنیا کے ادب میں بھی کمیاب ہیں - ان کی کمیابی
ایسی ہی ہے جیسے اس عظیم المرتبت شاعر کے جذبات کی ندرت -
اس شاعر عظیم کی مقالہ نگاری کا جذبہ اور بھی نایاب تر ہے -
ایسے تخییل اور طرز کی تقلید کسی خود مند کیلئے ممکن نہیں
معلوم ہوتی -

روبندرو ناتھ کے ساتھ اور بھی دو اہل قلم کا نام عزت اور
عظمت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے - ان کے طبیعیاتی مقالات نے بھی

ادبی عظمت حاصل کی ہے - ان میں سے ایک روبندرو ناتھ سے
کبیر الس، مشہور سائنس دان سر جگدیش چندر بوس ہیں جن کا
دور حیات سنہ ۱۸۵۸ع سے سنہ ۱۹۳۷ع تک تھا - دوسرے صاحب
جو ان سے عمر میں چھوٹے تھے وہ رامیندرو ناتھ تری بیدی ہیں -
ان کا دور زندگی سنہ ۱۸۶۴ع سے سنہ ۱۹۱۹ع تک تھا - سر جگدیش
بوس نے اپنی مشہور عالم کتاب Respect of the living and the
non-living کے ذریعہ تمام دنیا میں شہرت حاصل کی - جسم
نامی اور جاندار دنیا کے متعلق جگدیش بوس کی تحقیقات اور
نتائج اس کتاب میں قلمبند ہوئے ہیں - ہمیں ان کی "اَبکتو"
نامی بنگلا کتاب میں بھی اس کتاب کا عکس نظر آتا ہے - نباتات
میں تحقیق حیات اور اس کی ایجاد کے متعلق جو کچھ انھوں نے
جد و جہد کی ہے انھی چیزوں کی طرف انھوں نے کمال شفقت سے
ہمیں اسمیں بھی متوجہ کیا ہے - طرز ادا میں شاعرانہ نظر
اور ایک عجیب معویت اس کتاب کے ہر ہر جملے سے ظاہر ہوتی ہے -
رامیندرو کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے وسیع علم اور ظریفانہ
اور متجسس دل نے انھیں صرف سائینس کی تحقیقات تک
محدود تک نہیں رکھا - جہاں علم کی روشنی پڑتی ہے وہاں سے
جس طرح شعاعیں اپنے سیکڑوں رخ پیدا کر کے انعکاس پذیر
ہوتی ہیں - اسی طرح وید کا علم اور سائینس پر بنیاد رکھنے والے

فلسفے سے شروع کر کے مہا بھارت اور اقوال بزرگان کی وساطت سے
بنگال کے زمانے گیت تک میں رامیندرو سندر نے اچھے روشن دل اور
سنجیدہ ظرافت کے زیر اثر سیکڑوں انداز سے گونا گوں کیفیتیں
پیدا کی ھیں - رامندرو سندر کی کتاب " نا نا کتھا (مختلف باتیں)
اور " جگا شا " (سوال) وغیرہ مضامین کی کتابیں اسی قسم کے
گہرے علم اور عمیق فکر سے منور ھیں - ان کا طرز ادا دیکھ کر حیرت
ہوتی ھے - زبان کا اعجاز تخیل کا اظہار کرتا ھے اور اس میں
غیر متناھی ظرافت کروٹیں لیتی معلوم ہوتی ھے - اس صاحب
علم کے آزاد دل کا حال اس کی زبان سے ھر ھر قدم پر متشرح
ہوتا ھے *

پرمتھ چودھری

اگرچہ پرمتھ چودھری دور روبندرو ناتھ ھی کے ایک اھل
قلم ھیں لیکن بنگلا نثر میں ایک خاص اور علحدہ طرز کے
مالک ھونے کی حیثیت سے ان کا نام بھی بنگلا ادب کی تاریخ
میں خصوصیات کا حامل ھے - ان کا زمانۂ حیات سنہ ۱۸۶۸ع سے
سنہ ۱۹۴۴ع تک کا ھے - بنگلا ادب منثور کی تحریر میں بول چال
یا روزمرہ کی زبان انھی کے زور قلم سے مقبول اور کامیاب

ہوئی - انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں "کلیکتا کملا لائے" ، "نبو بابو بلاش" ، "نبو بی بی بلاش" وغیرہ مزاحیہ کتابوں کے مصنف بھوانی چرن بندوپادھیا کے ہاتھوں بنگلا نثر میں اس طرز تحریر کی ایجاد ہوئی - "الال" اور "ہوتم" نے اسی طرز کو زیادہ وسعت دی اور پھر پرمتھ چودھری کے ہاتھوں اس طرز نے عروج اور کمال حاصل کیا - پرمتھ چودھری نے افعال کی صورتوں میں تبدیلیوں سے اختصار ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ گفتگو کی زبان کے عجیب ادبی امکانات کو تسلیم کرکے اس میں سیکڑوں قسم کے رسیلے عنوانات پیدا کئے - سنہ ۱۳۲۱ ب کے قریب انہوں نے اپنے "سبزپتر" اخبار کو مرکز بنا کر اپنی اس بول چال کی زبان کو پوری طرح مقبول عام بنایا تھا -

"بیر بلر حال کھاتا" ، "نا نا کتھا" ، "رعیتر کتھا" وغیرہ کتابوں میں پرمتھ چودھری کے طرز گفتگو میں تیزی اور چابک دستی کا عجیب و غریب مظاہرہ نظر آتا ہے - کثیر التعداد عالمانہ موضوعات کے سلسلۂ بیان میں انہوں نے خشک مضامین کے باوجود صرف طرز ادا کی خوبی سے جان پیدا کی ہے - طرز کلام نے موضوع کلام کو مغلوب کر لیا ہے - "شادھو بنلم چلیتو بھاشا" کے مکالمے میں پرمتھ چودھری کی فتح کے نشانات جس طرح بنگلا نثر میں ہر جگہ نمایاں ہیں - اسی طرح ان کا طرز تحریر

بھی آج بنگالی ادب میں ہر طرف مقبول ہوچکا ہے - بنگلا نثر کی
زبان اور طرز ادا میں انھوں نے جو تبدیلیاں پیدا کی ہیں
انھیں بنگلا ادب کی تاریخ میں پرمتھ چودھری کے بڑے فیوض
میں سے شمار کیا جاتا ہے - اس مشکل راہ میں اپنے خاص طرز
پر تندی و تیزی کے ساتھ انھوں نے جو کچھ سپرد قلم کیا ہے
اس کا اہم عنوان دل اور ادب کی آزادی ہے - ان کی تمام تر تصنیفات
میں ایک روشن ظرافت کی تیز روانی متموج دکھائی دیتی ہے -
کرشنانگر کے باشندے ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنے طرز ادا کی
نہز روش کو بھارت چندر کے وارث کی حیثیت سے بطور استحقاق
لیا ہے - بنگلا نثر میں طرز گفتگو کی تخلیق کے لئے ایک بے نظیر
جد و جہد جو پرمتھ چودھری عرف بیربل نے کی اسکے اثرات کسی
قدر روبندرو ناتھ پر بھی پڑے تھے -

امام عصر روبندرو ناتھ پر جس پرمتھ چودھری کے نقوش نے
اثرات قائم کئے تھے وہ پرمتھ اپنی اس کامیابی پر جس قدر
بھی فخر کریں کم ہے - یہ افتخار انھیں ذاتی طور پر تو حاصل
ہی تھا لیکن اس سے بھی زیادہ بنگلا نثر کی ارتقائی ترقی
اور تدریجی توسیع کی تعیین کے اعتبار سے وہ لائق توصیف
سمجھے جا سکتے ہیں - اس کا سبب یہ ہے کہ پرمتھ چودھری
اور روبندرو ناتھ ان دونوں اہل قلم کی مشترکہ اور انفرادی

مساعی ھی سے آج روز مرہ کی طرز ادانے بنگلا ادب میں لازوال مقام حاصل کیا ھے - انھی دونوکی کوششوں سے اسے استحکام اور ترقیاں حاصل ھوئی ھیں - اس طرز تحریر میں جان ڈالنے والے پرمتھ چودھری ھی تھے جنھوں نے اپنے اخبار "سبز پتر" کے ذریعہ اس کی بنیادیں استوار کی تھیں - پھر روبندرو ناتھ نے اس میں روح ' غیر معمولی روانی ' شاعرانہ جذبات اور بھرپور زندگی پیدا کی -

بنگلا نثر میں گفتگو کی زبان استعمال کرنے والے ایک ممتاز اور بڑے صاحب قلم کی حیثیت سے روبندرو ناتھ کے بھتیجے "شلپی" (صناع) "ابوننذرو ناتھ" کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ھے - یہہ طرز تحریر کس قدر آسان اور شیریں ھے اس کا بے مثال نمونہ ھمیں ان کی کتاب "گھروا" اور "باگیشری شلپو پرو بندھا بولی" میں دکھائی دیتا ھے - گھروا میں انھوں نے جی بھر کے ٹھاکور باڑی کے افسانہائے ماضی اور ان کے بچپن کی داستانیں بیان کی ھیں - باگیشری شلپو پرو بندھابولی" میں صنعتوں کی مشکل جدوجہد اور حسن اسرار کی باتیں حیرتناک مگر آسان طرز تحریر اور غیر معمولی شیرینی کے ساتھ ظاھر کی گئی ھیں - مصنف کی آسان نظر اور ان کی محو حیرت کر دینے والی طرز نگارش ان کی تمام تحریرات کے ھر ھر فقرے سے

جھلکتی ہے - ایک ماہر صناع کی طرح ہمہ متعارف، ہمہ مستعمل
اور بےحد معمولی باتوں کو ہمارے روپ میں تیار کرکے عالم
صنعت کے مشکل اسرار، غوامض اور حقائق کو انھوں نے عام
پڑھنے والوں کے سامنے پیش کیا ہے - زبان کی یہ حیرتناک
عریاں ملاحت پڑھنے والے کو جس قدر محو حیرت بناتی ہے
اس سے زیادہ مدھوش کر دیتی ہے -

عبد الکریم شاہتو بشارد

(سنہ ۱۷۶۹ع—۱۹۵۳ع تک)

بنگالی ادب میں قدیم بنگالی ادب کے ایک مخلص خادم کی حیثیت سے عبد الکریم کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے - بنگال جس وقت مغربی اثرات سے مسحور ہو کر دور جدید کے ادب کی تخلیق کر رہا تھا اس وقت اس ہمہ گیر ادب کی خیرہ کن روشنی سے متاثر نہ ہو کر خادم علم عبد الکریم نے پوتھی ادب کی تحقیق ' فراہمی اور حفاظت نیز ادارت کے کام کو اپنا مقصد زندگی سمجھا تھا -

ضلع چاٹگام' تھانہ پٹیا کے موضع شوچکر و دندی میں سنہ ۱۸۶۹ع میں عبد الکریم کی پیدائش ہوئی - سنسکرت کے ساتھ انٹرنس اور ایف اے پاس کرنے کے بعد وہ ادبی کاموں میں لگ گئے - مشہور شاعر نبن چندر سین نے ان کی تحریرات میں ذہانت کا مشاہدہ کرکے عدالت فوجداری میں ایک محرر کی اسامی ان سے متعلق کر دی لیکن تھوڑے ہی دنوں تک اس عہدے پر فائز رہنے کے بعد انھوں نے اس سے مستعفی ہو کر ڈیویزنل انسپکٹر آف اسکولس کے دفتر میں بطور محرر دوم کے ملازمت اختیار کر لی - اس ملازمت کے ذریعہ تکلیف سے حاصل کردہ تنخواہ کے روپئے سے انھوں نے اپنے سکھ اور

راقم کا خیال نہ کرکے نیز بال بچوں کو مشقت میں ڈال کے تمام عمر پوتھی ادب کی کتابوں کی فراھمی میں گذار دی -

پوتھی کی فراہمی کا انھیں ایک نشہ تھا - مختلف مقامات پر جو منتشر پوتھیاں لا پروائی اور بے توجہی کی شکار تھیں وہ اگر بالکل برباد ھوجاتیں تو بنگلا قدیم ادب کا واحد قابل اعتماد سرمایہ ختم ھو جاتا - اس کے ساتھ ساتھ دور وسطیٰ کے بنگالی مسلمانوں کے تمام عمر کے کارنامے بھی نذر طاق نسیاں ھو جاتے - غالباً اسی تخیل نے جان ملت عبد الکریم کو پوتھی کی فراھمی کیلئے مستعد کیا تھا - کسی ادارے یا حکومت نے پوتھی کی فراھمی کے سلسلے میں عبد الکریم کی ایک پیسے سے بھی کوئی اعانت نہ کی - تاھم اس شکست کے منکر اور ضعیف العمر عبدالکریم نے اپنی ذاتی پونجی اور ذاتی جد و جہد سے ڈھائی ھزار سے زیادہ پوتھیاں فراہم کیں - ان سب میں ایک ہزار سے بھی زائد پوتھیاں بنگالی مسلمان صاحبان قلم کی یادگار ھیں - قدیم بنگالی مسلمانوں کی بنگالی ادبی جد و جہد کا بلا واسطہ نمونہ ایسے عظیم الشان ذخیرے کی صورت میں کسی دوسرے ادیب یا علمی ادارے کے ذریعہ آج تک ممکن نہ ہو سکا - یہ عبد الکریم کی زندگی کا یہ ایک لا زوال کارنامہ ھے -

وہ اپنی فراھم کردہ پوتھیوں سے تلاش وتحقیق کرکے "شیخ فیض اللہ" کی " گورکّھو بجے" ، "رتی دیب" کی " مرگو لوبدھو" اور " علی باز" کی

'' گیان ساگر '' وغیرہ بنگلا کتابوں کی ادارت بھی کر گئے ہیں - انہوں نے اراکان راج سبھا کے شعرا '' الاول '' ، '' دولت قاضی '' اور '' ما گن ٹھاکور '' وغیرہ کے متعلق بہت ساری تحقیقات کرکے پردہ ہائے اسرارکو دور کیا ہے - ڈاکٹر انعام الحق کی اعانت سے انہوں نے ایک کتاب '' اراکان راج دربارے بنگلا شاہتو '' (اراکان کے راج دربار میں بنگلا ادب) مرتب کی - اس کتاب سے عبد الکریم کی فراہمی مواد اور انعام الحق کی تشریح موضوع اور عالمانہ لیاقت کا پتہ ملتا ہے - عبد الکریم کی مصنفہ '' پراچین پونتھیر بی برن '' (قدیم پوتھی کا تذکرہ) بھی ادب قدیم پر تبصرے کا ایک نادر مجموعہ ہے - دور حاضر میں بنگالی مسلمانوں کے اندر پوتھی ادب کا جو ذوق پایا جاتا ہے نیز پوتھی ادب کی فراہمی اور اس پر مباحث و تنقیدات کا جو جذبہ پیدا ہوا ہے وہ سب کا سب عبد الکریم ہی کی تمام زندگی کی کاوش کا حاصل اور انھی کی جد و جہد کا رہین منت ہے - الاول کی نظم پدماوتی کی ادارت انہوں نے آخر عمر میں کی لیکن اسے اپنی حیات میں شائع نہ کرا سکے -

عبد الکریم کی مصنفہ '' پراچین پونتھیر بی برن '' کے مقدمے میں '' بیام کیش مستفی '' نے لکھا تھا ــــ '' محترم منشی عبد الکریم صاحب کا مختصر تعارف کرائے میں یہ مقدمہ ختم کروں گا - وہ قومیت کے لحاظ سے مسلمان ہیں ان کا وطن ضلع چاٹگام ' تھا نہ

پتا تیا کا موضع شچکرو دنقی هے اور موجوده وقت میں وه انسپکٹر آف اسکولس چاتگام کے دفتر میں ملازمت کر رهے هیں - اس سے قبل انوارہ کے ایک چھوٹے سے اسکول میں وه معلمی کرتے تھے ان کے اقتصادی حالات اچھے نہیں هیں بلکه وه صاحب احتیاج لوگوں میں سے هیں - پوتھی کی تلاش میں ایک ایک دیہات کا سفر کرنے کیلئے نه ان کے پاس وقت هے اور نه اخراجات برداشت کرنے کیلئے سرمایہ - ان کے پاس اس سرمائے کا تو کوئی نشان هی نہیں جس کے ذریعه وه لوگوں سے کتابیں خرید کر فراهم کرسکیں - تاهم اپنی مادری زبان سے غیر معمولی ' اُنس ' ' محبت ' بلکه عشق کی بنا پر انھوں نے اپنی ساری زندگی پوتھی کی فراهمی میں صرف کردی هے - انھوں نے اس سلسلے میں غیر معمولی مشقتیں برداشت کی هیں اور اپنی عمر کی پونجی پوتھی هی پر نثار کردی هے - انهی کے غیر فانی حوصلے ' حفاظت کی سعی اور بے پایاں شوق کا یهه ثمرہ هے که آج هزاروں قدیم پوتھیاں همیں دستیاب هورهی هیں "-

وه مسلمان هیں اور کسی هندو کے صحن خانه میں بھی داخل هونے کا انهیں کوئی حق حاصل نہیں لیکن یهه سن کر که کسی هندو کے گھر کوئی قدیم پوتھی هے وه بھکاری بن کر اس کے گھر گئے هیں اور پوتھی دیکھنے کی خواهش کی هے -

سرسوتی پوجا کے موقع پر هندو پوتھیوں کی پوجا کرتے هیں اسلئے صرف اس بنا پر کہ وہ مسلمان تھے اور پوتھی کو هاتھ نہیں لگا سکتے تھے انھیں پوتھی دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ملی - ایسا بھی هوا هے کہ بعض بعض لوگوں نے انکی عاجزانہ درخواست سے متاثر هوکر خود اپنے هاتھوں میں پوتھی لےکر انھیں اوراق الٹ کر دکھا دئیے هیں - منشی صاحب نے بلا هاتھ لگائے گھر کے باهر هی سے جوں توں کرکے کچھ باتیں پوتھی کے متعلق نوٹ کرلیں - اس طرح کے دوق شوق اور استقلال طبع کے ساتھ کسی هندو نے بھی اپنے گھر کسی پوتھیوں کو دیکھنےکی زحمت کبھی گوارا نہیں کی هوگی - انھی واقعات سے یہ اندازہ کیا جاسکتا هے کہ بنگلا زبان والوں پر منشی عبد الکریم صاحب کے کس قدر احسانات هیں -

منشی عبد الکریم کی ادبی خدمات کے صلے میں چاٹگام کے پنڈتوں نے انھیں "شاهتّو بِشارد" (فاضل یا ماهر ادب) کا لقب اور ندیا کے ادیبوں نے "شاهتو شاگر" (بحر الادب) کا خطاب دیا تھا -

منشی عبد الکریم نے اپنے گھر هی پر ۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۵۳ع کو رحلت کی - وفات سے تھوڑے هی عرصہ پیشتر انھوں نے اپنا تمام تر سرمایۂ حیات یعنی پوتھیاں ڈھاکا یونیورسٹی کو تحفةً دے دی تھیں -

---

سرت چندر چٹو پادھیائے

۱۸۷۶—۱۹۳۷ء

رابندر و ناتھ کے بعد جن ادیبوں نے اپنی مسحور کن تحریرات سے بنگالیوں کا دل خاص طور پر فتح کیا ہے ان میں سب سے ممتاز سرت چندر ہیں - ان کی پیدائش انیسویں صدی کے آخری ربع یعنی سنہ ۱۸۷۶ء میں ضلع ہوگلی کے موضع دیباندد پور میں واقع ہوئی - سرت چندر ایک غریب متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے - ان کے والد موتی لال چٹو پادھیا اپنے گاؤں میں لالو چٹرجی کے نام سے شہرت رکھتے تھے - غربت کی وجہ سے سرت چندر کسی اسکول یا کالج میں پڑھنے کی سعادت حاصل نہ کر سکے - علاوہ بریں کم عمری ہی میں ان کے سر سے والد کا سایہ بھی اُٹھ گیا - کسی لائق سرپرست سے محرومی اور افلاس کے ہاتھوں مجبوری نے انھیں کم سنی ہی میں آوارہ گردی میں مبتلا کر دیا - اسی اثنا میں انھوں نے ملازمت کی وجہ سے بہت دنوں تک برما کے دارالسلطنت رنگون میں زندگی گذاری -

آوارہ گردی کے زمانے میں سرت چندر کی ملاقات ایسے اوباش لڑکوں سے ہوئی جنھیں بدچلنی کی بنا پر ماں باپ نے گھر سے نکال باہر کر دیا تھا - ان کا بہت سارا وقت ملازمت پیشہ لوگوں کے "مس" Mess میں گذرتا - سادھوؤں اور سنیاسیوں کے اڈوں اور

آشرموں پر بھی انھوں نے کچھ وقت گذارا ھے - ان کے ادب میں جہاں کہیں آوارہ گرد لڑکے، ٹھاکور، چاکر، جھی (ملازمہ) اور بدکردار مرنیا قحبہ عورتوں کی سماج سے خارج شدہ زندگی کے حالات کا تذکرہ ھمیں ملتا ھے اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ان کے ساتھ سرت چندر کا بلاواسطہ تعارف اور تعلق تھا - زندگی کے تجربے ھی سے انھوں نے مردوں اور عورتوں کی زندگی کے مختلف رخ دیکھے، سیکھے اور اس سے اپنے ادب کو زینت دی -

عملی زندگی میں مشغول رھنے اور بنگال نیز بنگال سے باھر گھومنے پھرنے کی وجہ سے بہت سارے قصے ان کی زندگی سے پیوست ھوکر رہ گئے - ان کی ادبی زندگی کے پس منظر میں ھمیں کوئی عاقلانہ جد و جہد کارفرما نظر نہیں آتی - زندگی کے تجربات نے ان کے دل میں بہت سارے افسانوں کی تخلیق کی اور ان افسانوں ھی کو بنیاد بنا کر ایک پختہ کار جوھری کی طرح انھوں نے بنگلا ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا - بنگالی ناول نگاری میں سرت چندر کو کون سا ممتاز مقام حاصل ھے اس کا اندازہ ھمیں بنگال کے مشہور و ممتاز ناول نگار بنکم کے ساتھ تقابل کرنے ھی سے مل سکتا ھے - بنکم چندر نے ھندو بنگالی قدامت پرست برھمنوں اور زمینداروں کے نمائندے ھی کی حیثیت سے قدیم ھندو مذھب اور فلسفے کی بنیاد پر ھندو سماج کی زندگی کے مختلف رخ نمایاں

گئے ہیں - ان کی قدامت پسندانہ طبیعت اور نظریئے کی
قربان‌گاہ پر ان کے ہمعصر مرد اور عورتیں قربانی کا بکرا بنائی
گئی ہیں - وہ زندگی کو ایک تخلیقی یا فطری روپ بخشنے والے
ناول نگار نہ تھے - وہ صرف زندگی کی تبعیت میں مذہب اور
آدرش کے مفسر تھے - ہمیں سرت چندر کے ناولوں میں اُسی بنگال کے
ہندوؤں کا ایک دوسرا روپ بھی نظر آتا ہے - سرت چندر نے کسی آدرش کے
مفسر کی حیثیت سے قلم ہاتھوں میں نہیں لیا - زندگی میں مردوں
اور عورتوں کا دکھ درد یا سکھ اور آرام جسے انھوں نے محسوس کیا تھا
اسے اپنی زندگی کا دکھ یا سکھ سمجھ کر انھوں نے کمال محبت، ہمدردی
اور شفقت کے ساتھ اپنے ادب میں لازوال زندگی بخش دی ہے -
سماج کے مقرر کردہ معیار پر جو مرد اور عورتیں پوری نہ اتر کر
اخلاق باختہ سمجھی جاتی ہیں ان میں بھی اگر غور سے دیکھا
جائے تو بہت سے روشن نمونے اور انسانیت کی خوبیاں ہمیں
نظر آئیں گی - سرت چندر نے گناہ سے نفرت کی ہے لیکن گناہ گار سے
نفرت نہیں کی - سماج ہی کی غلطیوں اور مظالم کی وجہ سے اگر کوئی
انسان ایک مرتبہ لغزش کا شکار ہو جاتا ہے تو کیا وہ ہمیشہ کیلئے سماج سے
کاٹ کر خارج کر دئے جانے کے لائق ہے؟ اسے سرت چندر ایک بڑا ظلم
سمجھتے ہیں - سرت چندر نے انسان کی انسانیت ہی کو باعظمت سمجھا ہے -
دکھ درد کے باعث مظلوم انسانیت کا چہرہ جن نظروں سے سرت چندر نے

دیکھ کر اوروں کو دکھایا ہے اُس طرح بنگلا زبان کے کسی اور ناول نگار نے دکھانے کی قدرت نہیں پائی - یہی سبب ہے کہ ان کے " ستیش "، " سوریش "، " ساوتری "، " راج لکھی "، " انسودا دیدی " وغیر سماج کے غیر مسلّم اور قابل نفرت طرز زندگی کے باوجود با عظمت مرد و عورت شمار کئے جانے کے قابل ہو گئے ہیں - انسانیت کے اس روپ کی مصوری کے باعث ہی ہم انھیں ادیب کہتے ہیں -

خوش اخلاقی اور بد چلنی کا امتیاز نہ کر کے انسان کے دل کی عام حالت اور جذبے کو تسلیم کرتے ہوئے ایک وقت رابندرو ناتھ نے بھی اپنے " ششتـو نیـر " قصے میں " چارو " اور " امل " کے خارج از سماج پریم کی شرارتوں پر تبصرے کئے تھے - رابندرو ناتھ کے دور حیات ہی میں سرت چندر نے رابندرو کی متروک راگنی کا سُرالاپا اور اس کی وجہ سے عورتوں کے دل کی تہہ تک پہنچ گئے - اپنے ناول " گریہ داھو " میں " سوریش " سے " مہیم " کی بیوی " اچلا " کی محبت کا موتی سرت چندر نے ایک کامیاب غوطہ خور کی طرح اس کے جان و دل میں داخل ہو کر حاصل کیا ہے - بنکم نے ایسے موقع پر روھینی کو گولی کا نشانہ بنایا تھا لیکن سرت چندر نے اچلا کے ساتھ ایسا نہیں کیا - انھوں نے اس کی فطرت کے

جذبات کو تسلیم کر کے ایک صناع کی طرح ان کی خانگی زندگی کے التہاب اور اس کے انجام کا نقشہ کھینچا ہے -

مرد وعورت کی زندگی کی مشکلات کو مان کر سرت چندر نے جس طرح انکے باریک سے باریک تر تخیلات و جذبات کو پوری طرح گرفت میں لے کر ظاہر کیا اس کی وجہ سے بنگال کے ہندو سماج نے ان کے خلاف کم غم و غصے کا اظہار نہیں کیا - ان کی تمام تر شہرت اور بدنامی صرف اسلئے ہے کہ انھوں نے انسان کے دلی تخیلات ، آرزوں اور تمناؤں کو قبول کی حیثیت دی ہے - قدامت پرست سماج نے اسی وجہ سے ان کا جیسا مذاق اڑایا اتنا ہی رسم و رواج سے آزاد بنگالی نو جوانوں نے ان کی تصنیفات کو سر چڑھایا اور اس پر اظہار فخر و مسرت کیا - اسی مسرت کے شکار ہوکر بہت سارے لوگوں نے واقعی زندگی میں بھی ان کی مفروضہ ہیروئن " راج لکھی " کو تلاش کیا ہے - یہ بات کہ سماج کی متروکہ راہوں میں بھی دل کی متھاس ایک لازوال حسن سے معمور کھلا ہوا پھول دکھا سکتی ہے یہی بنگلا ادب میں سرت چندر کا سب سے بڑا کارنامہ ہے -

سرت چندر نے ایک زمانے کے بگڑے ہوئے ہندو سماج اور اور انکی ایک خاص کمزوری ہی کو اچھے ادب کا موضوع بنایا تھا اور اس موقع پر انھوں نے ایک مصلح کا پارٹ ادا کیا تھا -

سرت چندر کے زور قلم سے یہ معائب واقعۃً کسی قدر دور ہوئے ہیں - جو کچھ باقی رہگئے ہیں وہ بھی جدید تعلیم کے اثرات سے رفتہ رفتہ معو ہوکر صرف تاریخ کے دفاتر ھی کی زینت رہ جائیں گے - لیکن کیا اس دن سرت بابو کا ادب نا قدری کا شکار ہو جائے گا ؟ جس دن سرت چندر کی مصلحانہ حیثیت غیر ضروری ہو جائے گی اسی دن اُن کا مقصد ادب پورا ہو جائے گا - جس بےحساب درد و غم کا لاوا دل میں روشن کر کے سرت چندر نے اپنی ادبی زندگی شروع کی تھی اُس تمنا کی دنیا کو متشکل کرنے کیلئے بنگلا زبان میں جو روانی انھوں نے پیدا کی اس کے ساتھ ان کا خلوص بھی ہم آہنگ تھا - طرز ادا کا یہہ خلوص' ان کی قلبی اور سچی ہمدردی ھی ان کی تصنیفات کے پڑھنے والوں کا دل موہ لیتی ہے - ان کا یہ دلنشیں پیرایہ اور انکی صنعت کارانہ قدر و قیمت بنگلا تاریخ ادب میں زندہ جاوید رہے گی -

سرت چندر کے ہاتھوں بنگالی نثر بڑی ھی متموج اور رواں ہوئی ہے - ان کا ایک ناول روزمرہ میں لکھا گیا ہے - باقی سارے ناول اور افسانوں میں انھوں نے مکالمات میں روزمرہ اور تفصیلات میں شستہ زبان " شادھو بھاشا " استعمال کی ہے - سرت چندر کی تصنیفات کے مکالمات کی زبان میں جوش و خروش کی کمی ہے اور وہ ہمیں سمندر کی موجوں کی طرح رواں اور دواں

ہونے کے بجائے کسی خاموش جھیل کی سبک رو لہروں کی طرح مترنم، شہد کی نہروں کی طرح مسرورکن اور شراب کی موجوں جیسی کیف آور معلوم ہوتی ہے۔ ان کی زبان میں تسجیع ہے اور انہوں نے مشتقات سے زیادہ کام لیا ہے۔ تفصیلات اور تذکروں میں زبان کا تسلسل اور الفاظ کی ہم آہنگی نظر نہیں آتی لیکن روانی میں فرق نہیں ہے۔ "شری کانت" کے باب اول سے "شمشان" (مرگھٹ) تک یا اندھیرے کی کیفیات بیان کرتے وقت انہوں نے اپنی زبان میں وہ زور اور امد دکھائی ہے کہ پڑھنے والا مسحور ہوکر رہ جاتا ہے۔ نثر میں غیر معمولی آمد کا جوش پیدا کرکے انہوں نے قارئین کی نگاہوں کے سامنے ایسے مناظر کھڑے کردئیے ہیں کہ بےاختیار آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں سے امڈ آتا ہے۔ زبان میں عجیب و غریب جذباتی کیفیت Emotion کا اظہار اس طرح ہوا ہے کہ بنگلا منثور ادب اس طرز ادا سے مالا مال ہوکر رہ گیا ہے۔ ہم یہ ماننے کیلئے مجبور ہیں کہ بنگالی منثور ادب کی ترقی میں سرت چندر کو ایک بڑا ہی ممتاز مقام حاصل ہے۔

یہہ بات مانے بغیر چارہ نہیں کہ سرت چندر کا تخیل جس درجہ عمیق ہے اور اپنی متعارف زندگی کی خیالی تصویر جس قدر حسین اور دلکش انداز میں انہوں نے ہمارے سامنے

پیش کی ھے اس حد تک ان کی تفصیلات وسعت پذیر نہیں ہوئیں ۔ ان کے شاھکاروں میں بھی اس حد تک تعجب خیزی نہیں ھے ۔ ایک عظیم تر انسانی جماعت سے روگردانی کرکے سماج کے صرف ایک ھی طبقے سے ان کا ادبی ذوق متعلق ہوکر رہ گیا ھے ۔

سرت چندر نے جن ناولوں کی تصنیف کی ھے ان میں بڑو دیدی ، سری کانتو ، گریہوداھو ، رام‌ر شومتی ، بندور چھیلے ، میجھو دیدی ، دیوداس ، پنڈت مہاشائے ، چرترو هیں ، پلّی سماج ، شیش پرسنو ، پتھیر دابی ، بے‌پرو داس اور دینا پاؤنا " ھی ممتاز ناول هیں ۔

سنہ ۱۹۳۸ع میں سرت چندر نے اس دنیا کو خیرباد کہا ۔

بیــگـــم رقیــہ

۱۸۸۰ء۔۔۔۱۹۳۴ء

دور روبندرو ناتھ میں جن چند مسلم خواتین نے بنگلا ادب کی خدمت کے ذریعہ شہرت حاصل کی تھی ان میں بیگم رقیــہ سب پر تقدم اور امتیاز رکھتی ھیں ۔ وہ مسز آر ایس حسین کے نام سے زیادہ متعارف ھیں ۔ ضلع رنگ پور موضع پائیرا بند کے کسی ایک شریف مسلمان خاندان میں وہ سنہ ۱۸۸۰ء میں متولد ہوئیں ۔ وہ ایک نہایت قدامت پسند گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں اور ویسےھی ماحول میں ان کی پرورش بھی ہوئی ۔ ان کے گھـرانے میں تعلیم نسواں تو درکنار عورتیں نا واقف اور اجنبی عورتوں سے بھی پردہ کرتی تھیں ۔ خدا کی بخشی ہوئی ہوا اور دھوپ سے بھی عورتوں کو محروم رکھا جاتا تھا اور اس طرح انھیں سخت پردے کا خوگر بنادیا جاتا ۔ پردےکے پردے میں عورتوں کی شخصیت کی بےعزتی کا بیگـم رقیہ کو بچپن ھی سے احساس تھا اور خواتین پـر سماج کے گونا گوں مظالم اور غیر ہمدردانہ رویــہ نے ان کے دل میں ایــک باغیانہ جذبہ پیدا کر دیا تھا ۔

شادی کے بعد آزاد مزاج اور مشفق شوھر کے گھـر آ کر انھیں حصول تعلیم کے مواقع حاصل ہوئــے ۔ سہاگ کی خوش نصیبی

انھیں بہت دنوں تک میسر نہ آسکی اور شادی کے کچھ دنوں بعدھی
ان کے شوھر میر سخاوت حسین نے انھیں تنہا مصائب کی کشاکش سے
دوچار ھونے کیلئے چھوڑ دیا اور خود عدم کی راہ لی - اس
حادثے کے بعد ھی انھوں نے اپنی زندگی سماج کی اصلاح اور قومی
خدمات کیلئے وقف کردی - ان کے شوھر کے نام پر کلکتہ سخاوت
میموریل گرلس ہائی اسکول انھی کی یادگار ھے - ان کو یہہ یقین
تھا کہ مسلمان عورتیں اگر جدید تعلیم کے نور سے اپنے دلوں کو
منور نہ کرسکیں تو ان کے ذھنوں میں کسی طرح وسعت پیدا
نہیں ہوسکے گی، نیز یہ کہ مسلم سماج بھی کسی طرح ترقی نہ
پاسکے گا - اس تصور کے پیش نظر انھوں نے جس طرح ایک طرف
تعلیم گاہ قائم کرکے مسلمان بچیوں کو تعلیم یافتہ بنانے کی سعی کی
اسی طرح مسلمانوں کے دل سے تعصب اور تنگ نظری دور کرنے
کیلئے اور ان کی اصلاح کی خاطر انھوں نے قلم ھاتھ میں لیا - بیگم
رقیہ کی ساری تحریرات درد و غم کی آئینہ دار ھیں - " موتی چور،
سلطانار شپنو، پدّو راگ، ابورودھ باشینی " وغیرہ بیگم رقیہ کی
مشہور تصنیفات ھیں - موتی چور مختلف موضوعات پر دس
مقالے ھیں - ان سب مقالوں میں نور اسلام اور " نولیشیستار
ھتیا " قتل نولیشیا) بطور ترجمہ انگریزی سے لئے گئے ھیں -
سلطانار شپنو بھی ایک انگریزی مقالے کا ترجمہ ھے لیکن یہہ

انگریزی مقالہ بھی بیگم رقیہ ھی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔
" سلطانا رشپنو " میں مصنفہ نے ایک مزاحیہ اور تعجب خیز
کردار کی تصویر کشی کی ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ جو عورت
ہمیشہ مردوں کی محتاج بنکر رھی ھو وہ بھی اگر باسلیقگی کے
ساتھ کسی لائق بن سکے تو وہ سماجی خدمت یا لیاقت حکمرانی کا
موقع پاکر کسی طرح کی دقت محسوس نہیں کرے گی۔ اس
موقع پر وہ عورت کی شخصیت اور اس کی حریت کا علم
بلند کرتی ھیں۔

" ابرو دھہ باشینی " ھی ان کا شاھکار ہے۔ سنہ ۱۳۳۵ ب
مطابق سنہ ۱۹۲۸ع کے کاتک مہینے میں پہلی بار یہہ کتاب
شائع ھوئی۔ خاندانی زمینداروں کے گھروں اور عام شریف
مسلم گھرانوں میں تقید اور حراست کے نام سے نسوانیت اور
انسانیت کی بے عزتی اس ملک میں بہت دنوں سے مروج
ہے۔ منتشر واقعات کی تشریح اور افسانوں کی مدد سے اس
کتاب میں ایسی بہت ساری مسلمان خواتین کے پردے کی
حفاظت سے متعلق مبالغہ آمیز کہانیاں بیان کی گئی ھیں۔
مگر یہ قابل اعتبار نہیں معلوم ھوتیں بلکہ مبالغہ آمیز افسانوں کا
پارٹ ادا کرتی ھیں۔ بیگم رقیہ نے اپنی اس کتاب " ابرو دھہ
باشینی " میں بہت سی غمناک تصویریں بھی کھینچی ھیں۔

یہہ ایک حقیقت ہے کہ پردے میں تشدد کیلئے صرف مرد ھی قابل الزام نہیں ھیں بلکہ خود عورتوں کے دل و دماغ پر بھی اس حفاظت اور پردےکا تصور اس طرح مستولی ہے کہ انھیں اس ماحول سے نکل کر باھر لانے کی کوشش اور خدا کی بخشی ہوئی روشنی اور ھوا سے فائدہ اٹھانے کی سعی بھی لاحاصل ہے۔ سماج کی اس بری رسم کے خلاف ھی بیگم رقیہ نے قلمی جہاد کیا ہے۔ ان کی تمام تر تصنیفات سماج کی بہبود کے متعلق ھیں۔ ان کی زبان اور طرز ادا سے طنز اور دلکشی کا صاف اظہار ھوتا ہے۔

---*O*---

اسماعیل حسین سراجی

۱۸۸۰—۱۹۳۱ء

اب تک جو تبصرے کئے گئے ہیں ان سے یہی بات ظاہر ہوگی کہ بنگالی مسلمانوں کی ادبی جدو جہد اس دور تک صرف خاص دو شعبوں میں نمایاں رہی - ایک شعبے میں ہمیں اسلامی ادب کی تخلیق کے لئے وہ کوشاں نظر آتے ہیں اور اس میدان میں قیادت کا سہرا شودھاکر دل والوں اور ان کے متبعین کے سر رہا - دوسری جماعت خالص ادبی خادموں کی رہی - مسلمانوں کی مصنفہ کتابوں میں زیادہ تر مسلم تہذیب، ان کی قدیم تاریخ کا کوئی روشن حصہ اور اسی قسم کی چیزیں ان کا موضوع کلام نہیں - مسلم تہذیب و تمدن کو بنگالی ادب کی وساطت سے ظاہر کرنے میں ان کا اصل مقصد یہی تھا کہ بنگالی ادب کو وسیع تر کیا جائے - ہندو مصنفین ہی قائد کی حیثیت رکھتے تھے اور انھیں کی تقلید پر ان مسلم مصنفین کو فخر و ناز تھا - ان کے پیش نظر جس قدر بنگالی ادب کی خدمت کا جذبہ تھا اس قدر مسلمانوں کی قومی زندگی کی درستگی کے لئے اسلامی ادب کی تصنیفات میں اضافہ کرنا نہ تھا - اس جماعت میں ہمیں میر مشرف حسین، کیقباد اور

مزمل حق نمایاں نظر آتے ھیں - سنہ ۱۸۸۵ع میں ھندوستانی کانگریس وجود میں آئی -

اس کے بعد سے سنہ ۱۹۱۱ع یعنی تقسیم بنگال کے خاتمہ تک اسلامی ادب کی تخلیق کے راستے میں مسلمانوں کی طرف سے ھندؤں کے ساتھ ملکر ایک مخلوط ادب کی تخلیق کے لئے جدو جہد ھوتی رھی - اس کوشش کی بنیاد میں بیسویں صدی کی ابتدا ھی میں سب سے بڑا اور سخت دھکا اس وقت لگا جب تقسیم بنگالہ کے خاتمے پر ھندؤں نے ایک نئے عنوان سے اپنے اشھب قلم کو آگے بڑھایا - مسلمانوں میں اس وقت کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جس طرح ھندؤں اور مسلمانوں کے سیاسی راستے الگ الگ ھیں اسی طرح ادبی راستے بھی مختلف ھیں - مسلمانوں کی حفاظت کے لئے زندگی کے مختلف راستوں میں انھیں اپنی الگ راہ نکال کر ھی آگے بڑھنا ھوگا - انھیں نظریات کی وجہ سے اس صدی کے پہلے ھی عشرے یعنی سنہ ۱۹۰۶ع میں بنگال کی موجودہ راجدھانی ڈھاکا میں جس طرح مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اسی طرح ادب کے میدان میں بھی مخصوص راھوں کی تلاش اور اس پر گامزن ھونے کی کوشش شروع ھوئی -

بنگالی ادب میں ھمیں سب سے پہلے اسماعیل حسین سراجی ھی نظر

آتے ھیں جن میں اس نظرئیے کا قوی احساس اور خود اعتمادی کا اظہار دکھائی دیتا ہے - تقسیم بنگال کی تحریک کے سلسلے میں انھیں دو سال کے لئے قیدو بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں - قید خانے ھی میں انھوں نے اپنے نظریہ کو فیصلہ کی حیثیت دے دی -

اس کے بعد ان کی تقریر، انکی گفتگو، ان کے کام اور ان کے ادب سے وہ عام احساس کمتری جو مسلمانوں کے اندر ھندوؤں کے مقابلے میں پایاجاتا تھا اس کا اثر ختم ھوگیا اور خود اعتمادی واپس لانے نیز Superiority Complex پیدا کرنے کے لئے انھوں نے حتی الامکان کوشش کی - بنگالی مسلمانوں کی ادبی مساعی اور قومی زندگی کی تاریخ میں اسماعیل حسین سراجی کی خدمات کم نہیں ھیں - انھوں نے اس دور کے ادیبوں کے نظریات میں جس تبدیلی کی بنیاد رکھی اس نے تحریک خلافت کے زمانے میں اور اس کے متصلا بعد ھی کے عہد میں نذر الاسلام اور قاضی عبد الودود وغیرہ ادیبوں کی اجتماعی، مذھبی اور تخلیقی خدمات کے ماسوا سراجی کے قائم کردہ راستے ھی کے ذریعہ تحریک پاکستان کی راھوں کو سہل گذار اور مشرقی پاکستان کے قومی ادب کے راستوں کو ھموار کیا ھے -

سید اسماعیل حسین سراجی واقعی طور پر وھابی نہ تھے - لیکن خیالات، نظریات اور اعمال میں وھابیوں کے ساتھ ان کی

عجیب وغریب مماثلت دیکھی جاتی ہے - ان کا خیال تھا کہ بھارت کے مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کی قدیم شجاعت اور بہادری کا جذبہ پھر ان میں واپس لایا جائے - یہ احیائے ثانیہ Revivalist کا نظریہ بھی ان میں نمایاں نظر آتا ہے - ایک طرف تو وہ بھارتی مسلمانوں کے احیائے ثانیہ کے لئے ساعی ہیں دوسری طرف انہوں نے اسی جوش کے ساتھ وحدت عالم اسلام یعنی پین اسلامی نظریات کو سیاسی اور ادبی حیثیت سے اپنی متعینہ زندگی کا ایک جز بنا لیا ہے - اس حیثیت سے مسلمان اسماعیل حسین سراجی بنگالی ادب میں ہندؤں کے بنکم چندر، رمیش دت، ہیم چندر، اور نبین چندر کے مد مقابل نظر آتے ہیں - مسلم قومیت کی منصوبہ بندی میں وہ علامہ شبلی نعمانی اور اقبال وغیرہ زعماء کے ہم تخیل اور تخلیق ادب میں اسلامی فلسفۂ حیات کے مفسر تھے - اس اعتبار سے ادبی زندگی میں وہ شودھاکر دل ہی کے پیرو نظر آتے ہیں - دوسرے لفظوں میں شیخ عبد الرحیم، منشی محمد ریاض الدین احمد، پنڈت ریاض الدین مشہدی اور مولوی معراج الدین وغیرہ ہی کے وہ متبع ہیں - ان میں اور سراجی میں فرق یہ ہے کہ شیخ عبد الرحیم کے سوا مذکورہ ادیبوں میں سے کسی اور کی ادبی خدمات سراجی کی طرح ہمہ گیر نہیں

هیں بہر حال یہ بات ناقابل انکار ہے کہ ان کے مرتبہ ادب میں رفعت تخیل جس حد تک ہے اس حد تک اوروں میں کامیابی کے ساتھ نمایاں نہیں ہوئی۔

اسمٰعیل حسین سراجی کی تمام عمر کا سرمایہ صرف مسلمانوں کو بیدار کرنا ھی تھا انکی دلی تمنا یہی تھی کہ مظلوم مسلمان علم و عمل اور صنعت و تہذیب میں سر بلندی حاصل کریں۔

سراجی کے '' تورُشکو بھرومن '' ، '' پرو بندھو پترو '' (حصہ اول ۔ پہلا ایڈیشن سنہ ۱۶۱۳ع صفحات ۱۴۲) '' ادب قاء-دہ شکّھا '' (پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۴ع صفحات ۱۳۰) '' اسپینیر مسلمان شبّھوتا '' (پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۱۶ع صفحات ۸۹) '' شوچنتا '' ، '' ترکی ناری جیبن '' اور '' اِستری شکھا '' وغیرہ مقالات کی کتابوں اور '' رائے نندینی '' (دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۸ع صفحات ۲۲۹) ، '' فیروزہ بیگم '' (دوسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۷ع صفحات ۱۲۱) ، '' تارا بائی '' (صفحات ۹۵) اور '' نور الدین '' وغیرہ ناولوں کے ذریعہ یہی نظریات ظاہر ہوئے ہیں۔

ان کے مضامین میں تخیل کے جو نمونے اور نظریات ظاہر ہوئے ہیں ان کے ناولوں میں بھی سوانح اور واقعات نیز کردار کی تشکیل میں ان کا مقصود ارادی استوار نظر آتا ہے۔

ان کے کسی ناول میں بھی پوری طرح کردار کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ وہ آدرش کے حامل اور نظریات کے کھلونے بنکر رہ گئے ہیں - چونکہ انھوں نے اپنے ناول میں اسلام کی عظمت کے راگ الاپے ہیں اس لئے ان میں علماء کے کردار زیادہ نظر آتے ہیں - ان کے کیرکٹر کا اظہار پوری طرح ہو یا نہ ہو لیکن چونکہ اسلامی کردار اور فلسفہ خودی کا مظاہرہ مقصود ہے اس لئے ان کی شجاعت اور بلند کردار سے متاثر ہو کر بہت سے ہندو بھی انھیں اسلام قبول کرتے نظر آتے ہیں - کیدار رائے کی لڑکی "شرنو موئی" نے عیسیٰ خاں کے گلے میں بر مالا ڈال کر اسے اپنا شوہر بنانا منظور کیا (رائے نندنی) اور شیواجی کی لڑکی تارا بائی افضل خاں کے پیغام محبت کو قبول کرتی ہے لیکن شادی کی مجلس میں دشمنوں کی سازش کا شکار ہو کر اپنی جان قربان کر دیتی ہے - دوسری طرف "فیروزہ بیگم" ناول میں سراجی نے مسلمانوں اور مرھٹوں کی جنگ اور کشمکش میں مسلم دوشیزہ فیروزہ کو غیر معمولی ذہانت، علم اور بےحد شجاعت کا مظہر بنا دیا ہے - اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ سارے ناول بھی خاص مقاصد کے زیر اثر لکھے گئے ہیں -

سراجی خوابوں کی دنیا کے شاعر تھے - "گسم انجلی" اور "آزِل پروبا ہو" وغیرہ منظوم کتابوں سے جھیں ان کی

شاعرانہ جودت کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے - ان کے ناولوں میں بھی ان کے مخمور ذہن کی گونا گوں نقاشی نظر آتی ہے - " رائے نندنی " ناول میں جیسور کے راجا پرتاپ رائے کی راج کماری ارونا بتی اور اس کے عاشق ماہتاب خاں کے دریا کے راستے سے فرار ہونے اور گھنے جنگلوں میں پوشیدہ طور پر قیام نے ایک رومانی خمار پیدا کردیا ہے - ایک طرف مصیبت سے ہمکناری اور دوسری طرف انسانوں کی بستی سے دور جنگل کے بیچ میں آشیانہ محبت کی تعمیر کے ذریعہ اس ناول کو سراجی نے اس درجہ رومان پرور بنا دیا ہے اور اس میں عشق و محبت کا ایسا نقشہ کھینچا ہے جس سے اس ناول کا حسن دوبالا ہوگیا ہے - ان کے " فیروزہ بیگم" اور "تارا بائی' ناول میں بھی ایسے ہی مناظر نظر آتے ہیں لیکن ان کے شاعرانہ تخیل نے ماہتاب خاں اور ارونابتی کو ساتھ لیکر رومان کی خیالی دنیا میں جس طرح آزادانہ سیر کی ہے اس طرح کامیاب سیاحت دوسری جگہ میسر نہ آسکی - " رائے نندنی" کے بعض بعض مناظر میں بنکم چندر کے "کپال کنتلا" اور چندر و شیکھر کے بعض بعض مناظر سے حیرت ناک طرز پر مماثلت بھی دیکھی جاتی ہے - رائے نندنی ہی تمام ناولوں میں ان کا شاہکار ہے -

سراجی کے ناولوں میں تشبیہات صنائع سے معمور ہیں اور کلاسیکل سنسکرت کے اصولوں سے مماثلت رکھتی ہیں - ان کی زبان میں خالص سنسکرت کی ترکیبیں بھی پائی جاتی ہیں - ان کی زبان میں نشست الفاظ اگرچہ وقیع ہے لیکن کہیں بھی روانی میں کمی نہیں پائی جاتی - ان کی زبان میں آتش فشانی کے ساتھ ساتھ شیرینی بھی ہے اور اس میں تاراشنکر کی "قدم بری" سے مماثلت پائی جاتی ہے - رائے نندنی ناول کے شروع ہی میں ہمیں ایک جملہ تقریباً تین صفحوں میں ختم ہوتا ہوا نظر آتا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ختم ہونا نہیں چاہتا - وہ ایک بڑے مناظر بھی تھے - ان کی مناظرانہ کیفیت ناولوں میں بھی نمایاں ہے -

ان کی باتیں طوفان خیز ہوتیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بجلی کے بازوں پر پرواز کر کے اس کی شعاؤں کی جانب اشارہ کر رہی ہیں - اس آتشی شعلوں کے سامنے انسانی ذہن کا تمام انتشار ناپید ہو جاتا ہے اور سننے والے ان کی ساحرانہ باتوں کو سنکر مسحور اور تابندہ ہوجاتے ہیں - (عبد القادر)

اسماعیل حسین ضلع پبنا کے سراج گنج شہر میں ۱۳ جولائی سنہ ۱۸۸۰ع کو پیدا ہوئے تھے - چونکہ وہ سراج گنج کے باشندے تھے اس لئے لفظ سراجی کو بطور خطاب اپنے نام کے ایک جز کی

حیثیت سے استعمال کرتے تھے - انھوں نے ۱۷ جولائی سنہ ۱۹۳۱ع کو اس دنیا سے رحلت کی -

---

قاضی امدادالحق

۱۸۸۲—۱۹۲۶ع

سرت چندر جیسا صاف تخیل ان کے دو مسلمان ہم عصروں میں بھی پایا جاتا ھے - ان میں سے ایک کھلنا کے باشندے قاضی امدادالحق ہیں اور دوسرے جیسور کے رہنے والے لطف الرحمان - سرت چندر نے جس طرح ہندو سماج کے ایک رستے ہوئے ناسور پر آنسوؤں کا مرہم لگایا تھا اسی طرح قاضی امدادالحق اور لطف الرحمان نے بھی بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اندر بہت سارے نقائص اور معائب دیکھ کر ان کی ہمدردانہ تصویر کشی کرکے اپنے دلوں کو تسکین دی ھے - لیکن ان دونوں میں کمی صرف اس قدر ھے کہ انھوں نے سرت چندر کی طرح ملک کے عوام میں مقبولیت حاصل کر کے ان تک اپنی آواز پہنچانے کی کوشش نہیں کی -

امداد الحق میں ایک ناول نگار کا حیرتناک زور قلم اور زندگی کے مشاھدے کیلیے پر شوق تخیل تھا - ان کا ناول عبد اللہ صرف ایک اعلی درجے کا مسلم سماجی ناول ھی نہیں ھے بلکہ بنگال کے ناول ادب میں اسے ایک خاص مقام حاصل ھے - (اس کا اردو ترجمہ شائع ہوچکا ھے) ادب کے تنقیدی معیار پر سرت چندر کے "پلی سماج" کے ساتھ عبد اللہ کو بھی مساوی درجہ حاصل ھے - اس ناول میں امداد الحق نے بنگال کے اشراف و اطراف (شریف و رذیل) کے مسئلے ، پردے کے سوال ، پیر پرستی ، گرو پوجا اور مذھب کے نام پر رسم و رواج کی تقلید و غیرہ مختلف نقائص اور معائب پر سخت تنقیدی تبصرے کئے ھیں - انھوں نے کتنے ھی واقعات اور کرداروں کے ذریعہ مسلمان قوم کے بہت سارے پرانے امراض ھماری نگاھوں کے سامنے لا کھڑے کئے ھیں - جدید تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ اب یہہ مراسم پرستی بھی ایک قدیم تاریخ بنتی جارھی ھے - دیہاتیوں یا قدیم مراسم پرستوں میں ابتک جو کچھ اثرات باقی رھگئے ھیں ان کے متعلق بھی یہی متوقع ھے کہ مستقبل قریب میں رفتہ رفتہ ناپید ھو جائیں گے - لیکن امداد الحق نے جس زمانے میں یہہ ناول مرتب کیا تھا اس وقت یہہ مسائل بنگال میں موجودہ دور سے کہیں زیادہ گہری بنیادیں رکھتے تھے - ناول عبد اللہ نے سماجی زندگی کے ان نقائص

و معائب کی اصلاح کیلئے نیز جدید اصلاح پسند جماعت کے
مقابلے میں قدامت و مراسم پرست جماعت کی شکست کے
سلسلے میں بنیادی کام کیا ہے اور اس کا سہرا امداد الحق کے
سر ہے۔ عبد اللہ، عبد القادر اور حلیمہ کو اس جدید جماعت میں
نقیب کی حیثیت حاصل ہے مگر اس میں عبد اللہ کے سر قیادت کا
سہرا ہے۔ عبد اللہ کے خسر سید صاحب تنہا ہی قدیم رسم و رواج کے
حامی اور جدید اصلاحی جماعت کے شدید مخالف کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ سید صاحب اور انکی دختر صالحہ وغیرہ قدیم
مراسم پرستوں کی تصویر کشی یا ان کے ذہنی اور مذہبی
تصورات کی عکاسی میں امداد الحق نے کہیں بھی تمسخر آمیز
ہنسی سے کام نہیں لیا ہے۔ حیرتناک طور پر کم فہمی کا
ثبوت دینے والوں سے بھی ہمدردانہ طور پر افہام و تفہیم کی
سعی کرکے اور مصلحانہ انداز سے ان کی جماعت میں گھس کر قدامت
پسندوں کے ہم عقیدہ لوگوں کے چال چلن پر انہوں نے بڑا موثر تبصرہ کیا ہے۔
ہندؤں اور مسلمانوں کے مسائل پر اس ناول میں امدا دالحق نے
جو چند باتیں کہی ہیں ان سے بھی امدادالحق کے اعتد ال پسند
خیالات اور فیاضانہ جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ عبد اللہ جیسا کوئی
اور ناول ہمارے ایک خاص دور کے سماج کی صحیح تصویر پیش
کرنے والا تصنیف نہیں ہوا۔ اس ناول میں امدا دالحق کا ذوق

بہت اصلاح پسندانہ اور واضح ہے - اس کی زبان بھی رواں اور دلکش ہے -

عبد اللہ ناول تین سو انیس صفحات پر پھیلا ہوا ہے - اس کے اکتالیس ابواب میں سے صرف تیس ابواب کی ترتیب امداد الحق کے ہاتھوں سے ہوئی - اس کے بعد حیات نے وفا نہ کی ما بقی کامسودہ بھی ان کا ترتیب دادہ موجود تھا - ان کی تکمیل کا بوجھہ " اما دیہ دُکھّر " کے مصنف اور ادیب انوار القادر پر آ پڑا - اس کتاب کے آخری گیارہ ابواب کی زبان انوار القادر ھی کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان ابواب کے نظریات امداد الحق سے مختلف نظر آتے ھیں - امداد الحق امتیازی طور پر سماج کے مصور ھیں اور انوار القادر ماہر نفسیات - اس ناول میں ھمیں یہ نظر آتا ہے کہ انوار القادر نے امداد الحق کے معلمین اخلاق افراد میں جان ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے - یہہ کتاب سب سے پہلے " مسلم بھارت پتریکا " کے ذریعہ سنہ ۱۹۳۳ع میں طبع ہوئی تھی -

امداد الحق کے " پر وبند ھو مالا (صفحات ۱۴۰) میں مندرجہ ذیل مقالات ھیں :— " الکزندریا ر پراچھن پشتا کا گار " (اسکندریہ کا قدیم کتب خانہ) " عبد الرحمن ار کرتی " (عبد الرحمن کے کارنامے) " فرانسے مسلم ادھیکار " (فرانس میں

مسلمانوں کی فتح) "الحمرا" پہلا حصہ" "اور مسلم جگتے بگیان چرچا" (ممالک اسلامی میں سائنس کی تعلیم و ترقی) ان مقالات میں ان کی علمیت اور زور قلم کے نشانات ملتے ہیں - امداد الحق کی "نبی کا ھنی" اس زمانے کے ادب اطفال میں ایک غیر فانی یادگار ہے -

محمد لطف الرحمن

۱۸۸۹—۱۹۳۶ء

عالم انسانیت کیلے عام دلسوزی اور ہمدردی کے جذبے نے دور جدید کے بنگالی ادیبوں کو ممتاز مقام کا مالک بنایا ہے انیسویں صدی میں نصف ثانی ہی سے بنگلا ادب میں انسان کی اپنی عظمت کا بالذات احساس نمایاں ہوا - مغرب میں انفرادی بیداری کے سیلاب نے بنگال کی سرزمین کو بھی سیراب کیا - دور وسطی کے بنگالی ادب میں دیوتا اور حاکمانہ نظام کے ہاتھوں سے عام انسانوں کی جس حد تک تذلیل ہوئی اور جس طرح ان کی انفرادیت پامال ہو کر غیر تسلیم شدہ حقیقت بنی اسی کے خوف سے موجودہ ادب نے باغیانہ اقدام کیا - مدھد شودن اور بہاری لال نے ادب منظوم میں

اس بغاوت کی ابتدا کی تھی اور ودیاساگر نیز بنکم وغیرہ زعما نے مقالات ، افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ اس کی آبیاری کی - انسانیت کے اسی آدرش نے روبندر ناتھ اور سرت چندر کے ہاتھوں بنگالی ادب میں روشن اور واضح راستے بتائے - ڈاکٹر محمد لطف الرحمان بھی انسان کی اسی انفرادی بیداری اور انسانیت کے دلدادہ ہیں -

لطف الرحمن کے احساس انسانیت Humanism اور دلدادگی بشریت کا اگران کے ماسبق ہم رنگ ادیبوں سے موازنہ کیا جائے تو بڑا فرق نمایاں ہوتا ہے - اسی اختلاف نے ادبی اور سماجی زندگی میں اُن کی خصوصیت اور ان کے امتیاز سے متعارف کیا ہے - انھوں نے انسانیت یا قومیت کا ایک ہمہ گیر اور مکمل تصور قائم نہیں کیا ان کا مطمح نظر انسان کی انفرادی حیثیت Individualility تھی - ان کے خیال میں اشخاص کی انسانیت میں توسیع کی راہ کا دوسرا نام ہی کیریکٹر کی تعمیر ، خود اعتمادی اور صفائے باطن ہے - ان کا تصور ہے کہ رحم وکرم ، شفقت و محبت اور رفاہ عام وغیرہ قلبی اعمال کی پریکٹس سے انسان تکمیل انسانیت کرسکتا ہے - ان کے خیال میں باعزت اور شریف انسان وہی ہے جو اچھے اخلاق کا مالک ، صداقت پرست اور علم کا پرستار ہو -

اسی مثالی انسان کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا :—

" تمھاری روح پاک ہے - تم علم کے خادم ہو ' خدا کی عجیب مخلوقات کی تحقیق میں تمھاری مسرت پوشیدہ ہے - تمھارا اخلاق بلند ہے ' عظیم المرتبت انسانوں کی پیروی ہی تمھارا مقصود حیات ہے - اصلاح نفس میں تم ایک فاتح بہادر ہو ' جھوٹ اور گناہ کے راستے میں حائل ہونے کو تم مذہب سمجھتے ہو ' تمھاری نظر ہر لمحہ تیز تر ہوتی ہے اور تمھاری روح ہر آن بیدار اور مضطرب رہتی ہے اس لئے میں کمال ادب وعقیدت کے ساتھ تمھاری خدمت میں اپنا ہدیۂ سلام پیش کرتا ہوں - زندگی کو شیریں اور پاک کرنے کیلئے تم نے اپنے آپ کو مشقتوں میں ڈالا ہے ' بوسیدہ بستر پر بیٹھ کر تم اسرار کی تحقیق میں مشغول رہے ہو اسلئے دنیا کے عام انسان اگرچہ تمھاری عزت نہیں کرتے لیکن میں تمھارا احترام کرتا ہوں -"

لطف الرحمان کا یہ عقیدہ تھا کہ سماجی زندگی کے ڈھانچ کو حسن کے ساتھ کھڑا کرنے اور قومی زندگی کو بلند اور باعظمت بنانے کیلئے انفرادی زندگی کو قابل تقلید اور لائق نمونہ بنانا ضروری ہے - انفرادی زندگی کی تعمیر کا یہ کام اُسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب وہ جماعت جسپر قومی زندگی کی تعمیر کا انحصار ہے یعنی قوم کو جنم دینے والی

ماؤں میں بیداری اور زندگی پیدا ہو جائے اسی لئے ان کی تمام تر زندگی کی جدو جہد کے دیباچے میں ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ انہوں نے سماج میں عورتوں کی نئی قدریں متعین کرنے ہی میں اپنی تمام تر مساعی ختم کی ہیں - اس معاملے میں بیک وقت وہ معیاری Idialist اور حقیقت پسند Realist دونوں ہی تھے - Idialist اسلئے کہ انسان کو معراج انسانیت تک پہنچانا ہی ان کی زندگی کا خواب تھا اور realist اسلئے کہ اس مقصد کے حصول کیلئے ہم انہیں واقعی کاموں میں مشغول دیکھتے ہیں - ان کے اخبار " ناری شکتی " (طاقت نسوانیت) "اور ناری تیرتھ" کے نام سے عورتوں کی ایک پناہ گاہ کے قیام نے بیک وقت بیداری نسواں کے معاملے میں بہت مدد کی ہے - نیز لا تعداد بے بس عورتوں کیلئے آزادی کے ساتھ حصول روزگار کا سامان فراہم کیا ہے - انہوں نے کبھی یہ پسند نہ کیا کہ عورتیں مردوں کی خادمہ یا محتاج بن کر زندگی بسر کریں - ان کا مقصد یہہ تھا کہ وہ عورتوں کو اقتصادی آزادی دے کر مردوں کے مساوی صف میں کھڑا کردیں کیونکہ اس کے بغیر عورت کی انفرادیت قائم نہیں رہ سکتی - اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ محتاج اور مجبور عورتیں اپنے بچوں کی بھی لائق انسان کی حیثیت سے پرورش نہیں

رسکیں گی - لطف الرحمان کے ان نظریات اور اس قسم کے کاموں کی وجہ سے ایک طرف بعض لوگوں کی طرف سے انھوں نے جس طرح یورپ کے نمونے پر اس دور کے " ھیرو "—knight " کا خطاب پایا تھا اُسی طرح بہت سارے لوگوں نے انھیں Eccentric (سنکی یا پاگل) کا خطاب بھی دیا تھا -

اسی آدرش کو پروان چڑھانے کیلئے لطف الرحمان نے اپنی ادیبانہ زندگی کا آغاز کیا - سنہ ۱۳۲۲ ب میں ان کی ایک منظوم کتاب بنام " پرو کاش " شائع ہوئی - یہی کتاب ان کی سب سے پہلی مطبوعہ تصنیف تھی - اس میں " شاد ھینتا " (آزادی) کے عنوان سے ایک نظم اس طرح مرتب ہوئی ھے - (ترجمہ)

"کذب اور گندگی جس کے دل میں جگہہ نہیں پاتی
مہربانی کی امید میں جو ھاتھ نہیں پھیلاتا
بہادر اور دولتمند وھی آزاد جوان مرد
بوقت ضرورت خندہ روئی کے ساتھ موت کو
بھی خوش آمدید کہتا ھے

اس نظم میں شاعر نے آزاد سے صداقت پرست، صاحب مقدرت اور بہادر اسی انسان کو تسلیم کیا ھے جو اپنے مقاصد کی حفاظت کیلئے بوقت ضرورت خندہ روئی کے ساتھ موت سے ہم آغوشی میں مسرت محسوس کرے - ان کی کتاب

" اُنّتسو جیبن " (ترقی یافتہ زندگی) " مانب جیبسن " " مہت جیبن " " شتّو جیبن " (سچی زندگی) " پتھ ھارا " (گمراہ) " چھیلے دیر مہتو کتھا" " چھیلے دیرکرلا " " بانی ہیلن " وغیرہ مقالات کی کتابوں میں اور " باشر اُپہار " " پریتی اُپہار " (تیسرا ایڈیشن سنہ ۱۹۳۰ - صفحات ۲۶۲) " شرلا " اور " ریحان " وغیرہ ناولوں میں نیز مختلف ماہوار جرائد کے منتشر مضامین میں انسانیت کی توسیع اور ہمہ گیری کیلئے ہی جدو جہد نظر آتی ہے -

لطف الرحمان کی ادبی لیاقت ان کے مقالات ہی کے ذریعہ ظاہر ہوئی تھی - علم اور نفسیات انسانیت کے مصلحانہ مقالہ نگارکی حیثت سے بنگالی ادب میں بلا شک وہ ایک مستقل مقام کے مالک ھیں - ان کے " باشر اُپہار " اور " پریتی اُپہار " ناول کی صورت میں در اصل مقالے ھیں ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے مکمل کی حیثیت رکھتا ھے - " پریتی اُپہار " بھا بھی اور نند کا مکالمہ اور " باشر اُپہار " میں دو دوستوں کے مکالمے درحقیقت دنیاوی زندگی کی مختلف راھوں کو طے کرنے کیلئے اپنے اندر نصائح کا خزانہ رکھتے ھیں - ان دونوں کتابوں میں بیوی ، بچہ ، میاں بیوی اور اھل خاندان کے باھمی حقوق کیلئے تصفیہ کن فیصلے ھیں - ریحان (سنہ ۳۲۶ ب

صفحات ۱۹۸) خاص مقصد اور مفید نصائح پر مشتمل ایک ناول ہے۔ تنقید کے معیار پر ریحان ایک واقعی ناول ہے لیکن کسی خاص امتیازی نشان کا حامل نہیں ہے اسلئے اسے بھی ہم کامیاب ناول نہیں کہہ سکتے۔ کردار کے بیان یا مصنف کے مقاصد میں غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت، تعلیم نسواں اور ہندو مسلم اخلاقی مسائل کے متعلق بہت سارے مسائل کا اس میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں کوئی مرکزی واقعہ یا کیرکٹر نہیں ہے۔

صرف ''شرلا'' ہی میں (پہلا ایڈیشن سنہ ۱۳۲۵ب صفحات ۱۹۶) دسی قدر ناول کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں بھی دھرم اور دیوتا کی خدمت کیلئے وقف شدہ شرلا ایک لازوال جذبۂ عشق کے جال میں پھنس کر اور ماں باپ کی شفقت و محبت سے کنارہ کش ہوکر عام راستے پر نکل کھڑی ہوتی ہے اور زندگی کو ہمہ خار محسوس کرتی ہے۔ احمد نامی ایک معیاری مسلم نوجوان کی صحبت میں آکر اس نے از سر نو ذوق زندگی سے آشنائی حاصل کی۔ لیکن یہہ تعلق بھی اس کی زندگی میں دیرپا نہ رہا آخر کار اُس نے بڑی مشقتوں سے تعلیم اور دستکاری سیکھی۔ پھر اس ذریعے سے وہ خود اپنے قدموں پر کھڑی ہوسکی۔ اس ناول میں بھی کیرکٹر کی تصویر کشی

نہیں ہے۔ صرف ایک معیار اور آدرش کی تشریح اور اسکے متعلق واقعات ہیں۔

معیاری خادم قوم انسان قومی تعمیر کے مقصد سے اپنی زندگی کے تخیلات کو ادب میں قلمبند کر جاتے ہیں۔ وہ زندگی ہی سے اسباب ادب فراہم کرتے اور اس کی توسیع کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یہہ ہوتا ہے کہ وہ مابعد کے آنے والے انسانوں کی سماجی زندگی کی راہ زیادہ حسین، دلکش اور درخشاں کریں۔ انسانیت پرست لطف الرحمن کی عمرانی اسرار پر مشتمل تحریرات Socialogical writings سے بنگال کے مسلمانوں کو بھی بہت سے فوائد حاصل ہوئے اور غالباً اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ موجودہ اخلاقی بدحالی کے شکار پاکستان میں جان ملت لطف الرحمان کی تحریرات کی نئی قدریں متعین کرنے اور اس کے مطابق ہماری اولاد کے اخلاق کی تعمیر کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔

سنہ ۱۸۸۹ع میں لطف الرحمان ضلع جیسور میں متولد ہوئے تھے۔ وہ ہومیوپیتھک علاج کے ماہر تھے اور اسی وجہ سے وہ ڈاکٹر کے لقب سے ملقب ہوئے۔ جیسور کے دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں جوان کے ہم عصر تھے لطف الرحمان کا خالص انسانیت پرست نظریہ اور انکی حیرتناک وسیع القلبی

بہت زیادہ قابل ذکر ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ع میں دق کے مرض میں لطف الرحمان نے وفات پائی۔

نورالنسا خاتون

پیدائش سنہ ۱۸۹۴ع

بیسویں صدی کی ابتدا میں صرف مسلمانوں ھی میں نہیں ہندؤں میں بھی ادیب خواتین کی بہت کمی تھی۔ اس عتبار سے زمانہ زیر تبصرہ میں جن دو مسلم ادیب خواتین کا تذکرہ ھمیں ملتا ہے ان پر ھم بجا طور پر فخر کرسکتے ھیں۔ بیگم رقیہ سخاوت حسین کی ادبی زندگی کا ھم پہلے ھی تذکرہ کرچکے ھیں۔ نورالنسا خاتون بھی اسی دور کی ایک اور لائق ذکر مسلم ادیب خاتون ھیں۔ یہہ ضلع مرشدآباد کے مشہور مقام سالار کے معروف خندکار گھرانے اور صوفی شاہ طاھر صاحب کے خاندان میں سنہ ۱۸۹۴ع میں پیدا ھوئی تھیں۔ بیگم رقیہ کے گھر والوں کی طرح نورالنسا کے گھرانے میں بھی اس زمانے میں پردے کا رواج کسی طرح کم نہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ اسکول اور کالج کی تعلیم ان کیلئے بھی ممکن

نہ ہوسکی۔ اس لئے مختصر گھریلو تعلیم ہی ان کی ادبی زندگی کا ابتدائی سرمایہ بنی۔

قاضی غلام محمد کے ساتھ شادی کے بعد انھوں نے پردے کی دیوار پھاند کر بیرونی دنیا سے باخبر ہونے کا موقع پایا۔ شوہر کے وسائل عمل اور ذرائع سفر کی وجہ سے اس دور کے بھارت کی بہت ساری تاریخی جگہیں اور صحت بخش مقامات کا انھوں نے بچشم خود مشاہدہ کیا۔ اس ذریعے سے مقفاد زندگی اور دنیا کا نقشہ ان کے ذہن میں منعکس ہوا۔ ان کی طاقت سیر تیز رفتار ہے۔ سنسار اور سماج کی زندگی کے دوران میں انھوں نے اپنی نگاہوں سے جو کچھ دیکھا ہے ادب کے اسباب کی حیثیت سے وہ دانستہ اور نادانستہ طور پر خود ان کے دل میں مجتمع ہوکر رہا ہے۔ ترتیب ادب کے موقع پر اسی ذخیرے نے ان کے ذہن کی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کردی ہے۔ اس طرح ان کے تجربات کی دنیا خود بخود ان کے ادب میں آکر جلوہ گر ہوگئی ہے۔

سماج کے ناسور کی بنیاد کو نمایاں کرنے کے معاملے میں بیگم رقیہ کی نظر نہایت واضح تھی۔ انھوں نے گہری ظرافت اور طنز کی ضربات سے سماج کو شکستہ کرنے کے بعد جس طرح ہوشیار کیا ہے نورالنسا خاتون کی نظروں میں وہ گہرائی،

ہمدردی اور وسعت نہیں ہے۔ تجربات کے ذریعہ حاصل شدہ گھریلو زندگی کا نقشہ، علم سے حاصل کردہ حقائق اور سیر و سیاحت سے حاصل شدہ احساس کے انکشاف ھی نے ان کے ادب کو رنگین بنایا ہے۔

ان کا پہلا معاشرتی ناول "شپنو درِشتا" (پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۳ع صفات ۱۸۸) ہے اس ناول میں انھوں نے ایک مثالی دوستی کی عظمت بیان کی ہے۔ وکیل انوارعلی کی پہلی بیوی کے انتقال سے کچھہ دنوں بعد ان کی مرحومہ بیوی نے انھیں خواب میں ایک لڑکی کی صورت دکھا کر اس سے شادی کرنے کی درخواست کی۔ انوار علی کے مخلص دوست احمد حسین نے جو ولایت سے فارغ ہوکر واپس آئے تھے انوارعلی کے خواب کا واقعہ سن کر ان کی خواب میں دیکھی ہوئی لڑکی کو تلاش کرنے کا عہدواثق کیا۔ یہ خواب میں دیکھی ہوئی لڑکی خود احمد حسین کی سالی ھی تھی انوارعلی کے ساتھ احمد حسین کے خسر اورخوش دامن اپنی چھوٹی لڑکی رشیدہ کی شادی کرنے پر رضامند نہ ہوئے اور احمد حسین رنجیدہ ہوکر اپنی محبوبہ بیوی مومنہ کو چھوڑ کر بھارت کے مختلف مقامات پر آوارہ گردی کرنے لگے۔ نورالنسا نے اپنی ذاتی زندگی کے تجربات احمد حسین

کی پوشیدگی اور ان کے حصول کی کہانی کے بیان میں استعمال کئے ہیں - بالآخر احمد حسین پکڑے گئے اور گھر واپس آکر انھوں نے انارکلی جیسی سالی رشیدہ کو اپنے دوست انوار کے ہاتھوں سونپ کر سب کی زندگی خوشگوار بنائی

اس ناول میں رومانی طور پر تلاش محبوب کی نشانیاں ملتی ہیں - سماجی تصویر کشی کے بعض مواقع پر " الالسر گھر دولال " کا رنگ ظاہر ہوتا ہے - نیز احمد حسین اور مومنہ کی تعیش کوش زندگی کے آرام بخش نرالے لمعات کے تذکرے کے وقت مصنفہ کے مخلصانہ جذبات مسرت بھی غیر معمولی طور پر ظاہر ہوئے ہیں -

" جانکی بائی یا بھارت کے مسلم ہیرو " (بھارت میں مسلمانوں کی شجاعت) ایک تاریخی ناول ہے - اس کا پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۲۴ء میں ۱۴۰ صفحات پر شائع ہوا - اس میں علاء الدین خلجی کے ذریعہ بھارت میں اسلامی سلطنت کی توسیع کی کہانی کو مرکز بناکر اس کے سپہ سالار الف خان عرف یوسف خان اور راجا رام دیو کی بھتیجی جانکی بائی کے افسانے محبت بیان کئے گئے ہیں - اس ناول کا اصل موضوع کلام رومانی ہے -

" آتّو دان " (قربانی نفس) (سچاواقعه دیهاتی طرز بیان)
اس کا پہلا ایڈیشن سنه ۱۹۲۵ع میں ۱۲۴ صفحات پر شائع ہوا تھا -
اس میں مصنفه نے اپنی والدہ کے شداید اور ریاضات زندگی کا
حال بیان کیا ہے - شوہر کی کم سنی کی موت کو مرکز بنا کر
زرینه کی زندگی پر کس طرح دکھ کی گھنگھور گھٹائیں
چھائی تھیں، اس کا غمناک تذکرہ نورالنسا نے اس کتاب میں
کیا ہے -

" بھاگو چکّرو " " بیدھی لی پی " (طربیه) اور نیتّی
(المیه) کو ناول نگاری کے طرز پر مرتب کیا گیا ہے -
ان تینوں مختصر کتابچوں میں بھی مصنفه کی رومانیت
قابل لحاظ ہے -

مذکورہ کل تصنیفات کو یکجا کر کے " نورالنسا گرنتھا بولی "
کے نام سے ایک مجموعه فراہم ہوا ہے - اس مجموعے کے
صفحات ۶۰۲ ہیں -

" مسلم بکرم و بنگلائے مسلمان راحتّو " (پہلا ایڈیشن سنه ۱۹۲۶ع
صفحات ۳۹۱) نورالنسا کی ادبی زندگی کی جدو جہد کا آخری
ثمرہ ہے - اس میں حضرت ابو بکر کی زندگی سے آغاز کر کے
بنگلا کے آخری آزاد فرماں روا سراج الدوله کے خاتمے تک مسلم
شجاعت کے کارناموں کی تاریخ انھوں مرتب کی ہے -

نورالنسا کی ادبی خدمات کے صلے میں انھیں " بِدّیابی نودیفی " (علم سے مسرور خاتون) اور " شاهتو شرشتی ' (ادب کی سرسوتی) خطابات سے نوازا گیا تھا - بہت دنوں تک وہ بنگال کی انجمن خواتین کی صدر بھی تھیں -

نورالنسا کی زبان بے ساختہ اور سہل ہے - ان کی تصنیفات میں عورت کی روح ظاهر هوتی هے اور عدم ثقالت کے ساتھ صفائی اور روانی هے - ان کی کتابوں میں ظرافت اور طنز کی بھی کمی نہیں هے - پہاڑیوں کی بولی ' مدراسیوں کے مکالمے اور ڈھاکا کی بگڑی هوئی زبان کا انھوں نے حیرتناک مہارت کے ساتھ استعمال کیا هے -

مسلمان خواتین کی بیداری اور همارے قومی ادب کی تاریخ میں ان کی ادبی خدمات کے بارے میں یہہ متوقع هے کہ وہ لازوال رهیں گی -

ابتک جن مسلمان ادیبوں کے متعلق تذکرہ کیا گیا هے ان کے علاوہ پاکستان کے سابق دور میں اور بھی جو لوگ افسانے اور ناول وغیرہ تخلیقی طور پر مرتب کر چکے هیں ۔ وہ سب هی یا تو انیسویں صدی کے آخری عشرے میں یا بیسویں صدی کے ابتدائی عشرے میں پیدا هوئے هیں - ان میں سے محمد هدایت اللہ ' ایس واجد علی ' شاعر شہادت حسین مرحوم '

ابراهیم خاں ، اکبر الدین ، شیخ فضل الکریم ، ابو المنصور احمد ، محبوب العالم ، بنگال میں دور جدید کے بانی شاعر قاضی نذر الاسلام ، محمد نجیب الرحمان ، ابو الفضل ، نذیر الاسلام محمد سفیان ، محمد قربان علی ، شیخ محمد ادریس علی ، اور قاضی دین محمد کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے - ان میں سے اکثر اب بھی بقید حیات ہیں -

محمد ھدایت اللہ کی پیدائش سنہ ۱۸۸۰ع میں ضلع چوبیس پرگنہ ، تھانہ باراسات کے موضع قاضی پاڑا میں ہوئی - وہ بہت دنوں تک ٹالی گنج میونسپلیٹی کے چیرمین رہے - " پرودیپ و چراغ " (اس میں مختلف افسانے ہیں) - " نیک نظر " (ناول) اور تعزیہ (ناول) لکھ کر انھوں نے شہرت پائی ہے - ۶۶ سال کی عمر پاکر سنہ ۱۹۴۶ع میں انھوں نے وفات پائی -

شیخ واجد علی :- شیخ واجد علی ضلع ھوگلی محکمہ سری رامپور کے موضع بڑوجات پور میں ۴ ستمبر سنہ ۱۸۹۰ع میں پیدا ہوئے - انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے بی - اے اور بیرسٹری میں کامیابی حاصل کی تھی اور بہت دنوں تک کلکتہ کے تیسرے پرپسیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے سرکاری ملازمت میں مشغول رہے -

اپنے مقالات کی کتاب میں بنگال کے ھندوؤں اور مسلمانوں کے

اختلاط سے ایک مشترکہ قوم کی تعمیر کے امکانات پر ایس۔ واجد علی نے اپنا زور قلم صرف کیا ہے۔ ان کے ادب میں بلند پایہ ذوق، خیالات کی صفائی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ واجد علی کی ادبی زندگی میں ایک نرالا پن اور بے ھمگی بھی نمایاں ہے۔ سماج کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور اسی لئے ان کے ادب میں ہمیں واقعی زندگی کا فقدان نظر آتا ہے۔ ان کی کتاب "گلدستہ" "معشوقیر دربار" "درویشیر دعا" اور "بھانگا بانشی" وغیرہ میں صداقت اور حسن، اصول پرستی، مذھب پرستی اور طاقت کا احساس نظر آتا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل نے ان چیزوں کا عکس قبول کیا ہے۔ چھوٹے افسانوں میں قصوں کی اختراع سے بھی ان میں سچائی اور صداقت کی قدر زیادہ نظر آتی ہے۔

ان کے افسانوں میں کردار کی تصویر کشی نہیں ہے۔ انسانی زندگی کے عملی اضطراب کی طرف چھوٹے چھوٹے حصوں میں عمل اور رد عمل نہیں پایا جاتا۔ ان کے قصوں کی ایجاد میں ان کے احساس زندگی اور معیاری نظریات نے روانی پیدا کی ہے۔ ان کی کتاب "معشوقیر دربار" "پریمیر مسافر" درویشیر دعا، فرشتہ دیر کلھو، بھارت برشو

نبی درشن " وغیرہ قصوں سے یہی باتیں ظاہر ہوتی ہیں -
چھوٹے قصوں کی خصوصیات مقابلتاً ان کے غیر معروف دو چھوٹے
قصوں میں زیادہ احتیاط کے ساتھ باقی رکھی گئی ہیں -
ان میں ایک کا نام " تارا " اور دوسرے کا نام " ترون عرب " ہے -
ایس واجد علی نے دس جون سنہ ۱۹۵۱ع کو وفات پائی -

شہادت حسین :— شاعر شہادت حسین کی پیدائش سنہ
۱۸۹۳ع میں ہوئی - وہ ضلع چوبیس پرگنہ ' محکمہ باراسات کے
موضع پنڈت پول میں پیدا ہوئے تھے - ادبی دنیا میں انہوں نے
جو کچھ شہرت حاصل کی وہ شاعری ہی کی رہین منت تھی
تاہم ان کی شاعرانہ زندگی کے درمیانی وقفات میں ہم انہیں
چودہ ناولوں کے مصنف کی حیثیت سے بھی دیکھتے ہیں :—
" مورو رُکشم " " ہیرن ریکھا " " پاریرپتھے " " شامیر بھول "
" کھریر لکھی " " کھیاتری ' " شونار کا نکن " " رِکتا " " جرگیر آلو "
" پتھیر ریکھا " " کانٹا پھول " " شیریں فرہاد " " لیلی مجنوں "
اور یوسف زلیخا " کے مصنف شہادت حسین ہیں - ایک شاعر کی
حیثیت سے شہادت حسین رومانی ہیں - ایک ناول نگار کی
حیثیت سے وہ ماضی کے متعلق پرستارانہ عقیدت اور والہانہ
جذبہ رکھتے ہیں - رومانی شعرا ماضی کے کھوئے ہوئے لمحات کی
باتیں یاد کر کے انہیں نہ پا سکنے کے غم میں Where are the

snows of yester years ؟ کہہ کر جس طرح دو قطرے گـرم گرم آنسؤں کے ٹپکا دیتے ھیں - اسی طرح شـہادت حسین نے بھی ھندوستان کی تاریخ کے اوراق سے قابل فخر مسلم دور کے حسین دنوں کو عہد حاضر کے پس منظر کی حیثیت سے پیش کرنے کے لئے رنج و غم کی تصویر کشی کی ھے - ان کے "مورو رُشم" وغیرہ ناولوں میں ان کی جدو جہد کامیاب رھی ھے - شہادت حسین کی نظموں کی زبان میں جو شرافت اور علمیت نظر آتی ھے وہ ان کے ناولوں میں بھی پوری علاحیت کے ساتھ باقی رھی ھے -

شہادت حسین نے ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۵۳ع کو راہ عدم اختیار کی -

ابراھیم خاں :— ابراھیم خاں ضلع میمن سنگھہ محکمۂ ٹنگائل کے موضع شاباج نـگر میں سنہ ۱۸۹۴ع میں پیدا ہوئے - ان کی ادیبانہ شہرت ان کی "شونار شیکل" اور "لکھی چھاڑا" وغیرہ مضامین اور افسانوں نیز "کمال پاشا" اور "انور پاشا" وغیرہ ڈرامـوں کی وجـہ سے ھوئی - سماج اور قومی تعمیر کے لـئے انتھک کوشش ھی ابـراھیم خاں کی خصوصیات زندگی میں سے ھے - میمن سنگھہ میں کراٹیا کالج کی انھوں نے بنیاد رکھی - اس کالج کا بنیادی استحکام اور اس اطراف میں توسیع تعلیم کے لئے ان کے درد بھرے دل میں جن تمناؤں کے نشانات پائے جاتے ھیں وھی نشانات ان کی تصنیفات میں بھی نظر آتے ھیں -

ان کے مقاصد یہ ھیں کہ بنگال کے دیہاتوں کی پوری پوری
ہمدردانہ تصویر کشی وہ اسی انداز سے کریں جس طرح
ان کے دل میں وہ تصویریں زندہ ھیں - خاص طور پر
ان کے افسانوں میں غریب اور بیکس کسان گھرانوں کے ایک
ایک فرد کا کردار اور اس کے چھوٹے چھوٹے حصے جس طرح
صاف اور نمایاں نظر آتے ھیں ان سے یہ واضح ھوتا ھے کہ اپنے
وطن کی متی سے ان کے دل کو بڑا گہرا لگاؤ ھے - کردار کی تصویر
کشی میں یہ جذبات ہمدردی ایک ادیبانہ زندگی کا بڑا
قیمتی سرمایہ ھیں - ابراھیم خاں اس سرمائے کے مالک ھیں -

اکبرالدین :- اکبرالدین ضلع ندیا شہر کرشنا نگر میں
سنہ ۱۸۹۶ع میں پیدا ھوئے - بنگال میں اس صدی کے دوسرے
اور تیسرے عشرے کے اندر الاسلام، سوغات اور محمدی وغیرہ
رسائل کے ذریعہ بنگالی مسلمانوں میں خالص اپنی تہذیب سے
متعلق ادب کی تخلیق کے لئے جن لوگوں نے کامیاب کوششیں
کی ھیں ان میں اکبرالدین ایک صاحب سطوت ادیب ھیں -
بنکم چندر سے ڈی - ایل رائے تک سارے ھندو ادیبوں کے
ھاتھوں سے مختلف مسلم کردار کے نقوش جس طرح مسخ کرکے
پیش کئے گئے ھیں اس کے متعلق سنہ ۱۹۱۶ع میں رسالۂ الاسلام کے
ذریعہ "بنگالی ادب میں مسلمانوں کا مقام" کے نام سے ایک

مسلسل تفصیلی مضمون شائع کرکے اکبرالدین ھی نے یہ
ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اگر مسلمان خود اپنے قومی
ادب کی تعمیر نہ کریں گے تو غیروں کے مرتبہ ادب کے ذریعہ سے
ان کے صحیح خدوخال کبھی ھمارے سامنے نہ آسکیں گے ۔ سنہ
۱۹۲۵ع سے سنہ ۱۹۳۲ع تک اپنے ابتدائی خدمت ادب کے دور
میں انھوں نے بہت کچھہ پر مغز مقالے اور جان دار افسانے
نیز ناول اور ڈرامے لکھے ۔ " سرزمین بنگالہ میں مسلمانوں کو
ان کی اپنی حقیقت سے متعارف کرانا ھوگا اور انھیں خود اپنے
قدموں پر کھڑا ھونا پڑے گا " ھی اکبرالدین کے مقالات کا
موضوع کلام تھا ۔ یہی امور ان کے قوی تر نظریات کی
خصوصیات کہے جاسکتے ھیں ۔ مسلم تاریخ کے گزرے ھوئے
قابل فخر واقعات ان کے " شہید ھو بحے " (فتح سندھ) اور
" سلطان محمود " وغیرہ ڈراموں میں جیتے جاگتے نظر آتے ھیں ۔
مسلم سماجی زندگی کی واقعی تصویر میں رنگ بھرنے ھی سے
ان کے افسانے اور ناول امتیازی خصوصیات کے حامل ھوئے ھیں ۔

ان کے " بیڑا جال " اور " ابھی نیتا " نامی دو ناول سلسلہ
وار طور پر ماھنامہ " سوغات " اور ماہ نامہ " محمدی "
میں شائع ھوئے تھے ۔ صرف " ماتیر مانش " نامی ناول ھی
ان کی اپنی لائبریری سے اشاعت پذیر ھوا ۔ اس کی طباعت

سنہ ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی - اشراف اور اطراف کے تباہ کن مسائل نے اس دور کے بنگالی مسلمانوں کو کم نقصانات نہیں پہنچائے - سماج کے اس نقص کو ایک پختہ کار مصور کے موقلم کی مدد سے امداد الحق نے سنہ ۱۹۲۰ء میں اپنے مشہور ناول " عبد اللہ " کے ذریعہ ظاہر کیا تھا - اکبر الدین اس حد تک سماج کی تصویر کشی نہیں کرتے جس قدر وہ ماہر نفسیات اور مصور کردار ہیں - ایک اطراف (غیر شریف) گھرانے کا لڑکا لطیف جو بڑی شان سے تھانےداری کے فرائض انجام دے رہا تھا اپنی بد اطواری کی وجہ سے بد نصیبی کے جال میں پھنس کر ملازمت سے برطرف ہو گیا - اپنے ہم کُف " ہمت مول " وغیرہ لوگوں سے اس نے اپنی تھانہ داری کے زمانے میں بہت ہی متکبرانہ برتاؤ کیا تھا - ان حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے اکبرالدین نے اپنے ناول " ماتیر ماٗنش " میں بڑے ہی ہیبت ناک اور عبرت فزا احوال بیان کئے ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ایک خاکی انسان کس طرح رفتہ رفتہ حالات اور تغیرات کے ہاتھوں خاک میں مل جاتا ہے - اکبرالدین ایک ڈراما نویس کی حیثیت سے زیادہ متعارف ہیں - عزت و آبرو سے متعلق ایک نہایت ہی معمولی واقعے کو مرکزیت دے کر اس ناول میں انھوں نے واقعات میں بڑا ہی تموج اور طوفان خیزی پیدا کی ہے - مذکورہ واقعے

میں حیرت ناک مستقل مزاجی اور چابک دستانہ ڈرامائی روانی نیز کشمکش نے اس ناول کو ایک بلند پایہ ڈرامائی ناول بنادیا ہے - مذکورہ کرداروں میں ھمت موڑل اور لطیف داروغہ کے کیریکٹر کے تذکرے میں اکبرالدین کی بے مثال نفسیاتی عکاسی دی مہارت کا رفرما نظر آتی ہے - زبان کی سادگی نے اس ناول کی روانی میں اور بھی چارچاند لگا دئے ھیں -

o

شیخ فضل الکریم

۱۸۸۲—۱۹۳۶ء

" پرتّران کابّو " کے مصنف شیخ فضل الکریم بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ایک قابل ذکر ادیب اور طاقت ور اھل قلم ہوئے ھیں - ۹ اپریل سنہ ۱۸۸۲ء کو ضلع رنگ پور کے مقام کا نکی نائے میں ان دی پیدائش ھوئی اور ۵۴ سال کی عمر میں ۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء کو انھوں نے وفات پائی -

اھل قلم حضرات نے انھیں " شاھتّو بشارد " (فاضل ادب) " نیتی بھوشن " اور " کابو رتناکر " جیسے بلند پایہ خطابات دئے تھے -

ادبی جدو جہد میں فضل الکریم ایک غیر متزلزل اسلوب تحریر کے مالک تھے - ادب ھی ان کا محبوب تھا اور اسی لئے انھوں نے دربار ادب میں اپنا سب کچھ سرمایہ قربان کرنے کی سعادت بھی پائی تھی - اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے سارے ادبی کارناموں میں ایک بے داغ ادبیت کی روح رواں اور دواں نظر آتی ھے -

فضل الکریم اپنی زندگی میں اصول پرور اور اصول ساز ادیب تھے - اُن کا احساس اصول پروری زیادہ تر مذھبی بنیادوں پر مبنی تھا اور اسلام ھی ان کا ماحصل ادب تھا - روحانی طور پر وہ چشتیہ مسلک کے عقیدت مند اور مرید تھے - انھیں بیعت خانوادہ چشتیہ کے ممتاز اہل معرفت حضرت مولانا شاہ سہارالدین (رح) پانی پتی سے حاصل تھی - شیخ کی صحبت ھی کا اثر تھا کہ ادیب فضل الکریم مذھب کے متوالے بنے اور ھمیں ان کے ادب میں ایک صالح تخیل کا رفرما نظر آتا ھے - عظیم شاعر ملٹن نے کہا ھے

A good book is the precious life blood of a master spirit

یعنی اچھی کتابیں اعلی روحانی زندگی کی حیات کا درجہ رکھتی ھیں - انسانی تصورات اور تخیلات اس کی جدو جہد کے راستے تخلیقی صورت میں متشکل ھوکر نمایاں ھوا کرتے ھیں - اصول پروری کی تعلیم واشاعت میں دل سوز فضل الکریم نے بہت سارے لمحات زندگی ان تھک محنت میں گزارے تھے -

ان کے ادب میں مذہبی تصورحہات ہی ان کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتا ہوا شیر و شہد کے دھارے بہاتا نظر آتا ہے -

اصول اور مذہبی تصنیفات کے صلے میں آل انڈیا مقابلے میں شرکت کی وجہ سے انہیں " شری بھارت دھرمو مہامنڈل، کی طرف سے امتیازی تمغہ اور " نہتی بھوشن " کا خطاب ملا تھا - مسلم تہذیب و ثقافت اور تاریخ کے اوراق سے نیز مسلم اولیائے کرام کے تذکرہ ہائے حیات سے انہیں جہاں کہیں اصول پروری کے اقتباسات مل سکے انہیں بنیادوں پر انہوں نے اپنے ادب کی تعمیر شروع کردی - لیلی مجنوں راج رشی ابراہیم (سلطان المشائخ ابراہیم رح) وغیرہ کتابوں میں انہوں نے اگرچہ انسانی محبت کے واقعات قلمبند کئے ہیں لیکن کہیں بھی مذہبی احساسات اور اصول پروری کے راستے سے نہیں ہٹے -

ہمیں فضل الکریم کی جن مطبوعہ کتابوں کا پتہ مل سکا ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں :—

١ - شرل پدو بیکاش (بچوں کیلئے منظومات کا مجموعہ) جب وہ خود پانچویں جماعت کے طالب علم تھے اُس وقت یہ کتاب مرتب کی تھی)

٢ - لیلی مجنوں — (نثر)

۳ ـ پری تران کا بو — (نظم)
۴ ـ تیرشنا (پیاس) — (نظم)
۵ ـ مان سنگھ — (نثر ـ ڈراما)
۶ ـ چھاموٗ تنو — (نثر)
۷ ـ حضرت ربانی صاحب ایر جیبونی — (نثر ـ سوانح)
۸ ـ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ـ (نثر)
۹ ـ بی بی رحیمہ — (نثر)
۱۰ ـ پتھ و پا تھبو — (نثر)
۱۱ ـ چنتار چاش — (نثر)
۱۲ ـ ہارون الرشیدر ایر گلپو — (نثر)
۱۳ ـ سونار باتی — (شمع زر ـ نثر)
۱۴ ـ راج رشنی ابراھیم — (نثر)
۱۵ ـ گانتھا — (نظم)
۱۶ ـ افغان ایر اینیہاش — (نثر)
۱۷ ـ عمرخیام ایر انو باد — (ترجمہ ـ نظم)
۱۸ ـ ما تھار منی (جوہر سر ـ رسالہ زمزم میں شائع شد× (نثر)
مسلسل مضمون (نثر)
۱۹ ـ حاتم طائی ایر گلپو — (نثر)
۲۰ ـ بی بی خدیجار جیبونی —

۲۱ ـ بی بی فاطمار جیبونی — (نثر)

۲۲ ـ بہشت ایر پھول — (نثر)

۲۳ ـ باغ و بہار — (ناول)

۲۴ ـ منشی مہر اللہ — (غم کے مضامین ـ نبو نور میں شائع شدہ)

۲۵ ـ بھکتی پُشپو انجلی — (نظم)

۲۶ ـ راجا موھیما رنجن — (نظم و نثر مخلوط ـ مضامین غم)

علاوہ بریں ان کی مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ کتابوں کے متعلق بھی معلومات حاصل ہوئی ھیں ـ ان میں سے بعض کے متعلق یہ امکان معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلکتہ کی نور لائبریری سے اشاعت پذیر بھی ہوئی ھیں ـ

۲۷ ـ الہارون — (تاریخ)

۲۸ ـ بھگنو بینا — (نظم)

۲۹ ـ پڑ و لیکر پوری نام — (نثر)

(یہ کتاب منشی مہر اللہ کی خواھش پر لکھی گئی تھی)

۳۰ ـ ایک ایشور باد — (نثر)

۳۱ ـ تری شروتا — (ناول)

۳۲ ـ پریم ایر شرینی — (تروِلھائی ـ نظم)

۳۳ ۔ بی بی عائشه — (نثر)

۳۴ ۔ جوار بها ٹا — (ناول)

۳۵ ۔ پرش منی (پارس پتھر ۔ حضرت محمد صلعم کی سوانح کی تبعیت میں مضامین نثر)

۳۶ ۔ راجا موهی ما رنجن ایر پشچم کاهینی ۔ (سفر نامه)

۳۷ ۔ حضرت پیغمبر گونیر جیبونی —

علاوہ بریں فضل الکریم نے " کانت نامه " کے نام سے ایک منظوم داستان (پوتھی) بھی مرتب کی تھی ۔

فضل الکریم کی مختصر اور طویل کتابیں چالیس کے قریب هیں ۔ ان کی تحریرات کے دوسرے رخ سے قطع نظر صرف کتابوں کی تعداد هی سے ان کی بے پایاں ادبی خدمات اور بنگلا زبان کی توسیع و اشاعت میں حصہ وافر لینے کی خصوصیات نمایاں هوتی هیں ۔ ان کی متذکرہ بالا کتابوں میں سے " لیلی مجنوں " (سنه ۱۹۰۳ع) ' " پتھو پا تھیو " (صفحات ۱۳۶ ۔ سنه ۱۹۱۳ع) ' " بی بی رحیمه " (صفحات ۱۹۱ ۔ سنه ۱۹۱۸ع) ' راج رشی ابراهیم (صفحات ۱۶۴ ۔ سنه ۱۹۱۹ع) " مسلم بھارت " میں سلسله وار طور پر سنه ۱۹۲۰ع میں شائع هوئی تھیں ۔ پھر یه کتابی صورت میں سب سے پہلے سنه ۱۹۲۴ع میں حلیه طبع سے آراسته هوکر منظر عام پرآ ئیں ۔ ' چنتار چاش " ، " چھا مؤ تتر "

(صحفات ۲۸ - سنه ۱۹۰۳ع ، " هارون رشید اپر گلهو " " افغانستانر ایتیهاش " اور " باغ و بهار " وغیره کتابیں خاصی اهمیت رکهتی هیں -

فضل الکریم نے مذکورہ بالا کتابوں کی تصنیفات کے علاوہ مندرجه ذیل اخبارات کی ادارت کے کام بهی بڑی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دئے تهے -

۱ - " باشنا "-

۲ - " زمزم "

۳ - " کتولینی " - (ایک جزو کا چهپتا تها)

۴ - " رتنو پرودیپ " (دستی رساله)

(نوٹ - ' دلربا سنه ۱۳۵۹ ب ' " آترنگے شاهتو پروبندهو " عبد الکریم شاهتو بشارد)

متذکرہ بالا کتابوں میں سے " پتهه و پاتهیو " میں فضل الکریم نے مختصر افسانوں کے روپ میں بہت سے اصول کی تشریحات کی هیں - ان کی کتاب " چنتارچاش " ایک بہت هی مختصر سا کتابچه هے - شیخ سعدی کی گلستاں و بوستاں نیز روبندرو ناتھ کی " کنیکا " (جواهر پارے) کے نصائح کی تبعیت میں یه کتاب بهی نصائح کے جواهر پاروں سے مملو هے -

" بی بی رھیمہ " کے متعلق اخبار " دیش " کا مندرجہ ذیل تبصرہ
اس کی خصوصیات کو واضح کرے گا -

" ہم نے بڑے اشتیاق سے یہ کتاب پڑھی ہے اور پڑھ کر ایک واقعی مسرت محسوس کی ہے - ایک مقدس زندگی کے متعلق مصنف نے اپنے زور قلم سے جس تصویر کی عکاسی کی ہے وہ پڑھنے سے ہر ہر قدم پر واضح تر ہوتی جاتی ہے - ساتھ ہی ساتھ تقدس اور عظمت کا احساس دل پر مستولی ہوتا ہے - ایسی ہی زندگیوں کو مقدس اور خوش نصیب زندگی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - ہمیں سیتا ' ساوتری ' ' دمینتی ' اور مقدس شویو اور بالخصوص سری بتشو کے متعلق تخیلی مباحث کے ذریعہ جو دوقیاتی کیفیت محسوس ہوتی ہے اسی کا نمونہ حضرت ایوب اور بی بی رحیمہ میں بھی نمایاں ہوا ہے - مقدس عقیدتمندی کے نقوش اس کتاب میں زیادہ گہرے ہیں - اس کی زبان آسان' رواں اور دلکش ہے ... ... "

شیخ فضل الکریم کو بنگلا زبان پر غیر معمولی عبور اور قدرت حاصل تھی - مضامین کے لحاظ سے وہ بنگلا نثر میں شیرینی اور زور بیک وقت پیدا کرنے پر قادر تھے - بے حد آسان زبان' کلاسیکل زبان' روز مرہ کی زبان یا اہم علمی اور ادبی زبان جس میں طویل جملے عالمانہ مضامین اور وقیع زبان استعمال ہوتی ہے ہر ایک میں وہ بے پایاں روانی اور تموج پیدا کرکے ہنستے کھیلتے

گزرتے جاتے ہیں ۔ کتابی سنجیدہ زبان (سادھو بھاشا) اور روزمرہ (کتھو بھاشا) دونوں ہی نے فضل الکریم کے ہاتھوں بے حساب شیرینی اور توسیع کے امکانات حاصل کئے ہیں ۔ ان کے اسلوب بیان اور طرز تحریر کی عذوبت آمیز روانی نے اس دور کے مسلمان ادیبوں کے ساتھ ساتھ ہندو ادیبوں کو بھی ایک خاص طرز کی نعمت بخشی ہے اس میں شک نہیں کہ زبان کی حیثیت سے موجودہ دور میں انہیں یعقوب علی چودھری کے ساتھ بڑی مماثلت حاصل ہے ۔ " شانتی دھارا " میں اسلامی قومی فلسفہ کی بنیاد رکھ کر اس صنف ادب کی تخلیق میں یا " مانب موکوتھ " (تاج انسانیت) میں حضرت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات کے سلسلے میں یعقوب علی نے جس طرح اچھے جذبات کا بے مثال نمونہ زبان کے ذریعہ ظاہر کیا ہے اسی طرح حقیقی یا مجازی محبت کا بیان کرتے وقت یا کشمکش اور جدو جہد حیات کا نمونہ پیش کرتے وقت فضل الکریم نے بھی ایسے جواہر پارے پیش کئے ہیں کہ پڑھنے والا مسحور ہوکر رہ جاتا ہے ۔ ہر ہر لفظ اور ہر ہر جملے سے ان کے دلی جذبات اس طرح امڈتے پڑتے ہیں جنہیں الفاظ میں سمونا مشکل ہو جاتا ہے ۔ ان کی مصنفہ کتابوں بالخصوص راج رشی ابراھیم اور دوسری کتابوں سے ایسے وافر نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ ایسی صحت مند اور پر زور Emotional نثر لکھنے والا

مصنف نذر الاسلام کے سوا مسلمانوں میں ہمیں دوسرا نظر نہیں آتا۔

سنہ ۱۹۰۳ع میں سترہ سال کی عمر میں انھوں نے اپنی کتاب۔ "لیلی مجنوں" مرتب کرکے شائع کی۔ ۱۹۳۱ع تک میں اس کتاب کے آٹھ ایڈیشن نکلے۔ مشہور اور غیر فانی فارسی شعرا نظامی اور ہاتفی وغیرہ کی مصنفہ کتابوں اور لیلی و مجنوں کے شہرۂ آفاق عشق کی بنیادوں پر بنگالی سنجیدہ زبان میں فضل الکریم نے اپنی کتاب "لیلی مجنوں" مرتب کی۔ اگرچہ یہ کتاب ناول کے طرز پر لکھی گئی ہے لیکن مضمون کی دلآویزی اور زبان کی عذوبت نے اس مکمل کتاب کو راگ اور گیت کی طرح دلکش بنادیا ہے۔ سرنامہ، افراد اور انداز تحریر نیز ابواب وغیرہ کی ترتیب رو بندر و ناتھ یا بشنو شاعر وغیرہ کیطرح اس قدر موزوں اور دلچسپ ہے کہ ہر ہر لفظ پر شاعرانہ تخلیل کا گمان ہوتا ہے۔

اُن کی کتاب "راج رشی ابراھیم" کے متعلق یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ بلخ کی شہزادی سے درویش ادھم کی محبت کے حالات کا تذکرہ اس قدر شگفتہ ہے جیسے موسم بہار کی نسیم سحر۔ تارک الدنیا ادھم کے خیالات پر جس روحانی محبت کی شراب نے ان کے جسم کے ہر ہر عضو اور روح کی تمام طاقتوں کو جس طرح اپنی موجوں میں سمولیا تھا اُس کا تذکرہ مصنف نے

بھی اس طرح کیا ہے جیسے اُن کے جسم کا ایک ایک زواں کیفیت و مستی میں تڑپ کر اظہار محبت کر رہا ہے۔ تحریر پر مصنف کے دلی جذبات کی عکاسی حد سے زیادہ اثر انداز اور اُن کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز خود بولتی چالتی نظر آتی ہے۔ انہی محاسن نے فضل الکریم کے ادب کو استقامت کے راستے پر استواری بخشی ہے۔

طنز یہ مضامین بھی اعلیٰ ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور اس کا کامیاب نمونہ ہمیں ابو المنصور احمد کے "آئینہ" اور "فوڈ کانفرنس" نیز قاضی دین محمد کی "گولک چندر ایر آتّو کو تھا" (گولک چندر کی آپ بیتی) سے ہوتا ہے۔ اعلیٰ طنز (Satire) کے مصنف کی حیثیت سے ان کی خدمات مسلم ہیں۔ طنز نگاری میں ابو المنصور احمد کے دلی نظریات بہت تیز ہیں اُن کی زبان شاندار اور ذوق نہایت روشن ہے۔ ہندو اور مسلم زندگی کے مفاخرانہ مقابلے نیز احساس برتری کی کشمکش سے ماضی میں اس ملک نے جس قدر نقصانات اٹھائے ہیں اس کے لئے عام انسانوں کی خود ساختہ تہذیب ہی ذمہ دار ہے۔ ابو المنصور احمد نے اپنے افسانے "گودیوتا کا دیس" وغیرہ میں اپنی بالغ نظری کی بنا پر عوام کی کورانہ تقلید کے متعلق بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ انسانوں کی انہیں کمزوریوں پر

انھوں اپنے طنزکی بنیاد رکھی ہے اور اسی طنز کے ذریعے سے ابو المنصور نے اپنے وطن کی بد حالی کا رونا رویا ہے۔ " آئینہ " کے پیش لفظ میں نذر الاسلام نے اُسے مرصع کرتے ہوئے ابو المنصور کے طنزپر اس طرح تبصرہ کیا ہے۔

" اُن کی طنزیہ ہنسی کے پس پردہ جو آنسوؤں کے دھارے رواں ہیں اور ان کی ضربات کے پیچھے جو درد پنہاں ہے اُسے جو لوگ محسوس کر سکیں گے وھی ابو المنصور کے طنز کا واقعی اندازہ لگا سکیں گے "۔

اُن کی دو قابل ذکر کتابیں موجودہ بنگالی ادب میں بنام " آئینہ" اور " فوڈ کانفرنس " موجود ہیں۔

ابو المنصور ضلع میمن سنگھ، محکمۂ صدر کے موضع دھانی کھولا میں سنہ ۱۸۹۸ع میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک صحافت نگار کی حیثیت سے بھی وہ کم شہرت کے مالک نہیں ہیں۔

ابو المنصور نے طنز کے لئے افسانے لکھے ہیں اور قاضی دین محمد نے سنہ ۱۹۳۹ع میں اپنی شائع شدہ کتاب " گولک چندر آتّو کتھا " میں ملک کی تعلیم، رسوم، ادب، ھجاء، سیاست اور معاشرت وغیرہ بہت سارے امور کے نقائص اور کمزوریوں کی اصلاح کیلئے افسانہ نما مقالے لکھے ہیں۔ گولک چندر آتّو کتھا " بنکم کے " کملا کانتر دفتر " اور پرشو رام کے گڈا لیکا پروبا ھو " کی ھم جنس

کتاب ہے - ہلکا مذاق اور عجیب و غریب آسان ظرافت کے سُر نے اس کتاب میں ازاول تا آخر موجود رہ کر مصنف کی زندہ دلی کو نمایاں کیا ہے - اس کتاب میں مستعمل زبان کی حیرتناک سہل البیانی نے قاضی دین محمد کے طنز کو اور زیادہ سہل کر دیا ہے -

ضلع فرید پور، محکمہ گوپال گنج کے موضع تنگی پاڑا میں سنہ ۱۹۰۹ء میں قاضی دین محمد کی پیدائش ہوئی - علحدہ طور پر شائع شدہ ان کی " جاندریل اُوکیلر جیبن آلیکھو " وغیرہ افسانوں میں بھی طنز کا طرز نمایاں ہے - بچوں کیلئے ان کی مصنفہ کتاب "کہانی ڈاکو" (اشاعت اول سنہ ۱۹۴۱ء) انکی ایک اور کتاب بھی ہے -

محبوب العالم :- محبوب العالم یکم مئی سنہ ۱۸۹۸ء کو پیدا ہوئے - یہہ ضلع چاٹگام کے موضع فتح آباد میں متولد ہوئے تھے - ان کی کتابیں " مومن اِیر زبان بندی ، پلٹن جیبنیر سربتی ، چٹو گرامر ایتیہاش اور مفیضن " وغیرہ تصنیفات ہی ان کی ادبی شہرت کے اسباب ہیں - مذکورہ کتابوں میں " مومن اِیر زبان بندی " ہی ان کا شاہکار ہے - یہہ کتاب محبوب العالم کی آپ بیتی کے طرز پر ہے - اس میں مؤمن کے بچپن سے شباب تک کے مختلف اچھے اور برے اعمال کے خوبصورت بیان سے ادبی رس بڑا لذت آفریں ہو گیا ہے - انسانی کیریکٹر کے اندرونی

اسرار بیان کرتے ہوئے حواس خمسہ کو دعوت لذت اندوزی بخشنے میں محبوب العالم کی جس بالغ نظری کا پتہ ملتا ہے وہ حیرتناک ہے - اس کتاب میں مصنف کی بد ذوقی کے اثرات بھی جابجا ناقابل انکار طور پر نمایاں ہیں -

قاضی نذرالاسلام :— بنگالی مسلمانوں میں نثر نگاری کی خدمات سرانجام دینے کے سلسلے میں نظم اور شنگیت میں ایک نئے دور کی بنا ڈالنے والے قاضی نذرالاسلام کا نام بھی احترام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے - " بیتھاردان ' رکتیر بیدن اور " شیولی مالا ' کتابیں ان کے مجموعہائے افسانہ جات ہیں - " ساندھن ھارا ' نامہ نگارانہ ناول ہے - مرتّو کھودھا ' ان کا ناول ہے - یہ ساری کتابیں ' حسن تحریر اور شیرینی زبان کیلئے قابل ملاحظہ اور لائق تذکرہ ہیں - ان منثور کتابوں پر نذرالاسلام کی شاعرانہ طبیعت کا پر تو پڑا ہے - ان کی کتاب " مرتو کھودھا " ہی سب سے بہتر اور عمدہ ناول ہے - نوٹ ھمشن کے " ھنگر " کا پرتو اس ناول پر بہت نمایاں ہے - نذرالاسلام کی تمام تر منثور تصنیفات میں زبان کے غنائی یا تغزل پسند Lyric سرنے اُن پر نظم کی دلکشی کا پرتو ڈال رکھا ہے - افسانے اور کیریکٹر کی تصویرکشی میں کمزوریوں کے باوجود زبان کی ساحرانہ تاثیر سے پڑھنے والے کا دل محوخواب ہو جاتا ہے - انھی

خصوصیات کی بنا پر بنگالی منثور ادب میں نذرالاسلام کی مندرجہ بالا کتابیں اپنا خاص مقام رکھتی ھیں۔

محمد نجیب الرحمن :— عام پسندیدگی اور قبول عام کی بنا پر اگر کسی کتاب کو لائق تعریف سمجھا جاسکے تو محمد نجیب الرحمان کا ناول " انوارہ " یقیناً قابل داد ہے۔ یہہ کتاب سب سے پہلے سنہ ۱۹۱۱ع سے سنہ ۱۹۱۴ع کے درمیان شائع ھوئی۔ سنہ ۱۹۴۹ع میں اس کتاب کا تیئیسواں ایڈیشن شائع ھوا اور اس عرصے میں انوارہ کی ڈیڑھ لاکھ جلدیں فروخت ھوئیں۔ اس قبولیت کا سبب یہہ ہے کہ دیہات کے نیم خواندہ مسلمان ھی اس کے خریدار اور پڑھنے والے ھیں۔ سماج کی تعلیمی ضرورت، تعدد از رواج کے بد ثمرات، تعلیم نسواں کے فوائد، میاں بیوی کا باھمی خوشگوار تعلق، شرافت خاندانی کے مفاخر کی ناقدری، ملازمت کی زندگی پر تاسف، آزاد پیشے کا سکھ، دیہات کی فرقہ بندی، غرض کے اندھوں کا بھلے برے کی تمیز سے عاری ھونا، غنڈوں اور بدمعاشوں کی سازش، حقیقی عصمت پر فخر اور مذھبی زندگی کی عظمت وغیرہ سستے جذبات Cheap sentiments. کو اچھے دور کی شستہ زبان میں جس طرح قلمبند کیا ہے اُس کی کشش عام مسلمانوں کے دلوں میں قدرۃً بہت زیادہ ہے۔ یہی سبب ہے

که اس وقت سے ابتک اس کتاب کی اس قدر جلدیں فروخت ہوئیں - کثیر التعداد لوگوں کی قدر دانی نے اس کتاب کی مقبولیت کو چار چاند لگائے - مختلف نقائص کے باوجود یہہ کتاب ایک ناول کی حیثیت سے بہت زیادہ مقبول اور رنگین ہے -

مصنف کے دوسرے ناول " پریمیر شمادھی ' حسن گنگو بہمنی اور غریبیر مے " نامی ہیں - مصنف نے اپنی پہلی کتاب انوارہ لکھ کر جو غیر معمولی مقبولیت حاصل کی تھی اس کے مقابلے میں ان کی دوسری کتابوں کو مقبولیت حاصل ہونا تو درکنار ان کے نام سے بھی لوگ عام طور پر واقف نہیں ہو سکے -

محمد نجیب الرحمان پبنا کے باشندے تھے - مسلم قوم کی تمناؤں اور آرزوؤں نیز آدرش کے مطابق کتابوں کے تصنیف کرنے کی ضرورت وہ جان و دل سے محسوس کرتے تھے - یہہ خصوصیات ان کی کتابوں سے نمایاں ہوتی ہیں -

اسی کے ساتھ ہم سنہ ۱۹۲۵ع کی شائع کردہ " منورہ " مصنفہ جناب قربان علی اور اسی دور کی شیخ محمد ادریس علی کی کتاب " پریمر پتھے ' آدرشو گرہینی ' اور بنکم دوھیتا ' وغیرہ ناول کا نام بھی پیش کر سکتے ہیں - منورہ نجیب الرحمان کے " انوارہ " کی تبعیت میں لکھی گئی تھی -

" پریم پتھے " بھی نجیب الرحمان ھی کی " پریم شمادھی " کی پیروی میں مرتب کی گئی تھی - ان سب ناولوں میں سستے طور پر " پتی بھگتی (شوھر پرستی) کی داستانوں کو دھرایا گیا ھے - بنکم دوھیتا میں شیخ ادریس علی نے بنکم کی کتاب " راج شنگھو " کا جواب دیا ھے - " راج شنگھو " میں بنکم چندر نے اورنگ زیب کی صاحبزادی زیب النسا کے دامن اخلاق پر جو سیاھی لگانے کی کوشش کی ھے اس کا انتقام ادریس علی نے بنکم کی دوشیزہ کا کیریکٹر بیان کرکے لیا ھے - " بنکم دوھیتا " ایک معاندانہ یا حریفانہ تصنیف تو کہی جاسکتی ھے لیکن اس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ھے -

ابو الفضل :- محاسن سخن کے ماھر اور صنائع کلام کے فاضل ادیب ابو الفضل کا ذکر کرکے ھم تخلیقی تصنیفات کے مالک مسلم ادیبوں کا تذکرہ ختم کریں گے - یہہ ضلع چاٹگام ، تھانہ سات کانیا موضع کیونچیا میں جولائی سنہ ۱۹۰۵ع میں پیدا ھوئے تھے - ان کی کتابیں یہہ ھیں :- " چوڑ چیر " (سنہ ۱۹۳۴ع) جیبن پتھیر جاتری (راہ زندگی کا مسافر - سنہ ۱۹۴۸ع) شاھو شیکا (سنہ ۱۹۴۶ع) ، پرودیپ و پتنگو (ناول) ، " ماٹیر پری تھی بی " (سنہ ۱۹۴۰ع - افسانہ) اور عائشہ (سنہ ۱۹۵۱ع - افسانہ)

ابو الفضل کی کتاب " چوُ چیر" میں سماج کے متعلق بہت سخت تنقیدیں ھیں - اس کے ساتھ ساتھ نوخیزدل کے جوش سے پگھلا ھوا پریم بھی بہت وافر ھے - یہہ کتاب غمناک طرز پر مفارقت پر ختم ھونے والا ایک المیہ ھے جو خام تصویر کشی کی علامات کا حامل ھے - '' جیدن پتھیر جاتری " میں ابو الفضل نے صحت مند انسانوں کی تشکیل کیلئے کوششیں کی ھیں - بعض کردار اگرچہ غیر واقعی معلوم ھوتے ھیں تاھم اس کتاب کے ھر انسان کو اصلی روپ میں دیکھا جاتا ھے - اس کتاب سے کسی قدر صحت مند پریم کا بھی پتہ ملتا ھے - " ماٹیر پریتھیبی " کو توڑ مڑوڑ کر حال ھی میں ابو الفضل نے عائشہ کے نام سے بھی کتاب پیش کی ھے - اس میں جس طرح جا بجا کانٹوں کی خلش لذت دیتی ھے - اس طرح کہیں کہیں رس بھرے لطائف و ظرائف بھی رنگینیاں بڑھاتے ھیں -

قبل پاکستان کے لکھنے والے جن مصنفین کے دل آج بھی مشغول کار اور زندہ ھیں ان میں سے ابو الفضل بھی ایک لائق ذکر مصنف ھیں - رومانیت اور مرد و زن کے باھمی معاشرت کی تفسیر ھی ان کے ادب کی خصوصیات میں سے ھے - قبل تقسیم اور بعد تقسیم ملک کی تصنیفات میں ان کے اندر کسی قسم کی تبدیلی نظر نہیں آتی - "بچِتّر وکتھا " اور "بِدرو ھی کو بی نذرُل"

(باغی شاعر نذرؔل) نام سے موسوم ان کی اور بھی دو کتابیں سوانح اور ادبی تنقیدات پر مشتمل ھیں -

تخلیقی اور اختراعی تصنیفات کے ادیبوں کے علاوہ اس زمانے میں بہت سے مسلمانوں نے قومی زندگی کے مختلف رخوں کو اپنا کر مختلف اوقات میں مباحث اور مقالے مرتب کئے ھیں - یہ سب کے سب بنیادی طور پر مقالہ نگار ھیں - یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان میں سے کسی نے بھی کوئی تخلیقی کارنامہ پیش نہیں کیا - حقیقت یہ ھے کہ ان کے مقالات کے مقابلے میں ان کے اختراعی کارنامے پوری طرح نمایاں نہ ھو سکے - ان کی تصنیف کردہ بہت ساری کتابیں اور بہت سارے خطوط جن کی اشاعت اخبارات اور رسائل میں ھو چکی ھے انھوں نے مسلم ادب کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے بنگلا ادب کو کافی ترقی دی ھے - تنقیدی ادب اور تاریخی ادب میں اس زمانے کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا علحدہ رخ متعین کرنے کے لئے نیز مسلمانوں کے ادبی سرمائے کی تشریح اور علم و سائینس سے متعلق خدمات قلم بند کرنے میں اس دور کے بہت سے مسلمانوں نے اپنی اپنی کوششیں صرف کی ھیں - ان لوگوں میں عبد الغفور صدیقی ، ڈاکٹر محمد شہید اللہ ، محمد برکت اللہ ، محمد واجد علی ، ڈاکٹر قاضی مطہر حسین ، سید ابو الحسین

قاضی عبد الودود ، ڈاکٹر محمد انعام الحق ، ھمایون کبیر ، شیخ حبیب الرحمن ، (شاھتو رتنو) ، اکرام الدین ، ڈاکٹر ابوالحسین اکبر علی ، نظیرالاسلام ، محمد سفیان ، عبدالقادر ، محمد حبیب اللہ بہار ، بیگم شمس النہار محمود ، محمد عبدالحی اور سید علی احسن کے نام پیش کئے جانے کے لائق ھیں -

اسّی سال سے زیادہ معمر عبد الغفور صدیقی کو " انو شندھان بشارد " کا خطاب دیا گیا ھے - بنگلا پوتھی ادب کے متعلق انھوں نے بہت سے مباحث قلمبند کئے ھیں - قدیم ادب اور تاریخی اسرار کی تحقیق میں سائینس کے اصول کے معیار پر ان کی تشریحات پوری اتر سکیں یا نہ اتر سکیں تاھم یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ھے کہ قدیم اسرار علوم کی تحقیقات کا صحیح اور واقعی جذبہ ان کے دل میں موجود ھے - ماھوار " محمدی " اور " سوغات " وغیرہ جرائد میں بہت سے تحقیقی مقالے انھوں نے لکھ کر شائع کرائے ھیں -

سنہ ۱۸۸۵ع میں ڈاکٹر محمد شہید اللہ کی پیدائش ضلع چوبیس پرگنہ میں ھوئی - بنگال کے مسلمانوں میں سب سے بڑے ماھر لسانیات وھی ھیں - ڈھاکہ یونیورسٹی میں بنگالی زبان و ادب کے پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے انھوں نے تیس سال سے بھی زیادہ مدت تک بنگلا زبان اور ادب کی خدمت کی ھے -

ان کے بہت سارے تحقیقی مقالے ادبی رسالوں مثلاً " شوئیبارپو چیٹھی ' الاسلام ' سوغات ' ماشک محمدی ' اور ماہ نو وغیرہ جرائد کو وقیع تر بناتے رہے ہیں ۔ " بھاشا و شاھتّو " اور بنگلا شاھتّیر کتھا " ان کی دو قابل ذکر کتابیں ہیں ۔ انہوں نے اپنی مقدم الذکر کتاب میں زبان اور ادب کے متعلق بہت سے مسائل کا قابل قبول حل پیش کیا ہے ۔ مضامین کی کتاب میں " آبھیدھا نے آمد' آمار کا ھی نی پھورولو ' اور " بنگالی جیبنے مسلمان پرو بھاب " وغیرہ مضامین کے مطالعے سے ماہرلسانیات شہید اللہ کی پرذوق طبیعت کا پتہ ملتا ہے ۔ خشک مضامین کے مباحث میں بھی انہوں نے اپنے باذوق ہونے کا ثبوت دیا ہے ۔ " بنگلا شاھتیر کتھا " (سنہ ۱۹۵۳ع) ان کی مجوزہ تاریخ ادب بنگالہ کا پہلا حصہ ہے ۔ انہوں نے اس حصے میں قدیم بنگلا ادب کے متعلق تحقیقی اور اثباتی مقالے قلم بند کئے ہیں ۔ (اس کے بعض ضروری اجزاء اس کتاب کے حصہ اول و دوم میں داخل کر لئے گئے ہیں) انہوں نے " الاول " کی " پدماوتی " کی ادارت کرکے ' پدماوتی شتک " مرتب کی ہے ۔ عمر خیام کے ترجمے پر مقدمہ لکھ کے اپنے آپ کو عیر فانی بنا لیا ہے ۔ عمر خیام کے متعلق اس قدر تشریحی تحقیق بنگلا زبان ھی میں نہیں کسی اور زبان میں بھی اب تک ممکن نہ ہو سکی ۔ یہ تجسس

اور فلسفیانہ اصول پر اسرار و معارف کی تحقیق ھی شہید اللہ کی زندگی کی سب سے اھم خصوصیت ھے -

مسلمانوں میں سب سے پہلے محمد برکت اللہ ھی نے فلسفیانہ مضامین لکھ کر بنگلا ادب کو ترقی دی ھے - سنہ ۱۹۲۴ع میں محمد برکت اللہ کی " پارشو پر وتیبھا " کا پہلا حصہ ' سنہ ۱۹۳۲ع میں اس کا دوسرا حصہ اور سنہ ۱۹۳۳ع میں " مانو شیر دھرمو " کتاب شائع ھوئی - " پارشو پر وتیبھا " کے اکثر مضامین سنہ ۱۹۱۸ع سے سنہ ۱۹۲۲ع کے درمیان قلمبند ھوئے تھے - ان میں انھوں نے فارسی کے مشہور شعرا کی سوانح حیات اور ادب ' فارس کے حلقۂ ادب ' فلسفۂ تصوف ' اصول اور فلسفۂ و یدانت کے متعلق تحقیقی مقالے لکھے تھے - " مانو شیر دھرمو " نامی کتاب میں مادہ پرستی ' چیتنہ ' صوراشیاء اور ان کے طریقۂ زندگی وغیرہ مشکل حقائق کے متعلق مباحث مرتب کئے گئے ھیں - برکت اللہ کی کوششوں سے بنگلا پڑھنے والے فارسی کے مشاھیر عالم اور غیر فانی شعرا ' فردوسی ؛ عطار ' رومی ' جامی ' سعدی ' حافظ اور عمر خیام کے ادب سے جس طرح واقف ھوئے اس سے پہلے کسی اور سے اس طرح ممکن نہ ھو سکا تھا - فارسی ادب کے مستند حسن کا ٹکسالی بنگلا نثر میں برکت اللہ نے اس خوبی اور نفاست سے تذکرہ کیا ھے کہ اس میں فارسی

ادب کا رس اور مزا تبدیل نہیں ہوا - بنگالی ادب میں برکت اللہ کا یہ یادگار کارنامہ ہے -

(محمد برکت اللہ کی پیدائش پٹنہ ضلع میں سنہ ۱۸۹۸ع میں ہوئی)

کھلنا میں بانش دھا کے رہنے والے محمد واجد علی، " گلد ستہ " اور " معشوقیر دربار " وغیرہ کتابوں کے مصنف ایس - واجد علی کے ماورا یہ ایک اور اہل قلم ہیں - ایس واجد علی ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور تخلیق پاکستان سے پہلے وہ ہندوؤں کی ہم نوائی کی بناپر ایک قوم پرست مسلمان کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے - محمد واجد علی اس حیثیت سے خالص مسلم تہذیب کے حامل اور سماجی زندگی کے مفسر ہیں - محمد واجد علی ایک معیاری ادیب ہیں - ادبی خدمت کے ذریعہ سے سماج کی خدمت ہی ان کی زندگی کا سرمایہ ہے - اور اسی بناپر انہوں نے سرکاری ملازمت تک کو خیرباد کہا ہے - اسی وجہ سے انہیں اپنی زندگی میں برابر اقتصادی بدحالی کا شکار رہناپڑا تا ہم اس مخلص خادم قوم اور مسلم ادیب نے اپنے اصول کو ترک نہ کرکے مسلّم سماج کی مختلف خامیوں، کمزوریوں اور نئے سیاسی پس منظر پر ہماری قومی زندگی کی اصلاح اور زبان و ادب کی ترویج کے متعلق اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے ماہ نو، محمدی اور شنگباد وغیرہ اخبارات میں بہت سارے قیمتی مقالات لکھے ہیں - ان کی

مصنفه " چهپلے دیر حضرت محمد" (ص) بهی اس سلسلے میں ایک
یادگار تصنیف هے - وہ سنہ ۱۸۹۴ع میں پیدا هوئے اور اپنے وطن
مالوف هی میں ۸ نومبر سنہ ۱۹۵۴ع کو رهگرائے عالم جاوداں هوئے -
اس دور میں بنگلا ادب میں مسلمانوں کی خدمات اور ان کے
مقامات کی تعیین کرنے میں سید ابوالحسین، قاضی عبدالودود
اور قاضی مطہر حسین (ڈاکٹر) تینوں صاحبان قلم کا نام ایک هی
ساتھ لائق ذکر هے - ان کی ادبی زندگی کی ابتدا اور شہرت اس
صدی کے تیسرے عشرے سے سیاسی عدم تعاون اور تحریک خلافت کے
پس منظر میں هوئی - سنہ ۱۹۱۱ع میں تقسیم بنگالہ کے خاتمے پر
اسماعیل حسین سراجی وغیرہ مسلمان ادیبوں نے مسلم زندگی کے
علحدہ اور انفرادی رخ نیز ان کی خصوصیات کا پر زور طریقے پر
اعلان کیا - مسلمانوں کی ذهنی کمزوری دور کرکے عیسائی اور
هندو اثرات سے انهیں آزاد کیا - ساتھ هی ان میں یہ احساس پیدا کیا کہ
ان کا تعلق حکمراں طبقے سے هے اور اس اعتبار سے وہ بڑی شرافت
اور عظمت کے حامل هیں - اس احساس کی تخلیق کیلئے
اسماعیل حسین سراجی کی خدمات همیشہ یاد رهنے کے قابل هیں -
اس دور میں مسلم آدرش پر اساس رکھ کر ادب کی تخلیق کیلئے
جس قدر مسلمان ادیبوں نے جدو جهد کی اُس سے زیادہ انهوں نے
سیاسی اور قومی زندگی کی راهیں متعین کرنے کے لئے کوششیں کیں -

اسی عہد میں کانگریس کی تحریک ترک موالات اور انگریزوں سے عدم تعاون کی ابتدا ہوئی - تحریک خلافت کا بنیادی پیغام یہ تھا کہ اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو - اس تحریک کے ساتھ بنگال کے بہت سارے ادیبوں نے تعاون کیا تھا - بہت سے مسلمان ادیبوں نے اپنے دلوں میں اس امید کا چراغ بھی روشن کر رکھا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے بنگال میں ایک متحدہ تہذیب اور ثقافت کی بنیاد پڑ سکے گی ابوالحسین، قاضی عبدالودود اور قاضی مطہر حسین کی ادبی زندگی کے میدان میں جس طرح یہ سیاسی تحریک عمل سے ہم کنار ہو گئی تھی اُس طرح نذرالاسلام کے ماسوا کسی اور مسلمان ادیب نے اسے عملی جامہ پنہانے کی سعی نہیں کی - اس نظرئے سے ان تینوں ادیبوں نے مذکورہ وقت کے اندر ڈھاکا شہر میں "مسلم شاھتو شماج" کے نام سے ایک ادبی ادارے کی بنیاد رکھی - اس ادارے کا نقیب "شیکھا" (شعلہ) نامی ایک اخبار تھا - آزاد تصور اور آزاد افکار کی عظمت کا پرچار اور رجعت پسندانہ نظریات سے مسلمانوں کو دور رکھ کر اُس عہد کے حقائق کی ان کے دلوں میں بنیاد رکھنی یا دوسرے الفاظ میں ہندو مسلم اتحاد سے متحدہ ایک قومیت کی تعمیر ھی اُن کا مقصد جدو جہد تھا - تقریبا دس سال تک یہ ادارہ کام کرتا رہا - اس مختصر مدت کی خدمت میں اس ادبی

ادارے نے اس دور کے مسلم ادب اور نظریات کے میدان میں ایک
باقاعدہ ھلچل پیدا کر دی تھی - ابو الحسین نے سماجی مسائل کے
عنوان سے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا "بنگالی مسلمانر شکّھا
شمسّا" (بنگالی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل) اس کے علاوہ انھوں نے
" بنگلار کریشی " (بنگال کے مزارعین سے متعلق کتاب) "ھندو مسلم
پنچا نک ڈراما " اور " مسلم کلچر " (مرما ڈیوک پکتھال کی مسلم
کلچر نامی کتاب کا بنگالی ترجمہ) کتابیں لکھیں - علاوہ بریں انھوں نے
" آدرشہر نیدر ھو ، نشیدر بیر مبنا " اور " شت درا پینتالیس " کے
نام سے تین طویل اور مشہور مقالے لکھے - قاضی عبد الودود نے اپنی
کتاب " نبو پرجا " میں " شرم وھیتو مسلمان " کے عنوان سے
ایک تلخ و تند مضمون لکھا - قاضی مطہر حسین نے بھی " آنندو
و مسلمان گر یہو ، شنکیتو چرچا ئے مسلمان " اور " بنگالیر شماجک
جیبن " کے عنوان سے متعدد مضامین میں آزاد خیالی اور
معیاری تخییل کا نمونہ پیش کیا ھے - مولانا اکرم خاں ان کے
بالمقابل اپنے ماشک محمدی کے ذریعہ مخالفت کا علم بلند کرتے
رھے - عبد الودود کی کتاب " نبو پر جائے " پر سخت تنقید کرکے
مولانا اکرم خاں نے مسلسل طور پر " نبو پر جائے نانبو پر جے "
(نئے مشورے یا نئی راھیں) کے نام سے خالص مسلم نظرئے سے
اسلامی معیار زندگی اور قومی حیات کی تعمیر کے متعلق بہت

کچھ قیمتی مباحث پیش کئے ھیں -

ان تینوں ادیبوں میں سید ابو الحسین نے بہت دن گذرے راہ عدم اختیار کی - قاضی مطہر حسین اور قاضی عبد الودود ابتک بقید حیات ھیں اور ان کی ادبی زندگی ابتک قائم ہے - سنہ ۱۹۳۷ع میں شائع شدہ " شنچرن " کے عنوان سے ایک مجموعۂ مضامین کے مقالوں میں قاضی مطہر حسین کے مخصوص نظریات اور آزاد طبعی کا نشان ملتا ہے - قاضی عبد الودود نے حال ھی میں اپنی شائع شدہ " شاشتو بنگو " (غلام بنگال - سنہ ۱۳۵۸ب) کتاب میں اپنے سابق میں شائع کردہ بہت سے مقالات یہانتک کہ بعض کتابیں بھی شامل کر لی ھیں - اس کتاب سے ان کی طویل ادبی زندگی کے نظریات ' آزاد طبعی اور مفکرانہ اصول پروری پر روشنی پڑتی ہے - عبد الودود کا نظریۂ حیات رام موھن اور کمال پنتھی کے آدرش سے مشابہ ہے - ان کے ادب میں بھی آزاد خیالی کے متعلق تخییل کا بے مثال نمونہ ملتا ہے - ایک ادیب کی حیثیت سے عبد الودود کی خدمات اور مساعی قابل ستائش ھیں - ان کی ادیبانہ شہرت بھی مسلم ہے - حال کی شائع شدہ " شاشتو بنگو " کے علاوہ ان کی " کوبی گرو گیٹے " (دو حصے) " روبندر ناتھہ " اور " نذرل پرو تیبھا " میں ایک تنقید نگار کی حیثیت سے ان کی عالمانہ ذھنیت اور بے عدیل طاقت فیصلہ کا

اظہار ہوتا ہے - علاوہ بریں ان کے " مہر پریبار اور ترون" نامی افسانوں کے مجموعے ' نیز " ندی بکّھے اور " آزاد" نام کے دو ناول بھی ہیں - اپریل سنہ ۱۸۹۴ع میں ضلع فرید پور کے تھانہ پانگ شا میں قاضی عبد الودود پیدا ہوئے - قاضی مطہر حسین بھی سنہ ۱۸۹۷ع میں فرید پور کے اسی پانگ شا تھانے ہی میں متولد ہوئے تھے -

محمد برکت اللہ کی ادبی خدمات کی طرح اکبر علی کی ادبی خدمات بھی کچھ خصوصیات رکھتی ہیں - برکت اللہ کی " پارشّو پر و تیبھا" اور "مانو شر دھرمو" نے اسرار و حقائق پر مشتمل ہونے کے باجود طرز تحریر کی بنا پر ادبی اعزاز حاصل کیا ہے - ان کے مذکورہ موضوعات کی اپیل صرف فکر میں تحریک پیدا نہیں کرتی بلکہ دلوں پر بھی اپنا اثر دکھاتی ہے - اکبر علی کی دنیا مختلف ہے - انھوں نے بہت ساری کتابوں سے مضامین اخذ کرکے بہت سے اسرار کے رخ سے پردہ اُٹھایا ہے اور " بکّیانے مسلمانر دان " کے مختلف حصوں میں انھوں نے جو مباحث پیش کئے ہیں اس کی نظیر دور حاضر کے بنگالی ادب میں بہت کمیاب ہے - انیسویں صدی کے وسط " تتو بو دھینی ' اخبار کے دور میں " اکّھے دت " کی خدمات کے ساتھ اکبر علی کی خدمات کو بڑی مماثلت حاصل ہے - اکبر علی نے ظریفانہ رومانوی ادب تیار کیا - لیکن انھوں نے بنگال کے مسلمان

سائنس دانوں کی خدمات کا جو کچھ تذکرہ بڑی کاوش سے جمع کیا ہے اس سے فلسفیانہ ادب کی شاخ بہت کچھ باثمر ہوئی ہے -

ادبی تنقیدات اور تاریخ ادب کے موضوع پر تحریرات میں اس دور کے اور جن لوگوں نے عملی حصہ لیا ہے ان میں همایون کبیر هی ناقابل انکار طور پر ممتاز ترین ہیں - ان کی کتاب " بنگلا کابو " تاریخی اور سماجی پس منظر کے اعتبار سے بنگلا ادب کی توسیع کے دور میں ایک وقیع تنقید کی کتاب ہے - تاریخی پس منظر پر ادب کی جانچ اور فیصلے تک پہنچنے کا طرز بہت تابناک اور بے حد عاقلانہ ہے - ان کی انگریزی کتاب " سرت چندر" میں اور بنگلا ادب کے متعلق تنقیدات میں عقل و فکر کی روشن تابناکیاں پائی جاتی ہیں -

ڈاکٹر محمد انعام الحق کی پیدائش چاٹگام میں سنه ۱۹۰۶ع میں ہوئی - ان کی ایک کتاب " چٹو گرامی بنگلار رهشو بهید " (چاٹگامی بنگلا کے اسرار) ہے - یہ کتاب سنه ۱۹۳۴ع میں شائع ہوئی اس میں زبان کے متعلق تبصرے ہیں - عبد الکریم شاہتو بشارد سے مل کر انھوں نے " اراکان راج شبھائے بنگلا شاهتو " نامی کتاب تصنیف کی - لیکن اس کتاب میں بنگال سے باہر بنگلا زبان کی سرپرستی اور الاول، دولت قاضی اور ماگن ٹھاکور کی بنگلا ادبی خدمات کا تذکرہ جس قدر ہے اس قدر ادبی قدروں کا تعین نہیں ہے - مختصر

یہ ھے کہ یہہ کتاب تنقیدی نہیں کہی جا سکتی -

بردواں کے اکرام الدین اور جیسور کے شیخ حبیب الرحمان کا نام بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ھے - اکرام الدین کی کتاب "روبندرو پرو تیبھا" (سنہ ۱۹۲۶ع) اور "کرشنو کا نترول اے بنکم چندرو" (سنہ ۱۹۳۰ع) دونوں ھی تنقیدی کتابیں ھیں - ان دونوں میں مصنف کی ادیبانہ تنقید اور قوت فیصلہ کی نشانیاں پائی جاتی ھیں - اس حیثیت سے کہ ابتدائی دور میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی یہ تنقیدی کتابیں ھیں ان کی قدر و قیمت ناقابل انکار ھے - اکرام الدین نے تنقید کے علاوہ کسی قدر افسانے اور ناول بھی لکھے تھے - "کانچ و منی" (شیشہ اور ھیرا) ' جیبن پُن ' سوغات کے سالنامے میں شائع شدہ ایک مختصر ناول "نُتن ماں" ان کی ذھانت کا نقشہ پیش کرتے ھیں - ان ادھیکار پرو بیش" کے نام سے ان کا ایک ظریفانہ ڈراما بھی شائع ھوا ھے -

شیخ حبیب الرحمان کی مختلف نظم اور نثر کی کتابوں میں "آمار شاھتو جیبن" (سنہ ۱۹۲۷ع) کرمو بیر منشی مہر اللہ (سنہ ۱۹۳۴ع) اور "عالم گیر (سنہ ۱۹۴۸ع) قابل ذکر کتابیں ھیں - شیخ حبیب الرحمان کی ادبی خدمات کی بنیاد میں ان کے قومی درد سے معمور دل کا حال ظاھر ھوتا ھے - آمار شاھتو جیبن" میں انھوں نے جس طرح متوسط طبقے کے مسلمانوں کی تصویر کشی کی ھے

اس سے ان کے دل کا درد متشکل ہوتا ہے ۔ منشی مہر اللہ نے بنگال کے مسلم سماج کے نئے اسٹیج پر جو پارٹ ادا کیا ہے اس کی تفصیلی تشریح شیخ حبیب الرحمان کی کتاب " کرمو یر منشی مہر اللہ " میں موجود ہے ۔ ان کی کتاب عالم گیر میں جو پانچ سو چونتیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے ان تین ناموں سے تین ابواب بھی پائے جاتے ہیں ۔

(۱) " هندو شاستر ے اسلامیر پر ومان (هندو شاستر میں اسلام کا ثبوت)

(۲) نیـراکار اُپاشنار جکتی (غیر متشکل خدا کی عبادت کے دلائل)'

(۳) مانب ای خدا (انسان هی خدا ہے) ۔ ان تینوں ابواب سے کتاب " عالمگیـر " کی تصنیف کے مقاصد ظاہر ہوئے ہیں ۔ اس کتاب کو Defence of Alamgir بھی کہا جاسکتا ہے ۔ یہ کتاب نہ تو تاریخ ہے ، نہ ناول اور نہ تاریخی ناول ۔ اسے ہم Chronicle یعنی سرگزشت یا روز نامچہ کہ سکتے ہیں ۔

ہومیوپیتھک ڈاکٹر سید ابوالحسین (مسلم شاهتو شماج دل کے ابوالحسین کے ماورا) نے " گیان بھنڈار " (خزانہ علم ۔ سنہ ۱۹۲۴ع) نامی ایک طویل کتاب تقریبا پانچ سو صفحات میں بنکم پر تنقیدات کی حیثیت سے لکھی ۔ اس میں بنکم کی تمام تر ناولوں پر غیر مستقیم تنقید ہے ۔ اس معاندانہ تنقید میں کوئی ادبی ذوق نہیں پایا جاتا ۔ ایک چھوٹا بچہ کہاں تک ہاتھ پیر مار سکتا ہے اسی کا ایک واضح نمونہ اس کتاب میں پایا جاتا ہے ۔ شیخ ادریس علی کی " بنکم دو هیتا "

جس نظریئے کے ما تحت لکھی گئی تھی ابوالحسین کی " گیان بھنڈار" بھی اسی نظریئے کا نمونہ پیش کرتی ہے بنگال کے مسلمانوں میں کم از کم ایک جماعت نے ادبی طاقت کے فقدان کے با وجود کس طرح بنکم اور دوسرے ہندو زعما کے خلاف اظہار خیال کیا تھا اس کے اظہار کیلئے ان کتابوں کا تذکرہ ناگزیر سمجھا گیا -

محمد منصور الدین کے عوامی افسانوں کے مجموعہ بنام "ھارامونی"، مقالات کے مجموعہ " دھانر منجری" اور ان کے اپنے پبنا ضلع کے ایک کسان گھرانے کے احوال زندگی بنام " زرین قلم" سے ان کی ادبی خدمات کا پتا ملتا ہے - " زرین قلم" مصنف کا ادبی نام ہے - منصور الدین کی تحریر میں سلامت روی اور سادگی ہے - ان کی انفرادی زندگی کی غیر واجبانہ تصویر ان کے زرین قلم میں نظر آتی ہے - عوامی افسانوں کے مرتب کی حیثیت سے بھی منصور الدین کے حالات بنگالی ادب کی تاریخ میں قابل ذکر ہیں -

نظر الاسلام محمد سفیان متوطن ضلع بوگرا کی پیدائش سنہ ۱۹۰۶ع کی ہے - انھوں نے "جیبنر جے جاترا" اور "دربی پاک" نامی دو ناول اور " شونالی شپن' پیشا' اور شرکیھو پا لیتڈکس" نامی مجموعہ ھائے افسانہ جات کے مصنف ہونے کے باوجود حال ہی میں "بنگلا شاھتیر نوتن اتیھاش (سنہ ۱۹۵۰ع تعداد صفحات ۴۶۶) لکھ کر ایک ساتھ ھی نیکنامی اور بد نامی دونوں حاصل کی ہے -

نیکنامی اس لئے کہ ان سے پہلے کسی مسلمان ادیب نے اتنی ضخیم تاریخ ادب بنگالہ مرتب نہیں کی - لیکن اُن کی بد نامی اس لئے ہے کہ اپنی اس کتاب میں انھوں نے بے شمار ایسے خیالات اور نظریات کا اظہار کرنا چاہا ہے جو محض خیالی ہیں - سائینس ادب کے اصول اور حقائق لسان کی بنیاد پر انھوں نے اپنے نظریات کی موافقت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی - اندازہ اور خیال ہی پر ان کے موضوعات کی بنیاد ہے - بنگلا زبان کے ماخذ کے متعلق بنگلا کو دراوڑ زبان کی صنف میں داخل کر کے جو عجیب نظریہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ بالکلیہ ظنی اور خیالی ہے - عالمانہ مباحث کی کسی کتاب میں اس قسم کے خیالات کا اظہار صرف مہلک ہی نہیں بلکہ قابل تمسخر بھی سمجھا جاتا ہے - علاوہ بریں حقائق کی فراہمی میں بھی اس کتاب کے اندر بہت ساری غلطیاں باقی رہگئی ہیں - اس کی تمام تر قدر و قیمت صرف ادبی تذکروں میں ہے -

عبد القادر نے " کابو ما لنچو " کے مقدمے میں دور وسطی سے ابتک بنگالی شاعری میں تبدیلیوں کے متعلق ایک قیمتی مسلسل تذکرہ کیا ہے - اس کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں مسلمان ادیبوں کے متعلق انھوں نے جو کچھ تبصرے کئے ہیں ان سے ان کی ادیبانہ نہانت اور سمجھ کا پتا ملتا ہے -

بیگم شمس النہار محمود کی کتاب " رقیہ جیبنی " اور ان کے بھائی حبیب اللہ بہار کی کتاب " قائد اعظم " کی تصنیف کے علاوہ قبل پاکستان کے دور میں موقر ادبی رسالہ " بلبل " کی ادارت نے اس زمانے کے مسلمان خدام ادب کے درمیان ان کے مقام کو متعین کر دیا ہے -

قبل پاکستان کے دور میں مسلمان ادیبوں نے مختلف مدارج میں جس ادب کی تخلیق کی ان کی جانب اس تنقید ادب کے سلسلے میں ہم نے کچھ اشارات کئے ہیں - بنگال کی سیاسی فکر اور تحریک نے جب بھی جو رخ اختیار کیا اُس کے پس منظر کی حیثیت سے بنگلا ادب بالخصوص بنگال کے مسلم ادب پر اسکے اثرات مترتب ہوئے ہیں - سنہ ۱۹۲۰ء میں خلافت اور تحریک عدم تعاون کی وساطت سے ہندو مسلم اتحاد کے لئے ایک آخری کوشش عمل میں آئی - قاضی عبد الودود اور نذر الاسلام وغیرہ ادیبوں میں ہم اس وجہ سے کسی قدر خدمات کی کوششیں اس دور کے مسلمانوں کے تصنیف کردہ ادب میں موجود پاتے ہیں - اسی زمانے میں فرقہ وارانہ روئداد اور سنہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ کلکتہ اور ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ فسادات نے ہندو مسلم نظریات کو دو راستوں پر لگا دیا - سنہ ۱۹۳۷ء میں بنگال میں مسلم لیگ وزارت کا قیام اور سنہ ۱۹۴۰ء میں لاہور کی تجویز پاکستان نے ہندو مسلم

نظریات اور خیالات کو بالکلیہ منقسم اور علحدہ کر دیا - ان چند برسوں میں جو سیاست بنگالی مسلمانوں کی زندگی میں رونما ہوئی اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کیلئے بنگال کے مسلمانوں نے جس طرح سیاسی تحریکات میں حصہ لیا اور اُس کے پس منظر میں جو ادب مرتب ہوا اُس کی ادبی قدر و قیمت کے تعین کا وقت ابھی نہیں آیا -

تخلیق پاکستان کے ساتھہ ساتھہ جو مسرت اور جوش بنگالی مسلمانوں پر مستولی ہو گیا تھا وہ اسی میں کچھہ دنوں محو اور مگن رہے - ان کی محویت کا عالم ختم ہونے پر اب نسبتاً زیادہ سکون کے ساتھہ سابق نظریات کی بنیاد پر ادب کی خدمات متوقع ہیں - یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ اب تخلیقی اساس پر مشرقی پاکستان کے مسلمان اپنے قومی ادب کی تعمیر میں مشغول ہو جائیں گے -

---

حصۂ سویم

ساتواں باب

کلکتہ کی ادبی مرکزیت

اور

جدید حیات ادب ......

ایشور چندر گپت

رنگ لال بندو پادھیائے

مدھو شودن دت

سید علی احسن ——— مترجم— مولانا عبد الرحمٰن بیخود

ساتواں باب

کلکتہ کی ادبی مرکزیت
جدید حیات ادب

ایشور چندر گپت

شہر کلکتہ کو سنہ ۱۶۹۰ع میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے آباد کیا تھا - لیکن اٹھارھویں صدی ھی میں کلکتہ نے تیزی کے ساتھ ترقی حاصل کرنا شروع کیا اور بھارت کی راجدھانی بننے کا شرف حاصل کیا - ہندوستان کے سب سے پہلے گورنر جنرل وارن ھیسٹنگس نے کلکتہ میں سپریم کورٹ قائم کی - اس وقت محاصل ملکی کی وصولیابی کا مرکز کلکتہ ھی تھا سنہ ۱۸۰۰ع میں ھم کلکتہ کو دور جدید کا ایک ترقی یافتہ شہر پاتے ھیں - اس وقت کلکتہ ملک کی تہذیب، ثقافت اور اقتصادیات کا مرکز بن گیا تھا -

کلکتہ کی علمی ترقی کا مزید سبب یہ ہوا کہ سنہ ۱۸۰۰ع میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور اور وہاں سے قریب ھی سری رام پور میں بپٹسٹ مشن پریس قائم ہوا - اس کے بعد ھی سے ھم انیسویں صدی میں کلکتہ کو پوری طرح مذھبی، سماجی، تعلیمی، معاشرتی اور ادبی تحریکات کا مرکز دیکھتے ھیں -

اس کے بعد سے کلکتہ میں جس ادب نے جنم لیا اس میں اور قدیم ادب میں کافی فرق موجود تھا۔

اس زمانے سے پہلے جن لوگوں نے ادب کی تخلیق میں اہم کردار ادا کیا تھا وہ غیر شہری بلکہ دیہاتی تھے اور انھوں نے اپنے وطنی ماحول ہی کا نقشہ تیار کر کے اُسے ادبی روپ میں پیش کیا تھا۔ دیہاتی شاعری اور پوتھیوں میں انھوں نے اپنی دیہاتی تخییل کا نغمہ ہی الاپا تھا۔ اس کے ساتھ ان کا انداز بیان جس تہذیب و ثقافت کا ترجمان تھا وہ بھی چنداں وسیع النظری کا حامل نہ تھا۔ یہ ادب اگرچہ رؤسا اور تعلقہ داران ملک کی سرپرستی میں تیار ہوا تھا اور وہ شاہی درباروں کی بجھتی ہوئی شمعوں سے بھی اکتساب نور کرتا رہا تھا پھر بھی شعراء اپنے قدیم طرز اور ماحول کے تاثر کو نظر انداز نہ کر سکے تھے کلکتہ شہر میں جو ادب پیدا ہوا تھا اس کے معمار اکثر کلکتہ ہی کے رہنے والے ادیب تھے اسلئے اس میں بھی شہریت کا اثر نمایاں تھا۔ مزید براں ان کے مخاطب بھی شہری انسان تھے۔ اس نئے ادب میں تمدن اور شہریت کے امتزاج کی وجہ سے اعلی تہذیب و کلچر کے اثرات کے علاوہ ذہنی ترقی اور عمومی دلچسپی کا سامان بھی ملتا ہے۔ ان کے نظریات میں جدت اور تنوع تھا اور ان کی زبان شستہ اور موقر تھی نیز ان کے خیالات دور رس اور ہمہ گیر تھے۔

یہاں کے مصنفین نے مذہبی بنیادوں پر تحریروں کا سلسلہ بند کرکے عام انسانیت، ضروریات انسانی، معاشرتی اور سماجی کو الف کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ اس سے پہلے جس طرح منشا، دھرم، چندی اور مذہبی دیوی دیوتاؤں کا ذہنوں پر تسلط تھا اور انہی کے متعلق مضامین منظوم ہوتے تھے اس سے دور ہٹا کر اب نئی اور وسیع ترشاہراہ قائم ہوئی۔ لیکن چونکہ ان نظموں سے دیہاتی نظریات اور تصورات دور ہوگئے تھے اس لئے ان کی فطری سادگی اور اصلیت بھی کم ہوگئی تھی۔ اب ہمیں مندرجہ بالا خصائص کے بجائے شہری تہذیب کے اعلیٰ مذاق، وسعت نظر، ترفع تخییل اور بہت سارے مفید نیز دلچسپی سے معمور سامان ملنے لگے۔ اس زمانے میں انگریزوں کی وجہ سے تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوا اور اس طرح ملک میں سرمایہ دارانہ نظام کو ترقی ہوئی۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہاتی مراکز ادب و تہذیب ختم ہوگئے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں دیہات کی دولت سے شہر تعمیر ہوتے ہیں۔ دیہات کی گھریلو صنعتوں اور دیہاتی زندگی کی سادگی کا جنازہ نکل گیا۔ اس دیہاتی تہذیب و تمدن کے خصائص کے اثرات ہی مذکورہ بالا کوبی والا افراد کے نظریاتی اور تخییلی انحطاط کی صورت میں مل چکے ہیں۔ چونکہ ان کوبی والا افراد نے انحطاط پذیر زمینداروں کی سرپرستی میں اپنے ادب کی بنیادیں رکھی تھیں

اس لئے ان کا ادب بھی نمونہ تنزل و انحطاط تھا۔

دیہات کے اصول حیات اور متمدن مزارعانہ زندگی کے تنزل کے ساتھ ساتھ ایک درمیانی طبقہ تجار، ملازمت پیشہ، بنیا اور جدید مہاجنوں کا پیدا ہو گیا۔ اس نئے درمیانی طبقے نے دولت کے بل بوتے پر اپنے آپ کو "بھدر لوک" یعنی شریف انسان کہنا شروع کیا۔ اس طبقے نے اپنی ایک نئی تہذیب کی داغ و بیل ڈالی۔ حقیقت میں یہ ایک ہندو متوسط سماج تھا۔ اس سماج کے افراد انگریزی تعلیم حاصل کرنے کیلئے پوری طرح مستعد تھے اور اپنی ملکی تہذیب اور تمدن میں بدیسی اثرات داخل کرنے کیلئے مضطرب نظر آتے تھے۔ مغربی انداز فکر اور طرز زندگی کی دلدادگی اس جماعت کے لوگوں میں غیر معمولی تھی اور اسی کا اثر تھا کہ ان کے زمانے میں مغربی اثرات بڑی شدومد کے ساتھ شہر والوں کی زندگی پر مستولی ہوئے۔ برھمو سماج مت کا قیام اور پھر کچھ عرصے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کا وجود در حقیقت مغربی تخیلات اور نظریات ھی کا دوسرا نام تھا۔ بہر حال سنہ ۱۷۰۰ء سے بنگال میں جن ادیب شعرا کے کلام ہمارے سامنے آتے ھیں وہ سب کے سب اسی متوسط خوش حال ہندو سماج سے متعلق تھے۔

مسلمان متوسط طبقے کا وجود ھمیں سنہ ۱۸۶۳ء سے پہلے کہیں

نظر نہیں آتا - اسی سال نواب عبد اللطیف نے " محمڈن لیٹریری سوسائیٹی " (Mohamedan literary Society) کے نام سے ایک ادبی ادارہ کلکتہ میں قائم کیا - اس کے متعلق تفصیلی مباحث بعد میں آئیں گے - قدامت پسند لوگوں کی بھی ایک جماعت اس زمانے میں موجود تھی جو اس جدید تعلیم اور تغیر پذیر ادب کو دل سے نا پسند کرتی تھی - یہ صرف قدیم ہند کے ادبی ' معاشرتی' تمدنی اور تخیلی اثاثہ کو ہر قیمت پر اپنائے رکھنا چاہتی تھی - قدیم ادب تنزل پذیر ہو کر کوبی والا کی صورت میں آگیا تھا اور چونکہ قدامت پسند ادیبوں کے سامنے کوئی اعلی ادب کا نمونہ بھی باقی نہ تھا نیز جس زمانے میں نیا ادب اپنی پوری تابانی اور ضیا پاشی کے ساتھ جلوہ گر ہو گیا تھا اس وقت بہت پرانے دقیانوسی ادب سے استفادہ کی بھی اس جماعت میں طاقت اور ہمت نہ تھی اور ساتھ ھی جدید ادب کو قبول کرنا بھی ان کے مذاق قدیم کو گوارا نہ تھا کیوں کہ مذاق قدیم ادب جدید کے سامنے رفتہ رفتہ دم توڑ رہا تھا اور قدامت پسند لوگ تاسف اور حسرت کے اس جسد بے روح کا خاتمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اس لئے وہ حرماں نصیبی میں مبتلا تھے -

اس دور کا ایک اور اہم واقعہ ہمیں یاد رکھنا چاہئے اور وہ متعدد اخبارات کا قیام ہے - اس عہد کا قابل ذکر ہفتہ وار اخبار

" شماچار درپن " (آئینۂ اخبار) ہے - یہ اخبار در اصل سری رام پور کے مشن والوں کی ایجاد تھا - اور سنہ ۱۸۱۸ع تک جاری رہا - جان کلارک مارش مین اس کے ایڈیٹر تھے - ان کی ادارت برائے نام ہی تھی - حقیقت میں جے گوپال ترکالنکار ہی نائب مدیر کی حیثیت سے اس کے ناشر اور مدیر تھے - اسی اخبار نے بنگال میں جرنلزم کو ایک صنف ادب کا درجہ دیا - اس سے پہلے بھی سنہ ۱۸۱۶ع میں بنگال گزٹ کے نام سے ایک اخبار گنگادھر بھٹاچارجی کی ادارت میں جاری ہوا تھا لیکن وہ بہت دنوں زندہ نہ رہ سکا - شماچار درپن اخبار چونکہ تبلیغ عیسائیت کے پیش نظر مشینری والوں نے جاری کیا تھا اور اس میں ہندو مذہب اور سماج کے خلاف بہت سارے مباحث شائع ہوا کرتے تھے - لہذا انتقامی طور پر راجا رام موہن رائے اور دوسرے اہل علم و صاحب قلم حضرات نے سنہ ۱۸۲۱ع میں ایک ہفتہ وار اخبار بنام " شنگباد کؤمودی " جاری کیا - تارا چاند دت اور بھوانی چرن بندو پادھیا اس اخبار کے مدیر تھے - اس کے بعد کا قابل ذکر اخبار شماچار چندریکا تھا جو سنہ ۱۸۲۷ع میں بھوانی چرن بندو پادھیا کی ادارت میں جاری ہوا - اس کے بعد سنہ ۱۸۲۹ع میں نیل رتن حولدار کی ادارت میں " بھنگودوت " اخبار جاری ہوا - سب سے آخر شاعر و ادیب ایشور چندر گپت کی زیر ادارت سنہ ۱۸۳۱ع میں شنگباد پروبھا کر

مطلع صحافت سے نمودار ہوا -

ان اخبارات کا تذکرہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان کے ذریعہ ہمیں سماج کے مراسم، اصول زندگی، تعلیم و تعلم، تہذیب و تمدن، ادبی مذاکرات اور مذہبی مباحث کا نشان ملتا ہے - ایشور چندر گپت میدان صحافت کے ایک پختہ کار اور کامیاب شہ سوار تھے اور اسی وجہ سے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ان کی نظمیں ایک خاص وقت اور ایک مخصوص ماحول کی نظمیں تھیں - ہم ایشور چندر گپت کو بنگال میں بنگلا صحافت کا موجد یا امام کہہ سکتے ہیں - ان کے ہفتہ وار شنگباد پروبھاکر اور ماہوار " پروبھاکر" نے اُس زمانے میں جدید نظموں کی تخلیق کیلئے بہت کچھ کیا ہے - نظموں کے علاوہ اس اخبار میں سوانح حیات اور دوسری مفید چیزیں بھی سلسلہ وار طور پر شائع ہوا کرتی تھیں - اس اخبار نے ایک بڑا اہم کام یہ بھی انجام دیا کہ ایک ادارہ تحریر یا مکتب خیال کے قیام میں مدد پہنچائی - یہ نئے شعراء کے لئے مکتب مشق اور نئے ادیبوں کیلئے ذوق آفریں مدرسہ تھا - نو مشق ادیب ان اخبارات میں اپنی نظمیں اور اچھے مضامین شائع کراتے اور مشاقی بہم پہنچاتے تھے - اس طرح بنگالی نظم ونثر کے ادب میں رنگ‌لال بندو پادھیا، اکھے کماردت، دین بندھو متر، بنکم چندر چٹو پادھیا اور ہیم چندر بندو پادھیا کو

هم ان اخبارت کے اکھاڑے کے ذریعہ ورزش ادب کی مشق بہم پہنچاتے دیکھتے ہیں - اس زمانے کے نوآموز مصنفین میں مندرجہ بالا اصحاب قلم ہی نمایاں تھے -

ایشور چندر گپت کا آفتاب حیات سنہ ۱۸۱۴ ع میں طلوع ہوا اور سنہ ۱۸۵۹ع میں غروب ہو گیا - انہیں تاریخی حیثیت حاصل ہے - انہوں نے وقتی دلچسپی کے موضوعات پر بیشتر نظمیں لکھی ہیں - ان کی نظمیں ایک صحافی کے معیار سے بلند تر نہ ہو سکیں - وہ کاروباری حیثیت سے صحافی تھے مشاقی اور کوشش سے نظموں کو رفیع تر اور زبان و تخییل کے لحاظ سے زیادہ مرصع کرنا ان کے مقاصد میں سے نہ تھا - ان کی حیثیت ایک طرف تو قدامت کے پیرو کی تھی اور دوسری جانب ایک صحافی کی - قدامت پسند ہونے کی وجہ سے انہوں نے بھارت چندر کا تتبع کیا ہے اور دور جدید کی تمام تر تعلیمات اور تخیلات کا مذاق اڑایا ہے - چونکہ وہ ایک صحافی تھے اس لئے انہوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات اور سیاسی امور پر بھی نظمیں لکھی ہیں - ایشور چندر نے بھارت چندر سے ظرافت نگاری، دیہاتی گانے اور کوبی گان سے غیر مہذب، عریاں اور فحش مذاق نیز غیر متمدن زبان بھی سیکھی تھی اور اسی کی بنا پر شہرت حاصل کی - یہ بات بھی یاد رکھنے کے

قابل ہے کہ ایشور چندر اپنی جوانی میں کوبی والوں کے کھیلوڑ گانوں اور ہاف اکھڑائی گانوں میں خود بھی حصہ لیا کرتے تھے -

ایشور گپت کی ظرافت میں عموماً اس دور کے سماج ھی کی تصویر کشی ہوئی اور انھوں نے اپنے ماحول کے مشاھدات ھی کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے - بالخصوص بنگالی سماج کی معاشرت میں جو نئی رسمیں داخل ہوئی تھیں وھی ایشور گپت کے لئے موجب طنز و ظرافت بن گئی تھیں - مغربی طرز تمدن کے نمونوں کو دیکھ کر ایشور گپت نے اپنی نظموں میں ہر طرح ان کا مذاق اڑایا ہے - تا ہم ان کی ظرافت میں طعن و تشنیع یا بد گوئی نہیں ہے بلکہ یہ تفریح محض یا تمسخر ھی کی حیثیت رکھتی ہے -

ایشور گپت ایک طنزنگار بھی تھے اور اس وقت انگریزی تہذیب کے ملاپ سے جو نیا تمدن جنم لے رہا تھا وہ اس کا مذاق اُڑاتے تھے - چونکہ قدامت پسندی حد سے زیادہ تھی اس لئے ہر نئی چیز کا خواہ وہ مفید ہو یا غیر مفید انھوں نے دل کھول کر مذاق اُڑایا اور خوب اُڑایا - ایشور چندر کی تعلیم بھی قدیم اصول پر ہوئی تھی اور انھوں نے علوم جدیدہ سے کوئی فیض حاصل نہ کیا تھا لیکن خود ان کا وجود ایسے وقت میں تھا جب قدیم تہذیب دم توڑ رھی تھی اور جدید تمدن انگڑائیاں لے کر ماحول پر پوری طرح

چھاجا نے کیلئے پر تول رہا تھا اس لئے ان کو ہم دو دور کا مصنف یا دور جدید وقدیم کا سنگھم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن چوں کہ ان میں بذاتہ دونوں زمانوں کی آمیزش نہ تھی اس لئے زیادہ مناسب ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ وہ دونوں زمانوں کے درمیان ایک پل کی طرح حائل تھے۔ بھارت چندر کے متبعین عہد عتیق کی یادگار تھے اور مائکل مدھو شودن دت وغیرہ نقیبان دور جدید کے درمیان حد اوسط یا رشتہ وسطی انھی کو کہا جاسکتا ہے۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی ہم ان کے گانوں اور ان کی نظموں میں عہد جدید کی بو محسوس کرتے ہیں۔ اس وقت دور جدید ایک ہولی کا میلا تھا جس سے ہر چند کہ ایشور چندر نے بچنا چاہا مگر ان کے دامن پر رنگ کے چھینٹے پڑھی گئے۔ بجمیع الوجوہ قدامت پسند ہو کر بھی غالبا صحافی ہونے کی وجہ سے چوں کہ انھیں سیاست اور ثقافت میں حصہ لینے کا موقع ملا اس لئے ان کی شاعری بہارنو کی رنگینیوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ایشور چندر گپت کی نظموں میں سب سے زیادہ دلکش چیز وطنیت ہے۔ انھیں وطنی ادب وتہذیب سے محبت تھی۔ چونکہ بنگلا ادب کیلئے یہ چیز انوکھی تھی اس لئے انھیں ایک خاص مقام حاصل ہوسکا۔ زمانۂ مابعد میں وطن دوستی اور قوم پرستی کی جو لہریں بنگالی ادیبوں میں پیدا ہوئیں

س کا بانی ایشور چندر گپت ہی کو کہا جاسکتا ہے۔ انیسویں صدی کے شروع میں جب بنگال کے نوجوانوں نے انگریزی اور غیر ملکی ادب کے زیر اثر اپنے وطن کی یاد کو فراموش کرکے مغربیت کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنا شروع کر دیا تھا اس وقت ایشور چندر ہی نے ان کا رخ وطن اور وطنی ادب کی جانب پھیرا تھا۔ ان حالات میں ہم انہیں اس دور کا سب سے بڑا بنگالی شاعر اور بنگالی ادب کا سب سے زیادہ قابل قدر قاید اور نقیب کہہ سکتے ہیں۔

ایشور چندر گپت کی بعض نظموں کا نمونہ ملاظہ کرنے سے پہلے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس دور میں مغربیت اور مشرقیت کے تصادم سے کلکتہ میں خصوصاً ایک طرح کی بےنظمی اور تمدن میں بےربطی پیدا ہوگئی تھی اور اسی اختلاط سے ایک نئی مخلوط تہذیب وجود میں آئی اس پر ہر محب وطن کا دل کڑھا۔ اردو میں اکبر نے اصلاحی طنز کو معراج کمال پر پہنچایا اور بنگلا زبان میں ایشور چندر گپت نے اپنے دل کا دکھ نظموں میں بیان کیا۔ ایک موقعہ پر وہ طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ چونکہ انگریز اپنے نوروز میں شراب پیتے، رقص کرتے اور رنگ رلیاں مچاتے ہیں اس لئے ان کی دیکھا دیکھی بنگال کے جدید تعلیم یافتہ ہندو بھی اسی ڈگر پر

چلنے کی کوشش کرتے ہیں - لیکن چونکہ وہ اصل میں غریب ہیں اور ان کے گھر کی معاشرت بھی قدیم طرز کی ہے ' بیبیاں ساڑی میں ملبوس ہیں اور سیندور سے اپنی مانگ کو رنگین بنائے ہیں اس لئے ان کے شوہر صاحب بہادر بن کر بھی جدت پسند اور واقعی صاحب نہیں بن سکتے - انہیں صاحب بننے کا شوق تو بہت ہے لیکن صاحب بننے کیلئے نہ تو سامان ہے اور نہ صلاحیت - ان کے دلی تاثرات کی ترجمانی شاعر اس طرح فرماتے ہیں :—

جاتھاے کپالے بھائی ٹیبلے تے کھا بسو
تو سیا تبیر بٹے چیپلے تے جا بسو

کانٹا چھوری کاج نائی کھٹے جابے با با
دوئی ھاتھے پیٹ بھرے کھابو تھابا تھابا

پاترے کھابو نا بھات ' گو تسو ھل کالسو
ھوئیلے تو تل ناش شے برنگ بھالو

پوزیبے شکل آشا بسے بو نا رے لسو بھہ
ایکھونی صاحب شیجے را کھیبونا کھو بھہ

ترجمہ :— جو قسمت میں ہوگا وہ میں میز ہی پر کھاؤں گا - لگن کے تب ھی میں غوطہ لگا کر میں گرجامیں جاؤں گا کانٹے چھری سے کام نہیں کیونکہ اس سے ھاتھ کٹنے کا ڈر ہے -

میں دونوں ہاتھوں ہی سے پیٹ بھر کر ڈھیر کے ڈھیر کھالوں گا -
پتوں پر بھات نہیں کھاؤں گا - یہ کالا رنگ جہنم میں جائے -
پوری طرح برباد ہوکر بھی ہوٹل ہی میں جانا اچھا ہے -
سب امیدیں جل جائیں گی اس لئے لالچ کو چھوڑ دو -
انہی صاحب کی طرح بن سنور کر اپنے بال سجاؤ -

اس اقتباس سے ہمیں اس عہد کی انگریزی سے مخلوط زبان کا بھی اندازہ ہوتا ہے - اپنی دوسری نظم میں ایشور چندر گپت فرماتے ہیں کہ دن کو تو ہندو صاحب نما اپنی صاحبیت دکھاتے پھرتے ہیں لیکن رات کو جب اپنی حالت اور غربت پر غور کرتے ہیں تو انہیں اپنے حال پر رونا آتا ہے - فرماتے ہیں:

اے دیکھے دُکھے روائے منے جھولے پھانشی
باھرے پرو کاش کرے چُورکھر ھانشی
چھینترا پوچھا کمیج تاھار نالی ھاتھا
تالی پورے بابو ھون کھالی کرے ماتھا
بھانگا ایک ٹیبلے تے ڈش شاجائیا
ایشو بھابے کھانا کھان باھو باجائیا
منے منے کھید بڑو کاٹنا ھوئے دیتے
پراما نو پیٹھا پولی ناھیں پان کھیتے

ترجمہ :- ادھر دکھ سے رونا آتا ہے اور من پھانسی
پر جھولتا ہے۔
لیکن باہر جا کر وہ مسکراہٹ ظاہر کرتے ہیں۔
پھٹی گلی قمیص ہے جس کی آستین بھی غائب ہے۔
اُسی کو پہن کر وہ کھلے سر والے بابو بن جاتے ہیں۔
ایک شکستہ میز پر پلیٹیں سجا کر۔
عیسائیوں کی طرح وہ بغلیں بجا کر کھانا کھاتے ہیں۔
دلھی دل میں سخت بھوک کی وجہ سے گریہ بھی گلوگیر ہوتا ہے۔
لیکن " پراماتو " کھانے کیلئے پراٹھا وغیرہ پاتے ہی نہیں۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں :-

جکھن آشی بے شمن کری بے دمن
کی بولے تائے بوجھالسی بے
بوجھی ھٹ بولے بوٹ پائے دلے
چرٹ پھونکے شرگے جا لیبے

ترجمہ :- جب سمن یعنی موت کی طلبی کا وقت آجائے گا تو
وہ سب کو زیر کرے گا۔
معلوم نہیں اُسے کیا کہہ کے سمجھاؤ گے۔
شاید اُسے بھی ھٹ کہہ کے پاؤں میں بوٹ پہنے اور چرٹ پیتے ہوئے
ہی بہشت میں جاؤ گے۔

جو هندوستانی سیاست کی بازی گری کا شکار تھے اور ملکه وکٹوریه کی اطاعت گذاری هی کو اپنے لئے فخر سمجھتے تھے ان پر طنز کرتے هوئے ایشور چندر گپت فرماتے هیں :-

تومی ما للپو ترو * امرا شب پوشا گورو
شیکھی نائیں شینگ ناڈا * کیبل کھابو کھول بچالی گھاش
جینو رانگا آملا * تولے ما ملا
کا ملا بھانگے نا * آمرا بھوشی پے لے ای حوشی هوبو
گھوشی کھیلے بانچبو نا -

ترجمه :- تم ایسی ماں هو که سب کچھ دے سکتی هو اور هم سب تو پلی هوئی گائیں هیں -
هم نے سینگ هلانا بھی نہیں سیکھا - هم تو صرف کھلی پیال اور گھاس کھا کے جیتے هیں -
جیسے رنگین آنوله
کام کرتا هے
اس سے گملا نہیں ٹوٹتا -
هم بھوسی پاکر هی محظوظ هوں گے -
کیونکه گھونسے کھاکر نہیں بچ سکیں گے -

وطن پرستی کا نمونه ملاحظه هو - اس نظم کا نام هے " ش دیش " یعنی اپنا وطن :-

جانو نا کی جیب تومی * جننی جنمو بھومی
شے تو مارے ریدے رکھے چھے
تھا کیا مالیھر کولے * شنتانے جامی بھولے ؟
کے کو تھائے ایمن دیکھے چھے ؟
کتو کال گھریا چھو * اے کی دھرا دھریا چھو
جننی جٹھور پوری ھری
جاربلے بولیتے چھو * جاربلے چلی تے چھو
جاربلے چالیتے چھو دیھو
جاربلے تومی بولی * تاربلے آمی بولی
بھکتی بھابے کرو تاراسنیھو

ترجمہ :— اے لوگو! تم جانتے کہ ھو تم کون سی مخلوق ھو؟
تمھاری ماں تھاری جنم بھومی ھے۔
جس نے تمھیں اپنے دل میں جگہ دی ھے۔
کیا اپنی گود کے بچے کو کبھی ماں بھول سکتی ھے ؟
کیا کسی نے ایسا کہیں دیکھا ھے ؟
تم نے کتنی زندگی گذاری ھے کہ اسی راہ پر چل رہے ھو۔
ماں کے رحم سے باھر آئے ھو۔
جس کی طاقت سے تم باتیں کرتے ھو اور جس کے بل پر چلتے ھو۔
اور جس کے زور سے تم جسم ھلاتے ھو۔

تم جس کے سہارے باتیں کرتے ہو - میں بھی اسی کے بل پر بولتا ہوں
اس لئے عقیدت مندی کے ساتھ اس سے محبت کرو

بنگالی ادب میں ایشور گپت کو دور وسطی کا درجہ حاصل ہے - وہ دور وسطی اور عہد حاضر کے سنگھم کی حیثیت رکھتے ہیں - دور وسطی کے آخری نقیب بھارت چندر اور دور جدید کے سب سے پہلے اور سب سے ممتاز قائد مائیکل مدھوسودن ہیں اور ان دونوں کے درمیان رشتہ اتحاد کی حیثیت ایشور گپت کو حاصل ہے - انہیں ہم کوئی والوں کا آخری سفیر بھی کہہ سکتے ہیں - عہد جدید کی بعض خصوصیات سے بھی یہ بہرہ ور ہوئے تھے - اس زمانے کی تبدیلیوں سے وہ باخبر تھے اور اپنے ہم عصروں سے معاصرانہ علائق بھی رکھتے تھے - سبب یہ تھا کہ صحافت نگاری نے انہیں پوری طرح باشعور بنا دیا تھا -

ان کی وطن پرستی بنگلا ادب میں غیرفانی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ وہ اس کے نقیب اول تھے - زمانۂ مابعد میں بہت سے لوگوں نے اس راستے پر گام زنی کی لیکن انھیں تقدم حاصل ہے - جس زمانے میں بنگال کے نوجوان اپنی تہذیب کے گھروندے کو پامال کر کے غیر ملکی تہذیب کے دلدادہ بن رہے تھے اس زمانے میں ایشور گپت نے وطن پرستی کی بانسری بجائی اور انھیں وطنی تہذیب کو اپنانے کیلئے ابھارا - لیکن یہ

عجیب بات ہے کہ ان کے ہم وطن جب ملک کی آزادی کیلئے آگ اور خون کی ہولی کھیل رہے تھے تو ان کا مذاق اڑانے میں بھی ایشور گپت نے کمی نہیں کی - غرض کہ ان میں یہ دونوں متضاد باتیں بہ یک وقت پائی جاتی ہیں ۔

ایشور چندر گپت کے ہفتہ وار سنگباد پرو بھاکر اور ماہ‌وار پرو بھاکر کو اپنی قلمی مساعی کی جولاں گاہ بنا کر جن لوگوں نے میدان سخن میں قدم رکھا تھا ان میں رنگ لال سب سے زیادہ مشہور اور صاحب فضیلت مانے گئے ہیں ۔

رنگ لال بندو پادھیائے

رنگ لال انگریزی اور سنسکرت کے پوری طرح ماہر تھے - انھوں نے انگریزی ادب کی پیروی سے بنگالی ادب میں مفید اضافے کئے ۔ جدید تعلیم سے بہرہ مند ہونے کے باوجود رنگ لال پوری طرح قدامت پرست اور تہذیب قدیم کے دلدادہ تھے انھوں نے یہ سبق ایشور چندر گپت کے مکتب خیال سے ایسا

موثر طور پر سیکھا تھا کہ اس رنگ پر دوسرا کوئی رنگ نہ
چڑھ سکا - انھوں نے انیسویں صدی عیسوی کے جدید تعلیم
یافتہ سماج سے نفرت کا اظہار کیا ہے اور تقلید غیر سے تائب ہو کر
پھر اپنی قدیم ہندی تہذیب کی طرف واپس چلے جانے کی
ترغیب دی ہے - ان کا اعتقاد تھا کہ قدیم طرز کی تعلیم اور پرانی
تہذیب میں خلوص، صداقت، انصاف پسندی اور دوسرے
محاسن تھے لیکن جدید تعلیم نے ہمیں ان تمام خوبیوں سے محروم
کر دیا ہے - جدید تعلیم یافتہ سماج میں عدم خلوص، منافقت
فریب اور کذب کے سوا اور کچھ نہیں ہے - اس معاملے میں وہ
اس قدر قدامت پسند تھے کہ عہد جدید کی اچھی چیزوں کو بھی
قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے - ہم انھیں اپنے دور میں تہذیب
عتیق کا اکورا نہ مقلد پاتے ہیں - وہ بھارت کی قدیم تہذیب کی
واپسی کے متمنی تھے - عہد جدید کی چیزوں سے کہیں انھیں مطابقت
بھی ہو سکتی ہے یا نہیں اس کی انھوں نے کبھی کوئی تلاش
نہیں کی - ایشور چندر گپت نے نئے دھاروں کے خلاف جدو جہد
نہیں کی - وہ موجوں میں بہتے ہوئے طنز اور ظرافت کی
رنگینیوں سے کھیلتے رہے ہیں - لیکن رنگ لال اس سے کلیۃً مختلف
ہیں انھوں نے ان مٹتی ہوئی یادگاروں کو سینے سے لگائے رکھنا
چاہا جنھیں رو کے رکھنا ان کے بس میں نہ تھا -

" کرمو دیبی " کے باب اول میں وہ فرماتے ہیں (ترجمہ)

ہائے وہ دن کیا ہوئے

جنہیں سوچنے سے بھی ذہن پراگندہ ہوتا ہے

یہ عجیب زمانہ آگیا ہے

آج سچائی کی کوئی قدر نہیں

ہر شخص غیر صداقت شعار ہوگیا ہے

جھوٹ کا ہر طرف دار دورہ ہے

انسانیت کی سب قابل قدر چیزیں مٹ گئی ہیں

نہ پاپ باقی رہگیا اور نہ پُن

علوم اسرار دفتر پارینہ بن گئے ہیں

جو شخص بھی بہادری کے کاموں میں مشغول ہے

اسے سب گنوار (غیر مہذب) سمجھتے ہیں

وہ مہذب ہیں جو مرعوبیت کے شکار ہیں

آج سادگی پسندی مٹ گئی ہے

مالک والوں میں منافرت بڑھ گئی ہے

اس کا کیا انجام ہوگا کون جانے

قصیر جسم اور قصیر طبیعت

قصیر جان اور قصیر ذہن

اور اسی قصیر ذہن پر ہم مغرور رہیں

اگر وہ اپنی نظموں کے ذریعہ قدامت پرستی کے محاسن اجاگر کر سکتے تو ہمیں ان کی جدت نوازی پر برہمی اور ناروا نہ تقلید پر تعجب ہوتا۔ رنگ لال کی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے صرف جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ رنگ لال کے پاس مقاصد ہیں لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ مقاصد کی ادائیگی کیلئے زبان اور اسلوب کی بھی ضرورت ہے اور اس چیز کا ان کے یہاں فقدان ہے

رنگ لال کی دوسری خصوصیت ان کا نیشنلزم ہے۔ انھیں اپنی قوم کی ترقی اور اس کے عروج سے والہانہ عشق تھا۔ انگریزی شاعر تامس مور اور سر والٹر اسکاٹ کی نظموں سے متاثر ہو کر ان میں یہ جذبہ قوم پرستی پیدا ہوا تھا۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ رنگ لال نے قوم پرستی کو بحیثیت ایک موضوع (سبجکٹ) کے قبول کیا تھا۔ ہم اسے ایک طرح کا نشہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن رنگ لال کی قومیت میں صرف ہندو نظر آتا ہے اس میں مسلمان کا کوئی تذکرہ یا ان کے وجود کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ بلکہ بخلاف اس کے مسلمانوں سے منافرت پیدا کرانے کا جذبہ ان کی نظموں میں عریاں ہے۔ انھوں نے مختلف مفروضہ داستانیں اس مطلب کی گڑھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان فاتحین نے ہندو تہذیب اور ان کے مذہب کو برباد

کرنے کی پوری پوری کوششیں کیں لیکن ہندوؤں نے اپنے تمام تر مقدس اساسے کو محفوظ رکھنے کیلئے مدافعانہ سعی کی اور اسی جدو جہد میں اپنی جانیں بھی قربان کر دیں۔ اسی طرح کی نظموں کے ذریعہ انھوں نے ہندو سماج کو بیدار کرنے کی کوشش ضرور کی ہے لیکن فطری طور پر ان کے دلوں کو مسلمانوں کی طرف سے مسموم کرنے کی جدو جہد بھی پوشیدہ نہیں۔ ان کی اُس طرح کی نظموں سے ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور مسلمانوں کو قلبی جراحت کے سوا اور کچھ نہ مل سکا۔ اُس وقت اس ملک پر انگریزوں کا تسلط تھا۔ اس لئے جذبۂ حریت نوازی کا یہ تقاضا تھا کہ حصول آزادی کی جدو جہد ان کے خلاف ہوتی۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ انگریزوں کی قدمبوسی اور پالیسی کی ہے۔ ان سے وفاداری اور اطاعت کا اظہار کیا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کی مفروضہ کہانیاں اگرچہ ایک فرضی داستان پارینہ کی حیثیت رکھتی تھیں تاہم رنگ لال نے ان خوابیدہ جذبات منافرت کو بیدار کرکے دو ہمسایہ قوموں کے مندمل زخموں کو چھیڑنے کی ناخوشگوار کوشش کی ہے۔ اس ناخوش آیند ذریعے سے انھوں نے اپنی قوم کو بیداری کا پیغام دیا ہے۔ " پدمنی اُپکھیان " ان کی ایک تصنیف ہے۔ اس میں ان کی تنگ قومیت نوازی کا رنگ عریاں نظر آتا ہے

خاتمے پر وہ انگریزوں کیلئے اپنے خوشامدانہ کلمات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں :— ترجمہ

بھارت کی قسمت بہت اچھی ہے * کیونکہ مصائب کی اندھیری راتیں
صبح میں تبدیل ہوگئی ہیں

کیا اب بھی خواب غفلت باقی رہے گا ؟

انگریزوں کی مہربانیوں سے * اب انسان سر اٹھا کر چلتا ہے
علم و حکمت کا ہر سمت پرچار ہو رہا ہے

اس کتاب میں انھوں نے علاء الدین خلجی کی پدمنی سے محبت کا افسانہ تراشا ہے اور بیان کیا ہے کہ علاء الدین خلجی کے مظالم کی وجہ سے ہندو مذہب اور ہندو عورتوں کی عزت و عظمت پر شدید مصیبتیں نازل ہوئیں - پدمنی اور اس کی سہیلیوں نیز دیگر عورتوں نے اپنی جانیں دے دیں لیکن علاء الدین اور اس کی سپاہ کے قبضے میں آنا قبول نہ کیا - یہ قصہ بیان کرکے وہ اپنے خاص رنگ میں اپنے زمانے کے ہندوؤں کو برانگیختہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :—

" شادھینتا ھینتا لے کے بانچیتے چائے ہے کے بانچیتے چائے -
آزادی کھو کر اے لوگو بھلا کون زندہ رہنا پسند کر سکتا ہے -
داشتّو سر نکھل بو لوکے پڑی تے پائے ہے کے پڑی تے پائے -
غلامی کے نظام کو اے لوگو کون پاؤں پڑ کر قبول کرنا پسند کرسکتا ہے -

جنبیر داش تھا کا نسر کے رپرالی "-

دلیل مسلمانوں کی غلامی جہنم کے برابر ہے -

رنگ لال نے راجپوتانے کی تاریخ لکھنے کے شوق میں سچے اور جھوٹے روایات کے اختلاط سے ایک مفروضہ عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کی۔ پدمنی، کرمودیوی اور شور سندری نام کی تین نظم داستانوں کے رنگ میں ترتیب دیں - ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ قوم کے نوجوان قدیم راجپوتوں کی بہادری اور صداقت کی داستانیں سن کر غیر ملکی تہذیب کے سحر میں نہ پھنسیں اور قابل فخر اسلاف کی تبعیت میں اپنے آپکو سنواریں - پدمنی کی داستان دلی کے سلطان علاء الدین خلجی کے حملہ چتوڑ اور چتوڑ کی رانی پدمنی کے واقعات پر مرتب کی گئی ہے - اسکاٹ کی کتاب " لے آف دی لاسٹ منسٹریلز " کو پیش نظر رکھ کر رنگ لال نے " چارن " کی زبان سے یہ کہانی بیان کی ہے - " کانجی کا بیری " کے نام سے ازیسہ کی تاریخ پر اساس رکھ کر ایک رومانوی داستان تیار کی ہے -

رنگ لال نے کالی داس کی مشہور کتاب " کمار شمبھب " کا سات ابواب تک ترجمہ کیا تھا - (سنہ ۱۸۷۲ع) - رنگ لال سے پہلے ہمیں دو ایسے مصنفین اور بھی ملتے ہیں جنھوں نے کالی داس کی اس کتاب کا ترجمہ کیا تھا - پہلے ہری موہن کرمو کار اور دوسرے

پیاری موهن سین گپت - مقدم الذکر نے سنہ ۱۸۵۸ع میں اور مؤخر الذکر نے سنہ ۱۸۶۱ع میں یہ کام کیا -

"منو بچو هیتو لتها" کی تصنیف کے پس پردہ رنگ لال کا یہ مقصد کار فرما نظر آتا ہے کہ سنسکرتی اصول او رطرز پر قدیم تاریخ کے جستہ جستہ ابواب پیش کئے جائیں - اسی طرح انھوں نے "نیتی کسم انجلی" میں بہت سارے قدیم مراسم کا تذکرہ دیا ہے -

رنگ لال نے بنگلا نظموں کے متعلق مضامین بھی قلمبند کئے تھے - علاوہ بریں بنگلا ادب کا سب سے پہلا تنقیدی تبصرہ بھی لکھا تھا - یہ سچ ہے کہ اس میں با اصول طریقے پر فیصلے نہیں ہیں بلکہ انھوں نے انگریزی تنقیدات کے اصول پر بنگلا نظموں کے معائب ظاہر کئے ہیں -

رنگ لال سنہ ۱۸۲۷ع میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۸۸۷ع میں اس دنیا سے رخصت ہوئے -

---

مائیکل مدھو شودن دت

رنگ لال کی " پدمنی اپکھیان " سنہ ۱۸۵۸ع میں طبع ہوئی۔ اسی سال بنگلا ادب جدید کا سب سے پہلا ڈراما مصنفہ مائیکل مدھو شودن دت بنام " سرمیشٹھا " بھی شائع ہوا۔ سنہ ۱۸۵۹ع میں ایشورگپت کی رحلت ہوئی اور اسی سال مائکل کی پہلی منظوم کتاب " تلتّما " منظرعام پر آئی۔ اس کتاب نے جدید بنگلا شاعری کی بنیاد اسی طرح پڑی جس طرح سنہ ۱۸۴۷ع میں ایشر رچندر ودیا ساگر کی کتاب "بےتال پنچوبنگشتی" (بے تال پچیسی) نے جدید بنگلا منثور ادب کی اساس استوار کی تھی۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی کا وسطی زمانہ بنگالی ادب جدید بالخصوص نثر، نظم، ڈراما اور ناول کی ابتدا کیلئے مخصوص طور پر امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ سنہ ۱۸۵۸ع میں سب سے پہلا بنگالی ناول " الالیر گھرے دولال" ٹیک چند ٹھاکور نےشائع کیا۔

جس طرح ادبی حیثیت سے یہ زمانہ بڑی اہمیتوں کا حامل ہے اسی طرح سیاسی حیثیت سے بھی یہ زمانہ بڑا اہم تھا۔ کیونکہ اسی دور میں سات سو سال کی پرانی مسلمان حکومت کا خاتمہ ہوا اور بہادر شاہ کے ساتھ ساتھ مغلیہ سلطنت کا وہ آفتاب جو بابر کے ہاتھوں طلوع ہوا تھا اور جسے اکبر، جہانگیر، شاہ جہان

اور عالمگیر جیسے اولوالعزم حکمرانوں نے تابانی بخشی تھی غروب ہوگیا - سنہ ۱۸۵۸ع ہی میں ہندوستان کی تاریخ ایک نئے باب اور نئے عنوان سے شروع ہوئی اور ملکۂ وکٹوریہ نے اپنا اہم شاہی اعلان Queen's Proclamation شائع کیا اور اسی سال سے حکومت ہند ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر تاج برطانیہ اور پارلیمنٹ سے متعلق ہوئی - اس لئے معموعی طور پر ہم سنہ ۱۸۵۸ع کو بنگال کیلئے خصوصا ایک بڑا اہم سال سمجھنے پر مجبور ہیں ۔

بنگالی منظوم ادب میں سب سے زیادہ مقتدر ، اہم ، ہمہ گیر اور طاقت ور حیثیت مائکل مدھو سودن دت کو حاصل ہے - وہ ایک انقلابی شاعر ہیں - ان کی ساز حیات سے مملو اور گوناگوں رنگینیوں سے معمور زندگی نے ان کی نظموں میں ایک ایسا رس اور اس طرح کا کیف پیدا کردیا ہے کہ اُنھیں پڑھ کر ہم خود بھی ایک اتھاہ کیف اور بے پایاں مستی آفریں جذبات میں مستغرق ہو جاتے ہیں - ہمیں ایک غیر معمولی مسرت اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ناقابل بیان کیفیت ان کی سحر نگاری کے اعتراف پر مجبور کرتی ہے - مائکل نے بنگلا شاعری کے میدان کو بہت وسیع اور تنوع آفریں بنادیا - تحقیقات جدید کی بے پایاں مسرت اور نئے حوصلوں اور امنگوں کی روشنی میں انھوں نے بنگالی ادب کو بہت

کچھ رہتا - انگریزی اور دوسری زبانوں کی شاعری سے متاثر
ہوکر انھوں نے بنگالی نظموں میں بھی نئی روح
پھونکی اور ملٹن و شیکسپیر کی طرح اُسے نظم معری Blnak verse کے
مرصع زیورات سے آراستہ کیا - قطعہ Sonnet کی تخلیق بھی بنگلا
زبان میں سب سے پہلے مائکل ھی نے کی - دور جدید کے المیہ اور
طربیہ انداز کے بھی بنگالی ڈراموں میں موجود وھی ھیں - مغربی
طرز پر رزمیہ طویل نظموں Epics کی تخلیق بھی بنگلا زبان میں
سب سے پہلے مائکل ھی نے کی - ان کی میگھناد بودھ دور جدید کی
سب سے پہلی منظوم داستان ھے - بنگالی شاعری اور ڈراما نگاری
کو مغربی ادب کے طرز ادا اور غیر ملکی زبان کے اثرات سے روشناس
کرا کر زیادہ سے زیادہ بنگال کے اس صنف ادب کے خزانے کو مالامال
کرنے والے بھی مدھو شودن دت ھی ھیں - ان کے نئے انداز سخن
اور جدید طرز کلام نے بنگالی شاعری میں حسن بیان، رفعت
تخییل، اور دوسرے گوناگوں محاسن پیدا کئے - ان کی میگھناد
بودھ، اور "بیرنگنا" نظموں میں ھم جس طرح قدیم ھندی
شعرا کے مدھ بھرے سُر پاتے ھیں اسی طرح ھم غیر ملکی عناصر
ادب و شاعری مثلا ھومر، ورجل، تسو اور ملٹن کے نغموں کی
آوازیں بھی سنتے ھیں مائکل سے پہلے تک ھم بنگالی نظموں میں
صرف 'بینا' کا لطیف نغمہ ھی سنتے آئے تھے لیکن اس عظیم

المرتبت شاعر نے همیں ارغنوں کا عمیق تر اور لطف و تاثر سے ھم آهنگ سر سنایا ۔ یه تفریق مشکل هے که مدهو سودن کی شاعری انکی مغرب زده زندگی سے متاثر تهی یا ان کی زندگی ان کی غیر ملکی اثرات سے مملو شاعری سے متاثر هوئی ۔ کیونکه دونوں میں هم آهنگی، یک جهتی اور یکسانیت بدرجه اتم موجود تهی ۔ مائکل نے پوری عقیدت مندی اور محبت کے ساتھ مغربی طرز زندگی کو اپنا یا تھا ۔ بدیسی یا مغربی اثرات هی کی وجه سے انهوں نے بہت ساری مسرتوں کے ساتھ ساتھ بے شمار مصائب کا بهی مقابله کیا ۔ یه کہنا غلط نه هوگا که ان کی شاعری نے مغربی اثرات کی وجه سے بہت کچھه ترقیاں حاصل کیں لیکن اس اثر پذیری نے ان کی زندگی کو مصائب کی آماج گاه بنا دیا تها ۔

مائکل نے انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کے ادب سے اکتساب فیض کیا تھا ۔ انهی سوتوں سے ان کی شاعری میں سر اور طرز آیا تها ۔ غیر ملکی ادب پر انهیں اس قدر دسترس حاصل تها که وه به آسانی اس کے ساگر میں ڈوب کر همارے لئے انمول جواهر پارے جمع کرسکے اور اس طرح همارے خزینۂ ادب کو مالامال کر گئے ۔ اس خصوصیت میں غالبا وه اپنے زمانے کے اور سارے هندی اور بنگالی شاعروں سے بہت آگے تھے ۔ بهارتی روایات اور هندوانه تہذیب و تمدن کے خلاف مدهو سودن کے دل میں

جذبات نفرت و حقارت بچپن ہی سے موجزن تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ اسی جذبہ تنفر کے ما تحت انہوں نے سب سے پہلے اپنی مادری زبان چھوڑ کر انگریزی میں نظمیں لکھنی شروع کیں۔ لیکن بدیسی زبان اور غیر ملکی تخیلات کے میدان میں جب ان کی پیاسی روح کوئی منزل نہ پا سکی تو چونتیس سال کی عمر میں انہوں نے پھر اپنی مادری زبان کے مدھ بھرے ساگر ہی میں غوطہ زنی کر کے تسکین حاصل کی۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ جس مائکل نے ایک وقت اپنی مادری زبان اور ملکی سرمایہ تہذیب و تمدن سے کمال نفرت کا اظہار کیا تھا وہی جب پھر دوبارہ اپنی چھوڑی ہوئی ڈگر پر واپس آئے تو انہوں نے جس قابلیت ذکاوت، صلاحیت، زور بیان، ندرت تخییل اور گونا گوں صفات عجیبہ کا ثبوت دیا ان سے پہلے کسی اور بنگالی شاعر نے اس کا عشر عشیر بھی نہ دیا تھا۔ بدیسی ادب سے واپس آکر اپنے مادر وطن کی کوکھ میں انہوں نے جس ادب کی بنیاد رکھی وہ کسی طوفان مخالفت سے متاثر نہ ہوسکا بلکہ یوما فیوما زیادہ تر استقامت پذیر ہوتا گیا۔ یہ بات اور زیادہ حیرت انگیز ہے کہ اگرچہ مائکل نے بدیسی زبان چھوڑ کر ملکی ادب کا دامن وسیع تر کرنے کی سعی کی تھی لیکن ان کی زندگی اور ان کی ذہنیت

و تہذیب پر مغربی اثرات کا پورا پورا تسلط باقی رہا۔ اس طرح وہ ذہن اور عادت کے اعتبار سے مغرب پرست اور تخییل و زبان کے لحاظ سے وطن پرست کہے جاسکتے ہیں۔

مائیکل مدھوسودن کی قسمت میں سکھ نہیں لکھا تھا۔ بلند حوصلگی اور بے ترتیبی ہی ان کی پریشان زندگی کی ذمہ دار ہے۔ وہ سنہ ۱۸۲۴ع میں بنگال کے ضلع جیسور میں موضع شاگرداری کے ایک خوش حال اور باعزت ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے گھر کے قریب ہی سے ایک چھوٹی سی ندی "کپوتکھو" بہتی تھی۔ اس ندی کو انہوں نے اپنی ایک نظم میں مادر وطن کا شیر پستان کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ تیرہ سال کی عمر میں وہ تعلیم کیلئے ہندو کالج کلکتہ میں داخل ہوئے اور وہاں چھ سال تک علم حاصل کرتے رہے۔ یہیں سے ان کے ذہن پر انگریزی معاشرت اور زبان کا رنگ چڑھا اور رفتہ رفتہ وہ اس سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اسی رنگ میں رنگ گئے۔ اسی زمانے سے انہوں نے انگریزی زبان میں نظمیں کہنی شروع کیں اور انگلستان جانے کی لگن ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ سترہ سال کی عمر میں مدھوسودن نے اپنی ایک انگریزی نظم میں اپنا شوق سفر انگلستان اس طرح ظاہر کیا ہے :—

" I Sigh for Albions distant shore,

Its villeges green, its mountains high ;

Tho' friends, relations I have none

In that fair clime, yet oh I sigh

To cross the vast Atlantic wave

For glory or a nameless grave.

مائکل کا عزم اور حوصلہ اس قدر بلند تھا کہ کم عمری ھی سے وہ اپنی انگریزی نظمیں انگلستان کے مشہور جرائد مثلاً Bentley's Miscellany اور Black woods' magazine. وغیرہ میں اشاعت کیلئے بھیجا کرتے تھے -

مائکل نے ابتداءً انگریزی شاعر بائرن کو اپنا امام ادب بنایا تھا یہ زمانہ سنہ ۱۸۴۲ع کا تھا - زمانۂ ما بعد میں انھوں نے بائرن کے علاوہ اور بڑے بڑے انگریزی شعرا کا تتبع بھی شروع کیا - جن شعراء سے مائکل زیادہ تر متاثر ھوئے ان میں ھومر' اوِد' دانتے' تسّو اور ملٹن قابل ذکر ھیں -

مدھوسودن کی زندگی میں پہلی تبدیلی اس وقت دیکھی گئی جب انھوں نے اپنا آبائی مذھب ترک کرکے عیسائی مذھب قبول کیا اور بشپس کالج میں داخلہ لیا - ان کی بد نصیبی اسی وقت سے شروع ھوئی - وطن اور اھل وطن کے

ساتھ ان کا اختلاف دن بدن بڑھتا گیا - نوبت یہاں تک پہنچی
کہ انھیں اپنے گھر اور اھل خاندان سے بھی قطع تعلق کرنا پڑا -
یہ بات قابل لحاظ ھے کہ مدھوشودن عیسائیت کی محبت
میں عیسائی نہیں بنے تھے بلکہ صرف انگریزی معاشرت اور
تہذیب کی جاذبیت نے انھیں عیسائیت کی طرف مائل کیا تھا -
بچپن ھی سے وہ انگلستان جانے کیلئے بے چین تھے - شاید انھوں نے
یہ سوچا ھو کہ ان کی عیسائیت ان کے تکمیل عزم کی راہ میں
سہولتیں پیدا کر سکے گی - عیسائی ھونے کے بعد انھوں نے بشپ
کالج کلکتہ میں داخلہ لے لیا - لیکن بہت دن نہ گزرے تھے کہ
منتظمین و اراکین کالج سے ان کا اختلاف رائے شروع ھو گیا -
وھاں کے انگریز طلبہ کیلئے ایک مخصوص طرز کی ٹوپی داخل
لباس تھی - مائکل نے بھی وہ ٹوپی استعمال کرنی چاھی لیکن
منتظمین کالج نے اس کی اجازت نہ دی - اختلاف کی بنیاد یہیں سے
پڑی - بشپس کالج کے قیام ھی کے زمانے میں مدھوشودن نے انگریزی
اور بنگلا کے علاوہ فارسی، سنسکرت، تامل، تیلگو، یونانی،
لاطینی، عبرانی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانیں بھی
سیکھ لی تھیں -

سنہ ۱۸۴۸ ع میں مدھوشودن مدراس گئے اور تقریبا آٹھ سال
تک وھاں اقامت پذیر رھے - اس زمانے میں انھوں نے غیر مطمئن

حالت میں اخبارات میں شرکت اور معلمی کی - انھوں نے ابتداءً
ایک انگریز خاتون سے شادی کی لیکن تھوڑے دنوں میں اُسے طلاق
دیکر پھر ایک دوسری فرانسیسی خاتون سے شادی رچائی - یہ دوسری
شادی انھیں بہت ساز گار رھی اس بیوی نے مائکل کا ھر حال میں
ساتھ دیا - مائکل نے دوران قیام مدراس میں اپنا پہلا مجموعۂ
نظم انگریزی بنام کیپٹیو لیڈی Captive lady شائع کیا - یہ کتاب
قبول عام حاصل نہ کر سکی کیونکہ اس کا معیار چنداں بلند نہ تھا -
اگرچہ انگریزی تصنیف اہل وطن کے نزدیک ایک باعث افتخارامر تھا
لیکن انگریزوں نے اسے شرف قبول نہ بخشا -

تقریبا آٹھہ سال گزارنے کے بعد مدھو سودن پھر کلکتہ واپس
گئے اور وھیں نا معلوم طریقہ پر بنگلا ادب کا دروازہ ان پر کھل گیا -
پائک پاڑا کے راجا ایشور چندر سنگھ اور پرتاب چندر سنگھ نے
بیلگچھیا کے اسٹیج ھال میں رام نارائن ترک رتن کا ڈراما " رتناولی "
اسٹیج کرنے کی خواھش کی - ان لوگوں نے مائکل سے یہ خواھش
ظاھر کی کہ اس ڈرامے کو وہ انگریزی میں منتقل کردیں تاکہ
انگریزوں کو سمجھنے میں آسانی ھوسکے - مدھو سودن نے ترجمہ کیا
جو شائع بھی ھوا لیکن ان کے اعلی معیارپر پورا نہ اترا - اب
ان کے دل میں ڈرامانگاری کا شوق پیدا ھوا اور انھوں نے ایک
تخلیقی ڈراما خود تصنیف کیا - اس طرح سنہ ۱۸۵۸ع میں ان کا

ایک ڈراما " شرمشٹھا " نامی وجود میں آیا ۔ یہ ڈراما بیلگچھیا
اسٹیج پر کھیلا بھی گیا ۔ اس ڈرامے کی بنیاد انگریزی اصول پر رکھ
کر اسے نئے طرز میں سب سے پہلے بنگلا زبان کے ذریعہ عوام کے سامنے
لایا گیا ۔ قدامت پسند ڈراما نگاروں کے جذبات پر یہ ایک کاری
ضرب تھی کیونکہ وہ قدیم طرز کے سنسکرت ڈراماؤں ھی کو اپنا
ملجا وماویٰ سمجھے ہوئے تھے ۔ مائکل کا یہ ڈراما سنہ ۱۸۵۹ع میں
شائع ہوا ۔ اس زمانے سے غیر ملکی محاسن زبان اور مغربی
تخئیل کو بنگلا زبان کے ادب میں داخل کرنے کی کوشش مائکل نے
شروع کی ۔ انہوں نے قدامت کے تمام تر بندھنوں سے آزادی کا علم
بلند کیا اور جدت پسندی کو اپنا موضوع کلام اور مقصد زندگی
بنایا ۔ جدید امور میں بھی ان کی جدت پسند طبیعت نے گونا گوں
اختراعات کیلئے راستے پیدا کئے اور تحقیق و تصرف کے ذریعہ
انہوں نے بہت سارے اچھوتے محاسن سے بنگلا ادب کو مرصع کیا ۔
رنگ لال کی صحبت نے مدھوشودن کے بنگلا ادب میں
نکھار پیدا کیا اور اسی نکھار کا ثمرہ تھا کہ وہ اس زبان اور
ادب کی ترقی اور توسیع میں مشغول ہوئے ۔ پہلے ڈرامے کے بعد
مدھوشودن نے تین ڈرامے یکے دیگرے لکھے ۔ انہوں نے اپنا مشہور
ڈراما " پدّابتی " سنہ ۱۸۵۹ع میں لکھا ۔ اس ڈرامے کا بنیادی
موضوع ایک یونانی قصہ ہے ۔لیکن مائکل نے اسے اپنی وطنی

زبان اور دیسی تخییل کے رنگ میں ڈھال کر "پورانوں" کے افسانوی رنگ میں پیش کیا - اس میں اگرچہ یونانی دیویوں اور دیوتاؤں کے بجائے ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کا اضافہ ہے لیکن اصل قصہ کی بنیاد نو بے داغ طریقے پر محفوظ رکھا گیا ہے - اصل کتاب کے محاسن بھی بجنسہ باقی ہی نہیں رکھے گئے ہیں بلکہ نئے ابواب کا اضافہ کر کے ان کی تا بانی اور دلچسپی میں فراوانی پیدا کی گئی ہے -

اس کے بعد مائکل نے دو طربیہ ڈرامے سماجی اصلاح کے مقصد سے لکھے - ایک کا نام ہے " ایکے ای کی بولے شبّھتا " ؟ (کیا اسی کا نام تہذیب ہے ؟) اور دوسرے کا نام " بوڑھو شالکیر گھاڑے روں " (بوڑھی مینا کے گلے میں پر - یعنی بوڑھے کا عشق) مائکل نے مقدم الذکر ڈرامے میں نوجوان سماج کی شراب نوشی اور اخلاقی برائیوں پر طنز کیا ہے اور موخر الذکر میں قدامت پسند بوڑھوں کی تنگ نظری اور انسانی کمزریوں کا مذاق اُڑایا ہے - ان ڈراموں نے مدھو شودن پسر نئے ابواب کا افتتاح کیا اور ان کے ڈراموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی - ان ڈراموں کی مقبولیت نے ان پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اپنی وطنی زبان اور اپنی قوم ہی کے ذریعہ وہ ترقیوں کے زینے پر چڑھ سکتے ہیں - انہیں اس کا بھی تجربہ ہو چکا تھا کہ مغرب کی نقالی

اور بدیس پرستی نے انہیں کبھی بھی ابھرنے کا موقع نہیں
دیا تھا ۔ ان ڈراموں کی زبان اگرچہ جابجا مغلق اور دقت پسند ہے
لیکن موضوع کی دلچسپی میں زبان کی ثقالت حائل نہیں ہوتی ۔
مدھو شودن کی سب سے پہلی بنگالی نظم " تلتما شمبھب
کانو" تھی ۔ ہم اسی نظم کو بنگالی ادب میں نئے طرز فکر کی
بنیاد کہہ سکتے ہیں ۔ بنگالی نثر میں " بے تال پنچو بنگشتی "
(بے تال پچیسی) ، " الالیر گھرے دولال " اور " دُرگیش نندینی "
وغیرہ نے مجموعی طور پر جو تبدیلی اور انقلاب پیدا کیا وہی
انقلاب منظوم ادب میں صرف تلتما شمبھب نے پیدا کیا ۔

اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی ساتھ بنگلا شاعری کے رخ
اور اس کے طرز فکر میں تبدیلی پیدا ہوگئی ۔ اس سے پہلے تک
بنگلا نظمیں صرف " پویار" کی بحر میں لکھی جاتی تھیں
جسکی وجہ سے اس کا جسد اور اس کی روح یعنی لفظ اور فکر
دونوں ہی محدود اور بے جان ہو کر اپنی فطری ترقی
کھو بیٹھے تھے ۔ ادب کا دریا گھٹ کر نہر میں تبدیل ہو گیا تھا ۔ مائکل نے
یہ نظم انگریزی کا تتبع کر کے نظم معری Blank verse میں لکھی تھی
جس سے بنگالی ادب میں ایک نئی جان پیدا ہوئی ۔ مائکل کا
یہ مجموعہ سنہ ۱۸۶۰ع میں شائع ہوا ۔ اس کا ایک حصہ
سنہ ۱۸۵۹ع ہی میں شائع ہو چکا تھا ۔ اس منظوم کتاب کا سنگ

بنیاد پورانوں کے ایک قدیم قصے پر رکھا گیا ہے۔ اس کا مختصر قصہ یہ ہے کہ سندو اور اپوسندو دو بھائیوں نے جو دیؤں کی قوم سے تھے بہشت کے دیوتاؤں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ دیوتا جب اس جنگ میں ہار گئے تو انہوں نے ایک غیر معمولی حسینہ "تلتما" کو پیدا کیا اور اسے "ونـدو" یعنی ولدھیا چل پہاڑ کے جنگل میں پہنچا دیا۔ دونوں دیو برادران اسے دیکھ کر اس کے دام زلف کے اسیر ہوگئے اور وہ آپس ہی میں رقیب بن کر آخر آتش رقابت کا شکار ہوئے۔ یہ افسانہ اگرچہ دیسی ہے لیکن اس کا طرز بیان بدیسی ہے۔ مغلوب دیوتاؤں کا تذکرہ کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ اسے پڑھ کر خواہ مخواہ اسی مشہور انگریزی شاعر کیٹس Keats کی نظم ہائی پیرین Hyperion کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس نظم میں اگرچہ انسانی دلچسپی کا سامان یا روح انسانیت کو بیدار کرنے والی اسپرٹ نہیں پائی جاتی۔ تاہم طرز نگارش، انداز فکر، نشست الفاظ اور اسلوب بیان کی حیثیت سے یہ فکر خوابیدہ میں نئی بیداری پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کی بحر میں قدیم "پریار" کی ایک خصوصیت یعنی چودہ حروف کے مصرعہ کی تشکیل کی قید تو باقی ہے لیکن اس میں قوافی کی پابندی نہیں ہے۔ ساتھ ہی ایک نئی خصوصیت یہ ہے کہ

زور کلام مصرعۂ اول سے منتقل ہو کر حسب مقام فطری طور پر اُس لفظ پر منتہی ہوتا ہے جس پر عادۃً نثر میں ہونا مناسب ہے۔ بنگالی بحر میں مائکل کی یہ ایک نئی ایجاد تھی جس کا تتبع انھوں نے انگریزی سے کیا تھا۔ ملٹن کی معری نظم Blank verse کی خصوصیت بھی مائکل نے اپنی اس نظم میں باقی رکھی ہے۔

مائکل نے سب سے پہلے Blank verse کا تجربہ اپنے مشہور ابتدائی ڈراما "پدّا بتی" میں کیا تھا۔ انگریزی میں نظم معری Blank verse کی بنیاد Iambic اصول پر ہے۔ انگریزی نظمیں Syllabic ہوا کرتی ہیں اور اس کی تقطیع میں زور ادا کبھی پہلے سکتے پر اور کبھی دوسرے سکتے پر پڑتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کی بحروں میں ہر مصرعے پر یکساں طور پر متناسب اور موافق زور ظاہر نہیں ہوتا اور شاعر کیلئے یہ آسانی ہوتی ہے کہ وہ بڑی روانی کے ساتھ مصرعوں پر مصرعے لگاتا چلا جاتا ہے۔ بنگلا کی قدیم بحر "پویار" میں یہ سہولت نہ تھی۔ مدھو شودن کے ماسبق تمام شعراء نے بحروں اور سروں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔ مدھو شودن نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر پویار میں بھی نت نئی اختراعات کیں اور اس بحر کی قید کو باقی رکھتے ہوئے انھوں نے بڑی دانائی سے مناسب اصلاحات کرکے روانی اور زور کلام کو

بہت آگے بڑھا دیا - مزید براں نظم معری نے صرف الفاظ کے تناسب اور لہجے کے زور ہی کو نہیں بڑھایا بلکہ اشتقاق اور اختراع الفاظ میں بھی مدد بہم پہنچائی - "مارلو" نے انگریزی میں نظم معری Blank verse کی ایجاد کرکے جس طرح انگریزی منظوم ادب کو آگے بڑھایا اُسی طرح مدھوسودن نے بنگلا منظوم ادب کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا "پدابتی" میں مدھوسودن نے کہیں کہیں نظم معری کا نمونہ دکھایا ہے اور کہیں کہیں قدیم طرز پویار کا تاہم پدابتی کی نظم معری نے بہت زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کیا لیکن جب "تلتما" میں اسے استعمال کیا گیا تو یہ بحر عام طور پر لوگوں کی تنقید کا موضوع بن گئی - ابھی یہ تنقید و تعدیل ختم نہ ہوئی تھی کہ مائکل اپنا شاہکار "میگھناد بودھ" منظر عام پر لائے - پھر "بیرانگنا" سامنے آئی - ان شاہ پاروں نے تنقید نگاروں کا منھ بند کردیا اور بنگالی منظوم ادب میں نظم معری نے ایک مستقل مقام حاصل کرلیا - بنگلا ادب مائکل کے اس احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے پویار کی بےجان بحروں اور اس کے بےکیف قیود سے نجات اور اس کے بےسرے وقفات سے خلاصی دے کر اس میں نئی زندگی، نیا حسن، نیا زور اور نئی روح پیدا کی

مدھوشودن کا سب سے بڑا کارنامہ میگھناد بودھ" ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے سنہ ۱۷۶۱ع میں شائع ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت یونانی اصول پر مرتب کی گئی ہے۔ اس میں ہمیں یونانی ادب کے اثرات بڑے زور و شور کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے سنسکرت مہا کابو (رزمیہ منظوم داستان) کے اصول کو ترک کرکے یونانی رزمیہ نظموں Epic کی پیروی کی۔ سنسکرت علم العروض میں " بشوناتھ کوبی راج " نے " مہا کابو " کیلئے کچھ اصول مقرر کئے ہیں۔ ان اصول کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ایک مہاکابو میں آٹھ ابواب سے زیادہ ہوں۔ اس کا ہیرو یقینی طور پر کوئی راجا یا کوئی عظیم المرتبت انسان ہو۔ مختلف جذبات عشق یا شجاعت وغیرہ میں سے کوئی ایک جذبہ اس میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو اور دوسرے ضمنی جذبات اس میں تابع کی حیثیت رکھیں۔ اس نظم میں صبح، شام، رات، دن، طوفان و غیرہ امور کے متعلق تفصیلی بیانات ہوں۔ اس کے ایک ایک باب میں ایک ایک مکمل نظم ہو اور قدیم پوران کے افسانے یا کسی تاریخی واقعے کو اس نظم کا ماخذ بنایا گیا ہو۔

مذکورہ بالا اصولوں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سنسکرت کے مقرر کردہ ضوابط، قیود و بند اور پابندیوں کی وجہ سے اصلی روح شاعری سے

مقرا تھے۔ ان پابندیوں کے ساتھ جو تنگ بندیاں وجود میں آتی
تھیں انہیں بہ مشکل شعر و شاعری کا درجہ دیا جاسکتا تھا۔
اس میں شک نہیں کہ بشو ناتھ کوبی راج کے مرتب کردہ اصول
صرف قدیم راسائن اور مہانیات وغیرہ کی مطابقت یا تتبع کی
وجہ سے گھڑے گئے ورنہ ان ضوابط کو پیش نظر رکھ کر کسی نے
بھی کوئی مہا کاویہ مرتب نہیں کی۔ ایک مہاکاویہ میں شاعر کو
جن امور کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے ان کی تکمیل میں ان ضوابط کی
وجہ سے بڑی بندش اور پریشانی پیدا ہوتی تھی۔

مدھو شودن نے سنسکرت آدرش کو قبول نہ کرکے یونانی
نمونوں کی تقلید کی۔ یونانی شاعری کے بارے میں محققین کی
رائے یہ ہے کہ اس میں روح ادب و شاعری کو باقی رکھا گیا ہے۔
صنائع لفظی کے گورکھ دھندے اور غیر ضروری قیود بند کی
پابندی سے اجتناب برتا گیا ہے۔

اس طرح اس کے انداز تخیل میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی
ہے۔ تخیل کی وسعت سے مضمون کی طاقت اور طرز ادا کا
فطری انداز قوی تر ہوگیا ہے۔ زبان اور بحر کو بھی اس
وسعت تخیل اور طاقت بیان سے پوری پوری مطابقت حاصل
ہے۔ اس لئے مدھو شودن نے اسی آدرش کو قبول کرکے بنگلا
زبان میں ایک اہم کردار اور طاقت ور زندگی کی تصویر

کیفی گئی - انیسویں صدی کے بنگالی ادب میں ہم جس روح کا مظاہرہ دیکھتے ہیں اُس کی طاقت، وسعت، رجائیت، تجوشی اور قوت تخییل کا مائکل نے اپنے مہا کاسو میں بھرپوری طرح اظہار کیا اور اس طرح بنگالی نظموں کی حدوں کو بنگال کے محدود ساگر سے نکال کر دنیا کے ادبی مہا ساگر سے جاملایا جس کی وجہ سے بنگالی ادب کی رگوں میں حیات نوکا خون موج زن ہوا۔ مدھوشودن سنسکرت کے رس اسی قدر مرھون کرم ہیں کہ اس سے انہیں مواد کلام حاصل ہوا لیکن تخییل، طرز ادا اور اسٹائل کیلئے وہ یونانی اور دوسری مغربی زبانوں کے رھین احسان ہیں -

میگھناد بودھ میں ہمیں انسانی زندگی کا کوئی ایک مستقل رخ نظر نہیں آتا لیکن انسانی زندگی کا ایک مکمل تابناک اور چنچل رخ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے - اس کتاب کی کامیابی کا سبب یہ ہے کہ شاعر کے تخییل میں پختگی اور تصورات میں تکمیل موجود تھی - شاعر " گیٹے " نے " فاؤتس " کے متعلق کہا ہے کہ فاؤتس ڈرامے میں ان کے پیغام غم نے نامعلوم سمتوں سے تعریف و توصیف حاصل کی ہیں اور انہیں توصیفات نے شاعر کے عزائم کو زیادہ مستحکم بنایا ہے - ان کے مکالمات میں زندگی کی حرارت اور کلام میں خوشگوار ارتعاش

ہے جس سے روح بیدار ہوتی ہے - کہیں کہیں ان کے نغمات بھی گریہ حسین معلوم ہوتے ہیں - نئی زندگی کی جنوں خیزیوں نے مائیکل کے اعصاب میں ارتعاش پیدا کیا تھا - کشاکش حیات نے انہیں زندگی کے پھیلاو، اُس کی ہمہ گیری اور اس کی طاقتوں کے احساس کے مواقع فراہم کئے تھے - پریشانی، مصیبت، غم لامحدود رجائیت، ناکامی، مایوسی، تردد، بے یقینی اور جنگ و جدال کی ہماہمی نے اس نظم کو بے پناہ رفعت اور عظمت بخشی ہے -

میگھناد بودھ نظم میں اگرچہ لنکا کے راجا راون کی اس زندگی اور معاربات کاذکر ہے جو رام کی بیوی سیتا کو بجبرلے جانے کے بعد سے آپے در پیش ہوئیں لیکن اس کا کردار اچھوتا ہے - اس میں پوری طرح دکھایا گیا ہے کہ رام اور تمام دیوتاؤں بلکہ ارضی و روحانی طاقتوں کے مقابلے میں رفتہ رفتہ راون کی تمام مادی طاقتیں ختم ہوگئیں، اُس کے ساتھی مرگئے، اُس کے اعوان و انصار، اعزہ و اقارب سبھی خاک و خون میں مل گئے تاہم راون کے عزم، اُسکے حوصلے اور ارادے میں ذرہ برابر تزلزل پیدا نہ ہوا - ایسے موقع پر مائکل نے ہندؤں کے واجب الاحترام رام اور لچھمن کے کردار کو نہایت پست اور کمزور رکردار کی حیثیت دی ہے اور راون جیسے معتوب قوم اور دیوتاؤں کے

معاند کا کردار اُس نے بے حد بلند اور لاثانی توصیف ثابت کیا ہے - اُس کے حوصلے، ہمت اور عزم وارادے کے بلند معیار کی تصویر کشی مائکل نے بہت ہی دلکش انداز میں کی ہے -

میگھناد بودھ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مذہبی معتقدات اور تصورات سے اُسے بالکل علحدہ رکھا گیا ہے - جب ہم سنسکرت کی رزمیہ نظموں کے بنگالی تراجم جو دور وسطی میں لکھے گئے پڑھتے ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب مذہبی چیزیں ہیں - رامائن اور مہابھارت میں شان و شکوہ اور زور بیان کا امکان تو ضرور تھا لیکن مذہبی عقیدت مندی اور بھکتی نے تصور کے سارا زور ختم کر دیا ہے - اس اعتبار سے میگھناد بودھ بنگلا زبان کی سب سے پہلی حیات افروز اور زندگی نواز نظم کہی جاسکتی ہے - ایسی نظم جس میں زندگی کی امنگیں، اُسکے حوصلے، عزائم، طاقتیں اور امیدیں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں -

مائکل نے اس نظم کی ترتیب میں صرف یونانی تاثرات ہی کو قبول نہیں کیا ہے - اس پر رومن، فرانسیسی اور انگریزی اثرات کا پرتو بھی نمایاں ہے - ورجل، تسو اور ملٹن وغیرہ شعراء سے یہ نظم پوری طرح متاثر معلوم ہوتی ہے - ہم یہاں بطور نمونہ چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے مختلف اثرات کا اندازہ ہو سکے گا -

میگھناد بودھ نظم کے مختلف ابواب میں ہمیں عظیم الشان رزمیہ داستانوں کی نشانیاں ملتی ہیں - باب اول میں سمندر کو مخاطب کر کے بہادر اور فخر خاندان راون بڑے غرور کے انداز میں جس طرح اپنی عارضی زندگی کے عزائم کا اظہار کرتا ہے اسی طرح ظرافت، طنز، ملامت اور کشا کش سے اکتا کر خود اعتمادی کے ساتھ درخواست کے ذریعہ بھی تکمیل حیات کے راز بتاتا ہے - جن تشبیہات، استعارات اور تمثیلات کے ذریعہ ان کا پیغام تکمیل پذیر ہوا ہے ان میں بھی جوش حیات، روانی اور زور کا حصہ موجود ہے - باب اول ہی کے ایک دوسرے مقام پر "بیر باہو" کی خبر مرگ سنکر راون کے جذبات کی تصویر کشی میں عظمت کلام کی نشانیاں ملتی ہیں - ایک طاقتور سردار اپنی کامل تباہی کا نظارہ کرتا ہے - اس تباہی سے بچنے کے راستے مسدود ہو چکے ہیں - مصائب کی موجوں میں کھیلتے ہوئے وہ بے خوف ہو کر خود اپنی چتا پر کھڑا ہوا مسکراتا نظر آتا ہے - میگھناد بودھ میں ہمیں ایسی ہی تصاویر حیات کا مرقع جابجا دکھائی دیتا ہے - ایسی زندگی جو کشمکش، بربادی اور فتنہ و فساد کے بیچ سے راہ نکالتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ خود انہیں مصائب کی موجوں میں روپوش ہو جاتی ہے - ہمیں اس کتاب کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے جذبات رام اور راون کی زندگیوں میں رونما ہوگئے ہیں یا ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ مدھو شودن خود اس حساس زمانے میں موجود تھے جب انسانیت فتحیاب ہو کر اجاگر ہوئی تھی۔ انسانی زندگی میں صحیح جذبات کی تمیز بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور مدھو شودن یقیناً ان کم لوگوں میں سے ایک ہیں۔

میگھناد بودھ کے دوسرے باب کو ہومر کے اوڈی سی Odyssey کے پہلے باب کے ساتھ مناسبت ہے۔ اوڈی سی میں ہم دیکھتے ہیں کہ دیوی ایتھینے Athene ٹیلیمیکس Telemachus سے ملاقات کرتی ہے اور اس کی امداد پر آمادہ ہوتی ہے۔ میگھناد بودھ میں بھی یہ پایا جاتا ہے کہ دیوی اور دیوتا سب رام اور لچھمن کی اعانت کیلئے کمر بستہ ہوئے ہیں اسی طرح آٹھویں باب میں ورجل کی اینیڈ Aenied کے ایک حصے سے بھی مناسبت پائی جاتی ہے۔ یہ وہ موقع ہے جہاں اینس Aeneas پاتال میں اپنے باپ کی روح سے باتیں کرنے گیا ہے۔ میگھناد بودھ میں ہمیں ملتا ہے کہ رام بھی نرک (دوزخ) میں اپنے باپ دسرتھ سے باتیں کرنے گئے تھے۔ میگھناد بودھ کے اسی بابکی وڈی سی کے گیارھویں باب سے بھی مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسے ہم توارد یا واقعات میں اتفاقی تطابق بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن شاعر کی ماہرانہ خصوصیت سے جو طرز ادا، ور کلام، محاسن لفظی و معنوی نیز تمثیلات و تشبیہات اور

استعارات کے ذریعہ نمایاں ہوتی ہیں ان سے ہم کسی طرح پہلو تہی نہیں کر سکتے۔

ہمیں غیر ملکی ادب کے اثرات میگھناد بردھ میں تین طرح کے نمایاں نظر آتے ہیں۔

۱ – واقعات یا افسانوں سے متعلق۔

۲ – زبان یا استعمال الفاظ سے متعلق۔

۳ – مقاصد اور نتائج کلام سے متعلق۔

واقعات کے لحاظ سے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ دوسرے باب میں جس طرح محافظ خاندان راج لکشمی دوسرے دیوتاؤں کی مدد سے رام کی فتح اور راون کی شکست کیلئے دعا دیتی ہیں اسی طرح "اُودیسی" میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ٹیلیمیکس کی مدد کیلئے دیوی مستعد ہوتی ہیں۔ پانچویں باب میں "مایادیوی" نے "شپنودیوی" (خواب کی دیوی) کو یہ ہدایت کی ہے کہ تم خوابیدہ لکھن کے پاس جاؤ اور "الیڈ" کی دوسری کتاب میں "جیوس" نے خواب کو ہدایت دے کر "اگامن" کے پاس بھیجا ہے۔ آٹھویں باب میں غیر ملکی اثرات بہت بداهت کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔ یہاں بیک وقت "دانتے' ہومر اور ورجل" کا تتبع ہمیں نظر آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مدھوسودن نے اپنے خیال میں صرف "ورجل"

ی " اینیڈ " هی سے اکتساب فیض کیا ہے لیکن همیں " اوڈیسی " کے گیارھویں باب سے زیادہ مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ س کا ذکر پہلے هی هو چکا ہے۔

میگھناد بودھ کے شروع میں شاعر نے جس طرح نظم کی دیوی کے ساتھ اپنی عقیدت مندی کا اظہار اور اس سے ترتیب نظم میں استمداد کی ہے اُسکے ساتھ ورجل اور دانتے کی مطابقت بھی تفحص سے ظاهر هوتی ہے۔ ان دونوں شاعروں نے بھی " میوز " Muse یعنی نظم کی دیوی کے ساتھ اپنی عقیدت مندی اور اس سے استعانت کا ترانہ گایا ہے۔

زبان یا استعمالِ الفاظ کے اعتبار سے ہم یہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ مدھو شودن نے غیر ملکی کلاسیکل طرز ادا کو بنگلا زبان میں داخل کر کے اُس کی روانی، ترصیع، تقویت اور انداز میں تری و سعت پیدا کی ہے اور اسے ایک مایوس کن بندش سے رہائی دلاکر زبان پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس آزادی هی نے بنگلا نظم کی زبان کو زندگی کے رس سے باخبر کیا ہے۔ صفات اور تشبیہات کے استعمال هی میں مدھو شودن کی چابکدستی اور دانائی پوری طرح ظاہر هوتی ہے۔ اُن کی تخییل کے ان احساسات میں کہیں بھی اغلاق نہیں ہے۔ مثلاً :—

" کی کہلی، بشنلتی ؟ پربت گریہو چھاڑی
باہر آئے جبے ندی، شند هور اُدّیشے،

کار جھنو شاد ھو چے شے رود ے تار گوتی ؟
دانب نندینی آمی رکھو کول بدھو - '

ترجمہ :- اے بستی تونے کیا کہا ؟ جب پہاڑی گھر چھوڑ کر
ندی سمندر سے ملنے کا ارادہ کرے باھر آئے گی
تو کس ہی یہ مجال ہے کہ اُس کی راہ روک سکے
میں دیو کی بچی (دیوی) ھوں مجھے خاندان کی بہو بنا کر رکھو

اس اقتباس میں ہمیں یہ معلوم ھوتا ہے کہ " پر میلا " اپنا مقصد اور اس مقصد کی تکمیل کیلئے تمام تر رکاوٹوں کو پامال کرتی ھوئی آگے بڑھنے کا خیال ظاھر کرتی ہے -

ھومر کی تمثیلات میں صرف صنائع لفظی کا گورکھہ دھندا نہیں ہے بلکہ وہ حرکات و افعال یا کردار کی بھی تصویر کشی کرتا ہے - اس میں خاص اسماء سے تشبیہ زیادہ ہے - اس طرح کی ڈرامائی تشبیہات مائکل کے یہاں بھی بہت کثرت سے ملتی ھیں - ھومر کی نظموں میں خاص طور پر شیر اور آگ کی تمثیلات ملتی ھیں - اسی طرح مائکل کی نظموں میں یہ دونوں تشبیہیں خصوصیت کے ساتھ باربار آتی ھیں - مثلاً ایک جگہ وہ فرماتےھیں :-

" اگنی ملے چکھو جتھا ھر جکھو شر شے
کر مترِی بھیم د نتو پڑے لبھو دیا
بر پشو اسکندھے ' رام چندر و اکرو مہلار نے کمارے -

ترجمہ :— جس طرح آگ جیسی دہکتی ہوئی آنکھوں والا شیر دانت کٹکٹاتے ہوئے ایک سانڈ کے کندھے پر جست کر کے جھپٹتا ہے اُسی طرح رام چندر نے میدان جنگ میں کمار پر حملہ کیا۔

اس اقتباس میں رام چندر کے حملے کا ذکر کیا گیا ہے اور جس طرح شیر کسی سانڈ کی گردن پر انتہائی جوش اور غضب کے ساتھ حملہ کرتا ہے اُسی سے رام چندر کے حملے کو تشبیہ دی گئی ہے۔

شتو شتو ھینو جودھ ہستواے شمرے

جتھا جبے پرو بیش ہوئے اگنی بی پی نے

بو لیھشانر، تبنگو تر موھی روہو بوہو

پوری بھشو راشی شبے گھور دابا نلے

ترجمہ : اس لڑائی میں بڑے بڑے بہادر ہزاروں کی تعداد میں اس طرح ختم ہوگئے جیسے ایک جنگل میں سخت آگ لگنے سے بڑے بڑے درخت جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔

یہ تشبیہات دور ازکار نہیں ہیں اور سامع یا قاری کو ان کے سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی۔ اسی طرح شاعر نے خود ہی اپنی مستعملہ تشبیہات کو مشرح صورت میں پیش کیا ہے۔ اس طرح کی ڈرامائی رواں تشبیہات کو ہومری تشبیہات Homeric Similees کہتے ہیں۔ تشبیہات کے استعمال میں مدھو شودن نے اکثر و بیشتر ہومر کا تتبع کیا ہے۔ ہم اس کے ثبوت میں

میگھناد بودھ کے ایسے بے شمار ٹکڑے پیش کر سکتے ہیں جنمیں انھوں نے شعر اور آگ وغیرہ کو تمثیلات میں پیش کرکے زور کلام میں اضافہ کیا ہے - یہی تشبیہات ہمیں " اوڈی سی " اور " ایلیڈ " میں بھی جا بجا نظر آتی ہیں - تاہم یہ بات نہیں ہے کہ مدھو شودن نے صرف غیروں سے اخذ ہی کیا ہے بلکہ اپنی ملکی تشبیہات اور وطنی جواہر پاروں کو بھی اچھی طرح استعمال کیا ہے -

ہمیں ان کی تشبیہات میں سنہرے کھیت ، خوشنما پھول ، محنتی کسان ، حیا و شرم ، گھر کی بہو اور گھر کے دیہاتی کاموں کا بھی جابجا اظہار نظر آتا ہے -

سب سے آخر ہم مقاصد حیات اور ان کے پیش کئے ہوئے آدرش سے بحث کریں گے - یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ مدھو شودن نے اپنی کتاب میگھناد بودھ میں راون کا کردار بڑا ہی عظیم الشان دکھایا ہے - ہمیں اس کے پردے میں " ملٹن " کے اثرات کارفرما نظر آتے ہیں - ملٹن کی " پیراڈائز لاسٹ " میں ہمیں جس طرح شیطان غیر مغلوب ذہنیت کا حامل نظر آتا ہے اسی طرح میگھناد بودھ میں راون بھی اپنی بے نہایت طاقت پر مغرور اور مفتخر دکھائی دیتا ہے - اس نے تمام تر روحانی اور مادی طاقتوں کا اولو العزمی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے -

بہت سے لوگ میگھناد بدھ میں لطافت بیان، نزاکت تخیل
اور موسیقیت نوازی کا بھی اعتراف کرتے ہیں اور اس اعتبار سے
وہ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ بنگلا ادب کے گیتوں کا سر میگھناد بودھ
میں ضائع نہیں ہوا ہے - لیکن یہ بات بالکلیہ صحیح نہیں کہی
جا سکتی - ایک مہا کاو میں زور بیان میں اضافے کیلئے بعض
اوقات متصادم اور متضاد تخیلات کے درمیان سے راہ نکالنی پڑتی ہے
اور ہوا کی زد پر شمع روشن کر کے ضیا گیری ہی میں اخذ لطافت
اور طاقت بیان کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے - ایسے مقامات سے میگھناد
بودھ خالی نہیں - اس کتاب کے چوتھے باب میں اشوک بن میں
سیتا سے متعلق جو بزمیہ حالات بیان کئے گئے ہیں اور اس کے
اندر جو رقت آمیز تاثر پایا جاتا ہے اس کا حقیقت میں داستان
رزم اور مہا کاو سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے - تاہم یہ مقام
طبیعت کی شگفتگی میں اضافہ کرتا ہے اور اس مقام کیلئے نامناسب
نہیں معلوم ہوتا - سبب یہ ہے کہ فطرۃً طبیعتیں جنگ پسند
واقع نہیں ہوتی ہیں اور اگر کبھی اس سے دو چار ہونا بھی
پڑتا ہے تو طبیعتیں درمیانی وقفات فرصت کی اس لئے متلاشی
رہتی ہیں کہ رزم سے بزم کی آمیزش ہو سکے - اس طرح کے
بیانات سے رزمیہ ہماھمی میں سکون پیدا کیا جاتا ہے - خود پڑھنے
والے پر یہ تاثر بھی نمایاں کرنے کیلئے کسی قدر معرکۂ جنگ سے

هٹ کر بزم آرائیوں کے سکون کی ضرورت تھی کہ راون نے اپنی قسمت اور تمام دیوتاؤں کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر اپنے عزم اور حوصلے کو کس قدر مستحکم اور بلند رکھا تھا - ایسا رزم و بزم کا اجتماع فارسی رزمیہ نظموں مثلاً شاہنامہ اور سکندر نامہ نیز اردو طویل داستانوں مثلاً داستان امیر حمزہ، بوستان خیال اور طلسم ہوشربا وغیرہ میں جا بجا بکثرت پایا جاتا ہے -

سنہ ۱۸۶۱ و ۶۲ع کا زمانہ مائکل کی ادبی زندگی میں سب سے زیادہ اہم دور ہے - اسی دو سال کے عرصے میں ان کی میگھناد بودھ کابو، کرشنا کماری - ڈراما، بروج انگنا اور بیر انگنا کتابیں شائع ہوئیں - اسی قلیل زمانے میں مغربی ادب کے اثرات یہاں کے ادب پر پوری طرح چھا گئے - بروج انگنا اس تاثر سے متثنی کہی جا سکتی ہے - لیکن اور ساری کتابیں بھرپور طریقے پر مغربی تاثرات سے متاثر ہیں - کرشنا کماری ڈراما یونانی اور انگریزی المیہ کے اصول پر لکھا گیا ہے - بنگلا ادب میں ٹریجڈی پر مشتمل یہ پہلا ڈراما ہے - بروج انگنا میں رادھا اور کرشن کے افسانہائے محبت اور رانکی رنگ رلیوں کی کہانیاں بڑے دلکش انداز کی نظموں میں جمع کی گئی ہیں - مائکل کی تصنیفات میں سے صرف یہی ایک کتاب ایسی ہے جس پر مغربی ادب کا کوئی اثر نہیں پڑا - اس کی تمام تر تخییل اور شاعرانہ تصورات اسی سرزمیں اور یہاں کے

ادب کی پیداوار ہیں - نظم کے اعتبار سے بھی مالکل کا یہ کارنامہ بہت کچھہ کمزوریاں رکھتا ہے - کہیں کہیں چند شعروں کے سوا اکثر و بیشتر اس کتاب میں سست قسم کے تخیلات اور ذہن کو تھکا دینے والے بیانات ملتے ہیں -

رومن شاعر " اووڈ " Ovid کی Hroides (Pudlius Ovidius Nas—43B. C.—17 A. D.) کے طرز پر مالکل نے اپنی نظم نیر انگنا تصنیف کی ہے - اووڈ نے اپنی متذکرہ بالا کتاب میں جس طرح بہت سی ہیروئینوں کے وہ خطوط محبت جمع کئے ہیں جنھیں انھوں نے اپنے شوہروں یا محبت کرنے والوں کے نام لکھے تھے اسی طرح مالکل نے ہندو مشہور افسانوی ہیروئنوں کے خطوط محبت مرتب کئے ہیں جن میں آتش فراق کا التہاب ، جذبات محبت کی کرشمہ زائیاں ، وصل کیلئے اضطراب اور اسی قسم کی کیفیتیں منظوم زبان میں بیان کی ہیں - ان میں سے چند ہیروئنیں یہ ہیں :—

۱ — شکنتلا کا خط دشمنتو کے نام - اس کے ساتھ اووڈ کے اس خط کی مطابقت پائی جاتی ہے جسے پینیلپ Penelope نے یولیسس Ulysses کے نام لکھا تھا -

۲ — تارا کا خط بنام سوم - اس کی مناسبت اووڈ کے خط کے اس حصے سے ہے جس میں فیڈرا Phaedra ہیپولیٹس Hippolytus کے

پاس اپنا پیغام محبت بھیجتی ہے -

۳ - رانی کیکئی کا خط راجا دسرتھ کے نام - اس کی مماثلت اووڈ کے اس خط کے ساتھ ہے جس میں فیلس Phyllis نے ڈیمو Demophone کو مخاطب کیا ہے - بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن میں کوئی مماثلت نہیں نظر آتی ہے - نظم، شستہ الفاظ، ندرت تخییل اور تشبیہات و استعارات کے لحاظ سے بیرانگنا کو مدھو سودن کی سب سے زیادہ کامیاب تصنیف کہا جاسکتا ہے -

مائکل نے اپنے ادبی رخ کی تبدیلی یعنی بنگلا زبان میں اپنے خیالات کے اظہار کی ابتداء سے پانچ سال کے اندر ھی پانچ ڈرامے اور تین منظوم کتابیں مکمل کرلی تھیں - پھر ایک نئے "بھا کابیو" کا خاکہ انھوں نے ذھن میں مرتب کیا تھا جس کی بنیاد واقعات کربلا پر رکھی گئی تھی - لیکن وہ اسے نہ لکھ سکے اسی اثناء میں ان کے والد نے وفات پائی اور سنہ ۱۸۶۲ع میں مدھو سودن راھئی انگلستان ھوئے - ان کا ارادہ تھا کہ وھاں سے بیرسٹر ھوکر واپس آئیں گے - لیکن وھاں ان کے اسراف، شرابخوری اور فیشن پرستی نے انھیں اس حال تک پہنچا دیا کہ فرانس میں انھیں فاقہ کشی کی زندگی بسر کرنی پڑی - اس افلاس اور پریشانی کے زمانے میں مشہور غریب پرور اور علم

دوست فرزند وطن جناب ایشور چندر ودّیا ساگر نے کلکتہ سے ان کے پاس مالی امداد کے ضمن میں رقمیں بھی بھیجی تھیں - بدیس کے دوران قیام میں مائکل نے اپنے وطن کی یاد ' وطنی تہذیب ' ادب و تاریخ اور یاد اسلاف پر مشتمل متعدد فراقیہ نظمیں کہیں - ان نظموں سے پوری طرح وطن پرستی ظاہر ہوتی ہے - مائکل کی یہ نظمیں Sonnet کے طرز پر چودہ مصراعوں پر مشتمل ہیں - سب سے پہلے بنگلا ادب میں ایسی نظموں یا قطعات کے موجد مائکل ہی ہیں - انھوں نے سب سے پہلے ایسے قطعات اطالوی شاعر پٹرارک Ptrarch کی تبعیت میں لکھے تھے - نمونۃً ان کے ایک بنگالی قطعہ Sonnet کے اقتباس کا ترجمہ مع اصل کے ہدیۂ ناظرین ہے -

" ہے بنگو ' بھنڈارے تبو بی بیدھو رتن '
تاشبے ' (ابودھ آمی) ابوہیلا کری '
پرودھن لوبھے متو ' کریتو بھرمن
پرودیشے ' بھکّھا برتی کوکھنے آنچری
کٹائی نو بہودن شکھہ پری ہری -
اند رائے ' نی را ہارے شوبھی کائے من
مجھینوں بی پھل تپسے ابرنے بوری '
کے لی نو شولی بلے ' بھولی کمل کانن

شھنے تبو کو یو لکھی کولے دیلا پرے '

" ارے باچھا ماتری کوشے رتنھر راجی '

اے بھکھاری دشا تبے کیھنو تور آجی ؟

جا پھری اگیان تولی ' جارے پھری گھرے

پالی لم اگیا شکھو ' پسا لھلم کالے

ماتری بھاشا روپے کھنی پورنو منی جالے

ترجمہ :— اے بنگال تیرے خزانے میں بہت سے جواھرات ھیں۔
لیکن میں نے کم عقلی کی وجہ سے ان سب سے
لاپروائی برتی ۔
اور دوسروں کے دھن کے لالچ میں دیوانہ ھوکر
میں نے سفر کیا ۔
اور بدیس میں تھوڑی تھوڑی بھیک جمع
کرنے لگا ۔
عیش و آرام سے دور رھوکر میں نے بہت دن گزارے ۔
میں نے اپنی روح اور اپنے جسم کو بے خوابی اور
بے خوری کی نذر کردیا ۔
نا قابل قبول چیزوں تو قبول کرنے میں مست ھو گیا ۔
کنول کو چھوڑ کر میں صرف مٹی اور کیچڑ سے
کھیلتا رھا ۔

پھر بھی خاندانی لکھی نے مجھے خواب میں یہ بتایا ۔
" اے بچے تیری مادر وطن کے رحم میں تو بہت سے
جواھر پارے ھیں ۔
پھر اے بھکاری تیری آج یہ حالت کیوں ہے ؟
تو ناواقف ہے ' جا اپنے وطن لوٹ جا "
میں نے خوشی سے ان کی ھدایت قبول کی اور
واقعی وقت پر ۔
مجھے مادری زبان کی صورت میں ایک ایسی کان
ملی جو جواھرات سے بھری ھوئی تھی " ۔

سنہ ۱۸۶۷ء میں مائکل وطن واپس آئے اور انھوں نے کلکتے میں بیرسٹری شروع کی ۔ مگر اس میں ناکامیاب رہے ۔ اسراف اور عیش پسندی کی عادت نے انھیں تمام راحتوں سے محروم کر دیا ۔ افلاس بڑھتا گیا ۔ رھائش کیلئے مکان تک نہ مل سکا اور قیام و طعام کیلئے محتاج ھو کر بیماری کی حالت میں انھیں آخر ایک خیراتی شفا خانے میں پناہ ملی جہاں سنہ ۱۸۷۳ء میں مائکل نے اپنے آخری ایام حیات پورے کئے ۔ ان کی ولایتی بیوی انکی وفات سے چند دنوں پہلے ھی انھیں مفارقت کا داغ دے گئی تھیں ۔

آخر عمر میں انھوں نے نثر میں بھی دو کتابیں لکھی تھیں ۔ پہلی " مایا کانن " ڈراما اور دوسری " ھیکٹر بودھ " ۔ مگر یہ دونوں

ان کی پریشان حالی کی آئینہ دار ھیں اور اسی لئے ادبی حیثیت سے گراں پایہ نہیں ھیں -

ابتدائی زندگی میں مدھو شودن نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ میں ایک روشن اور زبردست شہاب کی طرح دنیا میں ظہور کروں گا - ان کی زندگی دیکھ کر ان کے مقولے کی تصدیق ہوتی ھے - واقعۃ وہ ایک شب افروز ستارے کی طرح ظاہر ہوئے اور بنگلا ادب کو روشن کر کے روپوش ہو گئے -

---

حصۂ سویم

آٹھواں باب

انیسویں صدی میں

"مہاکاوی" نظم کا دھارا

ہیم چندر

نبین چندر

کیقباد

اسماعیل حسین سراجی

حامد علی

سید علی احسن ——— مترجم— مولانا عبد الرحمٰن بیخود

آٹھواں باب

انیسویں صدی میں "مہاکابو" نظم کا دھارا

مائیکل کے بعد انیسویں صدی میں جن لوگوں نے "مہاکابو" نظمیں مرتب کرنے کی کوششیں کی تھیں انمیں سب سے نمایاں اور ہیم چندر بندو پادھیا اور نبین چندر سین تھے۔ مہا کابو کا یہ سلسلہ انھی دونوں شعراء پر ختم نہیں ہو گیا۔ اگرچہ ہم انیسویں صدی کے آخر میں "گیتی کا بو" یعنی مختلف اصناف پر مشتمل نظموں کا ایک عظیم الشان سیلاب بنگالی ادب میں دیکھتے ہیں۔ جس نے تمام اصناف نظم کو دبا کر اپنی جگہ سب سے بلند تر حاصل کر لی تاہم اس زمانے میں بلکہ بیسویں صدی میں بھی ہمیں مہا کابو کا دھارا ابلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس دور آخر میں ہمیں کیقباد، حامد علی، اسماعیل حسین سراجی اور جوگیندر ناتھ گپت وغیرہ مہا کابو لکھنے والے شعراء بنگلا ادب کو ترقی دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ہیم چندر بندو پادھائے :— دور حیات سنہ ۱۸۳۸ء سے سنہ ۱۹۰۳ء تک

کچھ لوگ ہیم چندر کو انیسویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا اور سب سے اہم بنگالی زبان کا شاعر بھی مانتے تھے لیکن زمانے کی تبدیلی اور مالکل کے کارناموں کی جدید تحلیل اور تنقید کے بعد دور حاضر میں ہیم چندر کو زیادہ سے زیادہ ایک متوسط درجے کا شاعر ھی مانا جاسکتا ہے - جن اسباب کی بنا پر ہیم چندر نے فروغ حاصل کیا تھا اور انیسویں صدی میں انہیں امتیازی شان حاصل ہوئی تھی انہیں ہم مندرجہ ذیل جملوں میں جمع کر سکتے ہیں -

۱ — انیسویں صدی کی ہندو سماج میں قومیت کا جو تصور پیدا ہوا تھا اُسے ہیم چندر نے بڑے اونچے سروں میں الا پا -

۲ — انیسویں صدی میں ہندوں کے مذہبی معتقدات اور مراسم کی تقلید اور پشت پناہی پر انہوں نے اپنے ادب کی بنیاد ڈالی اور زندگی بھر اپنے اسی آدرش کو اپنائے رہے -

۳ — سنسکرت کی قدیم ہدایات کے مطابق انہوں نے بھی ایک مکمل " مہا کا بو " بنگلا زبان میں منضبط کی -

۴ — مختلف اقسام نظم پر انہوں نے طبع آزمائی کی -

ان کے علاوہ اور بھی ضمنی اسباب تھے جنھیں ہم ان اسباب کی تفصیلات کے ضمن میں بیان کریں گے

ہیم چندر کا قومیاتی تصور جوان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے وہ حقیقت میں وطن اور اہل وطن سے عشق پر مبنی نہ تھا۔ ان کی قوم پرستی ایک محدود درجے کی قوم دوستی کہی جاسکتی ہے۔ قومیت کے صحیح تصور کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ سچا محب وطن انسان وطن کی ہر چیز سے محبت رکھتا ہے۔ اس میں رنگ و نسل کی تفریق، ملت و مسلک کا اختلاف اور کسہ وسہ کا فرق کوئی مقام نہیں رکھتا۔ لیکن ہیم چندر کی قوم پرستی اس معیار پر کسی طرح پوری نہیں اترتی۔ ان کے نزدیک مادر وطن سے مراد ایک ایسا رقبہ ہے جہاں صرف انہی کے ہم مشرب جیتے ہیں اور قوم سے مقصود وہی قوم ہے جس کے وہ خود ایک فرد ہیں۔ ان کی قومیت کے تصور میں غیر ہندو کو باریابی نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ بھی اپنے ابنائے وطن کی آزادی اور حریت پروری کیلئے کہا وہ دراصل ہندو قوم کی آزادی اور اسی قوم کی حریت کیلئے تھا۔ ان کے نزدیک اگر کوئی قوم لائق رحم تھی تو صرف ہندو قوم اور اگر کوئی مظلوم تھا تو صرف ان کی اپنی قوم ہی کا فرد۔ ان کی نگاہ میں صرف ہندو ہی تھا اور اسی لئے وہ صرف اسے ہی دیکھتے ہیں اور اسی کی ہر تکلیف پر وہ مسلمانوں کو مورد

الزام ٹھہراتے ہیں - مسلمان جو درحقیقت پس ماندہ تھے اور ہم ہندوؤں کی نظروں کے سامنے ان کی حکومت اور عظمت خاک میں مل گئی تھی ان سے انھیں کوئی ہمدردی نہ تھی - ان کی وطن دوستی در اصل ایک سیاسی بازی گری تھی جسے ادبی وطن دوستی سے دور کا بھی لگاؤ نہ تھا -

اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے رنگ لال کی طرح انگریز نوازی اور مسلم دشمنی سے بھی دریغ نہیں کیا - ہم ان کی قوم پرستی کو نسل پرستی یا ذات پرستی تو کہہ سکتے ہیں لیکن قوم پرستی نہیں کہہ سکتے - اس ذات پرستی کا نمونہ ہمیں ان کی نظم " بیرباہو " اور " کبیتا بلی " میں اچھی طرح نظر آتا ہے - بیرباہو نظم سنہ ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی تھی - اس نظم کے افسانوی پس منظر کو انھوں نے دیباچۂ نظم میں ظاہر کیا ہے - وہ مختصراً فرماتے ہیں کہ بہت سابق زمانے کے ہندوستان میں ہندوؤں کی شان و شوکت بہت عروج پر تھی اور یہی سبب ہے کہ اسے پھر واپس لانے کی سعی کرنا چاہئے - اپنے مقاصد کی وہ اس طرح توضیح کرتے ہیں کہ زمانہ سابق کے ہندو اپنے وطن کی حفاظت کیلئے اپنی جان اور اپنا مال سب کچھ قربان کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے ایک مفروضہ داستان " بیرباہو کابو "

تصنیف کی ہے - اس نظم میں انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے ہندو مردوں پر بے انتہا مظالم کئے تھے اور بے شمار ہندو عورتوں کی بے عزتی کی تھی اس لئے ہندوؤں کو بحیثیت قوم یہ چاہئے کہ وہ مسلمانوں کو ختم کردیں - اسی سلسلے میں وہ من گھڑت قصے ایجاد کرتے ہیں کہ ایک مسلمان بادشاہ بہت ہی عیش پرست تھا - وہ ہندوؤں پر بے جا مظالم کرتا اسلئے سب ہندوؤں نے مل کر اُسے ختم کر دیا - اس قصے کے ذریعہ سے انھوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف صف آرا کرنے کی کوشش کی ہے -

ہیم چندر کی کبیتا بلی ' سنہ ۱۸۷۰ع میں شائع ہوئی - اس مجموعہ میں مختلف قسم کی نظمیں ہیں - اس کی ایک نظم " بھارت سنگیت " میں بھی جو سنہ ۱۸۶۹ میں لکھی گئی تھی انھوں نے بیر بلھو کی اسپرٹ پیدا کی ہے - اس نظم میں وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے ہندو کسی زمانے میں بہت ترقی یافتہ تھے - پھر وہ مسلمانوں کے دست نگر اور غلام ہو گئے - اس تنزل پر وہ شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں -

" دھیک ہندو کولے بیر دھرمو بھولے

اتمو ابھی مان دوبسائے شولی لے

دیباچہ شبھا شترو کرو تلے

شونار بھارت کری تے چھار"

تف ہے ہندو خاندانوں پر کہ بھروں اور بہادروں کا دھرم بھول کر انھوں نے اپنے دائمی فخر و مباہات کو پانی میں غرق کر دیا اور دشمنوں کے ہاتھوں میں سونے کے بھارت کو اسلئے سونپ دیا نہ وہ جل کر خاک ہو جائے -

ایک دوسرے موقعے پر وہ ہندوؤں کے تنزل واد بارکے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سابق زمانے کے ہندوستان میں مذھبی کتابوں کا چرچا تھا - "شٹرو درشن" چھہ درشنوں کی شہرت تھی - یہاں کے وید کو دنیا کے انسان پڑھتے اور اس کا احترام کرتے تھے - اس زمانے میں "جے مینی ، گرگ اور پتنجلی ' نے مذھبی معتقدات کی تبلیغ کی تھی اور اس زمانے میں ہندو قوم ایسی نہ تھی کہ لوگ اس سے نفرت کا اظہار کرتے - لیکن آج وہ باتیں ختم ہو گئیں - ہندوؤں نے اسے فراموش کر دیا - ان کی آزادی ختم ہو گئی - ان کا وجود صرف اس لئے باقی ہے کہ ان کے تصورات میں ابتک وہ قدیم ایام زندہ ھیں - اور اس لئے آج یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے قدیم آریائی دھیان اور گیان کے ساتھ ساتھ مغربی اسلحہ بندی اور اسلحہ سازی کے علوم سے بھی اپنے دامنوں کو بھر لیں - انھوں نے رنگ لال کی طرح سستی

انگریز پرستی کے نغموں کا سر بھی اچھی طرح الاپا ہے۔
انگریزوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں :—

نا تھاکی لے اے ای انگراج * بھارت ارنّو آج
کے دیکھاتو کے شیکھاتو * کے باپتھے لوئے جیتو
جے پتھہ انیک دن کرے چھو برجن "

ترجمہ : اگر یہ انگریز نہ ہوتے تو آج بھارت ایک جنگل بن جاتا۔ کون دکھاتا اور کون سکھاتا یا کون اس راستے پر لے جاتا جس راستے کو تم بہت دنوں سے چھوڑ بیٹھے تھے۔

جہاں تک مذہبی معتقدات پر ان کے ادب کی بنیاد کا تعلق ہے اس کے متعلق یہی کہنا کافی ہے کہ ان کی اول ترین کتاب " چنتا ترنگھنی" تھی جو سنہ ۱۸۶۱ع میں شائع ہوئی تھی - اس میں انھوں نے برھمو سماج کے اصول سے متاثر ہو کر لکھا تھا کہ انسان کمزوریوں کی وجہ سے دیوتاؤں کی پوجا کرتا ہے اور نیرنجن یعنی خدا کی مٹی کی صورت بنا کر پوجا کرتا ہے - اگر وہ بیرونی دنیا کی خوبیاں دیکھے اور انھیں دیکھ کر خدا کو یاد کرنا چاہے تو وہ آخر میں شیو، درگا اور کالی وغیرہ کو بھول جائے گا اور صرف " نرنجن " یعنی خدا ھی کا نام جپے گا

لیکن زمانۂ مابعد میں ھیم چندر نے خود ھی اپنے اُن معتقدات کو خیرباد کہہ دیا۔ انھوں نے اپنی کتاب کبیتا بلی کی

" گنگا رأت پتی " (معدن گنگا) اور " بشیشر ر آرتی " (بشیشر کی پوجا) وغیرہ نظموں میں قدامت پسند هندؤں جیسے معتقدات کا اظہار کیا ھے - اس میں شک نہیں کہ مذهبی معتقدات کے ساتھ ساتھ انسانیت کی مسرتیں اور عروج انسانی کا تذکرہ بھی ان کی نظموں میں پایا جاتا ھے - مرتاض رشیوں کے متعلق هیم چندر فرماتے هیں کہ ان کی ساری شاقہ ریاضتیں دراصل بنی نوع انسان کی بھلائی اور ترقی کیلئے ھی ھوتی تھیں - هیم چندر کی " چھا مولی " نظم سنہ ۱۸۸۰ع میں شائع ھوئی تھی - اس میں وہ سناتنی هندؤں کے تصور آخرت اور نتائج معاصی کے پورے پورے معتقد نظر آتے هیں - انھوں نے اپنی نظم " دس مہا بدیا " (دنیا کے دس بڑے علوم) میں هندؤں کی معتقدہ دس دیویوں کا اس طرح تعارف کرایا ھے کہ نارومنی نے مہادیو سے دریافت کیا کہ ابتدائی طاقت یعنی تخلیق عالم کے اسباب (ازل) اور اس کی انتہائی منزل یعنی آخرت (ابد) کیا ھے - نیز یہ کہ مہامایا یعنی مہادیو کی بیوی اُوما مرنے کے بعد کس کس روپ میں اس دنیا میں موجود رهتی هیں - اس کے جواب میں مہادیو نے دس طاقتوں کا تذکرہ کیا ھے جن کے روپ میں مہامایا براجمان هیں - پھر ازل و ابد کا راز بھی بتلایا ھے - اس نظم میں هم

ہیم چندر کے قدیم اندھے ہندوانہ معتقدات کا عریاں مطالعہ کرسکتے ہیں ۔

تعجب ہوتا ہے کہ جس ہیم چندر نے اپنی سب سے پہلی تصنیف " چنتا ترنگینی" (موج خیال) (سنہ ۱۸۶۱ع) میں مباحث عقلیہ کی رو سے وجود انسان کا مفہوم سمجھنے اور ظاہر کرنے کی کوششیں کی تھیں وہی دش مہابدیا میں اپنی آنکھیں اور کان بند کرکے خالص ہندوانہ اندھی تقلید کا اظہار اور ناقابل قبول معتقدات کا پرچار کرتے ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہیم چندر نے اپنے مذہبی معتقدات کی نمایاں کمزوریاں دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی میزان عقل پر کس کر اسے خیرباد کہنے کی جرأت نہیں کی - ہم اسے حقیقت پسندی سے تعبیر نہیں کرسکتے - واقعہ یہ ہے کہ اس دور کے نوزائیدہ برھمو سماج مت کی تشریحات اور انگریزی تعلیم کے اثرات کی بنا پر ہم انمیں کسی حد تک اصلاحی تصورات اور صحت سے قریب تر آزاد نظریات کا مشاہدہ ضرور کرتے ہیں لیکن اس میں استقلال نہیں ہے - یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہیم چندر کے بیان کردہ معارف کے مقابلے میں ان کی مذکورہ بالا کتاب بڑی بے حقیقت سی نظر آتی ہے -

ہمیں نظموں میں ہیم چندر کا مذہبی احساس سب سے پہلے
اور سب سے نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ "گنگارات پتّی" اور
"بشیشر آرتی" میں ہیم چندر نے سناتن دھرم کے معتقدات کا
عقیدت مندانہ طور پر اظہار کیا ہے۔ اس میں ہمیں یہ بھی نظر
آتا ہے کہ وہ ہندوانہ مراسم معاشرت اور رسوم عبادت سے اپنا گہرا ربط
بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ انھوں نے ان مراسم و
معتقدات کی اپنے خیال کے مطابق جدید تشریحات بھی کی ہیں۔
"گنگارات پتّی" میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ رشیوں نے اپنی
ریاضتوں کی وجہ سے یا برہما سے تعلق حقیقی پیدا کر کے انسانی
روپ حاصل کیا ہے اور وہ دوسرے انسانوں کے قلوب میں بھی
اس طرح متمکن ہو جاتے ہیں کہ انہیں ہر طرح کے فائدے پہنچایا
کرتے ہیں۔ لیکن شاعر نے کہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ کسی طرح
فلاح انسانیت اور مفاد انسانی کی نگہبانی کرتے ہیں۔ تسکین
نفس اور اطمینان خاطر کےلئے شاعر کو یہ کہنا پڑتا ہے۔ لیکن ان میں
اس ہمت کا فقدان ہے کہ وہ سناتنی اصولوں سے نفرت یا بے تعلقی کا
اظہار کریں کیونکہ وہ خود ہی ان اصولوں کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔
مگر حیرت یہ ہے کہ جدید تعلیمی رجحانات اور آزادانہ خیالات سے
بھی وہ اپنا رشتہ جوڑے رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لئے انہیں
اس بات کی کوشش کرنی پڑتی ہے کہ اپنے کورانہ معتقدات میں

دلائل کے ذریعہ سے جان پیدا کریں - لیکن وہ اس کوشش میں بری طرح نا کامیاب ہوئے ہیں - سنہ ۱۸۹۰ع میں ہیم چندر نے اپنی کتاب "چھایا موئی" شائع کی اور آخرت یا حیات بعد الممات کے متعلق ان کے جو دلی جذبات یا معتقدات ہیں انہیں الفاظ کا جامہ پنہا کر سامنے لانے کی کوشش کی ہے - وہ یہاں عریاں طور پر ایک سناتنی ہندو نظر آتے ہیں - اسی طرح وہ اپنی کتاب "دس مہابدیا" میں بھی پکے سناتنی ہی دکھائی دیتے ہیں - بہر حال نظریات جدید و قدیم کی کشمکش ان کے ہر ہر لفظ سے نمایاں نظر آتی ہے لیکن تحقیق حق اور تفتیش صداقت کا جذبہ بالکل مفقود ہوکر صرف اندھے اعتقاد اور کورانہ تقلید کی چار دیواریوں میں محدود ہو گیا ہے -

ہیم چندر نے سنسکرت کے قدیم اصول کا تتبع کر کے ایک ضخیم اور عظیم مہاکابو بنام "برتّر و شنگہار" بھی مرتب کی تھی - یہ کتاب سنہ ۱۸۷۵ع میں حلیہ طبع سے آراستہ ہوکر منظرعام پر آئی تھی - مہابھارت کے درمیان "بن پربو" (جنگل کا باب) سے ہلاکت اعدا کی داستانوں کو ماخذ بناکر ہیم چندر نے اپنی یہ مہاکابو مرتب کی ہے - اس میں شاعر نے جابجا زندگی کے ایک مخصوص آدرش کو بھی اجاگر کیا ہے - وہ آدرش یہ ہے کہ جدو جہد کرنے والے کو ضرور ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے اور

جو شخص حصول مقصد کیلے جدو جہد نہیں کرتا وہ کبھی بھی کامیابی سے ھمکنار نہیں ہوتا - لیکن اس کتاب میں شاعر نے جس جدو جہد کی تشریح کی ہے - اس سے زندگی سو کوئی بھی علاقہ نہیں ہے - وہ بیان کرتے ھیں کہ اندونے قطب جنوبی کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر سخت ریاضت کی - یہ ایسی ریاضت تھی جس کا زندگی اور دنیا کے ساتھ ایک ھمہ گیر تعلق تھا - کسی دوسری جگہ " دوھی چی مُونی " بڑی ایک پہاڑ کے غار میں عبادت و ریاضت میں مشغول تھے - ان دونوں حالات میں ھمیں زندگی کے عملی اسالیب کے متعلق کوئی واضح نشان کہیں بھی نظر نہیں آتا - اور یہی سبب ہے کہ ھمیں ان ریاضتوں کی اصلی قدر و قیمت متعین کرنے کی صورت بھی نظر نہیں آتی - مائکل کی " میگھناد بودھ " میں ھمیں جو زور بیان اور جدو جہد حیات نظر آتی ہے اس سے مقابلہ کرنے پر ھیم چندر کی نظم بہت ھی پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے - ھیم چندر سنسکرت کے تمام اصول بیان وصنائع کی تکمیل میں کوشاں ضرور نظر آتے ہیں لیکن جس طرح یہ حقیقت ہے کہ نظم کے تمام اجسام ظاھری یعنی الفاظ کی تکمیل کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام اجزا مناسب ہوں اسی طرح اُس میں روح اور جان پیدا کرنا بھی ضروری ہے - ھیم چندر کی

نظم میں مختلف آدرشوں کا اجتماع اور اختلاط نظر آتا ہے لیکن وہ ان میں تناسب اور ربط برقرار نہ رکھ سکے - ان کے استعمال الفاظ، بندش، استعارات، تشبیہات اور تمثیلات میں ہمیں بہت ساری خامیاں دکھائی دیتی ہیں - ایک مہا کابو کیلئے جس حد تک تعجب خیزی، ندرت، جوش روح اور پر زور زبان کی ضرورت ہے اس کا ہمیں "برترو شنگھار" میں کہیں بھی پتہ نہیں ملتا - اس کتاب کی زبان مغلق اور بے جان معلوم ہوتی ہے اور اُس کی تشبیہات وغیرہ بڑی خامیاں رکھتی ہیں -

ہیم چندر کی تشبیہات اکثر و بیشتر مقامات پر بڑی سطحی اور معمولی ہیں - ان میں ندرت کا کہیں پتہ بھی نہیں ملتا - عموماً انھوں نے کسی پر جوش یا متحرک چیز کا اس کے مماثل کسی چیز سے مقابلہ نہیں کیا ہے - ترتیب واقعات میں ڈرامائی طرز اور اظہار خیال میں ایسا انداز کہ وہ واقعات کی جیتی جاگتی تصویر لا کھڑی کر سکے ہمیں جس قدر وافر اور موثر طور پر مائکل کے یہاں ملتا ہے ویسا انیسویں صدی کے کسی بنگالی مصنف کے یہاں نظر نہیں آتا - مدھو شودن نے مماثل چیزوں میں تشبیہات قائم کی ہیں - انھوں نے زور میں تطابق باقی رکھا ہے - خونی مناظر کے بیان میں جس آتش بیانی کی ضرورت ہے اسی کو شروع سے آخر تک قائم رکھا ہے - ان کے کلام میں شہر

کی جھنکار' آگ کی ہلاکت خیزی اور اسی قسم کی تمثیلات زور کلام میں اضافہ کرتی ہیں ۔ لیکن ہیم چندر نے عموماً سطحی اور ظاہری چیزوں کی مماثلت اور ان سے تشبیہات کا کام لینے ہی میں اپنا کمال سمجھا ہے ۔ مثلاً انھوں نے سیاہی کو تاریکی سے تشبیہ دیا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کے بیان نے ہیم چندر میں کہیں کہیں فطری آمد اور واقعی روانی بھی پیدا کر دی ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ صنائع کی تخلیق میں آمد مفقود ہے بلکہ آورد کا دخل زیادہ معلوم ہوتا ہے ۔

جس مہاکابو یا ڈرامے کا اختتام فراق پر ہوا ہے اُس کے ہیرو یا ہیروئن کے ساتھ ہیم چندر نے ہمدردی اور رحم و کرم کے دریا بہائے ہیں ۔ یہاں تک کہ بار بار اور مختلف طور پر اظہار ہمدردی کرکے انھوں نے قارئین کتاب سے بھی خراج ہمدردی حاصل کرنا چاہا ہے

یونانی المیہ افسانوں کا بھی یہی حال ہے ۔ ہیم چندر کی کتاب " برتر و شنگھار " بھی اس اصول پر پوری اترتی ہے ۔ کتاب کے خاتمے تک یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اب یہ کتاب ختم ہو رہی ہے ۔ ملٹن نے جیسے یہ کہا ہے Calm of mind all passions spent ہمیں ان کی اس کتاب میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا ۔

ہیم چندر نے غیر ملکی ادب کی تبعیت میں بنگلا زبان کے اندر بھی " آشا کانن " نامی ایک ڈرامائی نظم لکھی تھی ۔ اس

طرح " دانتے " کی Divine comedy پر اساس رکھ کر ایک نظم " چھایا موئی " مرتب کی تھی - انھوں نے شیکسپیر کے دو ڈرامے بھی بنگلا زبان میں منتقل کئے تھے - " رومیو جولیٹ اور تمپسٹ " موخرالذکر کا نام انھوں نے بنگلا میں " نلینی بسنتو " رکھا تھا -

هیم چندر نے اپنی آخر عمر میں بہت تکلیفیں بھی اٹھائی تھیں - ان کی قوت بصارت نے جواب دے دیا اور وہ بالکل اندھے ہوگئے تھے - اپنی اس حالت کا بیان انھوں نے اپنی کتاب چتّو بیکاش (اظہار ضمیر) میں کیا ہے - یہ کتاب سنہ ۱۸۹۸ع میں شائع ہوئی تھی - انھیں مالی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا -

هیم چندر کے متعلق ایک ہی بات کہی جاسکتی ہے کہ ان میں خلوص اور شاعرانہ جذبات تھے ' لیکن تصور و تخیل میں وسعت کی کمی اور اظہار بیان میں ندرت کا فقدان تھا کیونکہ شاعرانہ کمال کیلئے جس سعی مسلسل اور جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے اس میں کمی تھی اور یہی سبب ہے کہ جس مقام کے وہ متمنی تھے وہ مقام انھیں حاصل نہ ہوسکا -

---

نبین چندر سین :— سنہ ۱۸۴۷ تا سنہ ۱۹۰۹ء

اپنی زندگی میں نبین چندر سین نے بھی ھیم چندر ھی کی طرح شہرت حاصل کی تھی - ان کی حصول شہرت کے اسباب مندرجہ ذیل متعین کئے جاسکتے ھیں :

۱ — نام نہاد وطن دوستی -

۲ - قدیم ھندو مذھب اور تہذیب کے دوبارہ احیاء کی کوشش و آرزو -

۳ — عام پسند، دلکش اور آسان عوامی الفاظ کا خوبی سے استعمال -

نبین چندر نے متعدد منظوم کتابیں لکھیں - ان میں قابل ذکر " پلاشیر جُدّھو " اور " روئی بتک، پورو کھیتر و اور پرو بھاش تین کتابوں کے مجموعہ سے ایک مہا کابو ھے - ان کے علاوہ اور بھی ان کی متعدد تصنیفات مثلاً " ابوکاش رنجینی " (عیش فرصت) رنگومتی (ایک منظوم افسانہ) ، کھرشٹو (حضرت عیسیٰ ؑ) ، امی تا آبھو " (مہا تھا گوتم بودھ) آمریتا ابھو (شری چیتنہ) و غیرہ ھیں - بعض تحریرات سے معلوم ھوتا ھے کہ اکادرین کی سوانح کے سلسلے میں ان کا ارادہ تھا کہ حضرت محمد ؐ کی سوانح بھی وہ بنگلا میں منظوم کریں لیکن شاید انھیں فرصت میسر نہ آسکی -

نبین چندر سین نے نثر کی پانچ جلدوں میں خود اپنی سوانح حیات بھی لکھی تھی - یہ بہت دلچسپ ہے اور اس کے پڑھنے سے اس زمانے کی ادبی فضا اور تاریخی حالات کا اندازہ ہوتا ہے -

ہیم چندر اور نبین چندر میں عام طور پر یہ فرق ہے کہ جہاں ہیم چندر نے ایک ماہر آرٹسٹ نہ ہوکر بھی اچھے مقاصد کے بیان میں خلوص کا اظہار کیا ہے وہاں نبین چندر نے صرف عام اور دلکش انداز میں اپنے شاعرانہ محاسن اور لفظی خوبیوں ہی کی نمائش کی ہے ہیم چندر نے " بھارت بھکّھا " اور " بھارت بلاپ " نظمیں لکھی ہیں - وہ شاعرانہ محاسن کے اعتبار سے بہت بلند پایہ نہ ہو کر بھی جذبات اور طرز ادا کی رو سے ان کے خلوص اور محبت وطن کی کسی حد تک آئینہ دار ہیں - لیکن نبین چندر سین کی " بھارت اُچھاش " میں صرف انگریز پرستی ظاہر ہوتی ہے اور مخلصانہ وطن پرستی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے - شاید اسی لئے انھوں نے انگریزی حکومت کی طرف سے بطور صلہ پچاس گنی کا انعام بھی حاصل کیا تھا -

" ابو کاش رنجینی " نبین چندر سین کی نظموں کا مجموعہ ہے - اس کتاب کے ذریعہ ہمیں نبین چندر سے پوری واقفیت حاصل نہیں ہوتی - اس کتاب کی نظموں میں سطحی طور پر غم فراق کی سوز آفرینیوں کے سوا گہرے جذبات غم یا عشق و محبت کی

اصلی تخییل کا کہیں بھی پتہ نہیں ہے - " پتی پر ہمے دکھینی کامھنی" (شوہر کے غم کی ماری کا مینی) ' " پتری ہین جو بک " (بے باپ کا لڑکا) وغیرہ نظموں میں غیر فطری تخیلات کا اظہار ہے اور اسی لئے نہ تو وہ دلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں اور نہ دوسروں پر اپیل کرتیں - غم کی اپیل کا ہم نبین چندر سین سے توقع بھی نہیں کر سکتے - کیونکہ یہ نظمیں شاعر کی ابتدائے عمر کی کوششوں کا ماحصل ہیں - ان کی بندشیں سست ہیں ' صنائع لفظی ومعنوی کا فقدان ہے اور تشبیہات واستعارات بے محل اور غیر فطری ہیں - انہوں نے " بنگو درشن " (بیساکھ سنہ ۱۲۸۰ع بنگلا) میں ان نظموں کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ان میں دلی جذبات کے متعلق صرف اشارات پائے جاتے ہیں -

نبین چندر سین کی مفروضہ وطن دوستی کے نقوش ہمیں ان کی منظوم کتاب " بھارت اُچّھاش " اور " پلا شیر جدھو " میں ملتے ہیں - " بھارت اُچھاش " میں صرف انگریز پرستی ظاہر ہوتی ہے اور مخلصانہ وطن پرستی کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ہے - انہوں نے اپنی اس کتاب میں صرف انگریزوں کے گن گائے ہیں اور ہندوستان میں انگریزوں کی نو قائم شدہ اظہار تشکر کیا ہے - ہیم چندر نے اپنی کتاب

" بھارت بیلاپ " میں دلی درد اور خلوص کا اظہار کیا ہے مگر انھوں نے بغیر سوچے سمجھے انگریزی پرنس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملائے ہیں - البتہ نبن چندر سین میں چونکہ کسی طرح کا اصلاحی جذبہ نہ تھا اسلئے انھوں نے بے تکلف انگریزوں کی تعریف میں اپنا پورا زور قلم صرف کیا ہے - اور یہی سبب ہے کہ ان کی نظموں نے قوم کی قسمت کے متعلق کسی گہرے خیال کا نشان نہیں بتایا - ہمیں ان کی نظموں سے صرف اتناهی پتہ چلتا ہے کہ حکمرانوں کی مداحی اور طاقت والوں کی خوشامد هی ان کا مقصد تھا -

سنہ ۱۸۷۷ع میں نبین چندر سین کی کتاب " پلاشیر جُدّھو " وجود میں آئی - همیں اس کے تفصیلی مقدمے میں نبین چندر سین کی وطن دوستی کا کچھ تذکرہ نظر آتا ہے - رنگ لال نے هیم چندر کی وطن دوستی کا قصہ بیان کرتے ہوئے غلامی کے غم پر غیر مرئی طور پر اپنے قلبی جوش کا اظہار کیا ہے - لیکن نبین چندر سین نے اسے سب سے پہلے محسوس کرانے کی کوشش کی ہے - رنگ لال کی کتاب " پدنی " اور هیم چندر کی کتاب " بیر باهو " کے ذریعہ سب سے پہلے وطن پرستی کے جذبات ظاهر ہوئے - ان کتابوں میں مذکورہ شعراء نے وطن کی محبت کو عاقلانہ طور پر ظاهر کرنے کی کوشش کی ہے اور انهی منظوم کتابوں هی میں

سب سے پہلے انگریز حکمرانوں کی آمد کا ذکر کیا گیا ہے - ان کتابوں میں لارڈ کلایو کو انصاف پسند ' ترقی یافتہ اور طاقتور ظاہر کیا گیا ہے - انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کی تعریف اور یاد دھانی اور علی وردی خان کی پیشینگوئیاں نیز زمانے کی گردش اور قسمت کی تبدیلی کو تسلیم کرتے ہوئے قسمت پر شاکر و صابر رہنے اور انگریزوں کی فتح پر خوشیاں منانے کا مبسوط تذکرہ ہے - اس معاملے میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بنگالی ہندؤں کے خیال کے مطابق حکومتوں کی تبدیلیوں سے ملک کی آزادی یا غلامی پر کوئی اثر نہیں پڑتا - وہ صرف اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں کہ سماجی زندگی میں کوئی تبدیلی اور تغیر پیدا نہ ہو - انہوں نے اس حقیقت کو فراموش کر دیا تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کی حکومتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا - انگریز بہر حال غیر ملکی تھے اور مسلمان اس ملک کے باشندے اور اسی مادر وطن کے فرزند تھے - نبین چندر سین کے خیال میں ان کے ہم وطن مسلمان ہر طرح ظالم و قصوروار تھے مگر انگریز بڑے منصف مزاج اور ظلم کو ختم کرنے والے تھے - " پلاشیر جدھو " میں نبین چندر سین نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ ہم اس ملک کے ظالم مسلمانوں اور ان کے حکمراں کی امداد نہیں کرینگے بلکہ منصف مزاج غیر ملکی انگریزوں کو زیادہ پسند

کرتے ہوئے ان کی حمایت کرینگے - وہ انگریزوں کی فتح کو فال نیک سمجھتے ہوئے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی فتح در حقیقت ظلم کے مقابلے میں انصاف کی فتح ہے - شروع سے آخر تک انھوں نے اپنے انھیں جذبات کا اظہار کیا ہے - ہاں کہیں کہیں انھوں نے اثنائے واقعات میں مسلمانوں کی بد نصیبی اور حکومت سے محرومی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کو بہادر اور وطن دوست بھی لکھا ہے -

نبین چندر سین کی ایک منظوم داستان (مہا کابو) جو مذہبی جوش سے مملو ہے بنام " تروئی کابو " ہمارے پیش نظر ہے - یہ حقیقت میں تین کتابوں کا مجموعہ ہے جسے " روئی بتک " ، کروکھیترو اور پربھاش " کے نام سے ہم علحدہ علحدہ بھی موجود پاتے ہیں - اس " تروئی کابو " میں نبین چندر نے بہ یک وقت مذہب اور قومیت کا معجون مرکب پیش کیا ہے - یہاں ہمیں ان کی مذہبیت اور قومیت ہم آہنگ نظر آتی ہے کیونکہ ہندؤں کے مذہبی حکومت کے قیام کا تصور ان کی تخییل قومیت سے چولی دامن کا ساتھ رکھتا ہے - ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مذہبی حکومت کے قیام کا خواب ہی در اصل ایک مفروضہ قومیت کے تصور کا موجد ہے - ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب نے اپنی

اپنی مستقل حیثیت برقرار رکھی ہے نبین چندر نے صرف ایک قوم اور ایک بھگوان کے قیام کا خواب دیکھا تھا ۔ ان کے خواب میں قوم سے مراد صرف ہندو' مذہب سے مقصود ہندو مذہب اور بھگوان کا مفہوم سری کرشن ہی ہیں ۔ گیتا میں سری کرشن کے متعلق یہ اشارات پائے جاتے ہیں کہ جب زمین گناہوں کے بوجھ سے مجروح ہو جائے گی اس وقت سری کرشن انسانی روپ میں نیا جنم لے کر اپنا درشن دکھائیں گے - ان تصورات ہی پر مختلف ادوار کی نقشہ کشی ان کی نظموں میں موجود پائی جاتی ہے ۔ بعض لوگوں نے نبین چندر کی اس مہاکابو کو انیسویں صدی کی مہابھارت کا نام بھی دیا ہے ۔ بنکم چندر اس جدید مہابھارت کی نفع بخشی کے متعلق بہت مشکوک تھے ۔

نبین چندر سین کے جذبہ قومیت کی نشانیاں اُن کی دوسری تصانیف " چنڈی ' گیتا کا ترجمہ اور چیتنّو کابو " میں ملتی ہیں ۔ چیتنو کے متعلق نبین سین اپنی تصنیف مکمل نہ کر سکے تھے ۔ ان کی اس خواہش کا بھی پتہ ملتا ہے کہ وہ تمام مذاہب کے اکابر اور پیشواؤں کے متعلق نظمیں منضبط کرنا چاہتے تھے ۔ حضرت عیسیٰ اور گوتم بودھ کے احوال زندگی پر مشتمل دو نظمیں بنام " کھرشٹو " اور " امی تابھو " انھوں نے مرتب کی تھیں یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ حضرت

محمد ﷺ کے متعلق بھی وہ ایک نظم لکھنا چاہتے تھے -

" ترولس کا بو " میں دوسرے مہاکاسو کی طرح ضخامت اور وسعت موجود ہے - کردار اور تخییل میں بھی مسلمہ مہاکابو جیسی مفید صفات اور طرز ادا میں قوت بیان موجود ہے - لیکن استعمال الفاظ ، تمثیلات ، تشبیہات ، و استعارات یعنی شاعرانہ محاسن میں انہوں نے کسی عظمت کا ثبوت نہیں دیا ہے -

نبھن سین کا طرز تحریر ، اصول نظم نگاری اور مکالمات وغیرہ کی توضیح سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلوب نگارش یعنی style کی حقیقت کیا ہے - جن اصول کی تبیعت میں الفاظ کے مجموعے مصرعے اور نظمیں مرتب کی جاتی ہیں ان کے محاسن ، مناسب استعمال اور خصوصیات ھی کو طرز یا style کہتے ہیں -

علم نفسیات یا فلسفے کی کتابوں کے ذریعہ ہماری تشریحات واضح ہوتی ہیں اور ہم دلائل کے ذریعہ اپنے مقاصد کو ثابت کر سکتے ہیں - لیکن نظم میں ہم صرف یہی معلوم کر سکتے ہیں کہ صنائع لفظی اور محاسن ظاہری کس قدر اور کس طرح پیدا کئے جا سکے ہیں - اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے انتخاب الفاظ پر نظر رکھنا پڑتا ہے - شعرا ہمیشہ ہمارے روز مرہ کے اقوال اور مستعمل الفاظ ھی کو اپنے تخیلات کے ظاہر کرنے کیلئے منتخب کیا کرتے ہیں - اس طرح یہ الفاظ جس طور پر شاعرانہ ندرت پیدا

کرتے ہیں اس طرح عوام سے تقرب کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ نبین چندر سین نے عوامی تخیلات اور انہیں اپیل کرنے والے جذبات ہی پر سہل پسندی کے ساتھ اچھے کلام کی بنیاد رکھی لیکن انہوں نے یہ محسوس نہ کیا کہ الفاظ اور ترکیبات کا ایسا انتخاب ضروری ہے جو تخیلات کا ہم آہنگ ہو سکے ۔ یہ بات مدھو شودن میں حیرتناک طور پر موجود ہے لیکن نبین چندر میں اس کا فقدان ہے ۔

دوسری قابل لحاظ بات ترتیب الفاظ ہے ۔ محاسن نظم کو بعض لوگوں نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا صفت عکاسی یا صفت نقل ۔ مکالمات یا ڈرامائی ادب بھی اسی صفت میں داخل ہے ۔ دوسرا حصہ سنگیت اور جوش پیدا کرنے والی منظومات کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ۔ طرز خاص یا Pattern کا اظہار اسی میں ہوتا ہے ۔ منظومات میں ایک صناع خشک الفاظ کو حسن ترتیب سے مرصع جال کی صورت میں پیش کرتا ہے ۔ یہی حسن ترتیب چھوٹے چھوٹے اجزائے کلام کو ایک کامیاب تصنیف کا درجہ عطا کرتا ہے ۔ ہمیں نبین چندر سین میں اس کا فقدان نظر آتا ہے ۔

تیسری لائق لحاظ چیز اجزائے کلام اور الفاظ کا سُر ہے ۔ نبین چندر نے عموماً تجنیس Alliteratin اور تکرار سے سُر کی تخلیق کی ہے ۔ کسی اور خوبی کی تخلیق کے ذریعہ وہ اس پر قادر نہیں ہو سکے ہیں ۔

هیم چندر نبین چندر سین کے ہم عصر تھے - ان کے مابعد مہاکابو کے مصنفین میں قابل ذکر راج کرشن رائے ، آنند چندر مصر ، شیو ناتھ شاستری ، اکھے چندر چودھری ، دیجندر ناتھ ٹھاکور ، کیقباد ، حامد علی اور اسماعیل حسین سراجی ہیں - یہ سب کے سب بیسویں صدی کے مصنف نہیں ہیں - انمیں سے اکثر بیسویں صدی کے شعراء اور رو بندر و ناتھ سے عصراً متاخر ہیں - لیکن چونکہ ان سب کا تعلق " مہا کابو " سے ہے اس لئے ہم نے ایک ہی سلسلے میں ان کا ذکر مناسب سمجھا -

———:*O*:———

کیقباد

دورحیات لکھنئی سنہ ۱۸۵۸ء سے سنہ ۱۹۵۲ء تک

اگرچہ کیقباد نے اپنی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ بیسویں صدی عیسوی میں گذارا تاہم وہ حقیقت میں انیسویں صدی ہی کے شاعر ہیں۔ انہیں ہیم چندر اور نبین چندر ہی کا ہم عصر شمار کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بیسویں صدی میں نصف صدی سے زاید زندگی گذاری لیکن ان کے فطری تخیلات اور شاعرانہ تصورات میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہوئی اور وہ ہیم چندر اور نبین چندر ہی کے گلشن ادب سے خوشہ چینی کرتے رہے۔ انہوں نے دور جدید سے قطعی کوئی تعلق قائم نہ کیا بلکہ پرانی لکیر ہی کے فقیر رہے۔

کیقباد کی شاعرانہ زندگی کو تین دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان کا پہلا زمانہ گیتی کابو یا مختصر نظموں کا زمانہ ہے اسے ہم سنہ ۱۸۷۰ء سے سنہ ۱۸۹۴ء تک متعین کر سکتے ہیں۔ دوسرا دور ان کے مہاکابو کا زمانہ ہے جیسے سنہ ۱۸۹۴ء کے آخر سے سنہ ۱۹۱۴ء تک کا وقت دیا جاسکتا ہے۔ ان کا آخری دور مختلف الاصناف نظموں کا ہے جسے سنہ ۱۹۱۵ء سے ان کی

اخرمهات تک پھیلا یا جا سکتا ہے - اس دور اخر میں انھوں نے مختصر نظمیں ' منظوم افسانے ' مذہبی تصورات سے معمور مہاکابو اور قومی ترانے منظوم کئے -

کیقباد کے دور اول میں ہم تین کتابیں پاتے ہیں - " بیرھو بیلا ش " (نالہ فراق) مطبوعہ سنہ ۱۸۷۰ع ' اس کتاب کی نظمیں کیقباد نے بارہ سال کی عمر میں ہیم چندر اور نبین چندر کی عاشقانہ نظموں کی تبعیت میں مرتب کی تھیں - چونکہ اس عمر کے شاعر سے واقعۂ عشق و محبت کے واقعی جذبات متوقع نہیں ہوسکتے اس لئے ہمیں کیقباد کی اس کتاب میں حقیقت کی بوکم اور حکایت یا نقل تاثر کا رنگ زیادہ تر ملتا ہے - اسی قسم کی ان کی ایک اور بھی نا پختہ تصنیف " کُسم کانن " (باغ گل) ہے جو سنہ ۱۸۷۳ میں شائع ہوئی تھی - اس دور تک شاعر کی طفلانہ نا پختہ کاری نمایاں ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ ایک متبع راہ رو کی طرح شاہراہ ادب پر گامزن نظر آتے ہیں -

ان کی اس دور کی سب سے اہم اور معرکۃ الآرا تصنیف " اشّرو مالا " (آنسوؤں کی مالا) ہے - کیقباد کی شہرت اور عظمت کا باعث ان کی یہی کتاب ہے یہ کتاب ان کی پختہ عمر کے وقت سنہ ۱۸۹۴ع میں شائع ہوئی تھی - اس کتاب نے عام طور پر اہل علم اور اہل قلم حضرات کی خصوصی توجہ اس زمانے میں اس لئے

حاصل کرلی تھی کہ اس کی اکثر نظموں میں ہمیں شاعر کے دل سے نکلے ہوئے اصلی آنسو اور پارہ ہائے جگر نظر آتے ہیں۔ اس کا ظاہری یا مجازی سبب شاید یہ بھی ہو نہ جوانی میں بھدا ایک ہندو برہمن لڑکی "گوری بالا" کے دام زلف میں اسیر ہوگئے تھے - دونوں جانب سے دریائے محبت میں تموج اور جنون خیزی کی شہرت تو عام ہے لیکن حدود محبت سے تجاوز کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس مجموعے کی متعدد نظموں مثلاً "پر ینمار پورتی" (محبوبہ کو)، "شے ای مکھہ کہانی" (وہی چہرہ)، "بھولی لے کیمنے ؟" (کیسے بھول گئی ؟) "نیرب رودن" (گریۂ خاموش) وغیرہ میں ان کی سچی محبت کے آنسو جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس زمانے میں مسلمان شعراء کا فقدان تھا۔ کم علم، پست ہمت اور کمزور شاعرانہ جذبات رکھنے والے پرتھی کے مصنف شعرا کے سوا مسلمان ادیب اور واقعی شاعر اس زمانے میں صفر کے برابر تھے۔

یہ لوگ عوام کو اپنے عام پسند اور پست مضامین سے محظوظ کرنے کیلئے صرف پوتھی جیسی کتابیں تصنیف کرتے تھے لیکن حقیقت میں یہ نہ تو صاحب علم تھے اور نہ صاحب قلم۔ کیقباد ہی سب سے پہلے مسلمان صاحب علم شاعر تھے اور نثر نگاروں میں قابل

ذکر میر مشرف حسین تھے جن کا علحدہ تذکرہ نثر نگار ادیبوں کے ضمن میں کیا گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمان بنگلا ادب سے بجائے شغف کے ایک گونہ نفرت کا اظہار کرتے تھے اور غیر مسلم ادیب حوصلہ افزائیوں کے بجائے ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ "اشرو مالا" کے منظر علم پر آتے ہی ہوا کا رخ پلٹ گیا۔ ہندو ادیبوں نے بھی اس کی تعریفیں کیں اور "اشرو مالا" حقیقت میں ایک عوامی مالا بن گئی۔ اس کی زبان خالص بنگالی اور پیرایہ نیز جاندار تھی۔ ان کی سابق تصانیف "بیرھو بیلاش" میں ہیم چندر کی "چنتا ترنگینی" اور "کسم کانن" میں نبین چندر کی "ابو کاش رنجینی" کا اثر منعکس ہوتا نظر آتا ہے۔ لیکن "اشرو مالا" میں ہمیں اوریجینل تخییل اور اعلی جذبات کا سمندر رواں اور دواں نظر آتا ہے۔ اس میں ہر ہر لفظ سے دلی سوز اور اتھاہ غم کا چشمہ ابلتا معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ان کی سابق تصانیف کی زبان بڑی سہل ہے اور ان کے مضامین سے مقاصد آشکار نہیں ہوتے اور جوش و خروش بےتکا دکھائی دیتا ہے۔

کیقباد کی "اشرو مالا" کی اشاعت کے زمانے میں مسلمان ادیب دو بھاشی پوتھی ہی میں مگن تھے۔ ناخواندہ اور نیم خواندہ سماج میں نہ تو اعلی ادب کے سمجھنے کی صلاحیت

تھی اور نہ ان کے نزدیک ادب کا تفریح کے سوا اور کوئی مقصد تھا - باعظمت اور بلند پایہ ادب سے نہ انہیں تعلق تھا اور نہ اس کے سمجھنے کی صلاحیت تھی - ایشور گپت کی کوششوں سے "کوبی والا" فرقے کا تو خاتمہ ہوگیا لیکن نو بھلشی پوتھی بحالہ باقی رہی - اس کے بعد سے جو ایک طاقت ور ادب ملک میں پیدا ہوا اُس سے مسلمانوں نے کوئی علاقہ نہ رکھا - ان حالات میں کیقباد کی " اشرو مالا " کو ایک غیر معمولی طور پر وقیع کارنامہ کہا جاسکتا ہے -

اُنیسویں صدی کی ابتداء ھی سے کلکتہ شہر انگریزوں کی ریاست ' حکومت اور تہذیب کا مرکز بن گیا تھا اور اسی وقت آزاد خیالی اور یورپی تعلیم اور مذہبی مباحث کی بھی ابتدا ہوئی - ھندؤں نے انگریزوں کی تقلید ھی میں اپنی ترقی کا راز معلوم کیا مسلمانوں کے سامنے کوئی واضح راستہ نہ تھا پھر بھی بعض لوگوں نے شمعیں جلانے کی کوششیں کیں -

انیسویں صدی میں مسلمانوں کی تعلیم اور ادبی زندگی سے متعلق سب سے زیادہ اھم اور قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۶۳ع میں کلکتے کے مشہور اصلاح پسند قائد نواب عبد اللطیف مرحوم نے کلکتے ھی میں ایک محمڈن لیٹریری سوسائٹی Mohammaden literary society قائم کی تھی - اس سوسائٹی

میں متوسط اور اعلی طبقے کے مسلمان جمع ہوتے اور مذہبی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی امور پر بحث و فکر کرتے - وہ اس امر کیلئے بھی کوشاں تھے کہ مسلمانوں کو بھی انگریزی علم کی تحصیل کی طرف مائل کریں - اس زمانے میں یہ کوشش بھی جاری تھی کہ انگریزی کلچر قبول کرکے مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح تعلیم زبان اور تہذیب میں ترقیاں حاصل کریں - انیسویں صدی میں بنگال کے سب سے بڑے اور سب سے مشہور مذہبی رہنما حضرت مولانا کرامت علی صاحب جونپوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی سنہ ۱۸۷۱ع میں اس سوسائیٹی کے ایک اجلاس میں شرکت فرمائی اور تقریر کی تھی - اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں میں اُس وقت یہ جذبہ بھی ترقی پر تھا کہ انہیں اسلام کو اسکی قدیم صورت اور حقیقی روپ میں قبول کرنا چاہئے - اسی جذبے کا یہ اثر تھا کہ سید امیر علی کی مشہور کتاب اسپرٹ آف اسلام سنہ ۱۸۹۱ع میں منظر عام پر آئی - ان حالات سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں نے یہ اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ انہیں خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہئے اور دوسری بات یہ کہ ان کا مذہب اسلام ہی ہمیشہ کیلئے تمام محاسن کا سر چشمہ، سب سے زیادہ قابل

نظر اور لائق قبول ہے - یہی مذہب انہیں ترقی کی طرف لے جاسکتا ہے اور اسی کی پیروی سے مسلمان دوسری قوموں پر بھی اپنا اثر ڈال سکتے ہیں - ان دونوں واقعات کی روشنی میں اگر ہم اس دور کے مسلمانوں کی ادبی کوششوں کا جائزہ لیں تو ہمیں ان کی واقعی قدر و قیمت بھی معلوم ہوسکے گی اور کیقباد، مزمل الحق، اسماعیل حسین سراجی اور دوسرے مسلمان ادیبوں کی ادبی اور قومی مساعی کی صحیح حیثیت متعین کرنے میں سہولت ہو گی -

کیقباد کے "اشرو مالا" کی بعض نظموں میں مسلمانوں کے قدیم عظیم الشان اور باعث فخر و مباہات کارناموں کا تذکرہ اور ان کے انحطاط اور مذہبی اسپرٹ کے فقدان پر ماتم بھی ہے - مثلاً "سراج شمادھی" (مدفن سراج الدولہ)، "شوک شنگیت" (نغمۂ غم) اور "مسلم ششان" (مسلمانوں کا مرگھٹ) وغیرہ نظموں میں شاعر کا یہی تاثر کار فرما نظر آتا ہے - موخرالذکر نام میں "ششان" یعنی مرگھٹ کے لفظ کی ترکیب سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ لیٹریری سوسائیٹی کے زیر اثر کیقباد کا بھی یہ نظریہ تھا کہ ہندوؤں کی طرح انھی کی زبان اور طرز ادا کا تتبع کر کے ہم بھی سر بلند ہوسکتے ہیں - ہمیں ان نظموں میں اس طرح کی بے جوڑ ترکیبیں اور بھی جابجا نظر آتی ہیں -

اے احساس کمتری بھی کہہ سکتے ھیں لیکن اس دور کے حالات پر
نظر کرنے سے یہ معلوم ھو سکتا ہے کہ جب ادب اور سیاست پر
سو فیصدی ھندو چھائے ھوئے تھے ایسا احساس پیدا ھونا غیر
فطری نہیں تھا۔ کیقباد کی " اشرو مالا " ھندؤں میں بھی
بہت مقبول ھوئی - نبین چندر سین نے اس کتاب کے متعلق اپنی
کمال مسرت اور اس کتاب کی زبان اور طرز ادا پر تعجب کا
اظہار کیا - سنہ ۱۸۹۶ع میں نبین چندر سین نے کیقباد کو ایک خط
لکھا تھا جس میں وہ فرماتے ھیں - " اگر میں آپ کی یہ کتاب
خود مشاھدہ نہ کرتا تو ھرگز یقین نہ کر سکتا کہ کوئی مسلمان بھی
ایسی شستہ اور فصیح بنگلا زبان میں اس طرح کی نظم لکھ
سکتا ہے "۔ خط کے آخر میں لکھتے ھیں - " جس دن مسلمان
سماج کے افراد ھندؤں کے ساتھ مل کر بنگلا زبان میں اس طرح کی
نظموں کے ذریعہ آنسو بہا سکیں گے وہ دن بنگال کیلئے بڑا مبارک
دن ھوگا - اگر کبھی ایسا دن سری بھگوان کی مہربانیوں سے
خود غرضیوں کے اندھیرے کی چادر کو پھاڑ کر رونما ھو سکا تو آپ
کی کتاب " اشرو مالا " اس عروس صبح کیلئے اشکوں کے ھار کا
تحفہ پیش کر سکے گی "۔ اس خط سے اندازہ ھوسکتا ہے کہ نبین سین کے
نزدیک صرف ایک ھندو ھی ایسی فصیح بنگلا لکھ سکتا ہے اور
ایک مسلمان ادبی طور پر نہایت پست اور ادنی مقام رکھتا ہے۔

وہ تو اس پر بھی متعجب ہیں کہ کیقباد مسلمان ہو کر کس طرح اتنی شستہ اور فصیح بنگلا زبان میں نظمیں لکھہ سکے۔ اس وقت کے بعض جرائد نے بھی کیقباد کی "اشرو مالا" پر اظہار خیال کیا جس کے بعض اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان سے بھی یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اس وقت کے ہندو مسلمانوں کو ادبی، ذہنی اور علمی حیثیت سے کس مقام کا مالک سمجھتے تھے۔

١ - بنگو باشی ایک بنگلا اخبار لکھتا ہے — "مسلمان ہوکر بھی ایسی شستہ اور فصیح بنگلا میں اس قدر بلند پایہ نظمیں کوئی لکھ سکتا ہے یہ بات ہمیں معلوم نہ تھی۔ (٢١ بھادوں ١٣٠٣ ب)۔

٢ - بھارشتوپترو — "شاعر کیقباد مسلمان ہیں لیکن ان کی بنگلا مسلمان نہیں ہے۔ (١٦ جیٹھ ١٣٠٤ ب)

٣ - ڈھاکا گزٹ — "یہ شاعر مسلمان ہوکر بھی فراق زدہ رادھا کے غم میں غمگین ہے، مسلمان ہوکر بھی نربان کے منتروں پر فریفتہ ہے اور مسلمان ہوکر بھی ایک بیوہ کے غم میں شریک غم نظر آتا ہے۔ (١٨ - چیت سنہ ١٣٠٢ ب)

یہ اقتباسات خود بتاتے ہیں کہ "اشرومالا" کی زبان اس کے عنوانات اور اس کی طرز ادا کیسی ہے۔

ہم کیقباد کی شاعرانہ زندگی کے دوسرے دور کا اندازہ ان کی مشہور کتاب "مہا ششان" سے کر سکتے ہیں - یہ کتاب پانی پت کی تیسری جنگ سے متعلق ہے - مہا ششان (عظیم الشان مرگھٹ) اگرچہ سنہ ۱۹۰۴ع میں شائع ہوئی تھی لیکن واقعی طور پر یہ اس وقت سے پہلے ھی لکھی جا چکی تھی - اس کتاب کے چند ابواب مسلسل روشن علی چودھری کے ماہوار رسالے "کوہ نور" میں رفتہ رفتہ شائع ہوئے تھے اور ابتدائے تصنیف ھی سے شاعر نے اس میں مسلسل تبدیلیاں اور اضافے کئے - اس حیثیت سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سنہ ۱۸۹۴ع سے ۱۹۱۴ع تک کیقباد نے صرف اسی کتاب میں اصلاح اور اضافے کئے - ان کا اور کوئی کارنامہ اس زمانے کا نہیں پایا جاتا - اس کتاب کی وجہ تصنیف کے بارے میں شاعر نے خود ھی یہ بتایا ہے :-

۱ - مسلمان ایک بہادر قوم کے افراد ھیں - ھندو بھی بہادر ھیں - ان دو بہادر قوموں نے اپنے گرم خون سے بہادری ، باھمی دشمنی اور فخر کی داستانیں زمانے کی پیشانی پر ایک لازوال نقش کی طرح باقی چھوڑی ھیں - اس معرکے میں ھندو قوم مفتوح اور مغلوب ہوئی اور مسلمان فتح و کامیابی سے ھمکنار ہوئے - ایک قوم نے اپنے وطن ، قوم اور مذھب کے لئے اپنے پاک خون سے مادر وطن کو نہلا کر خود اپنا بلی دان دے دیا -

اور دوسری قوم نے اپنے وطن، قومی اعزاز اور مذہب کے لئے اپنے جگر کے مقدس خون سے اپنے وطن کے چہرے کو رنگین بنایا اور فتح و کامرانی کے تاج سے ممتاز ہوئی۔

۲ - جب میں نے "اشرو مالا" کتاب لکھی تھی اس وقت میرا دل باغ خلد کی طرح رنگین پھولوں کی خوشبو سے مست تھا۔ لیکن مہاششان میرے نزدیک ایک جنت لاهوتی ہے اور "اشرو مالا" فردوس ارضی۔ ان دونوں نظموں میں وہی فرق ہے جو جنت اور دنیا میں ہے۔ "اشرو مالا" میں صرف شاعر کے آنسو ہیں اور "مہاششان" میں هندو اور مسلمان سلطنتوں کے غیر فانی ماضی کے مرگھٹ کی راکھ پوشیدہ ہے۔

۳ - یہ بھارتی مسلمانوں کی بہادری اور شجاعت کی ایک مرصع داستان ہے۔

۴ - اس نظم کے ذریعہ میں نے بھرا افتخار ماضی کی یاد مسلمانوں کے دلوں میں تازہ کرنی چاہی ہے۔

شاعر کیقباد نے مندرجہ بالا امور کی توضیح اپنی کتاب مہاششان کے بارے میں کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے شاعر و شاعری کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں - ان خیالات کی روشنی میں ہم ان کی شاعری کو پرکھ سکتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں—

" شاعر ہونا اختیاری امر نہیں ہے۔ یہ موہوبات الٰہیہ میں سے ایک فیضان ہے۔ ایک شاعر ایک انسان کے مایوس دل کے ریگ زار میں بہشتی محبت کی نہریں بہا دیتا ہے۔ شاعری دل کی چیز ہے اور دل ہی پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ ہر مہاکابیہ کا ایک خاص مقصد اور خاص نقطۂ مرکزی ہوتا ہے۔ شاعر کوئی ایک خاص مقصد پیش نظر رکھ کر مختلف طرز ادا اور ترتیب کے ذریعہ نئے ساماں اور جدید اسلوب سے بے شمار کمروں والا ایک شاندار محل تعمیر کرتا ہے۔ ہر کمرے کے ساتھ دوسرے کمرے کا قوی تعلق ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر کمرہ مستقل اور دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اسی اختلاف میں باہمی ربط اور اس ربط کے باوجود ان میں اختلاف باقی رہتا ہے۔ اسی سے شاعر کی فنی تخلیق اور صفت شاعری کا کمال ظاہر ہوتا ہے اور یہی مہاکابیہ ہے"۔

مہاکابیہ کے متعلق شاعر کا عام خیال یہی ہے۔ مہاشمشان بھی ایک تاریخی مہاکابیہ ہے اور کیقباد کا دعوی ہے کہ بنگلا ادب میں واقعی اور تاریخی مہاکابیہ صرف یہی ہے۔ ان کا یہ دعوی غلط نہیں ہے۔ کیونکہ بنگلا ادب میں تاریخی مہاکابیہ کے سلسلے کا اگر ہم تحقیقی تجزیہ کریں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ رنگ لال کا " پدّنی اُپکھیان " ایک غیر تاریخی مہاکابیہ ہے۔ نبین سین کا " پلاسی یُدّھو " جو سنہ ۱۸۷۰ع میں

شائع ہوا تھا وہ حقیقت میں ایک افسانوی نظم یا منظوم افسانہ ہے اور اس میں مہاکاوو کی شان نہیں ہے۔ اسی طرح آنند چندر متر کی " بھارت منگل " جو سنہ ۱۸۹۴ع میں شائع ہوئی تھی وہ بھی کوئی تاریخی مہاکاوو نہیں ہے۔ اس میں انہوں نے راجا رام موھن رائے کے حالت زندگی اور مذھبی تخیلات بیان کئے ھیں۔ لیکن جوگیندر ناتھ بوسو کی " پرتھوی راج " اور " شیواجی " کتابیں تاریخی مہاکابو کہی جاسکتی ھیں۔ یہ دونوں کتابیں کیقباد کی مہاشمشان سے بہت دنوں کے بعد شائع ہوئی تھیں۔ پرتھوی راج سنہ ۱۹۱۵ع میں اور شیواجی سنہ ۱۹۱۸ع میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ بقول جوگیندر ناتھ بوسو یہ کتابیں تاریخی ماخذ رکھنے کے باوجود تاریخ سے دور ھٹی ھیں اور ان میں شاعر نے حسب ضرورت قطع و برید یا کمی و بیشی کرکے حسب ضرورت انہیں افسانوی رنگ دیا ہے۔

مہاشمشان کی بنیاد پانی پت کی تیسری جنگ پر ہے۔ اس مہاکابو میں ہندؤں اور مسلمانوں کے تمام تر جنگ کے حالات اور اهتمام جنگ کی داستان ہوتے ہوئے بھی شاعر نے رنگ آفرینی کیلئے اس میں مختلف قسم کے افسانہائے محبت ضم کئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب تاریخی ماخذ رکھتے ہوئے بھی ایک دلچسپ

داستان حسن و عشق اور دلکش قصۂ معاربات بن گئی ہے - یہ کتاب آٹھ سو ستر صفحات پر پھیلی ہوئی ہے - اتنی ضخیم کتاب میں داستان کی ترتیب اور واقعات کے تسلسل کو باقی رکھنا ایک غیر معمولی کام ہے - شاعر نے اس نظم میں صنائع شاعری کی طرف توجہ کم کی ہے - ان کی نظر صرف بیان واقعہ اور تنوع آفرینی پر ہے - اس لئے صنائع شاعری اور محاسن زبان کی حیثیت سے یہ مہا کابو بلند پایہ نہیں رکھتی - زور بیان اور صنائع لفظی و معنوی کا اظہار اس میں بہت کم ہے - تاہم اس کتاب کی عظمت اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ شاعر نے اس میں ایک بہادر قوم کا دوسری بہادر قوم سے پورا پورا مقابلہ کیا ہے - علاوہ بریں کیقباد نے اس مہاکابو میں سنسکرت کے متعین کردہ اصولوں سے کہیں بھی انحراف نہیں کیا ہے اور اس کی وجہ سے انہوں نے ایک جسم بے روح کی تعبیر کی ہے - یہ بات ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ ہیم چندر، نبین چندر اور رنگ لال وغیرہ سے کیقباد کے دل کی وسعت اس نظم میں بہت زیادہ نمایاں ہے - ان شعراء نے مسلمان قوم کی تذلیل، اہانت اور مفروضہ داستانہائے مظالم پر اپنے اپنے مہاکابو کی بنیادیں رکھی ہیں اور مقابلۃً ہندوؤں کے مفروضہ قصہائے شجاعت و بسالت سے اپنی نظموں کو رنگین

بتلایا ہے - لیکن کیقباد کا نظریہ یہ ہے کہ گیدڑ اور شیر کی جنگ میں شیر کی فتح کوئی قابل فخر کیا قابل ذکر کا رنامہ بھی نہیں ہے - البتہ دو شیروں کی لڑائی میں ایک کی دوسرے پر فتح لائق تحسین و آفریں اور باعث فخر و مباہات ہوسکتی ہے - اسی نظریئے کے پیش نظر کیقباد نے ہندوؤں کی بہادری کی داستانیں بھی کمال فراخ حوصلگی سے اسی طرح اپنی مہاکابیہ میں پیش کی ہیں جس طرح مسلمانوں کی -

کیقباد کی شاعری کا تیسرا دور سنہ ۱۹۱۵ع سے شروع ہوکر سنہ ۱۹۵۴ع پر منتہی ہوتا ہے - اس زمانے میں انہوں نے مختلف قسم کی منظوم کتابیں لکھیں - ان نظموں میں تاریخ، وطنیت، مذہب پرستی، علم حکایات اور اسی قسم کے موضوعات ہیں - ان کی اس دور کی اہم کتابیں مندرجہ ذیل ہیں -

شیب مندر - سنہ ۱۹۱۷ع، اُمیودھارا سنہ ۱۹۲۳ع، ششان بھشو سنہ ۱۹۲۸ع، محرم شریف سنہ ۱۹۳۳ع - ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ان کی مندرجہ ذیل قلمی کتابیں بھی موجود ہیں جو ابتک شائع نہ ہوسکیں - (۱) رتنابولی (جوہر ہدایت) (۲) حضرت غوث پاک جیبنی -

ان کتابوں میں لائق ذکر محرم شریف ہے - اس میں کربلا کے غم انگیز واقعات دردناک پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں -

یہ امر افسوسناک ہے کہ اسلامی تاریخ کے ایک المیہ کو انہوں نے بحر و قوافی کے قیود کا پابند بنانے کی کوشش کی ہے - حقیقت یہ ہے کہ تاریخ نظم کی پابندیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی - واقعات کربلا میں جو مبالغہ آمیز تصریحات یا افسانوی رنگینی بعض ساقط الاعتبار کتابوں میں پائی جاتی ہیں ان کی اصلاح اور تصحیح کر کے شاعر نے صحیح واقعات کو منظوم پیرائے میں بیان کیا ہے اور اسی لئے ہم اسے ایک منظوم تاریخ کا درجہ دے سکتے ہیں - جابجا اس کتاب میں مذہبی ہدایات بھی نظر آتی ہیں - شاعر کا نظریہ یہ ہے کہ واقعۂ کربلا اسلامی تاریخ کا ایک اندوہناک المیہ ہے - یہ تاریخی حیثیت سے مسلمانوں کی پیشانی پر ایک بدصورت دھبہ یا معصیت کا داغ ہے - مسلمانوں کا ظالم و غاصب طبقہ ہر دور میں زندہ رہتا ہے اور اس کے لئے واقعات کربلا اور اس کا پس منظر ایک تازیانہ عبرت ہے -

" امیو دھارا " میں شاعر کی متعدد نظمیں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق ہیں - انہیں قومی اور مذہبی نظمیں کہا جا سکتا ہے - یہ بات کہ موجودہ دور میں انسان مخلی بالطبع ہو کر اپنے فرائض زندگی انجام دے سکتا ہے اسے شاعر قبول نہیں کرنا چاہتا - اس کتاب کی ایک نظم کا عنوان ہے " کلیر ادبُھت جیب " (کلجگ کا عجیب و غریب جاندار) - اس نظم میں شاعر نے دورِ

حاضر کے انسانوں پر طنز کیا ہے ۔

شاعر کی غیر مطبوعہ کتابوں " اُپدیش رتنابلی " اور " حضرت غوث پاک پر جیبنی " سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آخر دور میں شاعر پر مذہبیت غالب تھی ۔ عام عادت کے مطابق وہ آخر عمر میں مذہب کے دلدادہ اور با وضع نیز مخلص و باعمل مسلمان ہو گئے تھے ۔

کیقباد کے بارے میں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے دور میں پیدا ہوئے تھے جس زمانے میں قدیم سلسلہ شاعری اور مہاکابو کی تصنیف ایک بے معنی چیز بن کر رہ گئی تھی ۔ جس وقت بنگلا ادب پر رابندر ناتھ ٹھاکور کا پورا پورا اثر قائم تھا اس وقت کیقباد کے نا مناسب نغمے بے موسم کے راگ یا بے وقت کے سُر معلوم ہوتے ہیں ۔

کیقباد ضلع ڈھاکہ میں تھانہ نواب گنج کے موضع اگلا پور بو پاڑا میں سنہ ۱۸۵۸ع میں پیدا ہوئے تھے ۔ تعلیمی مشغلے میں چند سال باہر گزارنے کے بعد عملی طور پر شاعر نے اپنی تمام عمر اپنے وطنی دیہات ھی میں گزار دی ۔ شاعر اسی وجہ سے تغیر ادوار اور تعلیمی و ذہنی انقلابات سے بہت کم متاثر ہوئے ۔ انھوں نے مختصر تنخواہ پر اسی دیہات کے ڈاکخانے میں پوسٹ ماسٹری کی نوکری سے پنشن لے کر گوشہ نشین ہو گئے ۔

آخر وقت میں سخت علیل ہوکر ڈھاکہ آئے اور یہاں سنہ ۱۹۰۲ء میں راہی ملک عدم ہوئے -

---

اسماعیل حسین سراجی

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہمیں مسلمانوں کی قومی زندگی میں ایک بڑی کشمکش نظر آتی ہے - اس دور کے بنگالی مسلمانوں میں ہمیں اسلام کی جانب ایک خاص رجحان اور بیداری کی نشانیاں بہت نمایاں دکھائی دیتی ہیں -
مسلمان شاعر یا ادیب زور بیان اور قوت تخییل کے ساتھ اپنی قومی زندگی کے حالات کچھ نہ کہہ سکے - اکثر حالات میں ہندو ادیبوں کی تقلید ہی ان کیلئے باعث افتخار تھی اور اسی فرض کی ادائیگی میں وہ اپنی عمر کی کشتی دریائے ادب سے پار لے گئے - نثر میں میر مشرف حسین اور نظم میں کیقباد نے ہندو طرز نگارش اور طریقۂ ادا کے ذریعہ ہی سے مسلمانوں کی ترجمانی کی کوشش کی تھی - مختصر یہ کہ مسلمانوں میں ادیبانہ اور شاعرانہ خصوصیات اس وقت تک پیدا نہیں

ہوئی تھیں ۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ مذہبی کتابوں کی تصنیف یا تراجم کے میدان میں بھی مسلمان انہیں تیز رو ثابت نہ ہوئے ۔ قرآن پاک کا سب سے پہلا بنگالی ترجمہ بابو راجندر ناتھ دت نے سنہ ١٨٧٨ع میں کیا تھا ۔ کلکتہ کے آیورویدپریس میں مہیر چندر رائے نے اسے طبع کرایا تھا ۔ اس کے بعد نبوبدھان برھموسماج کے ایک مصنف گریش چندر سین نے قرآن پاک کا دوسرا بنگلا ترجمہ سنہ ١٨٨٢ع میں طبع کرکے شائع کیا تھا ۔ مرخرالذکر مصنف نے ترجمۂ قرآن کے علاوہ مسلمان کی دوسری مذہبی کتابوں کا بنگلا ترجمہ بھی شائع کیا تھا ۔ تذکرہ الاولیا کا مکمل ترجمہ اور بعض احادیث کا ترجمہ بھی انہوں نے شائع کیا تھا ۔ "مہالیپی" کے نام سے انہوں نے حضرت مجدد الف ثانی کے بعض مکتوبات کا بھی ترجمہ کیا تھا ۔ انیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کا علمی اور ادبی کارنامہ کوئی خصوصیت نہیں رکھتا ۔ بعض ادبی کام جنھیں انہوں نے ہندوؤں کی تقلید میں جنم دیا تھا قابل ذکر حیثیت نہیں رکھتے ۔ مثال کے طور پر ہم محمد اصغر حسین کے "جوھر قول امام" کو پیش کر سکتے ہیں ۔ جس میں انہوں نے چند حدیثوں کا دو بھاشی بنگلا میں ترجمہ کیا تھا ۔ اسی طرح خان محمد نے ایک کتاب ہزار مسئلہ لکھی تھی اور غلام فرید نے حدیث اربعین کا ترجمہ

کیا تھا۔ سنہ ۱۸۷۰ء سے سنہ ۱۸۹۰ء تک اسی قسم کی غیر ادیبانہ کتابیں مسلمان شعرا و ادبا شائع کرتے رہے۔ یہ کتابیں اہل علم حضرات کیلئے لکھی نہ گئی تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ انکے یہ کارنامے اخلاص سے خالی نہ تھے لیکن ان کے مخاطب عوام تھے۔ اور خود ان مصنفین کے پیش نظر بھی کسی ادبی کارنامے کی تخلیق نہ تھی۔ انیسویں صدی کا ایک ھی اہم ادبی کارنامہ سید امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام تھی۔ یہ کتاب اگرچہ بنگلا زبان میں نہیں لکھی گئی تھی لیکن اس کا مذہبی اور ادبی اثر مسلمان مصنفین کی ادبی اور مذہبی زندگی پر کافی گہرا پڑا۔ اس اعتبار سے ہم اس کتاب کو مسلمانوں میں ادبی اور مذہبی روح پیدا کرنے والی پہلی اور بنیادی کتاب کہہ سکتے ھیں۔ ہم اس کے بعدھی سے اسماعیل حسین سراجی، مزمل الحق، منیر الزماں اسلام آبادی، شیخ عبدالرحیم، پنڈت ریاض الدین مشہدی وغیرہ متعدد صاحبان فہم و قلم کو میدان ادب میں گامزن پاتے ھیں۔ ان مصنفین نے مسلمانوں کی قومی ور مذہبی زندگی کے جمود کو ختم کرنے اور ان میں بیداری پیدا کرنے کیلئے ان تھک کوششیں کیں۔ ان سب میں سید ابو محمد اسماعیل حسین سراجی کا نام خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہے کیونکہ انھوں نے ادب کے ذریعہ مسلمانوں میں قومی

زندگی کے احیاء کے سلسلے میں سخت جدو جہد کی تھی۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں جریدۂ "الاسلام"° کے پہلے شمارے میں سید اسماعیل حسین سراجی ادب کی طاقت اور اس ذریعہ سے قومی تغیر کے امکانات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں ـــ "موجودہ بنگالی زبان اور بنگالی ادب ہماری منجمد اور غیر متحرک زندگی میں کوئی زندگی پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ہماری قومی زبان عربی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ فارسی اور اردو سے زیادہ تر مذہبی، ادبی، تاریخی، فلسفیانہ اور دوسرے اصناف کی کتابوں کا بنگلا زبان میں ترجمہ ہونا بہت ضروری ہے۔ مسلمانوں کیلئے اسلام روح اور جان کی حیثیت رکھتا ہے۔ قومی تاریخ اور بزرگان ملت کی سوانح کے سوا مسلمان کے مردہ جسم میں قوت زندگی پہنچانے والی اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس لئے اے بنگال کے مسلمانو اور اے ادب کے خادمو، خبردار ہو اور ہوشیار ہوجاؤ۔ دوسروں کی تقلید کرتے وقت اپنی روح کو نہ کھو بیٹھو اسلام کے تقدس اور اس کے اصول کے حدود سے باہر ہو کر ہرگز ادبی خدمت کا تصور مت کرو۔

°ـــ یہ رسالہ اس مقصد کے پیش نظر شائع ہوا تھا کہ مسلمانوں میں ادبی اور مذہبی روح بیدار کرکے انہیں حساس مسلمان بنایا جائے۔

اگر بنگالی ادب کو قومی ادب کے روپ میں ڈھالنا چاہتے ہو،
اگر ادب کی طاقت کے زیر اثر زندگی کے سفینے کو صحیح دھارے
پر لے چلنا چاہتے ہو اور اگر بنگالی ادب کے ذریعہ تم قومی
بہبودی اور ترقی کے خواہشمند ہو تو ہر قسم کے برے خیالات،
گھناؤنے جذبات اور معیوب تصورات، احساس کمتری اور
کمزوریوں سے اسے بچانے کی کوشش کرو۔ اچھے خیالات کے گلستان
میں اور بلند خیال اور عقلمندی کی آزاد فضا میں اچھے ادب کو
سیر کرنے دو۔ دنیا کے قومی ہیرو اور مذہبی بزرگوں کی
مقدس سوانح حیات کو خوبصورتی کے ساتھ اچھے ادب میں
جگہ دو۔ قدامت پسندی کے نظریات کو ترک کرکے دیکھو کہ
انسانی دنیا کی مختلف قومیں کن کن صفات کے ذریعہ ترقی
یافتہ ہوئیں اور کن اسباب کی بنا پر وہ انحطاط پذیر ہوئیں۔
تم ان اسباب کو نمایاں کرو۔ زندگی کے جوش، دل کی ہمت
اور صداقت کے پرچار کو اپنا مقصد زندگی بنا کر ادب کے
ذریعہ سے تمام ملک کو زندہ اور ہمت ور بناؤ۔ تم دیکھو گے
کہ ادب کی طاقت کے زور سے طوفانی ہوائیں جہالت کے ابر کو
پارہ پارہ اور نیست و نابود کردینگی۔ پھر ہلال ترقی و سعادت
پوری تابانی سے جلوہ نما ہوگا۔ (الاسلام صفحہ ۵۳ بیساکھ
سنہ ۱۳۲۲ب)۔

انھی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اسماعیل حسین سراجی نے سنہ ۱۸۹۹ء میں " انسل پرو باھو " (سرچشمۂ آتش) ایک کتاب شائع کی ۔ یہ کتاب مختصر نظموں کا مجموعہ ہے اور عموماً حکومت برطانیہ کی مخالفت پر ان نظموں کی بنیاد ہے ۔ غالباً اسی وجہ سے اُس دور کی حکومت نے اس کتاب کی ضبطی کا بھی حکم دیا تھا " انسل پرو باھو " میں ھیم چندر کی " بھارت بھکّھا " اور " بھارت بلاپ " وغیرہ منظوم کتابوں کے اثرات نمایاں دکھائی دیتے ھیں ۔ اس مجموعے میں متعدد نظمیں مسلمانوں کو بیدار اور انھیں نئی زندگی سے آشنا کرنے والی ھیں ۔ اس کے بعد اسماعیل حسین نے ایک کتاب بنام " اسپین بجے کابو " (فتح اسپین پر مشتمل نظمیں) منظوم کی ۔ انھوں نے ایک اور کتاب " مہاشکھا " (تعلیم عظیم) کے نام سے بھی منظوم کی ۔ موخر الذکر کتاب جریدہ " الاسلام " میں رفتہ رفتہ شائع بھی ہوئی تھی لیکن وہ مکمل نہ ہو سکی اور نہ پوری کتابی شکل میں شائع ہوئی ۔

اسپین بجے کابو میں سید اسماعیل حسین نے فتح اسپین کے واقعات اور طارق کے بہادرانہ کارناموں کو بڑی آب و تاب سے بیان کیا ہے ۔ ان کی دوسری کتاب مہاشکھا میں واقعات کربلا بیان کئے گئے ھیں ۔ اس میں شہادت حسین سے وہ دنیا کو دیکھ

سبق دیتے ھیں کہ مذھب، عدل اور دین کی کس طرح حفاظت کرنی چاھئے - آزادی کی بقا اور ظلم کی بیخ کنی کے لئے ایک مسلمان کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاھئے - میر مشرف حسین کی " بشاد شنگھو" کی تقلید میں اسماعیل حسین نے اپنی کتاب " مہا شکھا" لکھی تھی اور اسی لئے تاریخی اور غیر تاریخی مواد سے یہ کتاب مملو ھے -

اسماعیل حسین سراجی کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت صرف قومی معمار اور مذھبی اصلاح کے حامی ھونے کی وجہ سے ھے ورنہ شاعر یا ادیب کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت بلند نہیں - ان کے اشعار میں ھمیں ھیم چندر اور مائکل کی تقلید کا رنگ بھی نظر آتا ھے - ان کی زندگی کا مقصد یہ ظاھر ھوتا ھے کہ مسلمانوں میں ادبی، مذھبی اور اصلاحی بیداری پیدا کی جائے اور اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے بنگال کے مختلف مقامات کے دورے بھی کئے تھے - انھیں بجائے ادیب شاعر کے مبلغ شاعر کہنا زیادہ موزوں ھے -

پبنا ضلع کا مقام سراج گنج ان کا مولد و مسکن تھا اور اسی مناسبت سے وہ اپنے آپ کو سراجی کے نام سے موسوم کرتے تھے -

حامد علی - پیدائش سنہ ١٨٧٥ع - تاایں دم بقید حیات ھیں -

حامد علی نے متعدد منظوم افسانے لکھے ھیں جن کا ذکر یہاں

مناسب ہے - انمیں سے قاسم بودھ کابو (قتل قاسم پر نظم)، زینل أدّھار کابو (زین العابدین کی رہائی کے متعلق نظم)، سہراب بودھ کابو (قتل سہراب کی نظم) - ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں کی کتابیں یہ ہیں - "کبتا گنجو اور بھرا تری بیلاپ "- اپنے مقصد کے متعلق انھوں نے فرمایا ہے کہ ہندو دیب دیبی کے افسانے اور ہندو پوجا کے تذکروں کو ترک کرکے مسلم واقعات پر بنیادیں استوار کرکے ایک علحدہ مسلم ادب کا قیام ہی میری زندگی کا مقصد ہے -

حامد علی کی نظمیں زور بیان کی حامل ہیں - وہ واقعات جنگ کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ قلمبند کرتے ہیں - انہیں ہم کیقباد کے درجے میں جگہ دیسکتے ہیں -

حامد علی کا وطن ضلع چاٹگام میں رودن تھانے کے اندر ایک گاؤں سلطان پور تھا - ان کی پیدائش سنہ ۱۸۷۵ع میں ہوئی تھی -

حصۂ سویم

نواں باب

گیتی کا بھو

بہاری لال - سوریندرو ناتھ مجمدار - دیجندرو ناتھ ٹھاکور
دیبندرو ناتھ سین - اکشے کمار بڑال
شرنوکماری دیبی - گیریندرو موھنی داسی
کامینی رائے - مان کماری بوسو
مزمل حق - فضل الکریم

سید علی احسن ——— مترجم — مولانا عبد الرحمٰن بیخود

نواں باب

گیتی کابو

بنگلا ادب میں گیتی کابو کی تخلیق کا سہرا شاعر بہاری لال چکرورتی کے سر پر ہے - بہاری لال سے پہلے انیسویں صدی ہی میں مختلف عنوانات پر نظمیں لکھی جاچکی تھیں - مگر وہ ساری شاعری محسوسات پر مبنی تھی ۔ ان نظموں سے گیتوں کے سر پیدا نہ ہوسکے - بہاری لال کی نظموں کے ذریعہ بیرونی دنیا کو فراموش کر کے صرف اپنی ذات میں مستغرق ہو جانے یا من میں ڈوب کر سراغ زندگی پاجانے کا تصور بنگلا شاعری میں ایک بالکل ہی نئی اور انوکھی چیز تھا - انسان ہوکر اور انسانوں میں رہ کر انسانیت کا نغمہ ایشور چندرگپت نے سنایا ہے - علاوہ بریں دور وسطی میں دیہاتی گیتوں کے ذریعہ سے شعرا کا رجحان ہمیں معلوم ہوچکا ہے - مائکل مدھوسودن دت نے بھی انیسویں صدی کی شاعرانہ اسپرٹ کا اپنی نظموں کے ذریعہ اظہار کیا ہے - لیکن بہاری لال کی نظموں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا اپنا وجود اور اس کی روح بیرونی دنیا سے قطعی غیر متعلق ہے - یہ بھی

حقیقت ہے کہ بنگلا شاعری میں یہ چیز کلیۃ انوکھی نہیں کہی جاسکتیں۔ اسلئے کہ دور وسطی کی وشنو کابو (بشنو کے متعلق نظموں) میں ہمیں نظر آتا ہے کہ بنگالی شاعروں نے واقعی اور محسوسات کی زندگی کو بھول کر برندابن کے خواب دیکھے ہیں - لیکن بشنو کابو مذہبی تخیلات ہیں اور ان کے ذریعہ صرف بھگتی کے تخیلات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ان میں محبت، معاشقہ، تمنائیں، امیدیں اور اس قسم کی بہت ساری چیزیں صرف رادھا اور کرشن کے روپ ہی میں اجاگر کی گئی ہیں اور یہی سبب ہے کہ اس میں سب کچھہ محدود ہوکر رہ گیا ہے۔

انیسویں صدی میں ہمیں جس گیتی کابو کا دھارا اُبلتا ہوا نظر آتا ہے اس کے ساتھ سابق میں مذکورہ "مہاجن پدّا بولی" یا کوئی والوں کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ اس صدی میں جس نئی تہذیب کی بنیادوں پر اقتصادی، سیاسی اور ادبی شعور کی بیداری ہمیں دکھائی دیتی ہے اس کے ساتھ بھی "وشنو پدا بولی" کا کوئی تعلق ہمیں دکھائی نہیں دیتا۔

بہاری لال کی نظمیں بالکل ہی اُس سے مختلف صرف اپنی ذات سے متعلق یا تاثرات قلبی پر مبنی کہی جاسکتی ہیں۔ بہاری لال نے تمام عالم اور حیات عالم کو اپنے آزاد تخیل کی

حد بندیوں میں لاکر قلبی مسرت کا سامان فراہم کیا ہے - ان کی نظموں سے دکھ اور درد کا سمندر ابلتا ہوا دکھائی دیتا ہے -

انہوں نے عوامی دکھ درد سے اخذ احساس کیا اور انفرادیت کی بھلائی ہی میں جگ کی بھلائی کا خواب دیکھا - اسی کو انہوں نے اپنا آدرش بنایا - دلی تاثرات ہی محسوسات کی دنیا میں ان کے راہبر ہیں - عمل کی دنیا میں ان کی تمثیل سنیاسیوں کے مراقبے کے مانند ہے - یہ انفرادیت بنگالی ادب میں ایک ایسی نادر تخلیق تھی جس کا پہلے سے تصور بھی نہ تھا - بنگلا ادب کیلئے یہ تخیل اگرچہ اچھوتا تھا لیکن دراصل اسے انیسویں صدی میں انگریزی رومانوی ادب سے مستعار لیا گیا تھا - انگریزی رومانوی ادب میں عوارض ہی کو جواہر مستقلہ تسلیم کرکے اسی میں کھوجانا کمال تصور سمجھا گیا ہے - سنگسار اور سماج کے دردو غم سے بحث نہ تھی بلکہ احساس درد کو دل میں پروان چڑھانا ہی متصور تھا - اس طرح پھر یہ درد ہی لذت بخش بن جاتا ہے - اردو میں غزلوں کا بلند ترین معیار بھی اسی کی ہمنوائی کرتا ہے - بالخصوص انگریزی شاعر شیلی Shelley اور کیٹس کے ساتھ بہاری لال کو بہت مناسبت معلوم ہوتی ہے - تاہم شیلی کی نظموں میں جو احساس حقیقت اور دنیا کے مظلوم و مصیبت زدہ انسانوں کیلئے درد و تاثر تھا وہ بہاری لال کے یہاں نہیں ہے -

یہ سچ ہے کہ شیلی نے نئے تخییل کی بنیاد پر اپنی نظموں کے ذریعہ ایک نئی دنیا پیدا کرنی چاہی ہے اور اسی کی بنیاد پر ایک حسن کامل کا تصور قائم کیا ہے۔ لیکن انھوں نے ایسی دنیا کی تخلیق اس لئے کرنی چاہی کہ چونکہ موجودات کی دنیا دکھ اور غم سے بھری ہوئی ہے اور تخییل کی دنیا غموں سے آزاد ہے اس لئے دنیائے تخییل کی تخلیق ہی میں روحانی سکون مل سکتا ہے۔ علاوہ بریں ان کا یہ نظریہ تھا کہ بمقابلہ موجودہ انسانوں کے انکے تخیل اور شاعری کا انسان حقیقت سے قریب تر ہوگا۔ بہاری لال سے کچھ ہی پہلے مائیکل مدھوسودن دت کے چودہ مصراعوں والے قطعات میں ہم نے احساس درد و غم کا مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن ان کے احساسات میں متعین اسباب کا وجود پایا جاتا ہے۔ یہ درد ایسا ہے جو غیر مرئی راہوں سے غیر محدود حالات میں ہمیں اپنے وطن کے ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن رومانوی درد و غم میں کسی طرح کا بھی رس نہیں ہوتا۔ اس کے اسباب و وجوہ نہیں ہوتے بلکہ اس کا تعلق صرف احساس غم اور تصور درد ہی سے ہوتا ہے۔

انگلستان کے رومانوی شعراء میں "شیلی" نے نئی دنیا اور نئی زندگی کا خواب دیکھا تھا اور اسی کی بنیاد پر نئے تخییل کی دنیا کھڑی کی تھی۔ اپنے تمام تر تصورات میں

انھوں نے اسی درد و غم کے بیچ سے راستے نکالے ھیں اور درد و غم کے اندر انھوں نے تسکین قلب کے سامان پالیے ھیں۔ ان کی ساری امیدیں اور تمام تر توقعات غم ھی پر موقوف ھیں۔ Ode to the west wind میں سردی کی بے رحمیوں کا اعتراف ملتا ھے۔ لیکن اس پر صبر کی تلقین بھی ھے کیونکہ سردیوں کو برداشت کئے بغیر بہار کی رعنائیوں سے لطف اندوزی ممکن نہیں۔ Prometheus unbound میں قابل ذکر واقعہ پرومیتھیوس کی بد نصیبی اور بیماری ھی ھے۔ اس میں قابل غور امر یہ ھے کہ پرومیتھوس ھر طرح کی جسمانی مصیبت اور بیماری کے باوجود دل شکستہ نہیں ھوتا۔ لیکن جب دنیا کا مصیبتوں سے بھرا منظر اس کی بصیرت قلبی کے سامنے آشکار ھوتا ھے تو وہ دل گرفتہ ھوکر ھمت چھوڑ بیٹھتا ھے۔ یعنی پرومیتھیوس کے نزدیک اصلی مصائب ذھنی اور قلبی ھی ھیں۔ جسمانی مصائب کو وہ انگیز کرنے کے قابل سمجھتا ھے لیکن ذھنی اور قلبی محسوسات اسے زیادہ ھلاکت آفریں معلوم ھوتے ھیں۔

شیلی کی نظموں میں ھمیں حسن ازل کے تصورات ملتے ھیں۔ یہ حسن ازل یا عالم کو فریفتہ کرنے والا سرمدی جمال محسوسات یا مخلوقات میں بطور اعراض متمثل نہیں ھوتا تاھم مختلف مناظر حسن میں اس کا انعکاس ضرور ھے۔

ابتدائی نظموں میں انھوں نے ضرور بر و بحر اور کوہ و دشت میں ھر پھر کے اس ابدی و سرمدی حسن کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کی ترغیبات دی ھیں اور یہ بتایا ھے کہ یہ سیر و سفر ھی اُس غیر مرئی حسن کے مشاهدات کیلئے ابواب بصیرت کھول دےگا - " ای پی سائی کیڈین " Epiosychidian میں ھے کہ حسین مورتیوں میں ھمیں یہ حسن نظر آیا ھے - اسی تلاش حقیقت نے شاعر کے بحر دل میں مختلف اوقات میں مختلف انداز سے درد و غم کی لہریں پیدا کی ھیں اور انھی کے بیچ بیچ میں عجیب و غریب معارف و منازل معرفت کا انکشاف بھی پایا جاتا ھے - لیکن سب سے بڑی بات یہ ھے کہ اگرچہ اس درد و غم کا کوئی تعلق مادی زندگی سے نہیں ھے تاھم ھمیں یہ بالکل غیر متعلق بھی نہیں معلوم ھوتا - اسی میں شاعر نے ایک جہان نو کی تخلیق کی ھے - شاعر کی نگاھوں کے سامنے ھمہ اوست کا جلوہ ضیا پاش دکھائی دیتا ھے اور چونکہ یہ ضیا پاشی محسوس دنیا میں اس بات پر موقوف ھے کہ وہ حسین اشیاء میں منعکس ھو اس لئے شاعر نے ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرنے کی کوشش کی ھے جس میں ھمہ اوست کے سوا اور کچھ بھی نہیں - اسی دنیا اور اس کی زندگی کو وہ more real than living being سے تعبیر کرتا ھے -

بہاری لال شیلی کے اس نظریے سے بے حد متاثر ہوئے ہیں -
لیکن شیلی نے جہاں ٹھوس حقیقتوں کو تسلیم کیا ہے وہاں
بہاری لال نے زندگی سے الگ ہو کر صرف تخییل کی دنیا آباد کی
ہے - بہاری لال کی نظموں بالخصوص "ساردا منگل" اور
"شاد ہر آشن" میں زندگی سے منفرد حسن ازل کا تصور بہت
بھر پور نظر آتا ہے - اس تصور کی وجہ سے اگرچہ حقائق
زندگی اس میں موجود نہیں ہیں تاہم جذب وشوق کا تصور
بہت زیادہ کار فرما ہے - انھوں نے شیلی کی طرح "ساردا"
کو اپنا ازلی محبوب تسلیم کیا ہے - اور اسی "ساردا" کے
حصول کیلئے بحر و بر اور کوہ و دشت سب میں تلاش و تفتیش کا
عزم دکھایا ہے - اپنے تصورات کے مثالی حسن کا بیان بہاری لال
اس طرح کرتے ہیں -

لومی بشّو مولی کا نتی ، دیپتی انو پوما
کو بیر ، جوگیر دھیان - بھولا بر یمیکر پران
مانب منے تومی آدار شو شما

" تم تمام دنیا پر سایہ افگن حسن ہو اور ایک بے نظیر نور ہو
تم شاعر اور جوگی کا تخیل ہو اور خود فراموش عاشق کی جان ہو
تم انسان کے دلوں میں بسنے والا آزاد حسن ہو - "

اس سے معلوم ہوا کہ شاعر کے تخیل میں ساردا کا حسن ایک ایسی مثالی چیز ہے جس کا وجودی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے - روبندرو ناتھ نے اسی لیے بہاری‌لال کے متعلق فرمایا ہے کہ ان کے دل میں ہر چہار طرف سے شاعری کا مشتعل نور ہر لمحہ ضیاپاش رہتا تھا - ان میں ایک مستقل سکون اور شاعرانہ مسرت موجود تھی -

بہاری لال سنہ ۱۸۳۰ع میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے سنہ ۱۸۹۴ع میں وفات پائی - ان کی منظوم تصنیفات متعدد ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور اور اہم تصنیف " شادِ ہرآشن " (مسکن لذت) اور " ساردا منگل " ہے - موخر الذکر ان کا شاہکار اور ان کی عظیم ترین تصنیف ہے - اس میں شاعر نے اپنے دل کے اندر بسنے والی شاعری کی دیوی کو جن جن عنوانات سے سمجھا اور اس کا ذکر کیا ہے وہ بے مثال ہے -

ان کی سب سے پہلی منظوم تصنیف " بنگو سندری " تھی - اس کے علاوہ اُن کی دوسری تصانیف یہ ہیں - شنگیت شتک " " مایا دیوی " " شرت کال " " دھوم کیتو " " دیبو رانی " " باؤل بنگشتی " " کبیتا و شنگیت " " شرگو سندرشن " " بندھو بیوگ " " پریم پرو پاہینی " اور " شپنو درشن " - موخر الذکر ایک منثور کتاب ہے -

بہاری لال کی نظموں کی زبان بہت سہل اور رواں ہے۔ صنائع لفظی کی آورد سے ان کا کلام پاک نظر آتا ہے۔ خیالات میں وسعت ہے۔ کہیں کہیں مختلف تخیلات بھی یکجا ہو گئے ہیں مگر ایسے مواقع پر واضح شستہ نظم نمایاں نہ ہوسکی۔

بلا شبہ بہاری لال کی زبان میں ایک بے پناہ آمد کا مظاہرہ ہوتا ہے اور یہی سبب ہے کہ جابجا ان کی زبان روز مرہ اور بول چال میں تبدیل ہو گئی ہے۔ کثرت استعمال نے صنائع کے التزام میں بھی رکاوٹ ڈالی ہے۔

ایک وقت میں ڈاکٹر روبندرو ناتھ پر بھی بہاری لال کا رنگ بہت غالب تھا۔ روبندرو ناتھ کا ابتدائی کلام بہاری لال کے مماثل نظر آتا ہے۔ کسی قدر اثر تو ان کے پختہ کلام میں بھی موجود ہے۔

سوریندرو ناتھ مجمدار:- ولادت سنہ ۱۸۳۱ء - وفات سنہ ۱۸۷۱ء

سوریندرو ناتھ نے ایک پہلی کتاب بہ نام "موھیلا" (عورت) بہاری لال کے زیر اثر لکھی ہے۔ اس میں ایک عورت کی مختلف حیثیتوں پر نظمیں ھیں۔ مثلاً عورت بحیثیت (ماتا)، ماں بہ حیثیت جایا (بیوی)، اور بحیثیت بھگینی (بہن)۔ عورت کو ان تین اقسام میں منقسم کر کے سوریندرو ناتھ نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عورت دنیا میں خداوند کریم کا ایک عظیم الشان

اکرام و انعام ہے نیز یہ کہ مردوں نے عورتوں ھی کی رفاقت میں حیوانیت سے ترقی کرکے انسانیت حاصل کی تھی - سوریندر و ناتھ کی نظموں کی زبان بہاری لال سے زیادہ سخت ہے اور ان میں سنسکرت زبان کے الفاظ اور تخیلات کثرت سے لائے گئے ھیں -

دیجندر و ناتھ ٹھاکور - سنہ ۱۸۴۰ــــ ۱۹۲۶ع

دیجندرو ناتھ ڈاکٹر رو بندرو ناتھ ٹھاکور کے برادر بزرگ ھیں ان کا مزاج فلسفیانہ تھا - وہ فلسفیانہ موشگافیوں میں لذت محسوس کرتے اور اپنی زندگی میں مصوری ، موسیقی سے بہت زیادہ انہماک رکھتے تھے - علم ھندسہ و ریاضی سے بھی انھیں بہت شغف تھا - انھوں نے حصول فنون کیلئے اس قدر اپنے خیالات کو وسیع بنایا نہ کسی فن میں بھی صاحب کمال نہ ھوسکے - ان کی نظموں میں مایوسی ، پستی ، قنوطیت اور ناپسندیدہ قید و ضبط کی کیفیت پائی جاتی ہے - ان کی مشہور نظم " شپنو پرویان " (سفر خواب) ہے - جو سنہ ۱۸۸۵ع میں شائع ھوئی - اس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ شاعر کا دل خواب میں سفر کررہا ہے - خواب کے مناظر نیز عجائب و غرائب کے مشاھدات پر انھوں نے اپنے نظم کی بنیاد رکھی ہے - ان کی خصوصیت سلاست زبان اور روز مرہ کا استعمال ہے - اسی وجہ سے ان کی نظم نے مقبولیت حاصل کی -

دیجلدر و ناتھ کی دوسری منظوم تصانیف یہ ہیں :—

" پدے براھمو دھرمسو " (نظم میں برھموسماج مذھب) سنہ ۱۸۹۸ع اور " کابیۂ مالا " ان دونوں کتابوں کے مضامین بہت ھی سطحی ہیں اور انھیں کوئی قابل ذکر تصنیف نہیں کہا جا سکتا ۔ ان کی لائق تذکرہ کتاب صرف "شپنو پر ویان" ھی ہے ۔ دیجندر و ناتھ میں صرف سہولت زبان کی خصوصیت نمایاں ہے ورنہ مضمون میں ربط کے بجائے انتشار پایا جاتا ہے ۔

دیجندر بابو نے " میگھ دوت " کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا جو سنہ ۱۸۶۰ع میں شائع ہوا تھا ۔ علاوہ ازیں ان کی منثور تحریرات بے شمار ہیں ۔

دیبندرو ناتھ سین ۔ ۱۸۵۸—۱۹۲۰ع

بہاری لال کی حسیں " گیتی کابو " کی ڈگر پر چل کر کامیابی حاصل کرنے والے دیبندر ناتھ سین تھے ۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو بھول کر سنیاسیوں کی طرح تخییل کی دنیا آباد نہیں کی بلکہ ھلکے رنگوں سے زندگی اور فطرت کی تصویر کشی کی ہے ۔ اس طرح انھوں نے مسرت کو حصول لذت سے آشنا کیا ہے ۔ ان کی نظموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مختلف مناظر میں سے جو چیزیں ان کی طبعیت کو پسند آئیں اور جن کیفیتوں کو ان کے ذوق سلیم نے قبول کیا اس اپنی پسند کو

انھوں نے مختلف عنوانات سے سمجھانے کی سعی کی ہے۔ دیبندر و ناتھ نے خوبصورتی اور سلاست کے ساتھ اپنی نظمیں مرتب کی ھیں ان کی نظمیں پڑھ کر اسی طرح خوشی محسوس ھوتی ہے جیسے ایک راھی راہ چلتے چلتے خوشنما پھولوں بھرے چمن سے گذرتے وقت ایک نامعلوم مسرت محسوس کرتا ہے۔ ان کی نظموں سے ھمارے ذوق لذت پسندی کو تسکین ھوتی ہے۔ ان کے کلام میں ترصیع لفظی کی بہتات ہے اسلئے یہ کہنا غلط نہ ھوگا کہ انھوں نے عروس سخن کو زیور الفاظ سے اچھی طرح سجایا ہے۔ ھم ان کی نظموں میں زندگی کی طرف سے بے توجہ ھوکر خوشی اور آنند کے رس کا میٹھا گھونٹ بے اختیار پیتے جاتے ھیں۔

دیبندرو ناتھ نے بنگلا میں بہت سے قطعات Sonnet بھی مرتب کئے ھیں - ان کی پہلی مطبوعہ کتاب کا نام "پھول مالا" ہے۔ اس کی متعدد نظموں کے عنوانات ھی سے ھم ان کی باغ و بہار طبعیت کا اندازہ لگا سکتے ھیں۔ مثلاً سورج مکھی، رکتو جبا (گل لالہ)، قدم پھول، گلاب وغیرہ۔ ان کی لائق ذکر کتابوں کے نام یہ ھیں :—

گلاپ گچھو (گلدستۂ گلاب)، پارِی جات گچھو، شفالی گچھو، اور اشوک گچھو۔"

تخییل کا یہ خواب آفریں طرز ادا اگرچہ دیبندر ناتھ کیلئے جزو زندگی بن گیا تھا تاہم انہوں نے انسانی اور سماجی مسائل سے قطعی بے تعلقی ظاہر نہیں کی ہے - یہ ساری چیزیں ان کی تصوری یا تخییلی زندگی میں محلول ہو کر رہ گئی ہیں -

اکھے کمار بڑال سنہ ۱۸٦۰ ـــ ۱۹۱۹ء تک

اکھے کمار دیبندر ناتھ سے مختلف طبعیت رکھتے تھے - انہوں نے جہاں زندگی کی عکاسی بڑے ہلکے رنگوں سے کی ہے وہاں درد و تاثر میں ڈوب کر اپنی تاثر انگیز زندگی کا ثبوت بھی دیا ہے - شاعرانہ حیثیت سے بھی انہوں نے بہت زیادہ محاسن شاعری سے واقفیت کا ثبوت پیش کیا ہے - بہاری لال کی طرح انہوں نے صرف تخییل کی دنیا ہی کو آباد نہیں کیا بلکہ وجود کی دنیا کو اچھی طرح سمجھا ، پرکھا اور محسوس کیا ہے - ساتھ ہی ایک مثالی (آئیڈیل) دنیا کے حسین تصور کو بھی ہاتھوں سے جانے نہ دیا - اس وجہ سے ہم کہیں کہیں ان کے کلام میں تخییل اور واقعی دنیا کے درمیان ایک کشمکش پاتے ہیں - اسی کشاکش نے ان کے کلام کو زیادہ جاندار بنا دیا ہے -

اکھے کمار کی تصنیفات پانچ ہیں - پرو دیپ ، کنوکا انجلی ، بھول ، شنکھو ، اور ایشا -

پرو دیپ اکھے کمار کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ہے

اور اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو منزل کی تلاش ہے لیکن ابتک منزل دستیاب نہیں ہوئی ہے لہذا وہ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اس کے ذریعہ شاعر کی مستقبل میں راہ ادب کی جھلکیاں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ واضح طور پر اچھے راستوں کی تعیین اُس وقت تک گو ان کیلئے دشوار تھی لیکن نشانات راہ ضرور نمایاں ہیں - انھوں نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ معمولی مسرتوں کے اندر سے اپنی پسندیدہ چیزوں کو محسوس کر کے منتخب کر سکیں - کہیں کہیں تقلید کو رانہ کا پرتو بھی نظر آتا ہے - اکثر و بیشتر شاعر کے جذبات کا اظہار موثر طور پر ہوا ہے - مثلاً ایک مختصر نظم کا اقتباس ملاحظہ ہو -

"کُھد رو ندو پھولر باشے شارانا بشنتو بھاشے
کُھد رو اُرمی مولے بولے پرو لولے پلابن
کھُدرو شُوکو تارار کا چھو چیرو اوشا جِگے آچھے
کھُد رو شپنیر پاچھے اننتو بھوبن"

ایک مختصر پھول کی خوشبو میں ساری بہار رواں دواں ہے -
ایک چھوٹی سی موج کے دامن میں ایک عظیم الشان طوفان پوشیدہ ہے -
ایک ٹمٹما تے ہوئے ستارہ صبح کے سائے میں لازوال صبح انگڑائیاں لے رہی ہے -

ایک مختصر سے خواب کے پیچھے ایک عظیم الشان دنیا آباد ھے -"

اکھےکمار کی تصنیفات میں ایشاھی ان کی سب سے اھم کتاب ھے - اپنی رفیقہ حیات کی وفات پر انھوں نے فراقیہ نظموں کے ذریعہ اپنے پرسوز موسیقار سے دکھ بھری تانیں الاپی ھیں - بنگلا ادب میں جس قدر غمناک نظمیں اور مراثی لکھے گئے ہیں ان میں اکھےکمار کی نظمیں سب سے بہتر مانی جاتی ھیں - ان نظموں میں شاعر نے اپنے سنسار، اپنے معتقدات، اپنی روز مرہ کی زندگی کے اندر جو خلا محسوس کیا اس پر اظہار غم و الم ھے - کشمکش حیات کا بہترین نمونہ ھمیں ان نظموں میں ملتا ھے - بیوی کی موت نے شاعر کو دل شکستہ اور حرماں نصیب بنا دیا تھا اس لئے وہ دیوانوں کی طرح اس تجسس میں ھے کہ آنے والی زندگی میں بھی وہ اس سے مل سکےگا یا نہیں - آئندہ زندگی میں کوئی متعین حقیقت بھی نظر نہیں آتی اسلئے ان کے دل میں اس سلسلے میں بے شمار سوالات اور اندیشے پیدا ہوتے ھیں - وہ تحقیق و تجسس کرتا ھے - خود کشی سے قاصر رھتا ھے - اپنے دل سے سوال کرتا ھے - مذھب کی طرف رجوع کرتا ھے - علم سے سبق لیتا ھے - لیکن ھر طرف سے مایوسی اسے اپنا بھیانک چہرہ دکھاتی ھے - اسی التہاب و اضطراب کی حالت میں وہ زندگی گذارتا ھے - رفتہ رفتہ یہی درد اس کیلئے درمان

بن جاتا ہے - کشمکش اور اضطراب میں وہ تسکین حاصل کرتا ہے
اور اسی متاع حیات پر قانع ہو جاتا ہے - اپنے اس قلبی اضطراب کی
تصویر کشی شاعر نے کچھ اس طرح کی ہے اُس کے تاثرات درد
دل کی عکاسی ہ شاہکار بن گئے ہیں -

اس زمانے میں بہت سی عورتیں بھی بنگلا زبان کی
ادیب اور شاعرہ گذری ہیں - انھوں نے اپنے دلی جذبات کے اظہار
کیلئے سہل زبان اور آسان طرز بیان اختیار کیا - شیرینی اور
عذوبت کی بہتات کے ساتھ تاثر اور رقت اُن کے کلام کا خاصہ ہے.
ان میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں :—

شرنو کماری دیوی سنہ ۱۸۵۵ع تا سنہ ۱۹۳۲ع

یہ روبندرو ناتھ کی بڑی بہن تھیں - بہت دنوں تک
انھوں نے ایک ماہنامہ بنام بھارتی کی ادارت بھی کی تھی -
ان کی تصنیفات میں متعدد ناول بھی ہیں - یہ ایک کامیاب نثر
نگار اور فاضلہ شاعرہ تھیں - انگریزی ادب و تمدن کے ملاپ سے
بنگالی ادب میں جو نئی زندگی پیدا ہوئی تھی اُس میں
نسوانی ادب کی ترقی اور توسیع کیلئے شرنو کماری دیوی نے
بڑی نمایاں خدمات انجام دی تھیں - کم و بیش جملہ اصناف ادب
میں انھوں نے خامہ فرسائی کی اور ہر ایک میں اپنے حسن ذوق کا ثبوت
دیا - ان کی قابل ذکر تصانیف " کبیتا و گان "، " دیپ نر تک "

منظوم ڈراما) ، " کانتھا " ، " بشنتو ' اور " آتشب " وغیرہ
ہیں - علاوہ بریں انھوں نے بہت سے ناول بھی لکھے تھے -
ناول نگاری میں ان کے فیوض بہت نمایاں اور قابل توصیف ہیں -

گریندرو موھن داسی : سنہ ۱۸۵۸ع تا سنہ ۱۹۲۴ع

اس شاعرہ نے اپنے شوھرکو مرنز محبت بناکر بہت سی فراقیہ نظمیں لکھی ھیں - دراصل شوھر کی وفات کے بعد ان کی شاعری کو شباب نصیب ھوا - ان کی کتاب " اشرو کونا " (قطرہ ھائے اشک) اور آبھاش (اشارہ) ان کی نظموں کا مجموعہ ھیں - ان کتابوں کی نظمیں درحقیقت ان کے درد دل کی آئینہ دار ھیں - ان کی زبان ترصیع سے خالی اور سلاست و صفائی کی آئینہ دار ہے - انھوں نے بھی جنبی کے نام سے ایک ماھوار رسالہ جاری کیا تھا - ان کی دوسری کتابیں یہ ہیں :-
" شودیشینی " ، " شندھو کانتھا " ، " شیکھا " ، "بھارت کوشوم"
اور " کبھتا ہار " -

کامینی رائے ــــ سنہ ۱۸۶۴ع تا ۱۹۳۳ع

کامینی رائے کو انیسویں صدی کی تمام شاعرہ خواتین میں سب سے بلند مقام حاصل ہے - ان کی نظموں میں فطری جذبات کی بہتات ہے - یہ ایک اعلی تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور وسعت نظر نے ان کی شاعری کو جلادی تھی - وہ سولہ کتابوں کی مصنف

بھی جن میں آلو چھایا (نور و سایہ) سب سے زیادہ بلند مرتبت ہے ۔

ان کی نظموں سے صنعت کلام کا اثر بھی نمایاں ہوتا ہے - انھوں نے خود ھی ایک خط میں لکھا ہے کہ سکھہ ' دکھہ ' بھوک ' پیاس امید ' تمنا ' عیش وافر اور غم فراواں وغیرہ ھی سے انسانی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے - جس طرح ان تمام باتوں کو سمجھنے کیلئے ایک بیدار قلب اور بصیرت افروز نگاہ کی ضرورت ہے اسی طرح انھیں ظاہر کرنے کیلئے شائستہ زبان اور سلجھے ہوئے خیالات کے ساتھ زبان پر قدرت کی ضرورت ہے -

کامنی رائے کی نظموں میں ہمیں درد کی چبھن اور حیات انسانی کے غم آفریں لمحات کی یاد نمایاں نظر آتی ہے - شوہر کی وفات نے ان کی نظموں میں بھی درد و اثر پیدا کیا ہے - ان کی مشہور کتاب " آلو و چھایا " پر ہیم چندر نے ایک مقدمہ لکھا ہے - ان کی دوسری تصانیف میں " درمالو " ، " اشوک شنگیت " ، " دیپ و دھوپ " اور " جیبن پتھے قابل ذکر ھیں -

مان کماری بوشو :— سنہ ۱۸۶۳ع تا سنہ ۱۹۴۳ع

مان کماری مائکل کی بھتیجی تھیں - انھوں نے متعدد ناول لکھے ھیں - ان کی منظوم کتابوں میں " کابو کُسم انجلی " اور " بکنوک انجلی قابل ذکر ہیں - قابل ذکر امر یہ ہے کہ ان کی بہت ساری مختصر نظمیں کیقباد کی نظموں کے ہم رنگ نظر

آتی ھیں - بالخصوص کیقباد کی نظم " بھول بھیٹکے دو " کو
مان کماری بشو کی نظم " بھانگھونا بھول " کے ساتھ زبان ، بحر
اور تخیلات میں بڑی مماثلت حاصل ہے - ان دونوں نظموں کے
مضامین البتہ مختلف ھیں - انھوں نے بھی بیوگی کے بعد ادبی
زندگی میں قدم رکھا - ان کی نظموں میں فراق اور ہجر کے
مضامین ھی زیادہ اھمیت رکھتے ہیں اپنے دل کی آواز سنانے
کیلئے انھوں نے آسان اور دلکش الفاظ کا انتخاب کیا ہے -

مزمل حق — سنہ ۱۸۵۸ع سے ۱۹۲۳ تک

مزمل حق اگرچہ ایک نثر نگاری حیثیت سے بنگلا ادب
میں شہرت اور مقام کے حامل ہوئے ہیں لیکن گلشن نظم میں
بھی ان کی بہار آفریں طبیعت کے فیضان سے انکار نہیں کیا جا سکتا -
غالبا بنگلا زبان کے وہ سب سے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے
خرد سال بچوں کیلئے ادبی کتابیں لکھیں اور اس حیثیت سے
انھیں اردو کے اسماعیل میرٹھی کے ساتھ مناسبت حاصل ہے -
مزمل حق کا خاص موضوع کلام کم عمر بچوں کیلئے درسی کتابوں
کی شکیل تھی - بچوں کی تعلیم و تربیت پر ان کی مندرجہ
ذیل کتابیں شہرت رکھتی ہیں - شاھتّو شکھا (تعلیم ادب) ،
پوڈّو شکھا (تعلیم نظم) ، شرل بنگلا شکھا (آسان تعلیم بنگلا) ،
شیشو رنجن برنو شکھا (بچوں کیلئے تعلیم حروف شناسی) ،

پتّر و دلهل لکهن شکها (دستاویزات و خطوط نویسی) وغیرہ وغیرہ۔
ان کی منظوم کتابوں میں جاتهو پهوارا (فوارۂ قومی)؟ اسلام شنگیت
کر شوم انجلی مطبوعہ سنہ ۱۸۸۱ع ' اپور بو درشن کابو مطبوعہ
سنہ ۱۸۸۵ع ' پریم ہار اور حضرت محمد مشہور و معروف ہیں۔
انهوں نے ایک منظوم ماہوار رسالہ بهی سنہ ۱۹۰۰ع میں جاری
کیا تها۔ ان کی منظوم کتاب " جاتیو پهوارا " سنہ ۱۹۱۴ع میں شائع
ہوئی۔ اس کے دیباچے میں شاعر نے کہا ہے۔ " جاتهو پهوارا
متعدد قومی نظموں کا مجموعہ ہے۔ بیمار قوم کے اضمحلال اور
اس کی بدنصیبی نیز انحطاط کو دیکھ کر وقتاً فوقتاً جو سب
نظمیں متعدد جلسوں میں پڑهی گئیں یا اخباروں میں شائع
ہوئیں یہ ان کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں کسی قوم پر طنزیا
کسی قوم کی مخالفت میں کوئی نظم نہیں لکهی گئی ہے۔
اسلام ایک وقت مسلمانوں کی عمدہ خصوصیات کی بنا پر
ضیا پاش اور ترقی پذیر ہوا تها۔ اس کی تمام تر ترقیوں کے
پیچهے مسلمان قوم کی بہادری ' دینداری ' شاعری ' معماری '
موسیقی اور دیگر علوم عالیہ اور فلسفہ وغیرہ کا شوق کارفرما
تها۔ آج اُن اسلاف کے اخلاف میں نہ وہ جوش عاملی ہے اور نہ وہ
کس بل۔ یہ امر مسلمانوں کیلئے بے حد اندوہناک ہے۔ شاعر کے
نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ پهر پارینہ داستانوں کو مسلمان

از بر کریں اور اپنی خوابیدہ قسمت کو اچھے حسن عمل سے بیدار کریں

ایک موقعہ پر وہ فرماتے ہیں -

السوشتا بیلاشیتا کری بڑی ھسار
لوبھی تے ھارانو دھنے ، کرو جتنے پران ہئے ،
شمّوکھے کرمو کھتّرو رونے چھے بستار ،
کھوچی بے شکل جالا ، ھانشی بے ابار

" سستی اور عیش پسندی کو ترک کرکے
کھوئی ہوئی دولت کو حاصل کرنے کیلئے جان و دل سے سعی کرو -
میدان عمل سامنے وسیع ہے -
تمام دکھ درد دور ہوجائیگا اور تم پھر ہنس سکوگے -"

اسلام شنگیت میں بھی شاعر نے اسلامی موضوعات پر مختلف نظمیں جمع کی ہیں - انمیں بھی قومی درد اور اسلامی تڑپ کا اثر نمایاں ہے - اس کتاب میں بھی مزمل حق نے اسلام کی لازوال تعلیمات اور ہمیشہ زندہ رہنے والی ہدایات کو بار بار یاد دلایا ہے - ان کے ہر سُر سے یہی آواز نکلتی سنائی دیتی ہے کہ اسلامی ہدایات اٹل ہیں اور انہیں قبول کئے بغیر ترقی کا خواب تشنۂ تعبیر رہے گا -

مزمل حق کی سب سے پہلی منظوم تصنیف " ہرمتی یا آداشیں " ہے - اس کے نام ہی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب

کسی انگریزی کتاب سے بنگلا میں منتقل کی گئی تھی۔

مزمل حق کی تمام منظومات میں ان کی کتاب حضرت محمدؐ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس میں شاعر نے حضرت محمدؐ کی سوانح حیات نظم میں پیش کی ہے۔ پیدائش، بچپن، عدل و انصاف اور عظمت و جلال کا تذکرہ کرکے شاعر نے آنحضورؐ کی حضرت خدیجہ کے ساتھ شادی اور پھر حصول نبوت و تبلیغ اسلام تک کے واقعات اس میں درج کئے ہیں۔ حضرت ابو بکر رضؓ کے قبول اسلام کے واقعات بھی مذکور ہیں۔ اس اعتبار سے یہ ایک ناتمام کتاب کہی جاسکتی ہے۔ لیکن جس قدر کتاب مرتب ہوئی ہے اس سے شاعر کی ادیبانہ قدرت کلام اور دیندارانہ جذبات اسلامی کا موثر انداز میں اظہار ہوتا ہے۔ اس کتاب کی زبان بہت جاندار، بہت وقیع اور بہت پر شکوہ ہے۔ کیقباد کی نظموں میں جو روانی اور سلاست ہے۔ اس سے بلند تر ہوکر ہم اس کتاب میں چست بندش، موثر الفاظ اور وقیع زبان کا کامیاب نمونہ پاتے ہیں۔ کیقباد نے اپنی محرم شریف میں" حضرات سیدین رضؓ کا تعارف مافوق البشریت خصائص کے انسان جیسا کرایا ہے لیکن مزمل حق نے اپنی اس کتاب میں حضرت رسول خدا کے بچپن اور جوانی کو اس طرح بشریت کے حدود میں رکھ کر پیش کیا ہے کہ وہ بچپن میں ہمارے بچوں ہی جیسے

بچے لیکن ساتھ ھی بے حد محبوب اور ستودہ تھے اور جوانی میں ھمارے جوانوں ھی جیسے جوان مگر چاندنی سے زیادہ بے داغ اور آفتاب سے زیادہ منور چال چلن کے مالک تھے - غرضکہ اس کتاب میں مزمل حق نے ھمارے رسول کی شان بشریت میں مافوق البشریت صفات کو بہت زیادہ اجاگر کرنے کی کوشش کی ھے - یہ کتاب سنہ ۱۹۰۳ع میں شائع ہوئی تھی - اس کی ضخامت تقریبا دو سو صفحات ھے -

اس کتاب کے متعلق شاعر نے مقدمہ میں خود بیان کیا ھے کہ انھوں نے قدیم رواج کے مطابق ابتداءا حمد، تذکرۂ شہر مکہ، زمزم، خانہ کعبہ، ان کی ابتدائی تاریخ وغیرہ اور پھر حضرت محمد ؐ کی ولادت مبارک سے نبوت اور تبلیغ اسلام تک کے احوال بیان کئے ھیں - مزمل حق نے پرتھی کی زبان نہ استعمال کرکے خالص بنگلا ادب پر دسترس حاصل کی تھی اور مسلم سماج میں بھی وہ اسی زبان کے مبلغ تھے - چونکہ انھوں نے اور ان کے ساتھ ھی دوسرے مسلمان ادیبوں نے خالص بنگالی زبان کو اپنایا تھا اسلئے مسلمانی بنگلا بھی ھندو ادیبوں کے ھم رنگ ھوگئی ھے -

---

شیخ فضل الکریم

۱۸۸۲—۱۹۴۶

شیخ فضل الکریم نے بھی حضرت محمد ؐ کے متعلق ایک بلند پایہ کتاب لکھ کر شہرت حاصل کی۔ یہ کتاب تقریباً دو سو آٹھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا نام " بوری تران گابو " (مصیبت سے نجات کی نظم) ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اہل عرب حضرت محمد ؐ سے پہلے ہر طرح کی سماجی، معاشی، اقتصادی اور عملی بدحالی کا شکار تھے۔ حضرت محمد ؐ نے انھیں ہر قسم کی بدحالی سے نجات بخشی۔ اس کتاب میں خصوصیت کے ساتھ اصول تبلیغ مذہب کے ساتھ ساتھ ان کے محاسن اور خصائص سے بحث کی گئی ہے۔ ہم اسے رسالہ لائف کے ایک مذہبی یا تبلیغی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

شاعر کے اپنے الفاظ سنئے :—

چھٹی صدی عیسوی سے پہلے جب تثلیث پرستوں اور مشرکوں کے باہمی اتحاد سے مقدس مذہب اسلام کی بیخ کنی شروع ہوئی اور جب عرب کے گھر گھر میں پتھروں کے مصنوعی معبود تقدس کا مقام پا رہے تھے اسی زمانے میں پروردگار عالم نے

بے فضل وکرم سے حضرت رسالت پناہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہر مکہ میں مبعوث فرمایا ۔ مسلمانوں کے ھادی اور رھنما حضرت محمد ؐ کے احوال زندگی کو ابدی نقوش کی صورت میں منقوش کرنے کیلئے " پوری قران کابو " کی تصنیف عمل میں آئی ۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ھماری امیدیں جس قدر بلند ہیں اظہار و بیان کی صلاحیت اور الفاظ میں وسعت اسی قدر کم ہے ۔ لیکن یہ صاحب واقعہ کی برکت اور واقعہ کی کرامت ہے کہ خود بخود تخیل واضح اور روشن ھوتا گیا ہے ۔ امید صرف اس قدر ہے کہ محبوب کردگار کی محبت کے متوالے ان بیانات سے اپنے حوصلے کے مطابق مستفید ھوتے رھیں گے "۔

شیخ فضل الکریم اور مزمل حق کی زبان میں یکسانیت کی نشانیاں پائی جاتی ھیں تاھم یہ ظاھر ہے کہ شیخ فضل الکریم کا مقصد مالکل اور نبین چندر کی تخییل اور زبان کی تخلیق تھی ۔ انھوں نے یہ بات خود مقدمۂ کتاب میں تسلیم کی ہے ۔

—:*O*:—

حصۂ سوئم

دسواں باب

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم کا ادب

گوبندو چندرو داس - رجنی کانتو سین - کرشن چندر مجمدار
نتوکرشنو بوشو - اکھے چندر چودھری - دیجندرو لال رائے
عبدالحمید خاں یوسف زئی
منشی محمد ریاض الدین احمد
منشی داد علی - سید امداد علی

سید علی احسن ——— مترجم — مولانا عبدالرحمٰن بیخود

دسواں باب

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگھم کا ادب

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگھم پر بنگال میں اصول قدیم کے پیرو شعرا کافی تعداد میں اپنے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل ٹپکانے کی سعی کر رہے تھے - ان میں مندرجہ ذیل لائق تذکرہ ہیں :—

۱ - گوبندو چندرو داس - ۱۷۵۴ تا ۱۹۱۸ع - یہ ایک فطرت نگار شاعر تھے اور تمام عمر انھوں نے فطرت کے ساتھ ہی اپنا تعلق باقی رکھا - ان کی زندگی بہت سارے مصائب کا شکار رہی ضلع ڈھاکا کی ریاست بھاول سے وہ متعلق رہے - ان کی زبان میں سلاست اور روانی کی بہتات ہے اور اسی لئے وہ صنائع لفظی و معنوی پر زیادہ قدرت کا اظہار نہ کر سکے - تشبیہات اور استعارات سے ان کا کلام یکسر خالی ہے - بعض بعض مقامات پر مضامین میں خشکی اور عدم وضاحت بھی نمایاں ہوتی ہے - تاہم مذکورہ نقائص کے باوجود انھیں عوامی شاعر تسلیم کرنا

بغیر چارہ نہیں ہے - دس کتابیں ان کی تصنیفات میں سے باقی ہیں - ان کتابوں میں انھوں نے اپنے متعارف احباب اور مقامات کا تذکرہ کیا ہے - ان کی بعض تصنیفات کے نام یہ ہیں :— "پرو شون' کُم کُم (قمقمہ)' پریم و پھول' کستوری' چندن' کول و رینو اور بوٹی جینتی وغیرہ -

۲ — رجنی کانتو سین - ۱۸۶۵ — ۱۹۱۰ع - یہ سراج گنج ضلع پبنا کے باشندے تھے - انھوں نے قومی جذبات اور حب الوطنی پر نظمیں لکھیں - تقسیم بنگالہ اول کے خلاف انھوں نے قلمی جہاد کئے اور انقلابی نظمیں لکھیں - اس سلسلے میں انھیں بڑی شہرت حاصل ہوئی - ان کی نظموں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنے پیدا کرنے والے سے بہت محبت اور عقیدت تھی - ان کی یادگار آٹھ کتابیں ہیں - جن میں سے " بانی "، " کلیانی " اور " امرت " نے زیادہ شہرت حاصل کی -

۳ — کرشن چندر مجمدار - ۱۸۴۵ — ۱۹۰۵ع یہ کھلنا کے رہنے والے تھے - صدپند کے طور پر انھوں نے ایک منظوم کتاب لکھی جو سنہ ۱۹۱۶ع میں ڈھاکا سے شائع ہوئی تھی - دیوان حافظ سے بھی مضامین اقتباس کر کے انھوں نے بنگلا میں منظوم کئے تھے بہت دنوں تک " ڈھاکا پروکاش " رسالے کے ایڈیٹر بھی رہے - ان کی خصوصیات میں یہ بات نمایاں ہے کہ انھوں نے فارسی

نعیهل سے بنگلا ادب کو معمور کرنے کی کوشش کی - عوام کے دکھ درد سے انھیں گہرا ربط ہے - انکی نظمیں انگریزی کی Epigram کی طرح ہیں -

۴ - رجنی کانت گپتا - سنہ ۱۸۶۵ تا سنہ ۱۹۰۰ع - ان پر انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کا بہت گہرا اثر پڑا تھا - اپنی منظوم کتاب " مایا دیبی " میں انھوں نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مظاہر فطرت کی پرستش ھی ذریعہ نجات ہے - ادبی قدروں کو سب سے پہلے بنگلا ادب میں انھی نے متعین کیا - اپنی کتاب " شاھتّو شیبک ایر ڈائری " (جدام ادب کی ڈائری) میں انھوں نے وقتی اور دائمی ادیبوں کی بڑی پر مغز تحقیق کی ہے -

۵ - اکھے چندر چودھری - سنہ ۱۸۵۰ تا سنہ ۱۸۹۸ع - ان کی تصنیفات میں تین کتابیں ہیں - " اُداشینی " " شاگر شنگھے " اور " بھارت گاتھا " - اکھے چندر نے سلیس زبان میں قومی نظمیں لکھی ہیں - انھیں زبان پر غیر معمولی مہارت اور قدرت حاصل تھی - انھیں شہرت کی بھوک نہ تھی مگر خدمت ادب کا جذبہ ضرور تھا - وہ فن موسیقی کے بڑے ماہر تھے - ڈاکٹر رو بندرو ناتھ نے اپنی سوانح حیات میں ان کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ان کے محامد اوصاف بھی بیان کئے ہیں -

۹ ـ دیجندر و لال رائے ۔ سنه ۱۸۶۳ع تا سنه ۱۹۱۳ع ۔ ان کی شہرت بحیثیت ایک ڈراما نگار کے زیادہ لیکن ان کے ظریفانہ گانوں اور آسان نظموں میں جس استواری کا پته ملتا ہے وہ ان کے ڈراماؤں میں نہیں ہے ۔ بنگلا زبان کی خدمت انھوں نے ابتداءاً اپنے ظریفانہ کلام سے شروع کی ۔ سنه ۱۸۹۰ع میں ان کی ایک تصنیف بنام " ایک گھرے " (مقاطعہ) شائع ہوئی ۔ اس زمانے میں جو ہندو انگلستان سے واپس آتے ان کے ساتھ یہاں کے قدامت پسند ہندو مقاطعہ کا برتاؤ کرتے تھے ۔ اسی عنوان پر انکی ظریفانہ نظموں کا یہ مجموعہ مرتب ہوا ۔ وہ صاحب تصانیف ہیں ۔ " آرّدو گا تھا " ۔ " آشاڑ ہے " (ظریفانہ نظموں کا مجموعہ) ' " ہنشیر گان " (ہنسی کے گانے) ' " مندرو " (آواز) ، " الکھ و " (تصویر) ، " تر یبینی " (تین قسم کی نظموں کا مجموعہ) و غیرہ انکی مشہور کتابیں ہیں ۔ ان کی انگریزی نظموں کا ایک مجموعہ بنام The lyrics of Ind بھی شائع ہوا تھا ۔ انھوں نے " آنندو بدایے " نامی ایک Parody بھی تصنیف کی تھی ۔ بنگلا ادب میں یہ پہلی Parody ہے ۔

دیجندر ولال کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تخییل آزاد ہے اور زبان و طرز ادا سے بلند حوصلگی اور قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے ۔ بعض اوقات سلاست اور توضیح کی شدت نے نظم کو

نثر کا جامہ پہنایا گیا ہے - جس کی وجہ سے صنائع شاعری میں کمی پیدا ہو گئی ہے -

دیچندر ولال کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بحروں میں تبدیلیاں پیدا کرنے اور فن عروض میں نئی بحروں کے اضافے کی بھی کوشش کی ہے - ان کی نظموں کے مجموعے کافی ضخیم ہیں -

۷ - عبد الحمید خاں یوسف زئی :- یہ ضلع میمن سنگھ میں محکمہ تنگائل کے موضع چاران گرام کے رہنے والے تھے - اب سے تقریباً پچاس سال پہلے عبد الحمید خاں یوسف زئی نے اداسی نام کی ایک ضخیم منظوم کتاب شائع کی تھی - یہ کتاب دراصل تین کتابوں کا مجموعہ ہے - پہلی کتاب کا نام اداسی ' دوسری کا نام کیرن پروبھا (حسن شعاع) اور تیسری کا نام " ارون بھاتی " (شعاع مہر) ہے - یہ پوری کتاب عشقیہ نغمات سے معمور ہے - ان کی نظموں سے عام طور پر غمگینی ' اداسی اور رقت ظاہر ہوتی ہے - انکی کتاب ایک منظوم ناول ہے جو پڑھنے والے کو درد و غم کے ساگر میں غوطے دیتا معلوم ہوتا ہے - رومانوی کیفیت اور تغزل کی تخییل ان کے یہاں وافر ہے -

۸ - منشی محمد ریاض الدین احمد — سنہ ۱۸۶۲ع

یہ اپنی ادیبانہ خدمات سے زیادہ قومی خدمات میں نمایاں تھے -

اں کا تعلق بہت سارے اخبارات مثلا مسلمان ، نبو شو دھا کر ، سلطان ، مہرو شو دھا کر ، بدو جگ ، رعیت بندھو او ر مسلم بانی وغیرہ سے تھا ۔ اغلب ہے کہ کریشک بندھو مجموعہ نظم کے مصنف یہی ہیں ۔ اس مجموعے میں کسانوں کی ترقی کیلئے انھوں نے بہت افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ کسانوں کی بھلائی ہی میں انھوں نے عام مسلمانوں کی بھلائی کا جلوہ دیکھا ہے ۔ مشہور صاحب علم و مصنف ودیا ساگر کی کتاب " بودھو دئے " کی بعض غلطیاں ظاہر کرکے انھوں نے ممدوح الصدر کے نام ایک خط لکھا تھا اور ودیاگر نے ان غلطیوں کو تسلیم بھی کیا تھا ۔ مصنف نے مسلمان کسانوں کے مصائب کا حال بڑی دلسوزی سے لکھا ہے ۔ انھی کی ترقی میں انھوں نے ملک کی ترقی کا خواب دیکھا ہے ۔ قومی اتحاد کے ترانے بھی ان کی نظموں میں موجود ہیں ۔ وہ بحیثیت شاعر زیادہ شہرت کے مالک نہیں ہیں ۔ انکی نظمیں دراصل قومی اصلاح سے متعلق ہیں ۔

۹ ۔ منشی داد علی :— ان کا وطن کشٹیا تھا ۔ ان کی دو منظوم کتابیں ہیں "بھانگا پران" (شکستہ دل) اور عاشق رسول"۔

بھانگا پران درحقیقت کیقباد کی " اشر و مالا " یا نبین چندر کی " ابو کاش رنگینی " جیسی ایک کتاب ہے ۔ اس میں دکھ اور درد کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں ۔ لیکن "گیتی کابو" میں جو خود

ra موشی اور استغراق ہے اس کا ان کی نظموں میں پتہ نہیں ہے -
ان کے یہاں دردو غم کی بہتات ہے -

عاشق رسول میں شاعر نے حضرت محمد کے احوال زندگی میں سے بعض منتخب واقعات کو موضوع کلام بنا کر نظمیں مرتب کی ہیں - بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو انہوں نے ان واقعات کے پردے میں حقیقت کی راہ دکھائی ہے - ادبی عذوبت اور لسانی ملاحت کا اس کتاب میں تصور نہیں ہے - دلسوزی اور محبت کے ساتھ بیان واقعہ ہے - مقدم الذکر کتاب سنہ ۱۹۰۵ع میں اور موخر الذکر سنہ ۱۹۰۷ع میں شائع ہوئی تھی -

۱۰ - سید امداد علی :- پیدائش غالباً سنہ ۱۸۷۵ع -
ہارز نقید حیات ہیں -

یہ ضلع ڈھا کے مشہور مقام بکرم پور کے باشندے ہیں - ڈالی کابو (پھولوں کی ڈالی) کے مصنف کی حیثیت سے ان کی شہرت ہے - اسلام اور مسلمان کی زندگی ہی ان کی نظموں کا موضوع ہے -

حصۂ سویم

گیارھواں باب

ڈراما نگاری اور

بنگال کے ڈرامائی ادب میں مسلمانوں کا حصہ

رام نرائن ترکو رتنو - دینو بندھو متر - گریش چندر گھوش

دیجندر و لال رائے - کھیرود پرشاد بدّیا بنود

میر مشرف حسین - محمد عبد الکریم

ندرالاسلام - ابراھیم خاں

شہادت حسین - اکبر الدین

نور المومن

سید علی احسن ——— مترجم— مولانا عبد الرحمٰن بیخود

گیارھواں باب

ڈراما نگاری

بنگلا ادب میں فن ڈراما نگاری در حقیقت مغربی ادب کے براہ راست تعلق کی بنا پر پیدا ہوا - دور قدیم کے سنسکرت ڈراموں کے خاتمے پر اس ملک میں ڈراما نگاری تقریباً ناپید ہو چکی تھی - اور ان ڈراموں کا انیسویں صدی کے ڈراموں سے کوئی تعلق بھی نہ تھا - بعض بعض لوگوں نے قدیم طرز ڈراما نگاری پر بنیادیں رکھ کر بعض ڈرامے لکھے تھے لیکن اس سے کسی طرز کی بنیاد نہیں پڑسکی - لیکن دور وسطی کے طویل عہد میں نظموں کے سوا کسی ڈرامے کی تحقیق کا پتہ نہیں ملتا - مسلمانوں کے دور میں مسلمان حکمرانوں نے نظم نگاری کی حوصلہ افزائی ضرور کی لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انھوں نے ڈراما نگاری کی پشت پناھی کی جانب بھی قدم بڑھایا - تاھم عوام کی فطرت کو ڈراما نوازی سے جو فطری مناسبت تھی وہ اگر چہ حوادث اور عدم سرپرستی کی وجہ سے مردہ ہو چکی تھی لیکن اُس کی دبی ہوئی چنگاریاں ہمیں "جاترا" میں نظر آتی ہیں - جاترا میں اسٹیج، سینری اور پردے کی ضرورت نہ تھی بلکہ یہ ایک طرح کی موسیقی نواز نظمیں

تھیں جن میں مکالموں اور رقص وسرود کی آمیزش تھی۔ عموماً جاترا کے بند دیویوں اور دیوتاؤں سے متعلق ہوتے تھے۔ بالخصوص کرشن ان جاتروں کے عمومی ہیرو تھے اور رادھا کے ساتھ ان کے معاشقانہ معاملات اور رنگ رلیوں ہی کو جاترا کیلئے موضوع کلام بنایا گیا تھا۔ زمانۂ مابعد میں دوسرے قصے بھی مثلاً بدیا وسندر وغیرہ جاترا کے موضوع بنے تھے۔ لیکن اصولی زندگی سے ان ڈراموں کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا۔ تاہم طبیعتوں نے اپنی تسکین کیلئے "کوبی گان، پنچالی، کتھو کتا، ٹپا" کیرتن اور ہاف اکھڑائی وغیرہ کی تخلیق کی تھی۔ لیکن انیسویں صدی کے کلکتے میں جو درمیانی درجے کا سماج پیدا ہوا وہ جاترا کے نغموں سے تسکین حاصل نہ کرسکا۔ اس وقت ان کے ذوق کی تسکین کیلئے بالخصوص مغربی ڈراماؤں کے زیر اثر بنگال میں بھی نئے انداز پر ڈراموں کی تخلیق ہوئی جاترا کے گانے چونکہ عوام کو بےحد مرغوب تھے اور جدید ڈراموں میں ان کی کمی تھی اس لئے نئے ڈراموں میں ابتداءً اُس کے اثرات بھی باقی رہے۔

اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ یہاں میں بعض بنگالی ڈرامے لکھے گئے تھے۔ ہمیں ان ڈراموں میں بنگالی ڈراموں کی تدریجی ارتقا کا اگرچہ کوئی نشان نہیں ملتا لیکن

یہ بات قابل ذکر ضرور ہے کہ ان ڈراموں کی تخلیق نے ہمیں جستجو کے میدان میں آگے بڑھانے پر اکسایا - یہ ڈرامے اگرچہ " نیاری " حروف میں لکھے گئے تھے لیکن انکی زبان بنگلا ہے - ہندی اور میتھلی الفاظ کا انمیں اختلاط بھی ہے - اغلب ہے کہ نیپال کے راج دربار میں جو برھمن ملازم تھے یہ انھی کی کوششوں کا نتیجہ تھا - اس لئے بنگالی ڈرامانگاروں نے جدید طرز کے ڈاموں میں بھی جاترا کے طرز پر گانوں کو باقی رکھا -

کلکتے میں ایک تھیٹر خانہ سنہ ۱۷۵۶ع میں تعمیر کیا گیا تھا - اس کے بعد ھی سے بنگال کے تعلیم یافتہ طبقے میں ڈراما نگاری اور ڈراما بازی کی طرف رجحان پیدا ہوا - سنہ ۱۷۹۵ع میں ھیراسم لی بیڈوف Herasim lebedoff ایک روسی صاحب قلم نے انگریزی کے دو ڈراموں کا بنگلا میں ترجمہ کرکے اسٹیج کیا - جہاں تک معلوم ھو سکا ہے یہی دو بنگالی ڈراما سب سے پہلے نئے طرز پر اسٹیج کئے گئے تھے - لیکن یہ یقینی ہے کہ یہ تخلیقی ڈرامے نہ تھے بلکہ دوسری زبان سے ترجمہ کرکے ھماری زبان میں لائے گئے - پرسنو کمار ٹھاکور نے سنہ ۱۸۳۴ع میں ایک نجی تھیٹر خانہ تعمیر کیا اور اس میں بھارت چندر کی نظم بدیاسندر کو ڈرامے کے طرز پر اسٹیج کیا گیا - تاھم یہ صحیح ہے کہ باعزت لوگ اس زمانے میں ڈرامانویسی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے - ڈراما کے متعلق

اس زمانے میں ایک مشہور کہاوت یہ تھی — " ناٹک نامشتی، " یہ ڈراما ہے یا مٹھائی " - راجا رام موھن رائے کے " شنگباد پتر اور شنگباد کومودی " میں " کلی راج جاترا " کے نام سے ایک قدیم ڈرامے کے متعلق تنقید شائع ہوئی تھی - اس تنقید سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دراصل جاترا ھی کی ایک قسم تھا یا یہ ایک ایسا ناول تھا جس میں مکالمات بھی داخل تھے - اس میں ڈرامے کی خصوصیات تلاش سے بھی نہیں ملتیں -

انیسویں صدی کے وسط میں ھمیں کسی قدر وسعت کے ساتھ ڈراماؤں کی ایجاد کا پتہ ملتا ہے - مثلاً نیل منی بسال کا مرتبہ " رتنا بلی "، تارا چاند سکدار کا مصنفہ " بھدرا ارجن " نند کمار رائے کا ابھگیان شکنتلا اور کالی پرشنو سنگھ کا " بابو ڈرامہ " اسی زمانے میں لکھا گیا - اسی طرح ھرچندر گھوش کا " بھا نومتی چتو بلاش " بھی اسی عہد میں لکھا اور اسٹیج کیا گیا - ادبی حیثیت سے یہ ڈرامے بہت وقیع اور بلند پایہ نہ تھے - ان پر سنسکرت ڈراموں کا اثر غالب تھا اور اکثر و بیشتر ان کا موضوع سخن قدیم پورانی افسانے ھی تھے -

رام نارائن ترکو رتنو - ۱۸۲۳ ۱۸۸۵

" کولین کول شربشو " کو واقعی حیثیت سے بنگال میں جدید ڈراما نگاری کا سنگ بنیاد کہا جاسکتا ہے - یہ سماجی ڈراما

سنہ ۱۸۵۷ع میں اسٹیج کیا گیا اور اسی وقت سے ڈراما نگاری کو ایک فن کی حیثیت سے اعلیٰ گھرانوں میں قبول کیا گیا۔ امرائے ملک مثلاً مہاراجا جوتندر موہن ٹھاکور، راجا ایشور چندر سنگھ اور راجا پرتاپ چندر سنگھ وغیرہ نے خود مالی امداد دے کر ڈراما نگاری کی سرپرستی قبول کی۔ ان صاحبان دولت و اقتدار کی سرپرستی کی وجہ سے بنگال میں ڈراما نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ رام نارائن موصوف نے چار تخلیقی ڈرامے لکھے۔ ان میں سے "نبو ناٹک" کو عام طور پر ان کا شاہکار تسلیم کیا گیا ہے۔ انھوں نے بہت سے سنسکرت ڈراموں کا بنگلا زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ ان کا ایک مترجمہ ڈراما "رتناولی" سنسکرت سے بنگلا میں منتقل کیا گیا تھا۔ اسی ڈرامے کو پڑھ کر مائکل مدھو سودن دت نے بنگالی زبان میں نئے طور پر ڈراما نگاری کی بنیاد رکھی تھی اور اسی ڈرامے نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ڈرامے کی ادبی اہمیت پر غور کریں۔ رام نارائن موصوف چونکہ سنسکرت زبان کے بڑے ماہر عالم تھے اس لئے ان کے سب ڈراموں پر سنسکرت زبان کے ڈراموں کا اثر غالب تھا۔ نہ تو انھوں نے کرداروں کی تخلیق کی جانب نظر کی اور نہ نتائج پر نگاہ رکھی۔ اس دور تک کے ڈراموں میں یہ نقص عام تھا۔ ان کے نزدیک ڈراما نگاری کا عمومی مقصد صرف

تفریح تھا۔ بعض بعض ڈراموں میں بعض عوامی قبیلہ کی اصلاح
پیش نظر ضرور دکھائی دیتی ہے۔ لیکن انگریزی میں جسے
Holding the mirror upto the nature کہتے ہیں اس کا کچھ نہ
نمونہ ہمیں رام نرائن کے ڈراموں میں نظر آتا ہے۔ تاہم ہم
چونکہ ڈراما نگاری ابتدائی دور میں تھی اس لئے کردار نگاری کی
تکمیل نامکمل دکھائی دیتی ہے۔

رام نارائن نے متعدد ڈرامے لکھے تھے۔ " کولین کول سر بشو "،
" نبو ناٹک "، " رکنینی ہرن "، اور " شپھنو دھن "۔ ان۔
بعض المیہ ڈراموں میں ٹریجڈی کا مکمل نمونہ نظر نہیں آتا
اور اس کا اہم سبب یہی ہے کہ ان پر سنسکرت کے طرز کا
اثر غالب تھا۔ اس قسم کے ڈرامے بھی اصلاحی ضرور
کہے جا سکتے ہیں۔

رام نارائن نے سنسکرت کے بے شمار ڈراموں کے تراجم کئے تھے۔
تاریخی ڈراموں کی حیثیت سے " رتنا بلی " کا نام خاص طور پر
قابل ذکر ہے راجا ایشور چندر سنگھ اور جتیندر موھن ٹھاکور کی
کوششوں سے بیلگچھیا میں ایک نگار خانہ قائم ہوا تھا۔ اسی نئے
نگارخانے کیلئے رام نارائن نے " شری ھرش " کے سنسکرت ڈرامے
" رتنا بلی " کا بنگلا میں ترجمہ کیا تھا۔

مدھو شودن نے مغربی طرز پر سب سے پہلے بنگلا زبان میں

ڈراما نگاری کی بنیاد رکھی اور آج تک وہی طرز بنگالی ڈراما نگاری کا سرمایۂ افتخار ہے ۔ اسی بنیاد پر مائکل مدھوسودن دت کو بنگلا ڈراما نگاری کا موجد یا ابوالآبا کہا جاتا ہے ۔ مدھوسودن نے چھہ ڈرامے لکھے تھے جس میں ان کا المیہ ڈراما کرشنو کماری شاہکار سمجھا جاتا ہے مدھوسودن نے دو طربیۂ ڈرامے بھی سماجی اصلاح کیلئے لکھے تھے ۔ جن کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے ۔ جس بیلگچھیا کے نگارخانہ میں سب سے پہلے بنگالی ڈرامہ اسٹیج کیا گیا تھا اُس کی نقل دوسرے بہت سے لوگوں نے کی ۔ پتھریا گھاٹا اور بہو بازار کے نگارخانے خاصی شہرت رکھتے تھے ۔ یہ سب ذاتی طور پر اتملم شوق کیلئے بنائے گئے تھے ۔ ہمیں اس دور میں کسی قومی نگار خانے کا حال نہیں معلوم ہوتا ان نگارخانوں کے ساتھ عوام کو کوئی تعلق حاصل نہ تھا ۔ اس کے ذریعہ صرف دولتمندوں نے اپنے اپنے شوق کی تکمیل کا سامان مہیا کیا تھا ۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ نگارخانوں کی توقعات محدود ہو کر رہ گئی تھیں ۔ وہ طبائع جنہیں اس خاص فن کے ساتھ مناسبتیں تھیں اور جو موقع پاکر انہیں معراج ترقی تک پہنچا سکتے تھے انہیں تکمیل فن کے مواقع نہ مل سکے ۔

سنہ ۱۸۶۷ء میں گریش چندر سین نے شوقیہ طور پر باغ بازار میں ایک تھیٹر قائم کیا ۔ اسی تھیٹر نے زمانۂ مابعد میں ایک

قومی تھیٹر کی حیثیت حاصل کی - گریش چندر خود بھی ایک کامیاب ایکٹر تھے - اسی کے ساتھ ساتھ ان میں ڈراما نگاری کا ملکہ بھی راسخ تھا - اس قومی نگار خانے میں سب سے پہلا ڈراما دین بندھو متر کا مرتبہ " لیلاوتی " اسٹیج کیا گیا -

مائکل کے بعد قابل ذکر ڈراما نگار دینو بندھو متر ہیں -

دینو بندھو متر - ۱۸۲۹ــــ۱۸۷۲ع - سماجی بیداری کا تصور ان کی خصوصیات میں سے ہے - دینو بندھو متر سے پہلے بھی ہمیں قومی بیداری کے متعلق ڈرامے ملتے ہیں - مثلاً " کولینو پرتھا " بالوّ بیبہا ھو پرتھا ، بہو بیدھو ، بیدھو با بیدھاھو " وغیرہ - اس طرح کے مختلف امور سے متعلق طربیہ ڈراموں کی تخلیق پہلے ھی ہو چکی تھی - رام نارائن کی کتاب " کؤلینو پرتھا " کی تبعیت میں " کولین کول شرسشو " ڈراما ، " بہو بیدھا ھو " کی تبعیت میں تارک چندر چوڑامنی نے " شپتنی " نام کا ایک ڈراما لکھا - اسی طرح " سوراپان " (شراب نوشی) کی تبعیت میں مائکل نے " ایکے ای کی بولے سبھّوتا " (کیا اسی کو تہذیب و تمدن کہتے ہیں) لکھی - ان ڈراموں میں قومی اصلاح اور بیداری کی نشانیاں موجود ہیں - لیکن ان میں سے کسی ڈرامے نے بھی قومی حدود سے آگے بڑھ کے انسانیت کے حوائج کو پورا نہیں کیا ہے اور اسی لئے انھیں وہ درجہ حاصل نہ ہوسکا

جو ایک ادبی ڈرامے کو ملنا چاہئیے تھا ۔ عوامی دکھ درد اور انسانی مسرتوں کا انمیں فقدان ہے ۔ دینو بندھو متر ھی نے سب سے پہلے بنگالی زبان میں عام انسانی حوائج کی تلاش میں اپنی دماغی صلاحیتوں کو صرف کیا ہے

وہ انیسویں صدی کے ایک بلند پایہ اور مشہور ڈرامانگار ہیں ۔ ان کی شہرت نیل درپن کی وجہ سے ہوئی ۔ یہ ڈراما سنہ ۱۸۶۰ء میں شائع ہوا تھا ۔ اس وقت بنگال کے دیہاتوں میں انگریز نیل کی کاشت کی جانب خاص طور پر متوجہ تھے ۔ اس سلسلے میں وہ دیہاتیوں پر بےحد مظالم کرتے اور اپنی منفعت کیلئے وہ هر جور روا کو روا سمجھتے ۔ عوام کی مظلومیت سے متاثر ہو کر دینو بندھو متر نے یہ ڈراما لکھا اور اس میں انگریزوں کے مظالم کی بہترین عکاسی کی ۔ مدھوشودن دت نے گمنام طور پر اس کا انگریزی ترجمہ کیا اور ایک پادری ریورینڈ جیمس لانگ نے اسے شائع کیا ۔ یہ کتاب ہندوستان اور انگلستان کے مشاہیر کے پاس پہنچی گئی ۔ نیل کے کارخانہ دار انگریزوں نے جیمس لانگ کے خلاف مقدمہ دائر کیا اور انھیں مظلوموں کی حمایت کی پاداش میں کچھ دنوں کیلئے جیل بھی جانا پڑا ۔ اگرچہ ظاہری طور پر اس مقدمے میں نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تھی لیکن اسی

کتاب کا اثر تھا کہ تھوڑے ھی دنوں میں نیل کی کاشت کا بنگال سے خاتمہ ہوگیا -

یہ کتاب اگرچہ اصلاحی ہے اور ایک خاص مقصد کے پیش نظر لکھی گئی ہے لیکن اس میں عام دیہاتی انسانوں کے دکھ درد کا جن الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے - وہ بنگالی زبان میں بالکل جدید حیثیت کے مالک ھیں - ھمیں اس ڈرامے میں کشاکش حیات اور عام انسانوں کی گوناگوں خصوصیات کا بھی منظر دکھائی دیتا ہے - اس کتاب کی زبان اور کردار دونوں اپنے اپنے مقاصد کو واضح کرتے ھیں - کشمکش کی تھلجھن میں انھوں نے بڑی خوبی سے اپنا کمال دکھایا ہے - یہی چیز ایسی ہے جس میں بہت سے مصنف لغزش کھا گئے ھیں - دینو بندھو متر کے ڈرامے آج بھی فطری شوق کیلئے جاذبیت رکھتے ھیں - اسے پڑھنے والے ایک غیر محسوس اضطراب کی کیفیت پاتے ھیں -

ڈراما نگاری ایک خاص فن ہے - اس کے کردار میں ھیرو اور ھیروئن کو بڑی خصوصیت کا حامل ہونا پڑتا ہے - انھیں اپنے مقاصد کے مطابق بڑی بڑی دشواریوں میں سے راہ نکالنی پڑتی ہے - اور جس قدر یہ سفر فطری ہوتا ہے اسی قدر اس کے مصنف کو کامیابی حاصل ہوتی ہے -

" نبین تپشنی " اور " لیلاوتی " بھی دینو بندھو متر کے

دو جزوی حیثیت سے عمیق تخیلات کے حامل ڈرامے ہیں -

دینو بند ھو سماجی رسم و رواج کے واقف ایک خشک فلسفی تھے - جو واقعات اس دنیا کے رنگ و بو میں ان کی نظروں کے سامنے سے گذرے یا جو کہانیاں ان کے گوش گذار ہوئیں انہیں بہتر کامیابی کے ساتھ انہوں نے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی -

دینو بندھو متر نے بہت سارے ظریفانہ اور طنزیہ ڈرامے بھی مرتب کئے تھے جنمیں جمائی بارک ' اور بی اے پگلا بوڑھو وغیرہ مشہور ہیں - دینو بندھو کی خصوصیت ان کے مکالموں میں ہے - انہوں نے ان مکالموں کے ذریعہ سے کیریکٹر کو زندہ کر دکھایا ہے - تاہم ان کے ڈراموں میں تہذیب اور متانت کی کمی ہے - سنہ ۱۸۷۳ع میں گریش چندر گھوش کا قومی نگار خانہ بند ہوگیا - اس کے بعد بیڈن اسٹریٹ میں " بنگال تھیٹر " قائم ہوا - اس کے علاوہ " ہندو نیشنل تھیٹر " ، اور رینتیل تھیٹر ، گریٹ نیشنل تھیٹر " اور " دی انڈین نیشنل تھیٹر " وغیرہ وجود میں آئے - گریش چندر گھوش نے سنہ ۱۸۷۳ع کے بعد " اسٹار تھیٹر " قائم کیا - اس کے بعد " منروا تھیٹر " اور کلاسک تھیٹر بھی انہیں نے قائم کیا -

گریش چندر گھوش

گریش چندر گھوش اس دور میں سب سے زیادہ مشہور ڈراما نگار گذرے ہیں۔ عوامی اور قومی نگار خانے کے قیام کی حیثیت سے انھیں لازوال حیثیت حاصل ہے۔ ان کا زمانہ سنہ ۱۸۴۴ء سے سنہ ۱۹۱۱ء تک کا ہے۔ قدرت نے ان میں عجیب و غریب فطری صلاحیتیں رکھی تھیں۔ مختلف کردار میں Acting پر انھیں بےمثال مہارت حاصل تھی۔ حقیقت میں ڈراما نگاری کو مستقل فن کی حیثیت دینے والے یہی تھے۔ بہ خود اعلیٰ درجے کے ایکٹر، نگار خانے کے مالک، پرو ڈیوسر اور ڈراما نگار تھے۔ یہ تمام صفتیں ان میں بیک وقت موجود تھیں۔ سب سے پہلے انھیں نے عورتوں کا کردار ادا کرنے کے لئے عورتوں کا انتخاب کیا اور بنگالی ڈراموں کے اسٹیج پر عورتوں کو ایکٹریس بنا کر پیش کیا۔ قدرت نے انھیں ان تمام کاموں میں کمال بخشا تھا جن کا اس فن سے تعلق ممکن ہے۔

معاشرتی، سماجی، مذہبی اور سیاسی نیز دوسرے کثیر مضامین پر مشتمل ڈرامے گریش چندر گھوش کی یادگار موجود ہیں۔ انھوں نے رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا اور چیتنیہ وغیرہ کی زندگی کو بھی ڈراموں کی صورت میں پیش کیا ہے۔

ان کے مذہبی ڈراموں میں " جنا " ، پانڈ رب گورب " ، " تو پوبن "، " بدھودیب ' ، " شنکرا چاریہ " اور چتنّہ لیلا " وغیرہ مشہور ہیں -

سماجی ڈراموں میں " پرو فلو ' بلیدان ' ہارانیدھی ' شا ستی کی شانتی " وغیرہ قابل ذکر ہیں -

تاریخی ڈراموں میں سراج الدولہ ' میر قاسم ' چھتّر و پتی اور اشوک وغیرہ کو شہرت حاصل ہے - بنگالی قومیت کی ایک آزاد تصویر کشی انھوں نے سراج الدولہ اور میر قاسم وغیرہ ڈراموں میں کی ہے - اس کے علاوہ انھوں نے موسیقی سے متعلق طربیہ ڈرامے بھی لکھے ہیں جن میں " الہ دین " ، " ابو حسین " ، اور " جیسا کو تیسا " وغیرہ قابل ذکر ہیں - دوسرے مصنفین کی مشہور و معروف کتابوں کو بھی انھوں نے ڈراموں کے روپ میں ڈھالنے کی کوششیں کی تھیں - مائیکل کے " میگھنا د بود کابو " اور بنکم چندر کے متعدد ناولوں کو بھی انھوں نے ڈراما کے قالب میں ڈھال دیا تھا - حیرت ناک امر یہ ہے کہ انھوں نے شیکسپیر کے مشہور ڈرامے میکبتھ (Macbeth) کو بھی بنگلا ڈرامائی نظم میں تبدیل کر دیا تھا - یہ ترجمہ نہایت کامیاب اور پر زور ہے -

جن اسباب کی بنا پر گریش چندر گھوش نے غیر معمولی شہرت حاصل کی وہی اسباب حقیقت میں اس فن کی

عہد نظمی کے دمہ دار بھی تھے - اس میں شک نہیں کہ وہ اداکاری کے بادشاہ اور خود ایک کامیاب ایکٹر تھے اور یہی سبب ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ان کی ان مخصوص صلاحیتوں نے ان کی ڈراما نگاری میں بڑی طاقت کے ساتھ ایک خاص رخ اختیار کر لیا - انسانی طبیعتوں کو بعض خاص امور اور زندگی کے خاص رخوں کے ساتھ امتیازی لگاؤ ہوتا ہے اور اپنے طبعی میلان کی وجہ سے وہ ہر رنگ کو اسی رنگ میں مدغم کرنے کی کوشش کرتی ہیں - گریش چندر سین میں بھی یہ بات نمایاں ہوتی - وہ اپنے مخصوص طرز کو کرداروں میں جگہ دینے کی کوشش کرتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کی ہمہ گیری میں نقائص آشکار ہوئے — زبان پر بھی اثر پڑا اور اسکی آفاقیت ختم ہو گئی - جوش و خروش کم ہو گیا - زندگی میں سطحیت نمایاں ہو گئی اور اس کی اندرونی کشش میں جاذبیت کا فقدان ہو گیا -

یہ بتایا جاچکا ہے کہ گریش چندر سے پہلے ڈراما ایک تفریحی حیثیت رکھتا تھا جسے بڑے لوگوں کے تھیٹر خانوں میں اسٹیج کیا جاتا تھا - انھوں نے اپنی مساعی سے ڈراما نگاری کو بحیثیت فن کے ترقی دیکر عوامی ملکیت بنا دیا - خود اپنی زندگی میں کم و بیش اسّی ۸۰ ڈرامے لکھے اور اکثر و بیشتر کو خود اسٹیج کیا -

پبلک نگار خانوں کی ترقی کے دور میں "بابو منو موھن بوسو" ایک مشہور ڈراما نگار گذرے ھیں - انھوں نے قدیم پورانوں کے واقعات کی تبعیت میں بہت سے ڈرامے مرتب کئے تھے - ان کے ڈراموں میں گیتوں کی بہتات ہے اور جابجا جاترا کے نغموں کی آمیزش ہے - ان کے قابل ذکر ڈرامے یہ ھیں :—

"راما بھی شیک"، "پرونوے پرکھا"، "ناٹک"، "ستی ناٹک"، "ھریش چندر" اور "راس لیلا" وغیرہ -

سنسکرت ڈراموں کے مترجم کی حیثیت سے بابو جوتی ریندر ناتھ نے کافی شہرت حاصل کی - ان کا دور حیات سنہ ۱۸۴۸ع سے سنہ ۱۹۲۵ع تک تھا - ان کے بعض تخلیقی ڈرامے بھی ھیں اور ان میں انھوں نے بڑی بڑی صناعیاں دکھائی ھیں - ان سب میں لائق تذکرہ "پورو بکرم ناٹک"، "سرو جنی" اور "اشرو ستی" ھیں -

بنگال کی تاریخوں پر بنیاد رکھ کر غالباً سب سے پہلا ڈراما ھر لال رائے نے بنام "بنگلار سکھ ابوشان" سنہ ۱۸۷۴ع میں مرتب کیا - اس ڈرامے میں بختیار خلجی کے حملۂ بنگال پر اظہار خیال ہے اور اسے بنگال کے عیش و راحت کے خاتمے سے تعبیر کیا گیا ہے - اس میں مفتوح اور مغلوب ھندوؤں کے دلی دکھ اور رنج کا اظہار کیا گیا ہے - یہاں تاریخ کو قومی تاثرات کا پابند بنایا گیا ہے -

لکھمی نارائن چکرورتی کا ڈرامہ " سراج الدولار پروکاش کال " مرتبہ سنہ ۱۸۸۶ع اور گریش چندر گھوش کے مرتبہ " سراج الدولہ " سنہ ۱۹۰۵ع اور " میر قاسم " سنہ ۱۹۰۶ع قیمتی مضامین کے حامل ڈرامے ہیں - ہمیں ان کتابوں میں وطن پرستی اور اپنی قوم سے محبت کی نشانیاں نمایاں نظر آتی ہیں - گریش چندر نے قصوں کی خاطر تاریخ میں تلبیس نہیں کی بلکہ نئی نئی تحقیقات سے تاریخ کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے - کھیرود پرشاد کے " پلاشیر پرایش چتو " مرتبہ سنہ ۱۹۰۷ع ، " نند کمار " مرتبہ سنہ ۱۹۰۷ع اور " بنگلار شمپد " مرتبہ سنہ ۱۹۱۰ع دلچسپ اور پر جوش تاریخی ڈرامے ہیں -

دیجندر لال نے بنگال کی تاریخ پر بنیاد رکھ کر کوئی ڈراما نہیں لکھا - ان کا ڈراما " شنگھل بجے " افواہ یا فرضی افسانے پر بنیاد رکھ کر رومانوی طرز کا ایک ڈراما ہے -

اس دور کے ایک اور قابل ذکر ڈراما نگار امرت لال بوسو ہیں - وہ گریش چندر کے پیرو تھے - ان کے بعض ڈرامے ظرافت کے رنگ میں ہیں جن کے نام " بابو "، " بیبباھو بیدراٹھہ " اور "خاص دخل" ہیں - ان کا دور حیات سنہ ۱۸۵۳ع سے سنہ ۱۹۲۱ع تک تھا -

---

دیجندرو لال رائے :— ۱۸۶۳—۱۹۱۳ع -

تاریخی ، سماجی اور ظریفانہ ڈراما نگاری میں دیجندرو لال رائے نے بڑی شہرت حاصل کی - انھوں نے ہی سب سے پہلے انگریزی ڈراموں کی تبعیت میں بنگالی ڈراموں کے اندر بھی ذھنی کشمکش پیدا کرنے کی کوشش کی - اگرچہ وہ اکثر اپنے بیان کو واضح نہ کر سکے تاہم مجموعی طور پر وہ ایک کامیاب ڈراما نگار ھیں - ان میں کمزوری یہ ھے کہ ان کے ڈراموں کی زبان منظوم اور مقفی ھے - مکالمے طویل اور پر جوش ھیں - ان کے بعض تاریخی ڈرامے یہ ھیں - " پرتاب سنگھ " ، " درگاداس " ، " نورجہان " ، " میواڑ پتن " اور " شاہ جہان " - یہ سب ڈرامے اگرچہ تاریخی افراد سے متعلق ھیں لیکن ان کے کردار کی تاریخی حیثیت کم زور ھے - رامائن کی کہانی سے انھوں نے " بھشنو " اور " سیتا " نامی دو ڈرامے لکھے تھے - ان کے دو سماجی ڈرامے " پرو پارے " (اُس پار) اور " بنگو ناری " (بنگالی عورت) قابل ذکر ھیں - اسی طرح ان کے ظریفانہ ڈرامے " کلکی ابوتار " ، " بیرھو " ، " ترو ھشپرشو " اور " اشارھے " ھیں - بنگالی ادب میں پیروڈی کے موجد وھی ھیں - ان کے ڈرامے " آنند بدائے " نے ایک زمانے میں پیروڈی کا شاھکار پیش کرکے بڑی شہرت اور کامیابی حاصل کی تھی -

کھیرود پرشاد بدّیا بنود :— ۱۸۶۴—۱۹۳۷ء

دیجندر و لال رائے کے بعد قابل ذکر ڈراما نگار کھیرود پرشاد ھیں کھیرود پرشاد نے قدیم افسانوں اور بالخصوص الف لیلہ کی داستان سے متاثر ھوکر بہت شستہ اور دلکش ڈرامے لکھے ھیں۔ ان کے مشہور ڈرامے یہ ھیں۔ بدورا، علاء الدین، دولت دنیا، علی بابا۔ ان کے تاریخی ڈراموں میں "عالم گیر" نے بڑی شہرت حاصل کی اور وہ ابتک اسٹیج کیا جاتا ھے۔ کھیرود پرشاد کی تحریروں میں مستی مسرت اور تن آسانی کا پتہ ملتا ھے۔

رابندر و ناتھ ٹھاکور جن کا مستقل تذکرہ ایک علحدہ باب میں تفصیل کے ساتھ آئے گا انھوں نے بھی تقریبا چوبیس ڈرامے لکھے ھیں۔ ان کی خصوصیت یہ ھے کہ انھوں نے بنگلا ادب میں جدید طرز کے ڈراموں کا اضافہ کیا۔

شتندر و ناتھ دت نے غیر ملکی ڈراموں کی تخییل اور کردار کو اپناتے ھوئے چند ڈرامے لکھے ھیں۔ ان کے ڈراموں کی کتاب "رنگو ملی" میں چند ڈرامے ھیں جن کی بنیاد بدیسی ڈراموں اور تخیلات پر ھے۔ ان میں جاپانی، فرانسیسی اور انگریزی وغیرہ ممالک کے مختلف مختصر ڈراموں سے طرز اور افسانوی رنگ لے کر نئے روپ میں بنگلا زبان کے ذریعہ کردار پیش کئے گئے ھیں۔ ان کا ایک ڈراما میٹرلنک Metre link کے

ڈرامے کا بنگالی ترجمہ ہے جس کا نام درشٹی هارا ہے - ان کی
شہرت اور خصوصیت بحیثیت شاعر کے زیادہ ہے -

بنگال کے ڈرامائی ادب میں مسلمانوں کا حصہ

بنگالی کے ڈرامائی ادب میں کوئی مسلمان ادیب قابل ذکر نہیں ہے - انیسویں صدی کے آخر میں میر مشرف حسین (سنہ ۱۸۴۷ء — سنہ ۱۹۱۲ء) نے دو ڈرامے اور ایک طربیہ ڈراما مرتب کیا تھا - ان کا " بسنتو کماری ناٹک " مرتبہ سنہ ۱۸۷۳ء درحقیقت ڈرامائی طرز پر لکھا ہوا ایک مکالماتی ناول ہے - اسی طرح " زمیندار درپن ناٹک " جو سنہ ۱۸۱۳ء میں لکھا گیا تھا حقیقت میں زمینداروں کے مظالم پر ایک افسانوی قصہ ہے - ان کی کتاب " ایر اُپائے نی " بھی ایک خالص ظریفانہ تصنیف ہے - ڈرامے کی وہ خصوصیات جو ڈرامائی کتابوں کو دوسری اصناف سے علحدہ کرتی ہیں وہ یہاں مفقود ہیں - کردار کی تخلیق، کشمکش حیات سے ترصیع اور دانشمندانہ تدریجی ارتقا جو ڈراماؤں کی جان ہے اس کا ان میں پتہ

نہیں ہے - " زمیندار درپن " کو ہم دین بند ہو متر کی مرتبہ کتاب " نیل درپن " کے مماثل پاتے ہیں - یہ دونوں ہی پروپیگنڈا کی قسم کی کتابیں ہیں - ان دونوں ہی میں ہیں بعض خاص قسم Type کے کردار نظر آتے ہیں - ایک میں نیل کے مالک انگریزوں کے مظالم کی داستان ہے جس میں مظلوم رعایا اور صبر کرنے والی عورتیں ہیں اور دوسرے میں ظالم زمیندار اور مظلوم پرجا کا قصہ ہے فرق اتنا ہے کہ نیل کے مالکوں کے بجائے زمیندار کا حال درج ہے - اگر ڈراما نگاری کے فن کی حیثیت سے ہم فیصلہ کریں تو ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ " نیل درپن " ایک مکمل بنگالی ڈراما ہے اور " زمیندار درپن " سنسکرت کے اصول پر مرتبہ ایک قدیم طرز کا ناٹک ہے - اسمیں سنسکرتی ڈراموں جیسے ایکٹر ' ایکٹرسین ' تجویزیں ' مکالمے اور نتائج ہیں - علاوہ بریں افسانوی اعتبار سے بھی یہ نامکمل یا ناقص نظر آتا ہے - بنکم چندر نے اپنے " بنگو درشن " مرتبہ بھادوں سنہ ۱۲۸۰ع میں زمیندار درپن کی زبان کے متعلق بہت توصیفی کلمات استعمال کئے تھے -

محمد عبدالکریم کا ڈراما مرتبہ " جگت موہنی " سنہ ۱۸۷۵ع میں لکھا گیا - قادرعلی نے " موہنی پریسم پاش " سنہ ۱۸۸۱ع میں لکھا - یہ دونوں ہی ڈرامائی تصنیفات ہیں -

انیسویں صدی میں مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ہمیں مسلمانوں کا کوئی اور حصہ ڈرامائی ادب میں دکھائی نہیں دیتا۔

نذرالاسلام کی کتاب " جھیلی مہلی " مرتبہ سنہ ۱۹۳۰ء کو ڈراما کہنا مناسب نہ ہوگا۔ اس میں بیان حسن اور دلی جوش کا اظہار ضرور ہے۔ ان کا دوسرا ڈراما " عالیہ " البتہ قابل ذکر ہے۔ یہ سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس قصے کی مختصر روئداد یہ ہے :— " قندھار کا راجا اور جیسلمیر کی مالکہ رانی دلی جذب و شوق کا شکار بن گئے۔ دونوں ہی ایک دوسرے پر جاں نثاری کے مواقع تلاش کرنے لگے۔ آخر بڑی کشمکش کے بعد جب دونوں باہم قریب تر آسکے تو رانی نے راجا سے بے تعلقی اختیار کرلی۔" اس کتاب کے متعلق بعض اخبارات نے اعلی خیالات اور عمدہ افکار کا بھی اظہار کیا تھا۔

ابراہیم خاں نے متعدد تاریخی اور سماجی ڈرامے لکھے ہیں۔ تاریخی ڈراموں کے واقعات غیر ملکی ہیں۔ جدید ترکوں کے مشہور مجاہدین کے کارناموں میں انھوں نے حیات جدید کی جھلکیاں دیکھی ہیں اور انھیں اپنی زبان میں بیان کیا ہے۔ نذرالاسلم نے اپنی نظموں میں کمال پاشا اور انور پاشا کے معامد او صاف بیان کئے ہیں۔ انھی کو ابراھیم خاں نے بھی اپنایا ہے۔ ان کے سماجی ڈراموں میں صرف " قافلہ " ھی نے ڈرامے کے

مقتضیات کو پورا کیا ہے۔

شہادت حسین نے تین ڈرامے لکھے :۔ سرفراز خاں مسند ابر موہو' اور انارکلی ۔ یہ تینوں ہی تاریخی ڈرامے ہیں ۔ البتہ انارکلی تاریخی حقائق سے دور اور عشق و محبت کی رعنائیوں سے قریب تر ہے ۔ "سرفراز خاں" واقعۃً ڈرامائی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کے واقعے کی بنیاد سترہویں صدی عیسوی کے ایک واقعہ پر ہے ۔ شہادت حسین نے اس میں نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ کھیرود پرشاد نے بھی " مسند " نام کا ایک ڈراما لکھا تھا ۔ شہادت حسین کا ڈراما مسند ابر موہو" اگرچہ نام میں کسی قدر مماثلت رکھتا ہے لیکن مضمون کی حیثیت سے قطعی مختلف ہے ۔

بنگال کی تاریخ پر بنیاد رکھ کر غالبا سب سے پہلا ڈراما ہرلال رائے نے بنام " بنگلار سکھ ابوشان" سنہ ۱۸۷۴ع میں لکھا تھا اس میں بختیار خلجی کے حملۂ بنگال کا تذکرہ ہے ۔ اس قصے میں تاریخ نے قومیت کا روپ اختیار کرلیا ہے ۔ لکھی نرائن چکرورتی نے " نواب سراج الدولہ " کے نام سے ایک ڈراما سنہ ۱۸۷۶ع میں لکھا ۔ گریش چندر گھوش نے " سراج الدولہ " نام سے ایک ڈراما سنہ ۱۹۰۵ع میں مرتب کیا اور " میر قاسم " سنہ ۱۹۰۶ع میں پیش کیا ان دونوں کتابوں میں ڈراما کے

مقتضیات کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے اور ادبی حیثیت سے یہ
دونوں ھی بلند پایہ ڈرامے ھیں - ھمیں ان دونوں میں قومی
حیثیت سے حب الوطنی کا جذبہ سب سے پہلے نمایاں نظر آتا ہے -
گریش چندر نے تاریخی حقائق میں مفید اضافے بھی کئے ھیں -
انھوں نے افسانوی رنگ آمیزی کیلئے تاریخی حقائق کو توڑ
مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی ہے - کھیرود پرشاد نے
"پلاشیر پریاش چیتّو" سنہ ۱۹۰۷ع میں "نند کمار" سنہ ۱۹۰۷ع
میں اور "بنگلار مسند" سنہ ۱۹۱۰ع میں لکھا - یہ تینوں ھی عمدہ
اسالیب کے مالک ڈرامے ھیں -

دیجندر لال نے بنگال کی تاریخ پر بنیاد رکھ کر کوئی ڈراما
مرتب نہیں کیا - ان کا ڈراما "شدھگھل بجے" افواہ اور
کہانیوں پر بنیاد رکھتا ہے - درحقیقت یہ ایک پر جوش رومانوی
ڈراما ہے -

شہادت حسین کا کوئی ڈراما کسی انفرادی زندگی کے رخ سے
مکمل طور پر پردہ نہیں اٹھاتا - "مسندیر موھو" کسی قصے کی
تکمیل نہیں کرتا - سیاسی توڑ جوڑ اور سماجی و معاشرتی
زندگی میں کسی حد تک کشمکش پیدا کرتا ہوا ھنستا کھیلتا
آگے بڑھتا جاتا ہے - مشکل حوادث، سخت مرحلوں اور
دشوار گذار گھاٹیوں سے گذرتا جاتا ہے اور اسی میں شہادت

حسین کے زور تخیل کا نمونہ دکھائی دیتا ہے - المختصر اس ناٹک کے ذریعہ ہمیں مشکل مرحلوں ہی سے گذرنے کا پتہ ملتا ہے - جن مصائب سے دوچار ہونے پر زندگی کے بڑے بڑے امتحانات میں کامیابی حاصل ہوتی ہے اور جن مہالک کے پس پردہ اقتداری جنگ کارفرما ہوتی ہے ان میں معاندانہ اور حریفانہ جدوجہد کے ذریعہ بالاخر سکون کی گھڑی بھی نمودار ہوتی ہے ان امور پر شہادت حسین نے سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا اور ان کے ڈرامے ان چیزوں سے خالی ہیں - انہوں نے ڈرامائی طرز پر خاص خاص واقعات ہی کی عکاسی پر اکتفا کیا ہے -

" مسندایر مرھو " ایک مختصر ڈراما ہے - یہ دو مناظر میں ختم ہو گیا - اس ڈرامے میں واقعات کی عظمت اور کشاکش نہیں ہے - کردار میں بھی تکمیل کی کوشش نہیں ہے - تسلسل خشک ہے اور آگے بڑھنے کا شوق پیدا نہیں کرتا - جہاں جہاں مختلف امور کا امتزاج ہوا ہے وہاں بھی سہل پسندی کارفرما نظر آتی ہے - انفرادی زندگی کے دکھ سکھ کا اظہار بھی اسمیں نہیں ہے - اس کی بیان کردہ زندگی غیرمعمولی اور غیرفطری دکھائی دیتی ہے - اور یہی سبب ہے کہ اس ہماری زندگی پر گہرا اثر نہیں پڑتا - جوش و خروش کی کمی

نہیں ہے مگر یہ سب ناموزوں اور غیر فطری دکھائی دیتا ہے -

شہادت حسین کے بعد ہم تاریخی ڈرامہ نگاروں میں اکبر الدین کا تذکرہ کرسکتے ہیں - "سدھ ہو بجے" ان کا سب سے پہلا تاریخی ڈرامہ ہے - محمد ابن قاسم کے فتح سندھ کے حالات پر یہ ڈرامہ مشتمل ہے - اس میں بہادر راجا داھر کے مقابلے میں محمد ابن قاسم کی جنگ اور فتوحات کے علاوہ داھر کی دو لڑکیوں کی افترا پردازی اور دشمنی کے نتیجے میں محمد ابن قاسم کے زھرہ گداز انجام کو دردناک پیرائے میں بیان کیا گیا ہے - خلیفہ حجاز نے داھر کی لڑکیوں سے جب یہ فرضی داستان سنی کہ محمد ابن قاسم نے ان پر مظالم کئے ہیں تو یہ حکم جاری کہ محمد ابن قاسم کو کچی کھال میں سی کر خلیفہ کے سامنے حاضر کیا جائے - اس پر عمل کیا گیا اور محمد ابن قاسم کی وفات پر داھر کی دونوں لڑکیوں یعنی میرا اور اوما نے ھنس کر کہا کہ ہم نے محمد ابن قاسم سے اپنے باپ کا بدلہ لیا ہے اور حقیقت میں وہ بے قصور تھا - اگرچہ یہ ڈراما مختصر سا ہے تاہم اس میں ڈرامائی صنعتوں اور مکالماتی ہوشیاری کا پورا پورا ثبوت ملتا ہے - مسلمانوں کی لائق نمونہ طاقت برداشت اور جانب داری سے پاک قوت فیصلہ ھی اس ڈرامے میں موثر طریقے پر ظاہر کیا گیا ہے - بڑی خوبی یہ ہے کہ ھندوں کے

کردار کو بھی مصنف نے بڑا بہتر اور اعلی دکھایا ہے۔ ان کے کردار پر داغ دھبے نہ لگا کر اپنی وسیع القلبی کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں ان کی وطن دوستی، قوم پرستی اور جاں نثارانہ جذبۂ خدمت وطن کا اظہار بڑے موثر طور پر کیا گیا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ ڈراما ایک ذرا اور بھی طویل تر ہوتا تو زیادہ کامیاب ہوسکتا تھا۔ اختصار کی وجہ سے اس میں کسی قدر ایسی روانی اور تیزی پیدا ہوگئی ہے جو ڈرامے کی خوبی میں خارج معلوم ہوتی ہے۔ اگر توسیع ممکن ہوتی تو شاید کردار کی ادائیگی بھی زیادہ کامیاب ہوسکتی۔

اکبر الدین کا دوسرا تاریخی ڈراما نادرشاہ ہے۔ ایرانی شاہنشاہ نادرشاہ نے دلی پر حملہ کیا اور غالب ہوا۔ اسی واقعے کو محور خیال بنا کر اکبر الدین نے یہ ڈراما مرتب کیا ہے۔ ایران خانہ جنگی اور بد انتظامی کی بنا پر مصائب کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ آگے نادرشاہ نے کس طرح قبضہ و اختیار میں لا کر پورے افغانستان اور ہندوستان کی راج دھانی دلی تک پر کامیاب حملے کئے اس کا تذکرہ اکبر الدین نے بڑے موثر انداز میں کیا ہے۔ اس میں ہلاکت خیزیوں کے لرزہ براندام کر دینے والے وقائع بھی ہیں جن کا نادرشاہ کے ہاتھوں ظہور ہوا۔ لیکن اس میں نتائج کی تلاش اور مقاصد کی تعیین نہیں ہے۔ ایک

حاکم اور ایک مفتوح ' ایک غالب اور ایک مغلوب اور ایک ظالم اور دوسرا مظلوم بس یہی مقصد ترتیب معلوم ہوتا ہے ۔ انگریزی ڈراما نگار " مارلو " Marlow نے اپنے ڈراما Tamarlaine تیمور لنگ میں جس طرح تیمور کی فتوحات کا تذکرہ کیا ہے اسی طرح ہمیں " نادر شاہ " میں بھی صرف فتوحات ہی کا تذکرہ ملتا ہے ۔

اکبر الدین کا ایک اور ڈراما ' اذان '' ایک سماجی ڈراما ہے ۔

بیدار تصور ' تیز و تند تخیل اور دانشمندانہ ترتیب نورالمومن کے ڈراماؤں کی خصوصیت ہے انہوں نے ابتک دو ڈرامے مرتب کئے ہیں ۔ '' روپ انتر '' اور '' نے مے سیس ۔ یہ دونوں ڈرامے اگرچہ ظہور پاکستان سے پہلے مرتب ہوئے تھے لیکن ان کی اشاعت تخلیق پاکستان کے بعد ہوئی ۔ روپ انتر '' میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک عورت جو شوہر کی نگاہ میں معتوب اور ناپسند یدہ تھی اپنی دفادارانہ تدبیروں اور دانشمندانہ خدمتوں کی بدولت شوہر کی محبت اور خصوصی توجہ حاصل کر لیتی ہے ۔ مناسب ظرافت ' میٹھا طنز اور خوشگوار چبھتا ہوا انداز بیان اس ڈرامے کی جان ہے ۔

" نے مے سیس '' ڈرامے کے تصورات عجیب و غریب اور بالکل انوکھے ہیں ۔ یہ ڈراما ایک کردار کا ہے اور اس کی توسیع

رسائی حیثیت سے صرف ایک گھنٹے کی ہے - اس میں نورالمومن نے یہ کمال دکھایا ہے کہ ایک گھنٹے تک کے ڈرامے میں جوش بیان تسلسل اور دلکشی کو علی حالہ قائم رکھتے ہوئے زندگی کے ایک مکمل تجربے سے ہمیں آشنا کیا ہے - اس کامیاب کوشش کو ایک غیر معمولی اوشش کا درجہ دینا ہی پڑتا ہے - اس واقعے میں جنگ عظیم ثانی کے دور کا ایک واقعہ دکھایا گیا ہے جس میں چور بازاری کا مآل دکھایا گیا ہے - ایک شخص جو چور بازاری کی بدولت بڑی دولت اور اقبالمندی کا مالک بن جاتا ہے وہ خود ہی ظلم و عدل کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے - آخر کار وہ ذہنی کشمکش اور ضمیر کی ملامت سے مجبور ہو کر اپنی اصلاح کا طالب ہوتا ہے - یہاں تقدیر کا انتقام ایک حیرتناک بے کلی اور اضطراب پیدا کرتا ہے اور مصنف نے اسے بڑی کامیابی سے ظاہر کیا ہے -

ڈرامے کی تصنیف کیلئے اسٹیج اور اس کے لوازمات سے پوری پوری واقفیت ضروری ہے - اسٹیج ہی ڈرامے کی جان ہے - اس کے ذریعہ کردار نمایاں ہوتے ہیں - اعمال و کردار میں اسٹیج ہی کے ذریعہ زندگی پیدا ہوتی ہے - قصے کی توسیع ' بیان کے زور اور ادائیگی میں روانی نیز ترتیب میں درستگی باقی رکھنے کیلئے ڈرامے کو اسٹیج سے الگ کرکے زندہ نہیں رکھا

جا سکتا ۔ بلکہ اب میں خاص مقاصد کی تکمیل کرنے والے
ڈراموں کی، کمی کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم میں نگار خانوں اور
اسٹیج کی خصوصیات سے واقف مصنفین کی بے حد کمی ہے ۔
سٹیج کی اہمیت سے بھی ہم کما حقہ واقف نہیں ہیں ۔ مسلمان
ن محاسن اور خصوصیات سے زیادہ تر نا واقف ہیں ۔ ایک دور
میں کلکتہ تھیٹر خانوں کا مرکز تھا ۔ لیکن ان مراکز سے بھی
مسلمانوں کا کوئی تعلق نہ تھا ۔ ڈھاکے میں نگار خانہ تو دور
کوئی شوقیہ تھیٹر بھی قائم نہ ہوا ۔ انہی اسباب کی بنا پر جن
مصنفین نے اس راہ میں خامہ فرسائی بھی کی ان کی کتابیں
صرف پڑھنے کے کام آئیں اور انہیں اسٹیج پر آنا نصیب نہ ہوا ۔
یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک کسی ڈرامے کو اسٹیج نہ کیا جائے
نہ تو اس کے محاسن پر تنقید آسان ہے اور نہ اس کی کامیابی یا
نا کامیابی پر رائے زنی ممکن ہے ۔

اسٹیج سے بے نیاز ہو کر لیکن ڈرامے کے کسی قدر محاسن کو
باقی رکھتے ہوئے شوکت عثمان اور ابو الفضل نے ایک حد تک
کامیاب کوششیں کی ہیں ۔ شوکت عثمان کا ڈرامہ " تشکیر لشکر "
اور " آملار ماملا "، وغیرہ ڈرامائی صنائع سے خالی ہوتے ہوئے
بھی اچھے ڈرامے ہیں ۔ اُس میں تعجب خیزی اور مکالمے ہی
پر زیادہ زور ہے ۔ اسی طرح ابو الفضل کا " قائد اعظم " بھی

ڈراما کہے جانے کے قابل نہیں ہے بلکہ وہ ایک رواں افسانہ ہے۔

مشرقی بنگال کی زندگی، مذہبی نعرے، دیہاتی اصلاح اور سیاسی بیداری پر بنیادی رکھ کر عسکر ابن شیخ نے بھی چند ایک ڈراما نگاری کی کوششیں کی ہیں۔ مرکزی اور بنیادی کمزوریوں کی بنا پر ان کے ڈراموں میں اگرچہ جان پیدا نہ ہوسکی لیکن انداز بیان قابل تعریف ہے۔ ان کے ڈراموں پر نقد و تبصرے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ انھوں نے "بیر ودھہ"، پدّا اور تہنومیر وغیرہ چند ڈرامے لکھے ہیں۔

حصۂ سوم

بارھواں باب

روبندرو ناتھ ٹھاکور

اور

دور روبندرو ناتھ میں بنگالی ادب کا دھارا

پرمتھو چودھری - شتندرو ناتھ دت

مہیت لال مجمدار - قاضی نذر الاسلام

*

وجود پاکستان سے ماقبل دور میں بنگلا منظوم ادب

*

وجود پاکستان کے پس منظر میں مشرقی پاکستان کا منظوم ادب

سید علی احسن ــــــــ مترجم ــ مولانا عبدالرحمٰن بیخود

بارھواں باب

روبندرو ناتھ ٹھاکور

روبندرو ناتھ کی ادبی زندگی کی بساط ساٹھ سال سے زیادہ مدت تک پھیلی ہوئی ہے۔ تجربے کے تنوع اور وسعت کے لحاظ سے روبندرو ناتھ کے ساتھ صرف ایک شخص کا نام دنیا کے ادب میں لیا جاسکتا ہے جس کا نام وکٹر ہوگو Victor Hugo ہے۔ ایک ہزار سے زاید نظمیں، چوبیس کے قریب ڈرامے، آٹھ سے زیادہ مختصر افسانوں کے مجموعے، دو ہزار کے قریب گانے اور ادب، سماج، مذہب، سیاست اور دوسرے موضوعات پر کثیر مضامین کے مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ علاوہ بریں انگریزی زبان میں کثیر التعداد تحریرات ان کی یاد دلاتی ہیں۔ روبندرو ناتھ کی کثیر اور مختلف النوع تصنیفات کے ساتھ جب ان کی حیثیت بطور ماہر تعلیمات، مصلح قوم، بلند پایہ مفکر و سیاس ہمارے سامنے آتی ہے تو ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس جامعیت کی شخصیت ادب کے عالم میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ جامعیت میں اپنی آپ ہی مثال تھے اور

دنیا کے ادب کا کوئی مصنف بھی ان کے ساتھ دعوائے ہم سری نہیں کر سکتا۔

مائکل مدھو سودن دت کے بعد بنگلا ادب میں مغربی اثرات اپنے کمال تک رو بندر و ناتھ ھی کے ذریعہ نمایاں ہوئے مائیکل مدھو سودن دت نے بنگلا منظوم ادب میں جو تبدیلیاں پیدا کیں انیسویں صدی کی نوبیدار زندگی اور نوجوانوں کے ساتھ اسکا تعلق ناقابل انقطاع ہے۔ لیکن بنگال کے مستعملہ طرز نظم میں اس نے ایک حیرتناک تبدیلی پیدا کی تھی۔ روبندر و ناتھ نے مدھو سودن کے اس انقلابی طرز کو قبول نہیں کیا بلکہ بنگال کے مروج انداز نظم اور گیتوں کے طرز کو باقی رکھتے ہوئے اس میں اضافہ اور توسیع کی۔ روبندرو ناتھ پر انکی خدمت نظم کے ابتدائی دور میں ہمیں جیدیب اور بشنو کے پدوں کے مصنفین کے اثرات ان پر دکھائی دیتے ھیں۔ ان کی کتاب " بھانو شنگھیر پدا بولی " میں ہمیں اس نظرئے کا اظہار نظر آتا ہے۔ خاص طور پر یہ بات قابل غور ہے کہ جن مغربی اثرات نے مائیکل کی نظموں میں غیر معمولی تنوع ' عمق اور زندگی کی لہریں پیدا کیں انہی مغربی اثرات نے روبندرو ناتھ کی نظموں میں عظیم الشان حسن اور دلکشی پیدا کی۔ نیز انہیں قومی حدود سے آگے بڑھا کر بین الاقوامی تخئیل کے میدان میں ہمہ گیر بنادیا۔

راجا رام موہن رائے نے عالم انسانیت کی اصلاح کے جن تصورات کو پیش کیا تھا انھیں رو بندرو ناتھ نے عملی دنیا میں پیش کرنے کی کوشش کی - انہی اثرات کا نتیجہ تھا کہ روبندرو ناتھ میں ہم بین الاقوامی تصورات اور نظریات کی جہتات اور عمومی تشکیل کے نمایاں نشانات پاتے ہیں - وہ تمام بنی نوع انسان کیلئے ایک متحدہ تہذیب و تمدن کے حامی تھے اور اس کا ثبوت ہمیں ان کی قائم کی ہوئی بشو بھارتی یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط سے ملتا ہے - روبندرو ناتھ کا یہ اعتقاد تھا کہ موجودہ نظام مالیات اور دستور سیاسیات کی بدولت اس تنظیم باختہ اور مصیبت زدہ دنیا میں بے اطمینانی اور عام پریشانی پیدا ہوگئی ہے اور اسے دور کرنے کے لئے ادیبوں، عالموں اور شاعروں میں اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ وہ اپنے تصورات اور نظریات میں قومیت کی حد سے اور آگے بڑھ کر بین الاقوامی نظریات کو اپنالیں - ان کے تصورات کی بنیاد وطنیت پر ضرور ہوگی لیکن وہ ادبی جان اور شاخ و ثمر کے لئے آب و ہوا تمام دنیا کے گلشن سے حاصل کریں گے - ماضی کی تاریخ ہمیں سکھاتی ہے کہ اگرچہ انسانوں نے آپس میں خوفناک جنگیں بھی کی ہیں تاہم باہمی میل جول سے انھوں نے دنیا کی تعمیر میں حصہ لیا ہے - یہی اتحاد قلبی جس کی بنا پر دنیا کی تعمیر وجود

میں، آلی انسان کے علو مرتبت کا ضامن تھا - ایک موقعہ پر رو بندر ناتھ فرماتے ہیں — "انسان بربادی لا سکتا ہے - غارتگری کر سکتا ہے لیکن اس کی روح اس قدر بلند ہے کہ وہ سب کچھ سوچ سمجھ سکتا ہے - حقیقت میں انسان نہ تو اپنا غلام ہے اور نہ دنیا کا غلام - وہ ایک محبت کرنے والی ہستی ہے - اس کی آزادی اور تکمیل محبت ہی میں ہے اور اسی کو ہم تکمیل نظریات کہہ سکتے ہیں " (شادھنا) - لیکن جب ہم عملی دنیا میں رو بندر ناتھ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ان کی وشو بھارتی کا طرز تعلیم، تمدن اور تہذیب فی الواقع اسی ملک کی قدیم تہذیب کے احیا کا مرکز نظر آتا ہے - اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنے خیال میں اسی ملک کی قدیم تہذیب کے بہتر عناصر کو قبول کرنے کی کوشش کی ہے - رو بندر ناتھ کے نظریہ قومیت کے امتحان کا اس وقت بھی موقع ملتا ہے جب سیاسی تحریک آزادی ہند کی حمایت میں انہوں نے گانے اور نظمیں تصنیف کی تھیں - انہوں نے " ہربندھب اُپادھیا " کی معاونت سے قدیم طرز کا برھمو چرجا آشرم قائم کیا اور بنکم چندر کے آدرش پر ان کے بنگو درشن " رسالہ کی اُس کے اجرائے ثانیہ کے وقت ادارت بھی قبول کی - تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ رو بندر ناتھ کا نظریہ وطنیت و قومیت بنکم چندر سے قطعی مختلف ہے -

رویندر ناتھ کے تصور قومیت کے ساتھ عالم انسانیت کا تصور
بھی مختلط ہے۔ ان کا یہ نظریہ قدیم ہندوستانی مذہبی اور
سماجی نظریات سے ماخوذ ہے۔ انھوں نے عظمت، وسعت اور
عالم تصور انسانیت کو اپنے نظریۂ طبعت میں داخل کر لینا
چاہا ہے۔ انھوں نے اس میدان میں ہندوؤں کی قدیم مذہبی
کتاب اپنیشد سے روشنی حاصل کی تھی۔ اپنیشد میں ہے
"نہیں ہے سوکھوم اسمی تھومئی توسو تھم" یعنی قامت میں سکھ
نہیں اور کثرت میں سکھ ہے۔ اسی لئے انھوں نے اپنے نظریۂ
انسانیت اور اپنیشد کی ہدایت میں کوئی تضاد محسوس
نہیں کیا۔ اپنی اسی سہل فہمی کی بنا پر رویندر ناتھ نے بنگال
کی تہذیب کو زیادہ مستحکم کرنے کی سعی کے باوجود اپنے
خیال کے مطابق دنیا کی تہذیب کو قبول کرنے اور تمام انسانوں
کی مصیبت کو محسوس کرنے کا ادعا کیا تھا۔

ٹھاکر خاندان مغربی بنگال میں ایک معتبر خاندان تھا۔
رویندر ناتھ کے والد دیبندر ناتھ ٹھاکر اپنے وقت میں برھمو
سماج فرقے کے قائد تھے۔ رویندر ناتھ کی ابتدائی زندگی نہ جانے
وقت مذہب اور آرٹ کے قالب میں ڈھلتی گئی۔ مذہبی امور
میں انھوں نے اپنیشد اور ویدوں سے ہدایات حاصل کی تھی۔
مگر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رویندر ناتھ پر اپنیشد کے وحدۃ الوجود کا اثر

مغلوب اور وعلوصت کا عقیدہ ثنویت غالب تھا۔ وشنو ثنویت کا یہ تصور ہے کہ انسان اور خدا دونوں علحدہ بالذات ہیں اور ہر ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کیلئے کوشاں ہے۔ اگرچہ کامل مطلق صرف خدا ہے جس کی تقسیم ممکن نہیں لیکن اس دنیا میں خدا اور انسان کو دو الگ الگ ہستیاں مان لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو حاصل کرنے کی سعی میں مشغول ہیں۔ یہ دونوں مختلف النوع اثرات رویندر ناتھ کی بیشتر نظموں میں بحیثیت روح رواں کے معلوم ہوتے ہیں۔

سالکل کی زندگی میں ہم نے حیرت ناک تنوع دیکھا ہے لیکن رویندر ناتھ کی زندگی میں کسی قسم کا تنوع بالکل نہیں پایا جاتا۔ اس اعتبار سے ان کی زندگی پُرسکون اور استقلال پسند تھی۔ بچپن میں باپ کے زیر سایہ ان کا تعلیمی دور شروع ہوا اور بنگلا، سنسکرت اور انگریزی زبانوں میں ایک ہی ساتھ ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ سولہ سال کی عمر میں وہ حصول تعلیم کی غرض سے انگلستان تشریف لیگئے۔ اس کے ماسوا ان کی ابتدائی زندگی یا تو کلکتے میں گذری یا پدما ندی کے کنارے موضع سلائی دا کے نواح میں۔ اس گاؤں میں وہ اپنی خاندانی زمینداری کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ع میں انہوں نے بول پور میں شانتی نکیتن اسکول کا افتتاح کیا۔ اس اسکول کے

قیام کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ غلط طریقۂ تعلیم سے نجات حاصل کرکے صحیح اور فطری اصول پر تعلیم کا مقصد پورا کیا جائے۔ اس اسکول نے بڑی شہرت پائی اور یہیں سے شانتی نکیتن یونیورسٹی کی بنیاد پڑی - سنه ۱۹۱۱ع میں رویندر ناتھ اپنی انگریزی گیتا نجلی ساتھ لئے انگلستان گئے اور وہاں اسوقت کے سب سے بڑے انگریزی شاعر ڈبلیو - بی ییٹس W. B. Yeats سے متعارف ہوئے - ییٹس کے مقدمے کے ساتھ ان کی گیتا نجلی سنه ۱۹۱۸ع میں شائع ہوئی اور اس کے دوسرے ہی سال انہوں نے دنیا کا سب سے بڑا ادبی انعام نوبل پرائز پایا - ایشیا میں سب سے پہلا نوبل پرائز رویندر ناتھ ہی کو ملا تھا - اس کے بعد رویندر ناتھ کی زندگی کا بیشتر حصہ شانتی نیکیتن ہی میں گزرا - درمیانی وقفات میں وہ کبھی کبھی اندرون ملک اور بیرون ملک مثلاً ایران، عراق، ترکستان، افغانستان، چین، جاپان، امریکہ، روس، اٹلی، جرمن وغیرہ ممالک کی تعلیم گاہوں میں اپنے مخصوص موضوعات پر تقریریں کرنے کیلئے تشریف لیگئے -

جیبن سرتی (یاد زندگی) میں رویندر ناتھ نے اپنی ابتدائی شاعرانہ زندگی کو یاد کیا ہے - اور اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح شاعری کے غنچوں نے پھول بن کر ان کے دل میں خود نمائی کی - اس میں شاعر نے غیر واقعی دنیا سے انسانی

دنیا تک تدریجی ارتقا کے منازل بیان کئے ہیں - اس ارتقا کے اسباب سے بھی بحث کی ہے - " نرجھریر سپنو بھنگو " (چشمے کی نیند سے بیداری) میں شاعر نے اپنی روح کو ایک چشمے سے تشبیہ دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ایک اندھیری چٹان میں یہ چشمہ خوابیدہ تھا - یک بیک آفتاب نے اس تاریکی میں اپنی شعاعیں داخل کیں اور یہ جھرنا انگڑائیاں لیتا ہوا اُبل پڑا - یہ نظم رویندرو ناتھ کے مجموعۂ نظم " پربھات سنگیت " میں شامل ہے -

پربھات سنگیت کے بعد مختلف انداز سے رویندرو ناتھ نے نظمیں لکھیں - رویندرو ناتھ کی گیت نوازی Lyricism " کوڑی و کومل ' مانوشی اور چترا " وغیرہ میں بہت نمایاں ہوئی - چترا میں رویندرو ناتھ کے شاعرانہ حسن کی ضیا پاشیاں نمایاں ہوئی ہیں - "بجے نی" (فاتح خاتون) ' اُروشی (جنت کی ایک حور) ' وغیرہ نظموں میں رویندرو ناتھ کے مثالی حسن کا نمونہ ملتا ہے - یہ حسن بہ یک وقت مجسم اور غیر مجسم نظر آتا ہے - رویندرو ناتھ میں باطنیت یا تصوف Mysticism کا تخیل بھی کارفرما نظر آتا ہے - خصوصیت کے ساتھ یہ تصور ان کی کتاب شونارتری (کشتیٔ زر) کی نظموں میں نمایاں معلوم ہوتا ہے - فلسفیانہ اور مذہبی تخیل سے معمور نظمیں گیتا نجلی میں ہیں - ان تمام کتابوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل ہمیشہ متواضع

ور خدا نیز اعلی طاقتوں کے سامنے سرنگوں رہا ہے - اس میں ہمیشہ سکون اور شانتی کا اتھاہ سمندر اپنے جلال و جبروت کے ساتھ براجمان نظر آتا ہے - " پرو کریتیر پروتی شود " ڈرامے کے متعلق روبندرو ناتھ نے لکھا ہے " اس نظم میں بہادر سنیاسی تمام محبت کے تعلقات اور رشتہ داریوں کو توڑ کر فطرت پر فتحیاب اور اپنے خلوص اور صداقت کی بنا پر ازلی اسرار سے واقف ہوا ہے - ابدیت کا تصور ہماری دنیا سے خارج ہے - آخر کار ایک بچی اسے اپنی محبت میں مبتلا کر کے ابدیت کے تصورات سے اس دنیا کی طرف واپس لانے میں کامیاب ہوئی - دنیا کیطرف پلٹ کر سنیاسی نے یہی دیکھا کہ ذرات کے مجموعے کا نام دنیا ہے، محدود کو سمجھ کر ہی غیر محدود کا تصور کیا جا سکتا ہے اور محبت ہی میں نجات ہے - ہمیں انوار محبت جہاں بھی نظر آئے ہیں وہیں آنکھیں مل کر دیکھنے سے ہمیں یہ حقیقت بھی نظر آتی ہے کہ محدود ہی در اصل نا محدود ہے -"

" پرو بھات سنگیت " کے بعد روبندرو ناتھ کے تصورات نے ہمہ گیر رخ اور ہمہ گیر موضوعات کیطرف توجہ شروع کی اور اسی میں ترقیاں کرتے رہے - اُن کے اعلی ترین گیتوں کا نمونہ ہمیں "کوڑی و کومل " اور " مانوشی " میں ملتا ہے - انہی دونوں نظموں کے گیتوں نے " چترا " میں تکمیل حاصل کی ہے - " چترا " کی

ایک نظم " اُربوشی " اپنے محاسن میں بے مثال ہے۔ شاعر نے سارے عالم میں اپنے جمالیاتی ذوق کی بنا پر حسن ہی کو لازوال اور لا محدود دیکھا ہے۔ سوئن برن کی نظم " ایفسرو دیتی " میں تصورات حسن کی جو عکاسی کی گئی ہے اس سے " اردوشی " کے بیانات کو مماثلت حاصل ہے۔ ان دونوں شاعروں نے حسن کو زندگی سے غیر متعلق رکھ کر صرف خیالی دنیا کی آبادی ہی سے تسکین حاصل کی ہے۔ دونوں کے یہاں یہ حسن مشتعل ہے اور تمام مسرتوں نیز دلی اضطراب اور غموں کا مرکز ہے۔ انھوں نے اپنی نظم " شونار تری " میں سب سے پہلے صوفیانہ مضامین کا اظہار کیا۔ اس میں شاعر نے عالم فطرت کے جمالیاتی مظاہر کی توضیح کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ زندگی کی قدروں کا تعین کیا ہے۔ انھیں متصوفانہ مضامین نے رفتہ رفتہ " گیتان جلی " میں تکمیل پائی ہے۔

روبندر و ناتھ نے کم عمر بچوں کیلئے بھی منظوم کتابیں لکھیں۔ ان میں "شیشو" ، " چھڑا " اور "ھسے" (وہ) مشہور ہے۔ ان کے منظوم افسانے " کتھا و کاہنی" ، " پلاتو کا " اور " پو اشاچو" وغیرہ میں مجتمع ہیں۔ منظوم لطائف کی کتابیں " کنیکا " اور " لیکھن " ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے بہت ساری قومی نظمیں لکھی ہیں۔ روبندر ناتھ نے بےحساب گانے بھی لکھے۔ ان کی

سماجی اور سیاسی نظمیں بھی کثیر التعداد ہیں - رو بندرو ناتھ کی منظوم کتابوں میں ان کا شاہکار " بولاکا " ہے - اس میں شاعر کے فلسفیانہ خیالات اور دنیا کے ساتھ ان کی زندگی کے تعلق کا تجزیہ ہمیں نمایاں نظر آتا ہے -

روبندرو ناتھ نے اپنی شاعرانہ زندگی کبیتی کابو کے شاعر کی حیثیت سے شروع کی اور تمام عمر انھوں نے مختلف طرز اور مختلف انداز سے حسن کی تلاش کی ہے - ان میں بہت عمیق مذہبی تخیل بھی موجود تھا - ان کے گانوں میں ہمیں خاص طور پر مذہب اور محبت کے اثرات شعاع افگن نظر آتے ہیں - اس کے بعد تصوف Mysticifm اور کہیں کہیں تجرد کا تخیل کار فرما نظر آتا ہے - ان سب کے باوجود یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ روبندرو ناتھ زندگی کی موجوں سے کھیلتے ہوئے نہیں گذرے تھے - ان کی حسن پرستی اور تحقیق تجرد میں حیات کی تابانیاں جلوہ فرما تھیں - ہم نے خود شاعر کی زندگی میں بھی یہ بات دیکھی ہے کہ انھوں نے کبھی کبھی سیاسی تحریکات سے بھی اپنا تعلق رکھا ہے ، تعلیمی امور سے بھی انہیں دلبستگی رہی ہے ، اصلاحی اور تمدنی امور میں بھی وہ دخیل رہے ہیں - یہ ساری چیزیں بیک وقت شاعر کی زندگی میں موجود تھیں - اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کی زندگی

میں، تخیل مجرد، تلاش حسن اور دنیا کی عملی زندگی میں ہم آہنگی موجود تھی ۔

ہم نے اس سے پہلے روبندرو ناتھ کی تفہیم حسن اور افہام جمال کا تذکرہ کیا ہے ۔ روبندرو ناتھ کا یہ حسن تخلیلی طور پر جس طرح ایک طرف سنسکرت سے متأثر ہوا ہے اسی طرح دوسری طرف انگلستان کے رومانوی دور کے شعراء کے تخیل کی ترجمانی کرتا ہے ۔ ظاہری سجاوٹ اور ملاحت کے بیانات میں سنسکرت کے انداز بیان سے مماثلت دکھائی دیتی ہے اور حسن کو دلی جوش کے اظہار کا ذریعہ سمجھ کر حسن قبول انھیں "شیلی اور کیٹس" کے تصورات سے متأثر دکھاتا ہے ۔ نمونے کے طور پر ہم روبندرو ناتھ کی مشہور نظم "بیجے نی" سے اپنے اس خیال کی تائید حاصل کرسکتے ہیں ۔ اس نظم میں ایک گل عذار دوشیزہ کے ظاہری حسن اور اس کی ملاحت و صباحت کا تذکرہ ہے ۔ اس ظاہری تجزیہ حسن میں سنسکرت کے انداز بیان سے بڑی مماثلت نظر آتی ہے اور اسی لئے ایک نئے آفتاب کی سنہری کرنوں میں اس مفروضہ حسینہ کے جسم کا ہر حصہ رفتہ رفتہ جذب ہوتا دکھائی دیتا ہے ۔ لیکن روبندرو ناتھ نے سنسکرت شعراء کی طرح صرف اجزائے جسم کے بیان پر اکتفا نہ کی بلکہ انھوں نے اسرار و غوامض کے پردے میں حسن کی شعاعوں کو اجاگر کیا ہے ۔ ایسے بیانات جزوی طور پر

تخئیل محض بن کر رہ گئے ہیں - مگر رویندر و ناتھ کے تصور حسن کے متعلق ایک بڑی بات یہ ہے کہ ان کی تمام تر تخئیل مکمل نظام حیات پر مشتمل نہیں ہے - انہوں نے زندگی کے بعض اجزاء سے بحث کی ہے - اگر ہم مائیکل کی نظم "سو میر پروتی تارا" کے ساتھ "بیجے نی" کا مقابلہ کریں تو ہمیں حسن کی حقیقت اس مذکورۃ الذکر نظم سے پوری طرح معلوم ہو سکے گی - مائیکل کی نظم میں "تارا" کا مکمل وجود ہی حسن محض ہے اور وہ تصورات کے ساگر میں غوطہ زن معلوم ہوتا ہے - لیکن "بیجے نی" میں طلوع صبح کے وقت غسل کرنے والی دو شیزہ فطرت کے سکون اور تقدس میں جذب ہوکر ہی حسن کی شعاعوں سے منور ہوئی ہے - یہ ملاحت اس کی زندگی کا محض ایک حصہ ہے - اس میں ہمیں مسرت و غم کی تفتیش کیلئے کوئی راستہ نہیں ملتا -

موسیقی نوازگانوں کی تخلیق میں بھی رویندر و ناتھ کی خدمات غیر معمولی ہیں - وہ بھارتی سنگیت سے پوری طرح واقف تھے -

رویندر و ناتھ کی سیاسی زندگی کی تاریخ ہم سنہ ۱۹۰۵ع سے متعین کر سکتے ہیں - اس وقت تقسیم بنگال اول کے خلاف ہندؤں نے پر زور سیاسی تحریک شروع کی، اور انہوں نے بھی

اس کا ساتھ دیا - سنہ ۱۹۱۹ع میں بمقام امرت سر جلیانوالہ باغ کا عظیم سانحہ پیش آیا - اس موقعہ پر سر مائکل او ڈائر کے حکم سے ہندوستانی محبان وطن پر بے پناہ مظالم ڈھائے گئے - بلا امتیاز ہزاروں انسانوں پر گولیاں برسائی گئیں - اس ظلم سے متاثر ہوکر رویندرو ناتھ نے احتجاجاً سرکاری خطاب " نائٹ " واپس کر دیا - خطاب واپس کرتے ہوئے انہوں نے گورنر جنرل کو جو خط لکھا تھا اس کی چند سطریں یہ ہیں -

" The time has come when badges of honour make our shame glaring in their incongreous contest of humiliation, and I, for my part wish to stand, shorn of all special distinctions, by the side of my Countrymen, who for their so called insignificance, are liable to suffer a degradation not fit for human beings. "

وہ وقت آگیا ہے جب اعزاز کے تمغے ہمارے جذبۂ غیرت وحمیت کو ذلت و تحقیر کے مقابلے میں زیادہ تیز کر دیتے ہیں اور میں ' جہانتک میری ذات کا تعلق ہے یہ چاہتا ہوں کہ تمام امتیازی اعزاز و اکرام سے علاحدہ ہو کر اپنے ان ہم وطنوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں جو اپنی نام نہاد کم حیثیتی کی وجہ سے آج ان سب ذلتوں اور پس ماندگیوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں جو انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکا ہے -

اس سلسلے میں رو بندر و ناتھ کی ایک نظم بھی قابل ملاحظہ ہے -
وہ فرماتے ہیں :—

چتو جتھا بھے شنّو و، اُچّو جتھا شِر
گیان جتھا مُکتو، جتھا گریھر پراچیر
آپن پرانگن تلے دیبش شر بوری
بسو دھارے راکھے نائی کھنڈو کھدرو کری
جتھا باکو ھریدئیر اُتشو مکھہ ھوتے
اُچھو شیا اُٹھے، جتھا نر باریتو سرو تے
دیشے دیشے دِشے دشے کرمو دھارا دھائے
اجسّر و شہسّر و بیدھو چریتار تھو تا ئے،
جتھا تچّھو اچارو مرو بالو راشی
بچار ر شرو ت پتھہ پھیلے نائی گراشی
پؤرو شرے کرے نی شتو دھا نِتو جتھا
تومی شرسو کرمو چنتا آنندر نیتا
نیج ھستے نردئے اگہات کری پیتو
بھارتے رے شے ای شرگے کرو جاگوریتو

ترجمہ :—

جہاں دل بے خوف ہے اور سر بلند ہے -
جہاں علم آزاد ہے اور جہاں گھروں کی دیواریں -

اپنے صحن میں دن اور رات

تمام دنیا کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کرتیں -

جہاں حملے سویدائے قلب سے -

اُبل پڑتے ہیں ' جہاں نہ تھمنے والی موجوں کی طرح -

تمام ملکوں میں مختلف حیثیوں سے کاموں کے دھارے بہتے رہتے ہیں

بے انتہا اور لاکھوں کامیابیوں کے ساتھ '

جہاں حقیر رسموں کے ریگستان نے -

انصاف کے دھاروں کی راہ میں رکاوٹیں نہیں پیدا کیں

جوانی کو سیکڑوں حصوں میں تقسیم نہیں کیا ' جہاں ہر وقت

تو ہی تمام کاموں ' تمام خیالوں اور تمام خوشیوں کا رہبر ہے -

اے باپ تو اپنے انہی ہاتھوں سے سخت بے رحمی کا زخم لگا کر

اُسی سرگ میں بھارت کو بیدار کر دے -

روبندر ناتھ کی وطن پرستی میں بلند تخیلات پر شیدہ ہیں -

یہ وطن دوستی رنگ لال ' ہیم چندر اور نبین چندر جیسی قوم

پرستانہ دھمیت کی علم بردار نہیں ہے ان کی طبیعت مائکل

مدھوشودن کی پر لیف مگر بے خیال وطن دوستی جیسی بھی

نہیں ہے - اس کے ذریعہ انہوں نے ایک عظیم الشان حقیقت اور

بے مثال اتحاد کا سبق پڑھانا چاہا ہے - ان کی نظم '' بھارت تیرتھ''

میں اسی کی جانب اشارے ہیں - روبندر ناتھ کے خیال میں

یک ھی حقیقت کے زیر اثر مختلف قومیں متحد ہوئی ھیں
ر ایک ھی صداقت کے دھارے میں مختلف تہذیب و تمدن کے
سوئے آکر ممزوج ہوگئے ھیں - اس نظم کی تخییل میں بے مثال
فیاضی اور وسعت نظر کے باوجود رو بندرو ناتھ نے ھندو تہذیب
و تمدن ھی کے بندھن میں سب کو باندھ کر ایک متحدہ
قومیت کا خواب دیکھا ھے - " ماں ابھی سے کے ایشو ایشو تورا "
(ماں کے دامن عاطفت میں فورا آجاؤ) یا " منگل گھٹ ہوئے نی
جے بھرا " (اقبال مندی کا پیالہ ابھی نہیں بھرا ھے) اور سب سے
آخر میں ان کا یہ تصور کہ تیرتھ کے مقدس پانی سے سب لوگوں کو
چھینٹے دیکر پاک و صاف کر دیا جائے در حقیقت ھندو فلسفۂ
طہارت اور مشرکانہ پوجا کے مراسم ھی سے ماخوذ تخییل ھے -
انھوں نے ھندؤں کی سماجی زندگی قومی تخیل اور مذھبی
تصورات ھی کو تمام انسانوں کیلئے باعث نجات سمجھا ھے -
بہر حال رو بندرو ناتھ کی شاعرانہ عظمت ان کے قومی اور وطنی
شاعرانہ خیالات میں اس قدر پنہاں نہیں ھے جس قدر بڑائی انھیں
ان نظموں کے ذریعہ حاصل ہوئی جو زندگی کی لہروں سے معمور
اور محبت و معرفت کے اسرار سے مملو ھیں -

زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے اپنی شاعری کا نچوڑ
ان الفاظ میں پیش کیا ھے -

" میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں انسانوں سے محبت کی ہے - اسی تصور نے میری کشتی حیات کے باد بانوں میں خوشگوار ہواؤں کی طرح حرکت پیدا کی ہے - باد بان نے کبھی ادھر اور کبھی اُدھر رُخ موڑا ہے تاہم یہ تموج کسی تصنیف کی حد بندیوں سے بالاتر ہی رہا ہے -" (پرو باشی چیت سنہ ۱۳۴۵ ب) -

" شیندجوتی " کی ایک نظم میں انہوں نے مادر وطن کے ساتھ اپنے دلی تعلقات کا ذکر بڑے ہی موثر الفاظ میں کیا ہے - " امر تو " نظم میں وہ فرماتے ہیں :

" آمار مدے ایک تو نوئی بیکنتہ ایسر آشا
اوئی بھانے موز باشا
جے ماٹی تے شیورے اُٹھے گھاش
جارپرے اوئی منترو پوڑے دکھینے باتاش
چیرودن ار آلوک جالا نیل آکاشےر نیچے
جاترا آمار ہی رتو پاگل نت راج ایر پیچھے
پھول پھوٹا بارچے راگینی بوکول شا کھائے شاد ھا
نیشکارونے اوزار آبیگ چپل ایر پاکھائے باند ھا
شے ای د ئے چھے رکتے آمار تہے تاثر دول دولی
شپتو لوکے شے ای اُڑے چھے شور ایر پا کھنا تولی "

میرے دل میں ذرا بھی بہشت کی آس نہیں ہے -

کیونکہ میرا گھر تو خود ہی وہیں ہے -

جس زمین پر گھاس اگتی رہتی ہے -

جس کے اوپر سے معتر پڑھتی ہوئی دکھن کی ہوا گزرتی رہتی ہے

اُن نیلے آسمانوں کے نیچے جن پر سرمدی چراغ جلتے رہتے ہیں -

میں اُسی رقاصۂ عالم کے پیچھے خود رقص کرتا ہوا پاگل کی طرح چلتا رہتاہوں -

جو راگینی بوکول پھول کی شاخوں میں ترتیب کے ساتھ پھول کھلاتی ہے -

جسنے بے کار اڑتے رہنے کا شوق چیل کے پروں میں باندھ دیا ہے -

اسی نے میرے خون میں موجوں کا تلاطم بخشا ہے -

وہی خوابوں کی دنیا میں سروں کا پنکھ پسارے اڑتا رہتا ہے -

رو بندرو ناتھ نے اسی زمین سے اپنے دل کی دنیا کو آباد کرنے کیلئے تصورات کے باغ اُگائے ہیں اور انہیں میں کھو کر منظوم سُر الاپے ہیں - ان کے تخیلات کی یہ دنیا حقائق کی دنیا سے مختلف ہوتے ہوئے بھی غیر متعلق نہیں ہے - ان افکار کا اظہار ان کی نظموں میں بہت واضح ہے - یہ بات پیش نظر رکھنی ہوگی کہ اس دنیا میں انسان کی تمنائیں اور آرزوئیں جس طرح واقعیت رکھتی ہیں اسی طرح عالم عمل سے نجات حاصل کرنے کی خواہش

بھی اپنے اندر صداقت رکھتی ہے - اس لئے ہماری زندگی میں اُس خواب کی دنیا کی احتیاج ہے - رویندرو ناتھ نے بھی اس خواب کی دنیا کو صاف اور سنہرا روپ دیکر نمایاں کیا ہے - ان کی کتاب "کلپنا" ایک مجموعۂ منظومات ہے اس میں اور بالخصوص ان کی کتاب "چترنگدا" میں ہمیں ان کی یہ خواب کی دنیا بیدار ہوتی نظر آتی ہے -

غیر ممالک میں رویندرو ناتھ کی شہرت اگرچہ ان کی گیتا نجلی کی مرہون منت تھی مگر ان کے ہم وطنوں کے نزدیک ان کی قدر و قیمت ان کی فطری محبت اور شاعری کی وجہ سے ہے - ان نظموں میں موسیقی اور شاعری ہم آہنگ ہے - لیکن رویندرو ناتھ کا سب سے بڑا فیضان یہ ہے کہ انہوں نے جن الفاظ کو بنگلا زبان میں استعمال کیا ہے اور جن مختلف الانواع اور وسیع المعانی تراکیب کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے ان کی وجہ سے انہوں نے شاعرانہ ادب کی حدود کو بے حد وسیع کر دیا ہے - انہوں نے سنسکرت کے تمام تر محاسن کو اپنے کلام میں از سرنو قبول کیا اور غیر ملکی ادب سے تخییل اور طرز اظہار کو اپنایا - پھر تشبیہات، استعارات اور نادر خیالات کو اپنے ملک کی زندگی سے اخذ کرکے ادب کو جان بخشی -

بولاکا کے متعلق پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ یہ ان کا شاہکار ہے -

اس کتاب کی ایک نظم کا نام بولاکا (راج ہنس کا جھنڈ) ہے۔ شاعر نے یہ دکھایا ہے کہ راج ہنس کا ایک جھنڈ فضا میں پرواز کر رہا ہے۔ چونکہ تمام مخلوقات میں حرکت کی ایک لہر پائی جاتی ہے اور اسی حرکت ہی میں اس کی زندگی اور مسرت ہے بقول اقبال۔

؎ "جنبش سے ہے زندگی جہاں کی - یہ رسم قدیم ہے یہاں کی"۔

راج ہنس کی اس پروازی حرکت کو شاعر حرکت عالم کا ایک مثالی نمونہ بتاتا ہے۔ روح انسان بھی ایک نا معلوم ازل سے دوسرے نا معلوم ابدتک سفر کرتی جا رہی ہے۔ اس حرکت سفری کے ساتھ بھی شاعر نے اس راج ہنس کی پرواز کو مماثل ثابت کیا ہے۔ اس نظم کے نام سے یہ پوری کتاب موسوم ہے۔

روبندر ناتھ نے آخر عمر میں اپنی متعدد نظموں کے ذریعہ اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ انھیں سرزمین وطن سے بے نہایت محبت تھی۔ اس سلسلے میں ایک نظم شیامولی (شمع شام) بنام "شرن" (یاد) میں وہ فرماتے ہیں کہ ان کی وفات کے بعد جب دنیا میں ان کا جسم خاکی باقی نہ رہے گا اس وقت اگر کوئی ان کی یاد سے اپنے دل کو تازہ رکھنا چاہے تو اُسے چاہئے کہ وہ اس سرزمین کے درختوں، ندی اور گھاس وغیرہ سے اظہار محبت کرے۔

اس طرح وہ شاعر کو یاد رکھہ سکے گا ۔ وہ اپنی کتاب " ارگسّ " (معصت) کی ایک نظم " مدھو موئے یر بتھبیر دھولی " (شیرہ ذات ارضی) میں فرماتے ھیں کہ یہ زمین شہد جیسی مٹھاس سے بھری ھوئی ھے ۔ اُس کے ذرات قند پارے ھیں ۔ انہوں نے اپنے دل میں یہ بات محفوظ کرلی ھے کہ دنیا اپنی تکمیل تک پہنچ چکی ھے ۔ وفات سے چند دنوں پہلے لکھی ھوئی نظم میں وہ فرماتے ھیں ۔

" روپ نرانر کولے جگے اُٹھی لم
حانی لم اے جگت شپنو نالے
رکتیر اکھرے دیکھی لم اپنار روپ
چھنیلم اپنارے اگھاتے اگھاتے
بیدونائے بیدونائے
شتّو جے کتھن ' کتھینیرے بھالو باشیلم
شے کے کھونو کرے نا بنچھونا
امیرتو ر دُکھیر تپشا اےی جیبن
شتّیر دارن مولا بھہ کری سارے
مریتوتے "شکل دنیا شودھہ کرے دیتے

ترجمہ :-
روپ نرائن کی گود میں میں جاگ اٹھا ۔

میں نے معلوم کر لیا کہ یہ دنیا ایک خواب نہیں ہے -
میں نے اپنا حسن خون سے لکھے ہوئے حرفوں میں دیکھا -
ہر ہر زخم اور ہر ہر درد میں میں نے اپنے آپ کو پہچانا -
سچائی مشکل چیز ہے اور اس مشکل چیز سے میں نے محبت کی
وہ کبھی ہمیں دھوکا نہیں دیتی -
یہ زندگی دکھ اور موت کیلئے ایک جدو جہد کا نام ہے -
دو سچائی کی بیش قیمت پونجی حاصل کرنے کیلئے -
اور دنیا کے تمام قرضوں کی ادائیگی کیلئے (ایک سعی میں
مشغول ہے) -

شاعر کے نزدیک تصورات کی دنیا اور زندگی میں دوئی فرق نہیں ہے - انہوں نے جہاں کہیں بھی تخییل کی عمارت کھڑی کی ہے وہاں غم کی چاشنی بھی کارفرما نظر آتی ہے - ان کی تخییل در حقیقت خوابوں کی ایک دنیا ہے جسے نظم کا روپ دیکر وہ منظر عام پر لائے ہیں -

۲—ڈرامے :--

ایک حقیقت نگار شاعر کیلئے ڈراما نگاری آسان نہیں - ڈرامے میں خالق او مخلوق سے علحدہ ہو کر موجود ہونا لازمی ہوتا ہے - اور گیتوں میں یہ بات نہیں ہوتی - گیتوں میں شاعر مخلوقات کے دلوں میں ڈوب کر ان کی حقیقت کے موتی نکالنے کی سعی

کرتا ہے - بخلاف اس کے ڈراموں میں ظاہری روپ ہی پر تخییل عمارات کھڑی کرتی ہے -

روبندر وناتھ کی شہرت اور عظمت دراصل گیتوں کی وجہ سے ہے - وہ کسی وقت بھی اپنے گیتوں کی دنیا سے الگ نہیں ہوئے - انھوں نے ڈراموں میں محض زندگی کی عکاسی ہی کو مقصود تصنیف نہیں بنایا بلکہ زندگی کے متعلق ان کے جو نظریات ہیں انھیں بھی پوری پوری طرح پیش کیا ہے - اس طرح اصول ڈراما نگاری سے ان کا میل نہ ہوسکا - علاوہ بریں ان کے ڈراموں میں آدرش پر زور، سنگیت کی افراط اور صد ہیبت کی استرکاری بھی ڈرامائی خصائص کی راہ میں رکاوٹ بنتی رہی ہے -

ان کے دو ڈرامے بہت مشہور ہیں - " بشرجن " اور " راجا و رانی " " راجا و رانی " میں انگریزی کے " میلو ڈراما " کی طرح خونریزیاں ہیں لیکن وہ خصائص جو ڈراموں کی جان ہیں ان کا اس میں فقدان ہے - ہاں " بشرجن " ہی ان کا شاہکار ہے - ان دونوں ڈراموں میں انھوں نے دلی جوش اور کشاکش حیات کا اظہار کرنا چاہا ہے لیکن وہ پوری طرح کامیاب نہ ہوسکے - ان کا ڈراما " راجا و رانی " تو اصلیت اس سے عاری ہے - اس کے مختلف کرداروں میں امتیاز بھی نمایاں نہیں ہے - شاید انھوں نے خود بھی اسے محسوس کیا تھا اور یہی سبب تھا کہ ان میں کچھ تبدیلیاں

کر کے انھوں نے اسے پھر دوسرے نام " تپتی " سے موسوم کیا تھا ۔
ڈرامائی نقد و تبصرے کے معیار پر صرف ان کا شاہکار " بشرجن "
ہی پورا اترتا ہے ۔ ڈرامے کے اہم مقتضیات اس میں موجود ہیں ۔
عجیب چیز یہ ہے کہ اس کے بعض اجزاء ایسے ہیں کہ اگر وہ
" راجا و رانی " میں موجود ہوتے تو وہ ڈراما بھی مکمل ہوجاتا ۔
جے سنگھ کے کردار میں مصنف نے غیر معمولی ڈرامائی خصوصیات کا
اظہار کیا ہے ۔

" چیر و کمار سبھا "، " بیکنتھ ایر کھاتا "، " گوڑائے گلد " (غلط)
رو بندرو ناتھ کے ظریفانہ طرز کے شاہکار ڈرامے ہیں ۔ تاہم ان میں
تعجب خیزی کا رس بہت کم ہے ۔

علاوہ بریں انھوں نے اور بھی بہت سے ڈرامے لکھے جنمیں
" راجا ' پھال گونی ' رکتو کروبی ' اچل آیتن ' اور ڈاک گھر "
مشہور ہیں ۔ انھوں نے متعدد عشقیہ مختصر ڈرامے بھی
قلمبند کئے جنمیں " بالمیکی پرو تیبھا " اور " مایار کھیلا " خاصی
شہرت رکھتے ہیں ۔ ان کے ساتھ اس طرز میں یورپ کے " اوپیرا "
Opera کو مماثلت حاصل ہے ۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک ڈراما
نگار کی حیثیت سے بھی رو بندرو ناتھ نے کوئی بلند مقام حاصل کیا ۔
ایک ڈراما نگار کو واقعات و حقائق سے بہت دور ہٹ کر صرف الفاظ کے
ذریعہ پر بھتی کا اظہار کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن رویندرو ناتھ نے اچھے

ڈراموں میں خود اپنے آپ کو کردار سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ اس میں آپ بیتی اور پر بیتی کے ڈانڈے اکثر و بیشتر مل گئے ہیں۔ یہی ان کے ڈراموں کی کمزوری ہے ورنہ جہاں تک تخیل، طرز ادا، زور بیان اور بندش الفاظ کا تعلق ہے ان کی بلندی مسلم ہے۔

رو بندر و ناتھ نے اپنے ناولوں میں اعلی اور اوسط طبقے کے انسانوں کی زندگی پیش کی ہے۔ نوکا ڈوبی، چوکھر بالی، گورا، اور گھرے باہرے۔ ان چاروں ناولوں میں ان کا ذوق تخلیق بے نظیر طور پر کامیاب ہوا ہے۔ مقدم الذکر دو ناولوں میں انسانی تاثرات قلبی کی عکاسی ہے اور موخر الذکر دو ناولوں میں ہندوستانی زندگی پر مغربی اثرات کا تذکرہ ہے۔ "گورا" اس لحاظ سے ایک بڑا دل چسپ ناول ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک آئرش لڑکا بچپن سے ہندو برہمنوں کے گھرانے میں پرورش پاکر بڑا ہوا۔ وہ اپنے آپ کو خالص ہندو برہمن سمجھنے لگا۔ وہ ہندوؤں کے غلط معتقدات اور ان کی کورانہ تقلید کا گرویدہ تھا۔ لیکن اپنے پرورش کنندہ باپ کی وفات پر جب اسے معلوم ہوا کہ ایام تحریک آزادی ہند اول یعنی سنہ ۱۸۵۷ع میں اُسے کہیں سے لا کر ایک ہندو برہمن نے پرورش کیا تھا اور واقعۃً وہ ایک غیر ہندو آئرش نسل کا فرد ہے تو اس نے اپنے تمام قدیمی معتقدات کو ترک کر دیا اور تمام مذہبی

بندھنوں کا جوا اس نے اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا - اس کتاب سے رویندر و ناتھ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوؤں کی تہذیب اور ان کے معتقدات کس حد تک ناقابل قبول اور بے حقیقت ہیں -
"گھرے باہرے" میں انھوں نے تحریک سوراج کے اس جزو کو پیش کیا ہے جس میں غیر ملکی مال کے مقاطعے پر زور دیا جا رہا تھا -
اس کتاب میں ایک ہندو زمیندار کے گھرانے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس میں عورت مقاطعے کی حامی ہے اور مرد نے مقاطعے کے خلاف دلائل پیش کئے ہیں - یہ کتاب بھی بہت دلچسپ ہے -
رویندر و ناتھ کا ایک اور ناول - " چار ادھیائے " (چار ابواب) میں اس انقلابی تحریک سے بحث کی گئی ہے جس میں انگریزوں کو مار ڈالنے کیلئے خفیہ تدابیر پر عمل درآمد ہو رہا تھا -
ان کا ناول " شیشر کبیتا " درحقیقت منثور نظم یا منظوم نثر ہے - وہ بظاہر نثر میں لکھا ہوا ناول ہے - لیکن تخیل اور بندش کے لحاظ سے نظم سے قریب تر ہے - رویندر و ناتھ ناولوں کے مقابلے میں ایک کامیاب تر افسانہ نویس کہے جا سکتے ہیں کیونکہ ان کی شاعرانہ عظمت افسانوں ہی میں ظاہر ہوئی ہے - غیر طویل افسانوں کے مصنف کی حیثیت سے انہیں بلا شبہہ فرانس کے مشہور افسانہ نگار " موپاساں " کا مثیل ماننا پڑتا ہے - ان افسانوں کے ذریعہ سے رویندر و ناتھ نے انسانی تخیل کی بلند پروازیوں کو

بہت خوش نمائی کے ساتھ ظاہر کیا ہے - یہ حقیقت ہے کہ ایک شاعر عموماً اپنے دلی تصورات کی آئینہ بندی کرتا ہے لیکن ایک افسانہ نگار دور سے کھڑے ہو کر دوسروں کی زندگی کا عمیق مطالعہ کر اور ان کے تصورات و نظریات کو انھی کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے - موپانساں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ جس طرح خالق کائنات دور سے اپنی مخلوقات کا نظارہ کرتا ہے اسی طرح اس مصنف نے بھی دور سے زندگی کی باریکیوں کو دیکھ کر ان میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے - روبندرو ناتھ کیلئے یہ امر ایک حیرتناک اجتماع ضدین کی حیثیت رکھتا ہے کہ ایک کامیاب ترین شاعر ہو کر اور اپنی نفسیاتی تحلیل میں کھو کر بھی انھوں نے افسانوں میں دوسروں کی زندگی کی باریک ترین اور نازک ترین رگوں کو پہچاننے اور سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے - " کلپھوں گچھو" کے نام سے روبندرو ناتھ کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا ہے -

---

دور روبندرو ناتھ میں بنگالی ادب کا دھارا

بہت سے مصنفین نے روبندرو ناتھ کو ایک عظیم الشان برگد کے درخت سے تشبیہ دی ہے جسکے سائے میں کبھی کبھی بہت سے خوبصورت پودے اور چھوٹے چھوٹے خوشنما درخت بھی اپنی بہاریں دکھاتے ہیں لیکن دیکھنے والوں کی نظروں پر برگد کی عظمت کچھ اس طرح چھا جاتی ہے کہ ان چھوٹے خوبصورت پودوں پر انکی نگاہیں نہیں پڑتیں - روبندرو ناتھ نے پچاس سال سے زاید مدت تک بنگلا ادب کی ایک گلستان سدابہار کی طرح پھول پھول کر خدمت کی - اتنی طویل مدت کسی مصنف کو قسمت ہی سے میسر آئی ہوگی - علاوہ بریں روبندرو ناتھ کے آفتاب ضیا بار کے سامنے دوسرے ستارے خود روشن ہوتے ہوئے بھی ناظرین کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہے - یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ عام طور پر مابعد کے شعرا و مصنفین نے روبندرو ناتھ ہی کو امام ادب تسلیم کیا اس لئے بھی وہ نہ تو صاحب طرز ہوسکے اور نہ ان کی کوئی مستقل حیثیت قائم ہوئی - روبندرو ناتھ کے دور میں جن نئے ادیبوں اور شاعروں نے بنگلا ادب کے ساگر میں اپنے تخیل کا تموج دکھایا ہے وہ چونکہ روبندرو ناتھ کے زیر سایہ ہی پروان چڑھے ہیں اس لئے ان کے

محاسن ایک حد تک ہماری نگاہوں سے اوجھل رہے - اگر کچھ
وگ لائق توجہ ہوئے بھی تو وہ اپنا پورا پورا اثر قائم نہ کرسکے -
ان میں سے غیر معمولی خصوصیات کی بنا پر جو لوگ ان کی
روش سے ہٹ کر کسی قدر فلک ادب پر چمکے ہیں ان افسانہ
نگاروں اور انشا پردازوں میں پرمتھ چودھری قابل ذکر ہیں -
ان کے متعلق صرف قابل ذکر کہنا ہی صحیح نہ ہوگا بلکہ بعض
حیثیتوں سے موجودہ طرز نثر نگاری میں انہوں نے روبندرو ناتھ سے
بھی زیادہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے - نظم کے میدان میں
مہیت لال مجمدار، شتیندرو ناتھ دت اور قاضی نذرالاسلام
روبندرو ناتھ کے اندھے مقلد یا نقال نہ تھے - انہوں نے بنگالی
نظموں کے میدان میں اپنے لئے خاص راستے پیدا کئے اور اسی لئے
ہم انہیں صاحب طرز شاعر کہہ سکتے ہیں - ان کے حالات کا تفصیلی
جائزہ لینے سے پہلے ہمیں ان لوگوں کا ذکر کر دینا ضروری ہے جنھوں نے
روبندرو ناتھ کی تبعیت میں ان کے زیر سایہ ادب کے نونہال کو
پروان چڑھانے کی کوشش کی - ان متبع شعراء میں اتول پرشاد
سین، بلندرو ناتھ ٹھاکور، کرونا نیدھان بندھو پادھیائے،
جوتندرو موہن باگچی، کمود رنجن ملک، کالی داس رائے،
کیرن دھن چٹو پادھیائے، نریندرو دیب، ساوتری پرشنو چٹو
پادھیائے، ہمایوں کبیر، بند علی، عبد القادر، شہادت حسین

اور غلام مصطفی وغیرہ ایسے لا تعداد شعراء اور بھی ہیں جن کا نام
لیا جاسکتا ہے - استعمال الفاظ ، نظم کی ترتیب اور تخییل کی
آرائش کے اعتبار سے مندرجہ بالا شعراء کسی ایسی نئی چیز کا
ادب میں اضافہ نہ کر سکے جس کی وجہ سے ہم انہیں کوئی امتیازی
درجہ دے سکیں - ان کیلئے کوئی نئی چیز پیدا کرنا اس لئے بھی
ممکن نہ تھا کہ ایک طویل مدت تک رویندر و ناتھ نے بنگلا ادب کے
باغ پر آکاس بیل بن کر اس طرح سایہ افگنی کی تھی کہ اُس سے
باھر نکل کر اپنی بہار خود پیدا کرنا ان متبع شعراء کیلئے دشوار ھی
نہیں نا ممکن بھی تھا - اس لئے کہ نظم کی ترکیب اور نظم کی
زبان نے رویندر و ناتھ کے ھاتھوں ایک خاص ہیئت اور ایک
مخصوص انداز اختیار کر لیا تھا اور جو لوگ اس راہ پر گام زن ہونا
چاھتے ان کیلئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ
رویندر و ناتھ کی پیروی ھی میں اپنی سر بلندی کا تصور
کر سکیں - لہذا ان کی نظمیں پرانی ڈگر پر ایک جامد حقیقت
بن کر رہ گئیں - ان حالات میں جو چند شعراء اپنے لئے نئی راہ
نکالنے میں کامیابی حاصل کر سکے وہ ھمیں طرز جدید کے آسمان پر
ایک سیارہ مستقل کی صورت میں نمایاں نظر آتے ھیں - صاحب
طرز شعراء میں سب سے پہلے پر متھو چودھری کا نام لیا جاسکتا ہے -
پر متھو چودھری کو خاص طور پر شاعر نہیں کہا جاسکتا - وہ

در اصل افسانہ نگار اور نثر نویس تھے - ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بنگلا زبان میں فرانسیسی زبان کی عذوبت، سلاست اور گہرائی پیدا کی - اس گہرائی اور تیزی کو وہ کامیابی کے ساتھ اپنی نظموں میں بھی نبھا سکے ہیں - ان نظموں میں ان کے متعدد قطعات Sonnet قابل ذکر ہیں -

پرمتھو چودھری کے بعد لائق تذکرہ شتندرو ناتھ دت ہیں - انھوں نے طرز ادا پر زیادہ زور قلم صرف کیا ہے اور دوسرے محاسن نظم کی طرف نسبتہً کم توجہ کی ہے - اس خصوصیت میں انھوں نے لاجواب صلاحیت کا ثبوت دیا ہے - ان کی خصوصیات میں سے یہ بات ہے کی کسی موضوع پر نظم لکھتے وقت یہ اپنے تاثرات سے بے نیاز ہوکر موضوع ہی کا تذکرہ، اس کی توضیح اور اس کے متعلق خصوصیات کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں - بخلاف اس کے ہم روبندرو ناتھ میں یہ بات دیکھتے ہیں کہ موضوع سے متاثر ہو کر جس نئے تخیل کو ان کا ضمیر پیدا کرتا ہے اُسے الفاظ کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں - مختصر یہ کہ شتندرو ناتھ اپنے قلبی تاثرات سے بے نیاز ہوکر موضوع میں کھو جاتے ہیں اور روبندرو ناتھ موضوع سے متاثر ہوکر اپنے تاثر میں گم ہو جاتے ہیں - ایک مثال سے یہ بات زیادہ واضح ہوسکے گی - پدما ندی کو موضوع نظم بنا کر دونوں ہی شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں - روبندرو ناتھ

جہاں یہ فرماتے ہیں "ہے پدّا امار توما ئے اما ئے دیکھا کتو شتو بار "
یعنی اے ہماری پدما تجھے میں نے کتنی کتنی طرح سے کتنی بار دیکھا
ہے - روبندرو ناتھ پر پدما کے نظارے نے جو تاثر پیدا کیا ہے اُسے بیان
کر کے وہ دوسروں کو بھی متاثر کرنا چاہتے ہیں لیکن شتندرو ناتھ
کہتے ہیں - " ہے پدا پسر ولویدک کری ہے بھیشونا بھیربی
شندری " - یعنی اے پدما تو اگرچہ تباہی لانے والی ہے لیکن
ایک غیر متناہی حسن بھی رکھتی ہے - یہاں شاعر اپنے تاثر سے
بے نیاز ہو کر صرف پدما کے ان خصائص کو بیان کرتا ہے جس کا
نظارہ اس کی آنکھوں نے کیا ہے - اس طرح کی بہت ساری
نظمیں شتندرو ناتھ نے لکھی ہیں - بدیا ساگر ' نپھور چاند کنڈو
(ایک شخص خاص) ' نور جہاں اور همالیہ وغیرہ ان کی مشہور
نظمیں ہیں -

شتندرو ناتھ نے بہت سی نظمیں وقتی حالات سے متاثر ہو کر
بھی لکھی تھیں - یہ وقتی تاثر بھی ان کی خصوصیات میں سے تھا -
وقتی نظمیں اکثر و بیشتر کسی سیاسی ' اقتصادی ' سماجی یا
معاشرتی موضوع پر لکھی جاتی ہیں اور حالات کی تبدیلی کے بعد
وہ بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہیں - شتندرو ناتھ کی ایک
ایسی ہی نظم " مہتر " ہے - انھوں نے ہمارے ملک کے مہتر
(بھنگی) کی خصوصیات اور ان کی خدمات کا بڑے حسن کے ساتھ

تذکرہ کیا ھے - موجودہ معاشرے میں جب مہتر کی ضرورت ھے اور وہ ھماری ضروریات زندگی کا ایک لازمی جزبنا ھوا ھے یہ نظم قدر کی نگاہ سے دیکھی جا سکتی ھے - لیکن ایک ترقی یافتہ معاشرے میں جب مہتر کی ضرورت باقی نہ رھیگی اس وقت یہ نظم اپنی روح کھو بیٹھے گی -

شتندرو ناتھ نے نئی نئی بحریں بھی ایجاد کی ھیں اور ان میں تخلیق شگفتگی کا بھی کمال دکھایا ھے - اسی طرح منظوم تراجم میں بھی اپنی قابلیت اور صلاحیت کا کافی ثبوت دیا ھے - بعض آیات قرآنی احادیث رسول ' فارسی منظومات اور اسنۂ مغربیہ کے بعض تراجم ان کے زور قلم کے شاھد ھیں - ان کے مجموعہ تراجم کا نام "تیرتھو شلیل" ھے - دور جدید میں شتندرو ناتھ ھی سب سے پہلے بنگالی شاعر تھے جنھوں نے عربی ' فارسی اور اردو کے بے شمار الفاظ کو بنگلا ادب کا جزبنا دیا - چینی ادب کے بہت سارے تخیلات کو بھی انھوں نے بنگالی ادب منظوم میں جمع کر کے اس کا نام "چینر دھوپ" رکھا ھے - نا روے کے ایک ناول Liver Lavens کے انگریزی ترجمہ کو بنگلا کے قالب میں ڈھالا ھے - اس کا نام "جنمو دکھی" ھے - شتندرو ناتھ کے اور دوسرے مجموعۂ نظم کے نام یہ ھیں - "بینو و بینا ' ھوم شیکھا ' پھولر فصل ' کوھو و کیکا ' تولیر لیکھن ' منی منجوشا '

ابھر و ابھر" وغیرہ - شتندرو ناتھ کا ایک مجموعۂ نظم بنام "کابو شنچین" شائع ہو چکا ہے - شتندرو ناتھ کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ دور حاضر میں جو ساری چیزیں لا مذہبیت، غیر صداقت، بزدلی، انجماد، تحقیر اور تذلیل کی انھیں نظر آئیں انھیں اس شاعر نے اچھی طرح ٹھکرا دیا ہے اور ان کے خلاف آواز بلند کی ہے - ان کی زندگی کا مختصر دور سنہ ۱۸۸۹ع سے سنہ ۱۹۳۲ع تک ممتد ہے - ان کی موت پر رو بندر ناتھ نے ایک طویل نظم میں غم کے آنسو بہائے ہیں - ۰

مہیت لال مجمدار :—

مہیت لال مجمدار ایک شاعر سے زیادہ ترصیع زبان کے ہنر سے واقف اور فن بیان کے ماہر ہیں - انھوں نے زبان نظم کو زیادہ دلا ویز بنانے کی سعی کی ہے - اس اعتبار سے انھوں نے بنگلا زبان کو سنسکرت کے لغات سے زیادہ مرصع اور دولت مند بنانے کی کوشش کی ہے - ان کی پوری جدو جہد یہ تھی کہ زبان زیادہ موقر، پر زور، خوبصورت اور طاقتور ہو سکے - اس حیثیت سے وہ صاحب علم اور ہنر مند شاعر ہیں - انھوں نے شاعری کو بطور آرٹ کے قبول کیا تھا اور شاعری ان کے نزدیک کسی عام آمد کا نتیجہ نہ تھی - قوت زبان اور چستی تراکیب کے ساتھ انھوں نے وقیع تخییل کی تخلیق کی - مثال کے طور پر ہم ان کی نظم کالا پہاڑ میں دیکھتے ہیں کہ کالا پہاڑ ایک طاقتور

ہندو تھا جس نے ہندو متعقدات سے بغاوت کی - اس نے مورتیوں اور مندروں کو مسمار کیا - اس نظم میں شاعر نے کالا پہاڑ کے عزم و همت کی داد دی ہے - مہیت لال کی شہرت کا خاص سبب یہ ہے کہ انھوں نے عربی و فارسی تخییل کو بنگلا ادب میں بڑی کوشش سے جمع کیا - نذر الاسلام سے بہت پہلے ہی انھوں نے فارسی و عربی خیالات کی دولت سے بنگلا ادب کو مالا مال کیا تھا - اس سے پہلے شتن دت نے بھی عربی و فارسی الفاظ سے اس زبان کی دولت میں اضافہ کیا تھا - لیکن ان کی کوشش میں آورد کا دخل تھا اور مہیت لال کے یہاں بے ساختہ پن اور آمد ہے - وہ اپنی نظم دلدار میں فرماتے ہیں :—

رات بھر شور و غل * دل کھول خیالی
کلیجائے دک دول * دل نائے کھوالی
دور کر افسوس * جامی آر کر تیر
گوے جانا آپ ہوش * وقت ہے پھر تیر
بڑو میٹھا شربت * بھر بھر پیالی
کالے باجے نوبت * چوکیے لاگے دیالی

ترجمہ :—

تمام رات شور و غل - اے خود فراموش دل کی گرہ کھول دے
جب من میں اضطراب ہے - تو دل کھو دینے میں بھی کیا حرج ہے

افسوس دور کر - جامه اور پوشاک دیکھ کر
او خوش خیال باغ میں جا - یہ وقت خوشی کا ھے
بہت میٹھے شربت سے - پھر پیالے کو بھر دے
کان نوبت کی آواز سنتا ھے اور آنکھوں کے سامنے دیوالی ھے -

مہیت لال نے صرف عربی و فارسی الفاظ ھی سے بنگلا زبان کی دولت میں اضافہ نہیں کیا بلکہ اسلامی تاریخ و حیات مسلمین کے زریں پارھائے تابندہ سے انھوں نے بنگلا نظموں کے دامن کو بھرنے کی سعی بھی کی ھے - مثلاً " نادر شاھر جاگرن (نادر شاہ کی بیداری) ' نادر شاھر شیش (نادر شاہ کا خاتمہ) ' نور جہاں و جہانگیر ' شیش شعائے نور جہاں " (نور جہاں بستر مرگ پر) وغیرہ ان کی بڑی کامیاب نظمیں ھیں - مہیت لال کی نظم بیدوئن نے غیر معمولی شہرت حاصل کی - عرب کے بدوؤں کی آزاد زندگی اور بے آب و گیاہ ریگستان میں ان کی ایام گزاری ' ان کی باھمی محبت اور تعلقات وغیرہ کے انمول خزانوں کو انھوں نے اپنے ادب میں منتقل کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ھے - مہیت لال نے قبل اسلام کے شعرا مثلاً امرؤ القیس وغیرہ کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ھے - ان کی مشہور کتابیں "شپن پوشاری" (خواب کی ڈالی) ' بشورنی ' (بھولی ھوئی باتیں) ' شرو گرل (زھر شہوت) اور ھیمنتو گدھولی (شفق خزاں) ھیں - بحیثیت ایک تنقید نگار کے وہ خاص شہرت رکھتے ھیں -

قـــاضی نذرالاسلام

نذرالاسلام کی شاعری پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ہمارے سماجی و معاشرتی نظام میں جو ابتری پیدا ہو گئی تھی اس کا تفصیلی طور پر جائزہ لیا جائے - سیاسی میدان میں سوراج کی تحریک بہت پہلے ہی سے کارفرما تھی - یک بیک اس تحریک نے تخویف اور دہشت پیدا کرنے کی انقلابی صورت اختیار کر لی - ابتداءً اس جنگ میں جب اتحادیوں کی فتح کے امکانات کم ہو رہے تھے اور جرمنی کی کامیابی کا پھریرا فضا میں بلند تر ہو رہا تھا - اس نازک وقت میں ہمارے ملک کے کچھ نوجوانوں نے قاتلانہ صورت رکھنے والی دہشت پسندانہ انقلابی تحریک میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا - ان کا مقصود اولین یہ تھا کہ غیر ملکی صاحبان اقتدار کو جس طرح بھی بن پڑے قتل کر دیا جائے - یہ سازش بنگال میں زیادہ کامیاب رہی اور تمام ملک میں عموماً سخت غم اور غصے کی آگ بھڑکنے لگی - بہت لوگ گرفتار ہو کر سزایاب ہوئے - مجرموں کو پھانسیاں دی گئیں اور بہتیروں نے عبور دریائے شور و دائم

العبس کی سزائیں بھی بھگتیں - اسی اثنا میں روس کی عظیم مملکت سنہ ۱۹۱۸ء میں ایک عظیم الشان انقلاب کا شکار ہوئی اور اس کے نتیجے میں بعض عوام کو اسی راہ میں اپنی فلاح و بہبود کے امکانات نظر آنے لگے - روس کے انقلاب سے متاثر ہونے والے نوجوانوں میں سے ایک شخص کا مرید مظفر احمد نے اس نئے دھرم یعنی کمیونزم کی آگ کو ہندوستان میں بھی لا جلایا اور یہاں بھی باقاعدہ طور کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی - اس جنگ عظیم میں ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا اور ان کی همدردی میں ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی خلافت کمیٹی کی بنیاد بس استوار کیں - اس کمیٹی کے ساتھ نوجوان طبقے کو خاص عقیدت تھی - مذھب کی آڑلے کر انگریزوں نے چند با اثر مسلمانوں کے ذریعہ سے کمال اتاترک کے خلاف ہندوستان میں خوب خوب پروپیگنڈا کرایا اور عامة المسلمین نے بھی اس خیال سے کہ مسلمانوں کی مرکزیت کیلئے وجود خلافت ناگزیر ھے بقاو وجود خلافت کیلئے جدو جہد کی - کروڑوں روپئے چندے کے ذریعہ جمع کرکے ترکی بھیجے گئے اور کچھ لوگوں نے ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں اپنی رضاکارانہ خدمات بھی پیش کیں - لیکن اپنے مخصوص مفاد کے پیش نظر مصطفی کمال نے خلافت کے قصر کہنہ کی مسماری ھی میں ترک قوم کی فلاح محسوس کی -

مصطفی کمال کی مخالفت میں ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے زور و شور سے خلافت کی حمایت کی - گاؤں گاؤں میں خلافت کمیٹیاں قائم ہوئیں - اس تحریک کے پس پردہ مسلم زعما عالم اسلام کے قائدین کو ہم خیال بنانے اور باہمی ارتباط کی کڑیوں کو مضبوط بنانے میں مصروف تھے - چونکہ ہندوستان اس وقت عام طور پر انقلابی اور حریت پسندانہ تحریکوں کی آماج گاہ تھا اسلئے تحریک خلافت نے بھی بہت جلد قبول عام حاصل کر لیا - یہ بات قابل ذکر ہے کہ تحریک خلافت کے قائدین تحریک آزادی ہند کے بھی علم بردار تھے اور جہاں تک اس ملک کی حریت کا سوال تھا اس میں یہ کانگریسی لیڈروں کے بالکل ہم نوا تھے -

ملک کی جب یہ حالت تھی اس وقت نذر الاسلام نے فوجی ملازمت قبول کی اور ایک حولدار کی حیثیت سے وہ فوج کے ساتھ کراچی تک گئے - لیکن جنگ کے خاتمے کی وجہ سے انھیں میدان جنگ کا منھ دیکھنا نہ پڑا - فوجوں کے ساتھ ارتباط نے نذر الاسلام کی طبیعت میں ایک نیا جوش پیدا کر دیا - بعض فارسی داں فوجی ساتھیوں کی وساطت سے نذر الاسلام نے فارسی کے مشہور غزل گو شاعر حافظ شیرازی کے کلام سے واقفیت بھی حاصل کی - وطن واپس آکر مختلف رسائل و اخبارات میں نئے طرز کی انقلابی شاعری کی بنیاد پر انکی نظمیں شائع ہوئیں اور اس طرح صرف چندھی

دنوں میں انہیں غیر معمولی شہرت حاصل ہو گئی - اس زمانے کی ان کی مشہور انقلابی نظم " بِدروھی " (باغی) ہے - جس نے عوام میں بے حد مقبولیت حاصل کی - اس نظم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نذر الاسلام کا دل کس درجہ سیماب وار تھا - وہ کس حد تک عوام کی تکالیف سے خود متاثر ہو کر دوسروں کو متاثر کرنے کی قدرت اور صلاحیت رکھتے تھے - وہ سر تا پا انقلاب تھے - " بدروھی " شاعر کی قلبی کیفیت کی مکمل طور پر آئینہ دار نظم ہے اور یہی وہ نظم ہے جسنے بنگلا ادب میں خاص مقام کی طرف ان کی رھبری کی - ھمیں اس میں یہ نظر آتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کی قدیم تاریخ اور ان کے نظریات سے طاقت بیان اور انقلابی تصورات کو قبول کیا ہے - نذر الاسلام نے ایک باغی کی زبان سے وہ سب کچھ کہدیا ہے جس میں عزرائیل کے آھنی پنجوں کا زور اور اسرافیل کے صور کی گرج پوشیدہ ہے - انہوں نے ھندوؤں کے پورا نوں اور مسلمانوں کی تاریخوں سے تمام تر انقلابی خزینوں کو اپنا لیا - واقعۃً انہیں کسی مذھب سے ربط یا انس نہ تھا بلکہ صرف اس انقلابی حصے سے علاقہ تھا جسے ان کی بغاوت و انقلاب پسند طبیعت نے قبول کیا -

بنگلا ادب میں نذر الاسلام کے نغموں سے ایک نئی طاقت اور نئے سُر کا اضافہ ھو گیا - پُر جوش تخیل سے معمور اور بے انتہا

مضطرب اور چنچل طبیعت نے نذر الاسلام کو سارے بنگال کا محبوب شاعر اور ان کے نغموں نے سارے ملک کو متوالا بنا دیا۔ ان کی "اگنی بینا" (آگ کا بین باجا) اور "بشیر بانسی" (زھر کی بانسری) حکومت کے خلاف انقلاب اور بغاوت کے نغموں سے معمور نظمیں ھیں۔ ان میں مظلوم اور مصیبت زدہ انسانوں کے دلوں کی داستانیں پوشیدہ ھیں۔ وہ جس قدر حکومت کی نظروں میں معتوب ہوئے اسی قدر عوام نے انھیں اپنا محبوب بنایا۔ بہت ھی تھوڑے عرصے میں نذر الاسلام نے جو مقبولیت اور شہرت حاصل کرلی تھی وہ شہرت اور حسن قبول اتنے قلیل زمانے اور اس قدر کم عمری میں روبندر و ناتھ کو بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دور کے بنگالی سماج کی طبیعتیں اس قسم کی انقلابی نظمیں پسند کرتی تھیں اور اسی لئے انھیں قبول عام حاصل ھو سکا۔ یہ ممکن ہے کہ ھم اس سے ان کی نظموں کے استقلال اور ان کے پیغام کے دوام کے متعلق نا مناسب یقین پیدا کرلیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ نذر الاسلام کی اکثر و بیشتر نظمیں بالکل وقتی جذبات کی حامل ھیں۔ یہی ان کی خصوصیت ہے۔ یہ سچ ہے کہ وقتی جذبات پر اتنی کثیر نظمیں اور کسی نے بھی نہیں لکھی ھیں۔ بعض بے شک مستقل پیغام کا درجہ بھی رکھتی ھیں لیکن وہ تعداد

میں بہت کم ہیں ۔ نذرالاسلام کی نظموں کو مائیکل مدھو شودن دت کی انقلابی نظموں سے کسی حد تک مماثلت حاصل ہے لیکن فرق یہی ہے کہ نذرالاسلام کی نظموں میں وہ گہرائی اور سنجیدگی نہیں ہے جو مائیکل کے یہاں پائی جاتی ہے ۔ نذرالاسلام نے زندگی کی ان گہرائیوں سے تعلق قائم نہیں کیا تھا جس کی ایک عظیم الشان شاعر کو ضرورت ہے ۔ وقتی طور پر طبیعت میں جوش پیدا کرنے کی صلاحیت ان کی عام نظموں میں اچھی طرح پائی جاتی ہے ۔

نذرالاسلام کو انگریزی شاعر کپلنگ کے ساتھ بہت مماثلت حاصل ہے ۔ کپلنگ کے متعلق ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ نے لکھا ہے کہ کپلنگ نے شاعری میں صحافت کا تتبع کیا ہے اور بیشتر انہوں نے خالص آرٹ کی شاعری نہیں کی ہے ۔ لیکن ان کی وقتی نظمیں بھی وقتی جذبات کی حامل ہوتے ہوئے بڑی ہی جان دار ہیں ۔ نذرالاسلام کے متعلق بلا تکلف یہی باتیں کہی جا سکتی ہیں ۔ انہوں نے بیک وقت پروپیگنڈائی قسم کی نظمیں اور مضامین لکھے ہیں اور اخبارات کی ادارت بھی کی ہے ۔ ان کی رومانوی نظمیں بھی وقتی تاثر کی کیفیات سے خالی نہیں ہیں ۔

پہلے ہی عرض کیا جاچکا ہے کہ جس وقت تحریک عدم موالات اپنے شباب پر تھی اور سارے ملک میں آزادی کیلئے ایک

تڑپ پیدا ہو چکی تھی اس وقت ہم نے بنگال میں نذرالاسلام کے ذریعہ آزادی کا نغمہ سنا - ان کی ابتدائی نظمیں ہمیں بندھن سے مکتی کے حصول کا نغمہ سناتی ہیں - ان کی نظمیں بہ یک وقت پر جوش ' غیر مرتب ' غیر منظم لیکن وحشیانہ دیوانہ پن سے معمور ہیں اور اس صفت نے انھیں عوام کا محبوب بنایا - انھوں نے مذہب سے بے نیاز ہو کر ہندؤں کی طاقتور دیوی کالی اور مسلمانوں کے انقلابی ہیرو مثلاً اتاترک وغیرہ کے محامد اوصاف کے ترانے یکساں جوش و خروش سے گائے - انھوں نے ہندؤں کے پوران اور مسلمانوں کی تاریخ کو یکساں طور پر قبول کیا اور ان پر اپنے بلند آہنگ ترانوں کی بنیادیں رکھیں - اسی زمانے میں انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار بنام "دھوم کیتو" (شہاب ثاقب) بنگلا زبان میں جاری کیا - اس کے ذریعہ عموماً باغیانہ مضامین کی اشاعت ہوتی اور اسی کے ثمرے میں انھیں کچھ زمانہ قیدوبند کی کڑیاں جھیلنے میں بھی گزارنا پڑا - قید میں بھی انھوں نے بہت ساری قومی نظمیں لکھیں - اسی دور میں انھوں نے بھوک ہڑتال کی جو چالیس روز تک باقی رہی - جیل سے نکلنے پر نذرالاسلام نے شادی کی اور حتی الامکان ایک متاہل زندگی گزارنے کی کوشش کی لیکن ان کے جیسے چنچل من والے انسان کیلئے نچلا بیٹھنا ممکن نہ تھا - اسی اثنا میں

نذرالاسلام نے "لانگل" نامی ایک اخبار کیلئے عوامی نظمیں لکھنی شروع کیں - اس قسم کی نظمیں لکھتے لکھتے نذرالاسلام کی طبیعت نے سنگیت اور موسیقی کی طرف پلٹا کھایا اور انھوں نے بہت سارے سودیشی گانے اور ھندؤں کے شیام سنگیت مرتب کئے - لیکن جس چیز نے انھیں بے مثال شہرت بخشی وہ تھی ان کی بنگلا ادب میں غزلوں کی تخلیق - ان سے پہلے کسی نے اس کا تصور بھی نہ کیا تھا - ان کی وہ تمام تر غزلیں جو اردو فارسی غزلوں کے طرز پر لکھی گئی تھیں بنگلا ادب کا ایک غیر فانی جز بن گئیں -

نذرالاسلام کے تمام گانے ابتک منظم اور مرتب صورت میں ھمارے سامنے نہیں آسکے ھیں - روبندرو ناتھ کے گانوں کی تعداد دو ہزار بتائی جاتی ہے لیکن نذرالاسلام کے گانے تعداد میں ان سے زیادہ ھیں - ان کی اھم منظوم کتابیں یہ ہیں :- "اگنی بینا ، بشیر بانشی ، شندھو ہندول (سمندر کا ھنڈولا) ' شامّو بادی ' چکّر و باک ، چھایا نٹ ، دولن چاپا ، نوتن چاند " وغیرہ ؛ گانوں کے مجموعے میں بلبل ، ذوالفقار ، نبو گیتی وغیرہ ؛ تراجم میں ترجمہ رباعیات حافظ اور ترجمہ رباعیات عمر خیام قابل ذکر ھیں - ڈراموں "میں جھیلی میلی" اور "عالیہ" مشھور ھیں - ناولوں میں "بر تو کھودا ، کوھے لیکا ، باندھن ھارا" اور افسانوں کے مجموعے بنام

" بیتھار دان " اور "شیولی مالا" مشہور ھیں - اسی طرح کی چند اور کتابیں بھی ان کی یادگار ھیں -

اسلامی موضوعات پر بھی نذرالاسلام نے کتابیں لکھیں - ان موضوعات میں پارہ عم کا منظوم بنگالی ترجمہ اور حضرت محمد کی منظوم سوانح حیات بنام " مورو بھا شکر " (آفتاب صحرا) قابل ذکر کتابیں ھیں -

مندرجہ ذیل مختصر نمونۂ کلام نذرالاسلام کی بے قرار زندگی اور بے تاب دل کے احوال پر کچھ روشنی ڈال سکے گا :-

۱ - ایشو طوفان جیمن آشے
شموکھے جا پابے دولے چلے جابے
آکارن اُلاشے
اس طرح آؤ جیسے طوفان آتا ھے
سامنے جو بھی آئے اُسے مسرت بے سبب سے
پامال کرتے جاؤ
آنو انتو بستریتو پران
بھولو پرو باھو گوتی
غیر متناھی حدوں تک پھیلی ھوئی ایسی زندگی حاصل کرو
جس کی موجیں بے حدو بے حساب حدوں تک پھیلی ھوں
کو لر ابوجنا بھیشے گیلے ھو بے نا کاھارو کھوتی

ساحل کی گندگی اگر بہہ بھی جائے تو اُس میں
کسی کا نقصان نہ ہوگا

٢ - کھولو ارگول پاشانر کھوشی بھوک انر گل ،
جھانک بیندھے نیل اکاشے جمین اُڑے
پارا بت دل

خوشی کی آمد کے لئے خوشی کے دروازے کھول دو تاکہ وہ
بے روک داخل ہوسکے -
جیسے نیلے آسمان پر کبوتروں کا غول اُڑتا پھرتا ہے -

شاگرے جھانپائے پڑو اکارنے ، اُتھو دور
گری چوڑے

بلا سبب بھی سمندر میں کود پڑو اور بڑے اونچے پہاڑوں کی
چوٹی پر چڑھ جاؤ -

بندھو بولیا کنٹھے جڑاؤ پتھے پیلے مرتورے
راہ میں اگر موت سے ملاقات ہو تو اسے دوست کہہ کر گلے لگالو -

٣ - بنی کر دوتو جاہاج ڈوبی بے
تابولے شند ھو ڈھؤ
کسی تاجر کے دو جہاز ڈوب جائیں گے کہا اس خیال سے
سمندر کی موجیں -
شانتو ہو ئیا گھو مائے روٹھی بے - شونیاچھے کبھو کے او؟

ساکن ہو کر سوئی رہیں گی ؟

کیا ایسا کسی نے کبھی سنا ہے ؟

اولی رابت کی چلی بے نا پتھ پی پی لیکا

مرے بولے

کیا اس خیال سے کہ چیونٹیاں مرجائیں گی ہاتھی راستے پسر نہیں چلے گا ؟

گھر پوڑے بولے پر بل بنّی شیکھا

اوتھی با نا جلے

اور کیا صرف اس خیال سے کہ گھر جل جائے گا آگ اپنے شعلوں کو روک لے گی -

انکو کشے نا حشاب کرے نا

بے حشابی جؤبن

بے حساب جوانی نہ حساب کرتی اور نہ ریاضی کے مسائل حل کرتی -

بھا نگا چال دیکھ نامی بے نا کیرے

شرابنیر برشن ؟

کیا ٹوٹی ہوئی چھت دیکھ کر ساون کی جھڑیاں اپنی برسات روک دینگی ؟

نذر الاسلام کی ایک بنگلا غزل کا نمونہ دیکھئے -

باگھچا لے بلبلی تولی پھول شا کھالے دش نا آجی دول

اے بلبل تو باغ میں آج پھولوں کی شاخوں کو حرکت نہ دے ۔

آجو تار پھول للی دیر گھوم توٹے نی تندر الے بی بھول

کیونکہ اس کے پھولوں کی کلیوں کی ابتک نیند نہیں ٹوٹی ہے اور

وہ مدھوشی سے جھوم رہی ہیں ۔

اجو ھالے دنتو شا کھالے اُتری بالے جھر چھے نی شی دن

افسوس کہ آج بھی برھنہ شاخوں پر اتر کی ٹھنڈی ہوا رات دن

برف باری کیا کرتی ہے ۔

آشے نی دکھنے ھوا ' غزل گاوا موما چھی بی بھول

دکھن کی ہوا ابتک نہیں آئی اور شہد کی مکھیاں غزل گانے

نہیں نکلیں ۔

یہ افسوسناک امر ہے کہ سنہ ۱۹۴۱ع میں نذرالاسلام پر فالج کا
ایک شدید حملہ ہوا اور اس وقت سے ابتک بنگال کا یہ انقلابی
شاعر زندہ درگور ہے ۔ سوچنے ' سمجھنے ' کسی کو پہچاننے
یہاں تک کہ باتیں کرنے کی طاقت سے بھی محروم ہے اور اپنی
زندگی کے باقی ایام پورے کر رہا ہے ۔

تخلیق پاکستان سے متصل سابق ولاحق ادبی دور

نذرالاسلام کے ساتھ ساتھ بنگلا نظم میں سماج کی بیداری کا ایک عجیب وغریب مظاہرہ منظر عام پر آیا۔ بنگال کے شاعروں اور ادیبوں نے انسانوں کے طبقاتی اختلافات اور اقتصادی عدم توازن پر بہت عمیق طور پر غور وفکر شروع کردیا۔ اس کی بنیاد دراصل نذرالاسلام ھی سے شروع ہوئی تھی۔ ان کی نظم قلی، شرمک (مزدور) : مانش انسان) وغیرہ اس تخیل کی تعمیر کیلئے بنیادی اینٹ کہی جا سکتی ہے۔ نذرالاسلام کی نظموں میں ہمدردی، دلی جوش، اور محبت انسانیت کا ایک گہرا جذبہ موجود تھا۔ البتہ نئے شاعروں نے اقتصادی عدم توازن وغیرہ کے اظہار میں اپنے دلی جذبات اور تاثر کو دخیل نہیں بنایا۔ ان کا یہ مقصد نہ تھا کہ عام طور پر انسانوں سے محبت کی جائے بلکہ ان کے پیش نظر صرف یہ تھا کہ ایک خاص طبقے اور جماعت کے انسانوں سے اظہار ہمدردی کیا جائے۔ ان کا مقصود سیاسی طرز کی محبت کا اظہار تھا اور ان کی شاعری میں سیاسی بازی گری کی چالیں تھیں۔ تاہم جس ملک میں گلستان ادب کی آبیاری مائیکل، بہاری لال اور رویندرو ناتھ نے کی تھی وہاں

بازاری ادب کو قبول عام حاصل کرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس سلسلے میں جوتندر ناتھ سین گپتا کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے لوہار اور بڑھئی وغیرہ پر نظمیں لکھی ہیں اور ان کی عملی زندگی کی مدح و ستائش کی ہے۔ نذر الاسلام کے طرز کی تقلید میں پریمندر و مترانے اپنی ''پراتھما کا بو گرنتھو'' میں لکھا ہے کہ وہ مزدور، قلی اور غریبوں کے شاعر ہیں۔ روبندر ناتھ اس وقت بھی بہ قید حیات تھے اور ان کا قلم تھکا نہ تھا وہ خود بھی جذبات عوام کے کامیاب مصور تھے۔ وہ ان تبدیلیوں کو دیکھ رہے تھے اور ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ انھوں نے اس طرز کی مخالفت نہ کی۔ بلکہ بخلاف اس کے انھوں نے اپنی موت سے کچھ پہلے اس سلسلے کے متعلق یہ کہہ کر اپنی پسند کا اظہار بھی کر دیا کہ کسان اور مزدور کی زندگی اور اس کے متعلقات سے جن لوگوں نے عملی و زبانی طور پر اظہار تعلق و نمائشی ہمدردی کی ہے ان لوگوں کے کلام کا مطالعہ کرنے کیلئے وہ خود بے قرار ہیں۔ ان کی آخر عمر کی چند کتابیں'' روگ شجائے'' (بستر مرض پر)' ''ارگسو'' (صحت) '' جنمودنے '' (یوم پیدائش پر) وغیرہ میں انھوں نے اپنے تبدیل شدہ نظریات کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس سلسلے کے ساتھ ساتھ ہمیں ایک اور سلسلے کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ جنگ عظیم اول کے بعد یورپ کی سماجی

زندگی میں ایک غیر معمولی بد نظمی اور عدم توازن رونما ہوا۔ ان کی زندگی کا سابق دور اور اس کی تمام تر اقتصادی کڑیاں ایک ایک کرکے شکستہ ہوگئیں۔ جنگ کے بعد حصول امن کے سارے دروازوں نے بدامنی، بے اطمینانی اور بھیانک مستقبل کو دعوت دی۔ مسٹر ٹی۔ ایس۔ الیٹ T. S. Eliat نے اس بے اعتمادی اور عدم سکون کا اظہار اپنی کتاب "دی ویسٹ لینڈ" The Waste land میں کیا ہے۔ ہمیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید خشک، شکستہ اور بے جان زندگی کے متعلق اظہار خیال کیلئے ایک، نئے طرز، نئی زبان، نئی ترکیب اور نئے اسلوب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ٹی ایس الیٹ نے تمام سابق بند ھنوں اور اسلوب شاعری کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا۔ ان کی شاعری نے جدید تخیلات کی تبعیت میں نیا روپ لیا۔ بنگالی شاعروں نے بھی نظم کی اس تبدیلی کو قبول کرنا چاہا لیکن ان کے راستے میں دو دقتیں حائل تھیں۔ یورپ کی شاعری نے جس بربادی کی خاک سے اٹھ کر جنم لیا تھا وہ بربادی بنگالی شاعری کو زندہ کرنے کیلئے موجود نہ تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ روبندرو ناتھ کی عالم افروز شاعری اپنی پوری تابانی کے ساتھ نہایت قریب سے جلوہ پاشی کر رہی تھی اور آسانی کے ساتھ اس سے بے نیازی ممکن نہ تھی۔ تاہم نئی

زندگی کی تصویر کشی کیلئے نئے طرز، نئے اسلوب اور نئی بندشوں کے علاوہ نئے الفاظ اور نئے تخیل کی ضرورت تھی۔ اس لئے سابق طرز میں عمدا تبدیلی لانے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ ہمارے شاعروں نے روبندرو ناتھ کی شاعری سے الگ راہ نکالنے کی کوشش میں ان کے مستعمل الفاظ۔ تراکیب اور اسلوب سے قطع نظر کرکے بہت ہی سہل الفاظ اور نظمیاتی تخییل سے عاری زبان کا استعمال شروع کیا۔ اس کی وجہ سے بسا اوقات نظم میں بد نظمی اور کبھی کبھی ابتذال اور نا ہم آہنگی بھی پیدا ہو گئی۔ بشنو دے، جیبا نند داس اور امیو چکرورتی وغیرہ نے بنگالی نظم کے ذریعہ بڑی شدت کے ساتھ قدیم خواب کو ختم کرنے کا تصور پیدا کیا۔ روبندرو ناتھ کی شاعری نے شاعر کی بے نظیر خود اعتمادی اور مذہبی اعتقاد کی قوت سے زور حاصل کیا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی نظمیں واقعیت اور تاثر سے بھرپور ہیں اور ہم ان سے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔ لیکن ہمارے ان جدید شاعروں میں نہ تو خود اعتمادی تھی اور نہ مذہبی اعتقاد کی اہمیت۔ ان لوگوں میں سے جن میں کسی قدر مذہبی اعتقاد کی جھلک ملتی ہے وہ حقیقۃ ان کا سیاسی اعتقاد تھا جسے مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ سیاسی معتقدات عموما وقتی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اور سیاست کی

بساط میں تبدیلی پیدا ہونے کے ساتھ ہی یہ معتقدات بھی بدل جاتے ہیں - ان وجوہات کی بنا پر جدید شعراء اپنی کوئی مستقل راہ پیدا نہ کرسکے اور بنگالی ادب روبندرو ناتھ کی شاعری سے بے نیاز نہ ہو سکا -

روبندرو ناتھ سے الگ ہوکر جدید شاعری کا زمانہ ہم سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک کا متعین کر سکتے ہیں - ہم نذرالاسلام کو بھی اسی زمانے کا شاعر کہہ سکتے ہیں - پریمندرو متر کا حال پہلے ہی بتایا جا چکا ہے - ان کے بعد بشنودے ، شموسین اور شوبھاش مکھوپادھیائے کو ہم اس دور میں نمایاں دیکھتے ہیں - اس دور میں ہم مذکورۂ بالا شعراکی شاعری کو "سیاسی مارکسی شاعری" کا دھارا کہہ سکتے ہیں - پریمندرو نے خود اپنے آپ کو قلی اور غریب طبقے کا شاعر کہا ہے - اس طرح شوبھاش مکھوپادھیائے نے اپنے آپ کو مزدوروں اور کسانوں کا شاعر کہا - شعراء میں سے صرف شوبھاش مکھوپادھیاے نے اپنی نظموں کو سیاسی اعلانات کی صورت میں شہرت دی ہے - ان میں واقعی شاعرانہ اسپرٹ اور صحیح جذبات کی کمی نہ تھی اور ہم ان کی کاملانہ خدمات انسانیت سے انکار نہیں کر سکتے - نذرالاسلام کے بعد اس جماعت میں بشنودے ہی نے سب سے زیادہ قبولیت اور شہرت حاصل کی - بشنودے کی نظموں میں ہمیں تدریجی ترقی اور ارتقائی منازل کا مشاہدہ

ہوتا ہے - وہ ایک چابک دست ٹیکنیشین معلوم ہوتے ہیں جنھوں نے نئی بندشوں اور ترکیبوں کے ساتھ الفاظ کو استعمال کیا - اسی وجہ سے ان کے بعض اشعار کو ناقابل فہم بھی کہا گیا ہے - ان باتوں کے باوجود دشنود سے کی نظموں میں موسیقیائی حسن کی بہتات نظر آتی ہے -

اس زمانے میں ایک دوسری جماعت نے نظم کے میدان میں نئی نئی راگنیاں نئے سروں میں الاپنی شروع کیں - بعض نے قدیم طرز کی پیروی کی اور بعض نے تبدیل شدہ حالات سے تطابق پیدا کرکے اپنے خوابوں کی تعبیریں سنائیں - لیکن یہ خواب بھی حقیقت سے دور نہ تھے - بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے دیہاتی زندگی اور دھقانی تصورات کے دریعہ ابنائے وطن کو متوالا بنایا - جن لوگوں نے قدیم طرز کو اپنایا اور رویندر و ناتھ کی ڈگر پر آگے بڑھے ان میں ہم شہادت حسین ، غلام مصطفے ، عبد القادر ، سوجنی کانتو داس وغیرہ کے نام نمایاں دیکھتے ہیں - نئے طرز کے ساتھ نئے اسلوب پر اپنے تخیل کو عملی جامہ پنھانے والوں میں اجیت دت ، جیبانند داس اور شودھین دت لائق تذکرہ ہیں - شودھین دت ان سب میں زیادہ قابل اور تعلیم یافتہ شاعر ہیں - انھوں نے نظم کی زبان کو حتی الامکان موقر اور بلند کرنے کی سعی کی ہے - جیبانند داش کی شاعری میں ہمیں ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ جیسے بہت دور کوئی سنگیت بج رہا ہے اور اس کی دل کش تانیں ہمیں اپنی جانب کھینچتی رہتی ہیں ۔ جیمانند کی نظموں کی زبان بہت خوب صورت، نازک اور زندگی کے رس سے معمور ہے ۔ اس میں ہمیں سروں کا بلند پایہ اجتماع نظر آتا ہے ۔ اجیت دت کی شاعری میں خیال اور خواب کی دنیا آباد ہے ۔ ان کا طرز جدید ہے جن لوگوں نے دیہاتی زندگی پر زور دماغ اور قوت قلم صرف کی ان میں صرف جسیم الدین کا نام قابل ذکر ہے ۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض بعض شعرا مثلاً بند علی میاں نے دیہاتی زندگی کا تتبع کرکے شعراء کی صف میں جگہ حاصل کی ہے ۔ لیکن جسیم الدین کی بات ان میں پیدا نہ ہو سکی ۔

جسیم الدین

روبندر ناتھ کے بعد جس طرح نذرالاسلام نے ایک نئے سر کی تخلیق کر کے عوام کی توجہ اپنی طرف جذب کر لی تھی اسی طرح جسیم الدین نے بھی ایک عام شاہ راہ سے ھٹ کر قطعی اور مکمل طریقے پر ایک نا معلوم زندگی سے ھمیں متعارف کیا۔ حقیقت میں مائکل، بہاری لال، روبندرو ناتھ اور نذرالاسلام کے دھارے سے جسیم الدین کو کوئی تعلق نہیں ھے - ان کا بنیادی علاقہ میمن سنگھ گیتیکا یعنی میمن سنگھ کے گیتوں، دیہاتی گانوں نیز دیہاتی زندگی کی مسرت بخش کہانیوں اور رقص کے ساتھ ھے۔ انھوں نے جس دیہاتی نغموں سے ھمیں متعارف کیا ھے اس میں ایک گونہ تاثر، ہمدردی اور صفائی کے ساتھ ندرت پائی جاتی ھے۔ ان کے مستعمل الفاظ، خصوصاً اسماء و صفات اور تمثیلات و تشبیہات وغیرہ میں دیہاتی زندگی کا اصلی رنگ متحرک نظر آتا ھے - ان کی شہرت سب سے پہلے ان کی نظم "قبر" سے ہوئی - اس نظم سے ھمیں اچانک ایک نئے سر کا احساس ھوا - جسیم الدین نے اس نظم میں یہ دکھایا ھے کہ ایک دیہاتی بوڑھا اپنی پوتی کو آپ بیتی سنا رھا ھے - وہ اپنی بیوی کی قبر اُسے دکھاتا ھے اور اس کے محاسن اوصاف بیان کرتا ھے - ان اوصاف کے تذکرے میں درد

اور فراق کے کانٹے بھی جا بجا اپنی کھٹک دکھا تے ہیں جنھیں وہ سلیقے سے بتاتا جاتا ھے - اسی طرح وہ اپنے تمام گزرے ہوئے اعزہ کی قبروں سے اُسے متعارف کراتا ھے اور ان کے ساتھ اپنی زندگی کے علائق اور ساتھ ھی ان کے ھجر کی چبھن کو ایک ایک کرکے سناتا جاتا ھے - یہ اگرچہ ایک دیہاتی کی آپ بیتی ھے مگر تصورات و نظریات ایسے ھیں جن میں تمام انسانیت یکساں طور پر شریک ھے - ان کی نظموں کے مجموعے بنام " رکھالی ' بالوچر ' دھان کھیت " وغیرہ شائع ھوچکے ھیں - ان کے منظوم افسانوں میں سب سے مشہور " نکشی کانتھار ماٹھہ " (منقش کپڑوں کا میدان) ھے - اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بنام The field of emboridered quilt مسز میل فورڈ نے کیا ھے اور وہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ھوچکا ھے - ان کا دوسرا منظوم افسانہ " شجن بادیار گھات " ھے - ان کے مرتبہ گانوں کی ایک کتاب کا نام " رنگیلا نائر ماجھی " (رنگین کشتی کا ملاح) ھے - تخلیق پاکستان کے بعد سے جسیم الدین مشرقی پاکستان میں ادبی خدمات انجام دے رھے ھیں اور اس اثنا میں ان کی تین کتابیں شائع ھوچکی ھیں - پہلا ڈراما بنام " بیدرمے " (سپنیرے کی لڑکی) ' دوسرا مجموعۂ نظم بنام " ماٹیر کنا " (نوحۂ زمین) اور گانوں کی ایک کتاب بنام " پدا پار " جسیم الدین ، مشرقی پاکستان میں ضلع فرید پور کے باشندے ھیں -

اردو شاعری سے بنگلا شاعری کا تعلق

اس زمانے میں اردو شاعری سے بعض بنگالی شعرا کافی طور پر متاثر ہوئے اور اقبال و حالی وغیرہ کی متعدد نظموں اور کتابوں کے تراجم بنگلا نظم میں کئے گئے - شکوۂ اقبال کا سب سے پہلا ترجمہ شاعر اشرف علی خاں نے کیا - ان کے سینے میں بھی ندر الاسلام کی طرح ایک بے چین دل تھا اور جس زمانے میں ندر الاسلام اپنی انقلابی اور باغیانہ شاعری سے سارے بنگال کو مست کر رہے تھے اُس وقت اشرف علی خاں نے شکوۂ اقبال میں کسی قدر باغیانہ رنگ کی جھلک دیکھ کر اور اس کے انقلاب پسند مضامین سے متاثر ہو کر اس کا ترجمہ بنگلا زبان میں کیا - لیکن یہ ترجمہ لفظی نہ تھا بلکہ اس کے مضامین کو اپنا کر انھوں نے اپنے تخیل کی آمیزش کے ساتھ شکوہ کو پیش کیا تھا - اس کے بعد شکوہ اور جواب شکوہ کے متعدد تراجم شائع ہوئے - قابل ذکر مترجمین یہ ہیں - مولوی تمیز الرحمن ، قاضی اکرم حسین ، محمد علی اعظم ، میزان الرحمن ، ڈاکٹر محمد شہید اللہ ، امین الدین احمد ، محمد سلطان - ابو الفضل سید علی نے شکوہ کے ترجمے کا نام شکایت رکھا - اقبال کی کتاب اسرار خودی کا منثور ترجمہ سید عبد المنان نے کیا - بعض اجزا کا

منظوم تـرجمہ سید علی احسن نے پیش کیا ۔ اقبال کی بعض منتخب نظموں کا مشترک ترجمہ سید علی احسن اور فرخ احمد نے کیا ہے جس کا نام "اقبالر کبیدہ" ہے ۔ اس کتاب میں بانـگ درا کی بعض مختصر نظموں کے مشتـرک تـراجم منظـوم صورت میں ابو الحسین اور فرخ احمد نے کئے ہیں ۔ مسدس حالی کے دو ترجمے غلام مصطفی اور ہمایوں کبیر نے کئے ۔ غالب کی بعض غزلوں کے تراجم اکرم حسین نے کئے ۔

دور جدید میں بعض فارسی کتابوں کے بنگلا تراجم بھی کئے گئے ۔ منطق الطیر اور مثنوی مولانا روم کے بعض اجزا کا بنگلا منثور ترجمہ "تتو رتنو مالا" کے نام سے گریش چندر سین نے کیا ۔ انھوں نے سنـہ ۱۸۸۷ع میں قرآن پاک اور بعض احادیث رسول کا ترجمہ بھی بنگلا زبان میں شائع کیا تھا ۔ شیخ عبد السلیم شاہتّو رتنو نے اپنی کتاب "آب‌حیات" میں حافظ، شمس تبریز، جامی اور سعدی کی بعض نظموں اور غزلوں کے تراجم کئے ہیں ۔ قادرنواز نے اپنی ایک منظـوم کتاب "مورال" میں ایـام جاہلیت کی بعض عربی نظموں کے بنگلا تراجم شائع کئے ہیں ۔ تراجم کے سلسلے میں جن صاحبان قلم کے نام لئے جاسکتے ہیں ان میں ہریندرو دیب اور کانتی چندر گھوش قابل تذکرہ ہیں ۔ ان لوگوں نے رباعیات عمر خیام اور حافظ کی رباعیات کے تراجم کئے ۔ ڈاکٹـر محمد شہید اللہ نے

سنہ ۱۹۳۸ء میں رباعیات عمرخیام اور دیوان حافظ کی بیشتر غزلوں کا بنگلا منظوم ترجمہ کیا ۔ نذرالاسلام نے رباعیات خیام اور رباعیات حافظ کے منظوم بنگلا تراجم کئے ۔ اسی طرح مہر عزیز الرحمن نے خواجہ معین الدین چشتی کے دیوان کا بنگلا ترجمہ کیا ۔ ان ترجم کے علاوہ اور بھی بہت سے تراجم ہوئے اور ہوتے جارہے ہیں ۔ یہاں صرف مختصرا بعض قابل ذکر مترجمین کے نام پیش کئے گئے ہیں ۔

تحریک پاکستان اور نیا ادبی دور

جنگ عظیم ثانی کے ساتھ ساتھ تمام ملک میں آزادی کیلئے ایک نیا جوش و خروش دیکھا جانے لگا ۔ آزادی ملک کی تحریک کے ساتھ ہی حصول پاکستان کی تحریک نے مسلمانوں میں شدت اختیار کی ۔ انگریزوں نے بھی یہ یقین کر لیا کہ ہندوستان پر ان کی حکمرانی کی شب اب صبح فنا سے ہمکنار ہونے والی ہے اس لئے انھوں نے سیاسی طور پر اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں سونپ دینے کا مکمل طور پر فیصلہ کر لیا ۔ اس سیاست کی تاریخ کا تاریخ ادب سے تعلق ہوتے ہوئے بھی یہاں اس کا تفصیلی

تذکرہ ضروری نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس برصغیر کے ہر زندہ انسان کے قلب پر وہ نقش کالحجر ہے - اس لئے اس سلسلے میں صرف ادبی حیثیتوں ہی کا تذکرہ ضروری ہے - تحریک پاکستان کے موقع پر ہندوستان کے مسلمان عموماً اور بنگال کے مسلمان خصوصاً جس طرح اپنی تاریخ ، ثقافت اور تہذیب سے زیادہ باخبر ہوئے اسی طرح انہوں نے ادبی حیثیت سے بھی اپنی باخبری کا ثبوت دیا - مشہور لاہور ریزولیوشن کے بعد ہی سنہ ۱۹۴۱ع میں کلکتے میں ایک ادبی مجلس بنام " پوربو پاکستان رینیسا سوسائٹی " اور سنہ ۱۹۴۷ع میں ڈھاکے میں ایک مجلس بنام "پوربو پاکستان شاهتو شنگشدہ ' قائم ہوئی - ان دونوں مجلسوں نے مشترکہ مفاد اور مجموعی مقاصد کے پیش نظر اجتماعی طور پر کام کیا - ان دونوں ادبی مجلسوں کا واحد مقصد یہ تھا کہ پرانی راہ سے الگ ہو کر مسلمانوں کے قدیم ادبی ' تمدنی ' ثقافتی اور مذہبی سرمائے کو ادبی حیثیت سے محفوظ رکھا جائے - اسی وجہ سے انہوں نے بنگال کے مسلم ادب مثلاً دیہاتی گانوں اور قدیم پوتھیوں پر زیادہ زور دیا - انہوں نے بنگلا زبان میں مناسب طور پر عربی ' اردو اور فارسی کے وہ سارے الفاظ داخل کرنے شروع کئے جنھیں مسلمان اپنی روزمرہ زندگی میں عموماً استعمال کرتے تھے - ان کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ تمام دنیا کے

ادب سے عموماً اور اسلامی ممالک کے ادب سے خصوصاً وہ تمام چیزیں حاصل کی جائیں جو عام انسانیت کیلئے مفید اور قابل قدر ہیں۔ اس تحریک میں بنگال کے بہت سارے مسلمان ادیبوں اور شاعروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اردو ادب میں اس کی اس لئے ضرورت نہ تھی کہ وہ پہلے ہی سے اسلامی تہذیب وثقافت کا گہوارہ تھا۔ سید امداد علی، مولانا اکرم خاں، حسیم الدین، فرخ احمد، سید علی احسن، سید سجاد حسین، ابو الکلام شمس الدین، مجیب الرحمان خاں اور غلام مصطفےٰ وغیرہ اس تحریک کے زبردست علم برداروں میں سے تھے۔ اس سلسلے میں چند شعراء اور ادیبوں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے تخلیق پاکستان کے قبل سے اپنی ادیبانہ مساعی مقاصد بالا کیلئے وقف رکھیں اور آج بھی اپنے کام میں مشغول ہیں۔

فرخ احمد— پیدائش سنہ ۱۹۱۸ع بمقام جیسور۔ ان کی دو منظوم کتابیں بنام "شات شاگر یر ماجھی" (سات سمندروں ملاح) اور "سراجا منیرا" شائع ہو چکی ہیں۔ مو خرالذکر کتاب سنہ ۱۹۵۳ع میں اشاعت پذیر ہوئی۔

احسن حبیب— پیدائش سنہ ۱۹۱۶ع بمقام باریسال۔ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ بنام "راتری شیش" (رات ختم) شائع ہو چکا ہے۔

سید علی احسن — پیدائش سنہ ۱۹۲۴ء بمقام جیسور۔ ان کے مجموعہ نظم کا نام "چہار درویش" ہے - ان کی ایک تنقیدی کتاب "نذرالاسلام" ہے - یہ دونوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں - ان دونوں کے علاوہ چند اور کتابیں ان کی زیر ادارت بھی شائع ہوئی ہیں -

۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کو پاکستان ایک حقیقت بن گیا اور اس کے بعد سے مندرجہ بالا ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ اور بہت سارے جواں ہمت اور جواں سال ادیب نئے میدان میں نئے انداز، نئے تخئیل اور نئے اسلوب کے ساتھ بنگلا ادب کی خدمت کے لئے آگے بڑھے اور کام میں لگے ہوئے ہیں - کارواں ادب رواں ہے اور مسافر ہوشیار-

تمت بالخیر

تفصيلي فهرست تصانيف معه شمار صفحه

(ا)

(ب)

(پ)

(ت)

(ٹ)

(ج)

(چ)

(ح)

(خ)

(د)

(ڈ)

(ر)

(ز)

(س)

(ش)

(ط)

(ع)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(گ)

(ل)

(م)

(ن)

(ر)

(ہ)

(اس فہرست میں لغوی اصول کی پوری مطابقت نہیں ہے - صرف حرف اول و دوم کی ترتیب باقی رکھی گئی ہے -)

تفصیلی فہرست مصنفین وغیرہ

(اس فہرست میں اصول لغت کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے - صرف حرف اول و دوم کی ترتیب کا خیال کیا گیا ہے)

(ب)

(پ)

(ت)

(ج)

(چ)

(ح)

(خ)

(د)

(ڈ)

(ر)

(ز)

(س)

(ش)

(غ)

(ف)

(ق)

( )

(گ)

(ل)

(م)

(ن)

(و)

(ہ)

(ی)